

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224200

UNIVERSAL
LIBRARY

ادبی رز وکامہوار با تصویر سالہ

العصر

مربطہ

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

جلد اول

مارچ لغایت جولائی ۱۹۱۳ء

جس میں

ٹائٹل سے زائد نامور اہل قلم کے تقریباً پچاسی مضامین

پوسٹ تین سو صفحات میں درج ہیں

اور

تیس نایاب و نادر تصاویر شامل ہیں

مقام اشاعت فہرست العصر، لکھنؤ

فہرست مضامین

| صفحہ | نمبر | صفحہ |
|------|--|--------------------|
| ۱۰ | ۲۳۔ قوتِ لامسہ۔ خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب | ۱۰۵ |
| ۱۹۶ | ۲۴۔ قوتِ خیال۔ مولوی شعیب احمد صاحب ندرت (میرٹھی) | ۹۶ |
| ۱۱۳ | ۲۵۔ کرہ ہوائی۔ شیخ فیروز الدین مراد ایم ایس سی بی اے | ۱ |
| ۲۲۵ | ۲۶۔ کیا زمین کی حرکت سست ہو رہی ہے؟ | ۲۲۵ |
| ۲۰۵ | ۲۷۔ گرہ مسکین۔ (قصہ) بابور دش لال صاحب | ۵۷ |
| ۲۰ | ۲۸۔ لارڈ کیلون۔ مترجم۔ آر۔ اے | ۱۲۳ |
| ۱۳ | ۲۹۔ مغلوں کی سوشل زندگی۔ بابو ڈی لال صاحب ٹیم بی اے | ۱۲۶ |
| ۳۰ | ۳۰۔ مسلمانوں کی علمی ترقی۔ مولوی محمد شفیع الدین خان ایم آر اے ایس | ۲۲۹ |
| ۷۲ | ۳۱۔ مایا کی غلاسنی۔ منشی تیرتھ رام صاحب فیروز پوری | ۲۴۳ |
| ۸۷ | ۳۲۔ مصنوعی انسان۔ (قصہ) بابور دش لال صاحب | ۲۶ |
| ۱۸۶ | ۳۳۔ میر ہمدی مجروح۔ سید محمد فاروق صاحب شاہپوری | ۷۸ |
| ۳۵ | ۳۴۔ نواب سالار جنگ ٹاٹ | ۲۶۲، ۱۹۵، ۱۵۳، ۱۰۰ |
| ۶۷ | ۳۵۔ نظام شمسی۔ مترجم۔ آر۔ اے | ۱۷۷ |
| ۱۵۰ | ۳۶۔ نواب فریدن جنگ بہادر | ۲۲۱ |
| | ۳۷۔ آکھ کا طلسم۔ منشی دواد کا پرشاد صاحب اُفق (لکھنوی) | ۲۵۷ |
| | ۳۸۔ افسانہ گل۔ مولوی محمد سیف الدین صاحب شباب | ۲۹ |
| | ۳۹۔ العصر کا خیر مقدم۔ حافظ محمد یعقوب صاحب الفجر گیادی | ۱۶۹ |
| | (۱۲) مولوی محمد عبدلکریم خان صاحب صبر دہلوی | ۱۸۷ |
| | (۳) بابو گوری شنکار لال صاحب اختر | ۵ |
| | ۴۰۔ اپنے عکس دو دو باتیں۔ منشی محمد عبد الحمید صاحب حمید (میرٹھی) | ۲۴۹ |
| | ۴۱۔ اُردو کیا ہے؟ جناب زوہار آبادی | ۴۳ |
| | ۴۲۔ بہار دکن۔ خواجہ معین الدین صاحب سلام | ۱۲۹ |
| | | ۶۲ |

نشر

۱۹۵۶

| | | | | | | | | | | | | | | | | | | | | | |
|---------------------------------|----------|--------------|---|---|---|-----------------------|---|---|------------------------|---------------------------|---|------------------------------|---|---|---|---|------------------------------------|---|---|---|---|
| ۱۔ آنریبل مولوی سید حسین بگرامی | ۲۔ العصر | ۳۔ ایڈیٹوریل | ۴۔ انتہائے سائنس۔ شیخ فیروز الدین مراد ایم ایس سی بی اے | ۵۔ انسانی دماغ کی ماہیت۔ منشی تیرتھ رام صاحب فیروز پوری | ۶۔ اساتذہ اُردو کی فارسی شاعری حکیم حبیب الرحمن صاحب احسن ایم آر اے ایس | ۷۔ اجودھیا۔ جناب عزیز | ۸۔ اُصول زندگی۔ قاضی حمید الدین احمد صاحب حمید کوٹلوی | ۹۔ بہادر شاہ ظفر۔ سید محمد فاروق صاحب شاہپوری | ۱۰۔ پینڈت رتن ناتھ شلر | ۱۱۔ تنقید کتب۔ "سید اعظم" | ۱۲۔ تحصیل سائنس کی اہمیت۔ مترجم۔ آر۔ اے | ۱۳۔ تاریخی تصورات میں انقلاب | ۱۴۔ تدبیر الدولہ سید مظفر علی خان امیر۔ از (لکھنوی) | ۱۵۔ حفظِ صحت اور علاج۔ منشی تیرتھ رام صاحب فیروز پوری | ۱۶۔ حرکت کا پہلا قانون۔ شیخ فیروز الدین مراد ایم ایس سی بی اے | ۱۷۔ حیات بعد المات۔ منشی رشید احمد صاحب صدیقی | ۱۸۔ دُنیا کی بربادی۔ مترجم۔ آر۔ اے | ۱۹۔ دولاہڑ راستی کش (قصہ) مسٹر ظفر عمر بی اے (علیگ) | ۲۰۔ رازداری۔ بابو بگت موہن لال صاحب رولان بی اے | ۲۱۔ شمس العلماء خواجہ حالی۔ سید محمد فاروق صاحب شاہپوری | ۲۲۔ علم النجابت۔ پروفیسر شمس الدہی صاحب |
|---------------------------------|----------|--------------|---|---|---|-----------------------|---|---|------------------------|---------------------------|---|------------------------------|---|---|---|---|------------------------------------|---|---|---|---|

العصر کے قواعد

یہ باتصویر یا ہزار رسالہ، جو اردو علم ادب کی ترقی کا اصلی نمونہ ہے، ہر ماہ کے آخر میں لکھنؤ سے شائع ہوتا ہے۔ ملک کے نامور اہل قلم مسلم القیوت اساتذہ اور بہترین انشاپرداز اسے وقیع و دلچسپ اور مفید بنانے میں سرگرم ہیں۔ مضامین کی نوعیت ایسی ہے جو ہر طبقہ کے لیے دلچسپ ہو۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کے مضامین نثر و نثر خواہ نظم، تعلیم یافتہ ستورات کے لیے بھی اُسی قدر دلچسپ، مفید اور خوشگوار ثابت ہوں جبکہ تعلیم یافتہ اصحاب اور بالغ نظر حضرات کے لیے۔

اسکی ضخامت ۵۶ صفحات ہوتی ہے اور صفحہ میں دو کالم ہونے کی وجہ سے اس میں معمولی تقطیع کے ایک سو صفحات سے زائد گنجائش رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ہر ماہ التزاماً ایک رنگین اور متعدد رنگی تصاویر دی جاتی ہیں جن میں مشہور مصوروں کی تصانیع کے نمونے، مشاہیر حضرات کے فوٹو، تاریخی عمارات کے نقشے اور دیگر دلچسپ واقعات کے مرقعے ہوتے ہیں۔ بعض تصاویر کے متعلق مشہور شاعروں کی نظمیں بھی حاصل کی جاتی ہیں جو تصویر کی دلکشی کو دوبالا کر دیتی ہیں۔ قدر دانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے حجم اور تصاویر کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

تصاویر کے علاوہ اسکی لکھائی چھپائی میں بھی اعلیٰ درجے کا اہتمام کیا جاتا ہے اور قیمتی کاغذ پر نہایت صفائی کے ساتھ تصاویر چھاپ کر اس میں اضافہ کی جاتی ہیں جو اسکی مقررہ ضخامت سے علاوہ ہوتی ہیں۔ بہ نفع قدر دانانِ علم اس کے لیے ایسا پرہیزگیا کیا گیا ہے جو کمی قیمت کے ساتھ انگریزی سیکڑیوں سے مشابہ ہو۔

اسکی سالانہ قیمت للمعبر مع محصول ہے۔ اس قیمت میں ان خصوصیات کے ساتھ کوئی پرچہ نہیں مل سکتا، بلکہ اس رزانی کے ساتھ اس قدر تصاویر بھی کہیں دستیاب نہیں ہو سکتیں۔ نظربین معزز ناظرین رسالہ سے استدعا ہے کہ اگر یہ خدمات قابل قبول ہوں تو علاوہ ذاتی قدر دانی کے اسکی توسیع اشاعت میں بھی حتی الامکان امداد سنمائیں۔

خریداری کے لیے پیشگی قیمت آنا ضروری ہے۔ نمونہ مفت نہیں بھیجا جائے گا بلکہ اسے وصول ہونے یا دیو پلے ایبل کی اجازت آنے پر ارسال ہوگا۔ نام اور پتہ صاف اور خوشخط لکھا جائے تاکہ پرچہ پہنچنے میں دقت نہ ہو۔

اس رسالہ میں مذہبی مباحث اور موجودہ پالیٹکس پر کوئی مضمون نہ چھاپا جائیگا۔ نام تمام مضامین بھی نہیں لے جائینگے۔ جس مضمون کے ساتھ تصویر کی ضرورت ہو اسکا مضمون نگار حضرات خود بند و بست فرمائیں۔

طلباء اور کم استطاعت صحاب کے لیے "العصر" کا ایک سٹاڈیشن بھی شائع ہوتا ہے۔ اس میں صرف ایک تصویر ہوتی ہے اور کاغذ اچھری فٹش کے بجائے ایسی استعمال کیا جاتا ہے۔ اسکی سالانہ قیمت سے مع محصول ہے۔

جملہ خط و کتابت پتہ ذیل پر ہونی چاہئے:
پیارے لال شاکر (میرٹھی) مالک ایڈیٹر رسالہ "العصر" لکھنؤ

العصر

بصر

زمانہ کا بھی ہر شے ہر آدمی کا زمانہ یکساں نہیں رہتا۔ اس سے بھی یہی
 مترشح ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی کامیابی اور ناکامی کے ساتھ اسکو ایک گہرا تعلق
 ہو جو روز و رات سے قائم ہو اور جب تک دنیا کا عالم اسباب ہونا مسلم ہو قائم رہے گا۔
 یہاں یہ سوال قدر تا پیدا ہوتا ہے کہ اس تعلق کو خوشگوار اور سود مند بنانے کا
 طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ یہ سوال دیکھنے میں چھوٹا اور مختصر ہے لیکن حقیقت یہ ہے
 کہ انھیں دو چار لفظوں میں فلسفہ زندگی کا راز پوشیدہ ہے اور اسی لحاظ سے
 اسکا جواب چند حرفوں میں ادا نہیں ہو سکتا۔ آج تک اس معرکہ آرا مسئلہ پر
 حکماء قدیم و جدیدین سے ہر ایک نے فرداً فرداً طبع آزمائی کی ہے اور اس
 کوشش میں اگرچہ کئی ایک شاہراہ صداقت سے کسب قوت ہو گئی ہیں لیکن
 مجموعی طور پر بے یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ زمانہ کے ساتھ تعلقات کا عددگی
 اور خوش اسلوبی سے برقرار رکھنا یہی ہے کہ ”تم اُسکے نقش قدم پر چلو“
 فلاطون کہتا ہے ”وقت کی قدر و قیمت کرنا ہی مال زندگی ہے۔“
 ایک حکیم کا قول ہے ”زمانہ اور وقت ایک ہی طاقت کا نام ہے۔“
 اس طاقت کو کام میں لانا چاہتے ہو تو اسی کے بن جاؤ۔“
 ایک اور حکیم کا مقلد ہے ”تم زمانہ کے ہو جاؤ، وہ تمھارا ہو جائیگا۔“

زمانہ عصر و وقت، یمنون ایک ہی چیز ہیں اور یمینون کا اثر انسانی زندگی پر
 یکساں پڑتا ہے۔ یہ اثر کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کیونکر ہوتا ہے؟ ان سوالات کا
 تفصیلی جواب خواہ کچھ ہی کیوں ہو لیکن یہ امر عین الیقین کے درجے تک
 پہنچا ہوا ہے کہ بنی نوع انسان کی حیات و اعمال کے ساتھ اس اثر کا ایک مستقل
 دائی اور استوار تعلق ہے جہاں اسے بہت پریشانی خیز خیالات کا اظہار فرمایا ہو
 دنیا کے سرور گرم چشمہ لوگوں نے تجربہ و عمل کے بعد ایسے اتفاق کیا ہے۔ زمانہ کی
 زیرکیان مشہور اور زبان زد خاص و عام ہیں۔ اسکی تلون مزاجیان چھٹی ٹی
 نہیں لیکن آدمی کے ساتھ من حیث مجموعہ اسکے جو کچھ تعلقات ہیں اس میں
 ہمواری اور یکسانیت کا ایک ایسا مضبوط رشتہ قائم ہے جو کبھی نہیں ٹوٹتا۔
 یہ ضرور ہے کہ زمانہ کے تاثرات موافق بھی ہوتے ہیں اور خلاف بھی لیکن کسی
 نہ کسی صورت میں ہوتے ضرور ہیں۔ اسکی مثال بعینہ ایسی ہے کہ شمع
 آفتابی کی حرارت پودہ ہونے لگے اور نشوونما کی بھی کفیل ہوتی ہے اور جب
 مخالف سبب جمع ہوجاتے ہیں تو یہی حرارت اُنکے لیے برق خرم کا بھی کام
 کر جاتی ہے۔ دونوں حالتیں بلاشبہ ایک دوسرے کی متضاد و متناقض ہیں لیکن
 یہ کون کہہ سکتا ہے کہ ان دونوں نتیجوں کا ماخذ ایک ہی شے نہیں ہے۔ یہی حال

اسی قسم کی اور مثالیں مقول تعداد میں مل سکتی ہیں جن سے
ترشح ہوتا ہو کہ ”زمانہ شناسی“ کامیابی اور کامگاری کی کلید ہے۔ اسی
عقدہ کو کسی نکتہ سنج شاعر نے ذیل کے مصرعہ میں کسیدہ زراکت اور
لطافت سے قلمبند کیا ہے: مصرع

زمانہ باتوں ساز و تو بازمانہ باز

اس مصرع پر سرسری طور سے غور کرئیے یہ معنی بھی خود بخود حل ہو جاتا
ہے کہ زمانہ کوئی ایسی چیز نہیں جو زور و زبر کے اثر سے کسی کے قابو میں آسکے
اور یہ بات بھی پیدا ہوتی ہے کہ زمانہ خود کسی کے ساتھ موافقت نہیں
کرتا بلکہ یہ کام آدمی کا ہے کہ وہ اُسکے ساتھ ساتھ بہنے میں کوشاں ہو۔
بہر کیف اس مختصر بحث کا ماحصل یہی ہو سکتا ہے کہ انسان کو زمانہ شناسی
کا ملکہ راسخ اپنی ذات میں پیدا کرنا چاہیے اور یہی صفت اُسکی کوششوں
کے سر کامیابی کا سہرا باندھ سکتی ہو۔

پُرانی روایات کو تقویم پارینہ سمجھا کر قابل فوج نہ جانو، لیکن آج کل کرہ
ارض پر جو کچھ گذر رہا ہے وہ کم از کم دور بین طبائع کیلئے ضرور سبق آموز اور
ہمارا مطلب پوشیل حالت سے نہیں بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آج
جو اقوام ضروریات زمانہ سے باخبر ہیں اور وقت شناسی کا مادہ جنہیں
موجود ہے وہ سیاسی تفوق سے قطع نظر علمی، تمدنی، معاشرتی اور دینی
ترقی کے لحاظ سے بھی دوسروں کیلئے باعث رشک ہیں اور جو ممالک
ان صفات سے محروم ہیں وہ قعر ذلت میں گرتے جاتے ہیں۔ پُرانی تاریخوں
کی ورق گردانی کرو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ جو قومیں آج تک پیدا ہو کر
مست چکی ہیں وہ اسی وقت تک سرسبز و کامیاب رہی ہیں جب تک
کہ وہ زمانے کے قدم بہ قدم چلتی رہی ہیں اور جو قومیں ان سے یہ صفات
سلب ہو گئی ہیں انکا عروج خاک میں مل گیا ہے۔ موجودہ اقوام میں بھی
جو اس وصف سے خالی ہیں اور آئندہ کیلئے بھی اُنکی آنکھیں اور اُنکے
کلان بدین وہ رفتہ رفتہ زوال کا شکار ہو کر اس طرح فنا ہونیوالی ہیں

کہ آگے اُنھیں کوئی یاد بھی نہ کرے گا مختصر یہ ہے کہ اس دُنیا میں بُرا
وہی ہو سکتا ہے جو ”زمانہ“ کی شناخت رکھتا ہو۔ یہ اصول انفرادی اور
مجموعی دونوں حالتوں پر یکساں صادق آتا ہے۔ جو قوم یا جو فرد قوم قی
کرنا چاہے اُسے ”زمانہ شناسی“ کے مکتب میں سبق لینا چاہیے اور وہ
گزشتہ قاعدہ وہ قانون سیکھنا چاہیے جنہیں ”انسانی زندگی“ کے عقدہ
مشکل کے حل کرنے کا راز مستتر ہے۔

زندگی! عزیز زندگی!! اس نام میں کیا کچھ دلفریبی اور اس لفظ
میں کیسی کچھ دلربائی پائی جاتی ہے۔ اس پنج حرفی مجموعے میں ایک
خاص قسم کی مقناطیسی کشش چھپی ہوئی ہے جسکے گونا گون اثرات کا
قلبِ انسانی کے ساتھ ایک غیر معمولی علاقہ پایا جاتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ
ہے کہ اس علاقہ اور رابطہ کا اظہار جن جن طریقوں سے کیا جاتا ہے وہ قابل
ستائش بھی ہیں یا نہیں۔ جواب میں تفصیل کی ضرورت ہوگی لیکن
بہ نظر اختصار صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں
باشندگان عالم میں سے ایک فیصدی مشکل ایسے عاقل اور دشمن
نہ کلین گے جو اس انعام خداوندی (زندگی) کے ساتھ حقیقی محبت و محو
کا سلوک کرتے ہوں۔ وہ کون ہے جو اپنی زندگی کو قدر و قیمت کی نظر سے
نہ دیکھتا ہو اور اُسے عزیز نہ سمجھتا ہو لیکن جس طرح دوستوں میں دشمن نکل آتے
ہیں بعینہ یہی حال زندگی کے چاہنے والوں کا ہے۔ سب اُسکے نام پر مینے
اور دوستی کا دم بھرتے ہیں لیکن غور سے دیکھو تو شاید ہی کوئی اُسکے
حق محبت ادا ہوتا ہو۔ زندگی! زندگی! ابھرا ایک کی زبان پر ہوتا ہے
لیکن یہ نہیں سوچتا کہ آخر زندگی کا ماحصل کیا ہے اُسکی عظمت کا پتہ
حقیقت میں کیسے ہو سکتا ہے۔ ان باتوں پر غور کرئیے دانشمندانہ طرز
زیست کی طرف رہنمائی ہوتی ہے۔ اور جو شخص اس دُنیا میں حقیقی طور پر
زندہ رہنا چاہتا ہو اُسے بار بار اسی مسئلہ پر ذہن دوڑانا اور بالآخر کسی
صحیح اور صائب نتیجے پر پہنچنے کی سعی کرنا چاہیے۔

وجود انسانی، اخلاق، عالم کی خاص، انخاص مصلحت شناسیوں کا نتیجہ ہو۔ آدمی پیدا ہوتا ہو اور مر جاتا ہو۔ اب تک کتنے آئے اور کتنے اٹھ گئے لیکن اگر اسی آمد و رفت کا نام زندگی ہو اور یہ زندگی وہی ہو جس کا صرف نام انسانی دل و دماغ پر با فوق الفطرت اثر پیدا کر دیتا ہو تو خون ہو کہ یہ زندگی آل بین اور دور اندیش نظروں میں کسی واجبی عزت و احترام کا استحقاق نہ حاصل کر سکے گی بلکہ ظریفانہ انداز میں یوں کہا جائیگا کہ بنی آدم نے اپنی کرتوتوں سے اپنے ہی چکارہ ہونے کا ثبوت دیکر ملائیک کے الزامات کو جو اس پر روزِ تخلیق عاید کیے گئے تھے اور تقویت پہنچا دی۔ حق یہ ہو کہ اگر اسی کو زندگی کہا جائیگا تو انسانی فضل و کمال کا دیلے ذخائر ہمیشہ کیلئے خشک ہو جائیگا اور تمدن، معاشرت، فلسفہ، سائنس اور علوم و فنون کی برکتیں دُنیا سے ہمیشہ کیلئے اٹھ جائیگی۔

دُنیا اور دُنیا والوں کی شانِ نزول، اور ان کی ضرورتِ تخلیق کا مسئلہ پیچیدگیوں اور عقائد کی رنگارنگیوں کے باعث ایک عقدہ لا ینحل بن گیا ہے لیکن اس اختلافی مسئلہ کی ایک شق ایسی ہو جس پر مذہب اور فلسفہ دونوں متفق ہیں اور وہ یہ ہے کہ

”تم کام کے آدمی ہو“

”کام کا آدمی“ دیکھنے میں تو ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ہم تم، لیکن اُس کے خیالات میں بندی اور جذبات میں پاکیزگی ہوتی ہے، اُس کا دماغ عجیب و غریب قوتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ آنکھ اور کان اُس کے بھی ہوتے ہیں لیکن اُس کے دیکھنے اور سننے کی چیزیں کچھ اور ہوتی ہیں۔ اُنہیں لوگوں کو اس بات کا حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ”خلیفہ اللہ“ کا مستحق سمجھیں۔ لیکن اُن کے کام نام و نمود کیلئے نہیں ہوتے بلکہ اُنہیں خدا اور حقیقت کی تلاش ہوتی ہے۔ اُنہیں تمام دُنیا سے واسطہ نہیں ہوتا ایک دُھن ہوتی ہے جو اُن کے دماغ کو کسی وقت فرصت سے نہیں دیتی۔ ہاں وہ زمانہ شناس ہوتے ہیں۔ اُن کی دُھن وقت کے خلاف

نہیں ہوتی۔ بھیر دین میں پنچم کا جوڑ وہ نہیں ملائے بلکہ وہی راگ الپتہ میں جس کا وقت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی ایک ایک تان سننے والوں کی روح تک کو متاثر کیے بغیر نہیں رہتی رکاش صفت عام و خاص میں پیدا ہو سکے کہ خاکدانِ عالم حقیقت کی روشنی سے منور اور صداقت کی مے سے مست بجائے۔

بہندوستان کو بھی ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے جو اپنے تن و مہن سے اُس کے نام کو اُجالین اور اپنے آپ کو محسن ملک ثابت کر دکھائیں۔ اسکے لیے ایسے آدمی درکار ہیں جو زمانہ کی ضرورتوں کو جانیں اور وقت کے نقش قدم پر چلیں۔ ابھی ہمارے یہاں ایسے پاک نفوس ناپید ہیں لیکن اُن کی ضرورت محسوس ہو رہی۔ قومی اور ملکی ضروریات کی تکمیل میں ”جر نلزم“ کا بھی ایک حصہ ہوتا ہے۔ اسی مقصد کے پورا کرنے کیلئے اکثر اچھے اچھے پرچے اور رسالے نکل رہے ہیں اور اس بات کی کوشش کی جا رہی ہے کہ ملک غفلت کی نیند سے چونکے اور ہمارے یہاں کارآمد عنصر کا اضافہ ہو۔ صنعت و حرفت، علم ادب، معاشرت، تمدن اور اسی قسم کے کئی صیغے ہونگے جو اہل ملک کی خاص توجہ کے محتاج ہیں۔ مبارک ہیں وہ کوششیں جو کسی نہ کسی پہلو سے بہتری اور فلاح کیلئے کی جا رہی ہیں۔ یہ وقت ہے کہ باہمت اور کارکن جماعتوں کا ہاتھ بٹایا جائے اور اُن کے بوجھ کو تقسیم عمل کے اصول کے مطابق فرد فرد بانٹ لیا جائے۔ اسی بند پایہ خیال کے مرکوز خاطر ہونے کے بعد العصر کے اجراء کی جرات کی گئی ہے اور خدا سے دعا ہے کہ ہماری ناچیز کوششیں مقبول ہوں اور جن اغراض کو پیش نظر رکھ کر العصر کی اشاعت کا انتظام کیا گیا ہے وہ با حسن الوجہ پوری ہوں۔

العصر کے مقاصد کی توضیح غالباً یہاں طوالت پیدا کرے گی۔ مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ ملک کے فائدے اور بہبودی کے ہر ایک صیغے سے اس کو تعلق رہیگا۔ پالیٹکس اور مذہبی مباحثات البتہ اسکے

ارادوں میں پکا اور اغراض میں پورا کرے۔ ہمیں سچی اور حقیقی خدمت کے لیے ثابت قدم رکھے اور ملک اور قوم کو اُن سے نفع اٹھانے کا موقع نہ بخشنے۔

العصر کا اجراء ذاتی منافع اور تجارتی فوائد کے خیال سے نہیں کیا گیا۔ بلکہ اس کا محرک وہ خیال تھا جو ہمارے دل میں زمانہ دراز سے موجزن ہو رہا تھا اور شکر ہے کہ آج وہ پورا ہو رہا ہے۔ مالی حیثیت سے العصر کچھ زیادہ خوش نصیب نہیں ہو بلکہ درودل سے مجبور ہو کر یہ بوجھ محض باری تعالیٰ کی عنایت و مہربانی کے بھروسے اور ہی خواہان ادب کی حوصلہ افزائیوں کے سہارے پر نازک اور کمزور شانوں پر اٹھایا گیا ہے۔ اہل ملک سے ہماری التجا ہے کہ اگر انھیں العصر کی خدمات قابل قبول نظر آئیں تو اُسے امداد و عنایت اور سرپرستی سے محروم نہ رکھیں۔

آخر میں ہمیں بارگاہِ بے نیاز میں سرسجود ہو کر پھر التجا کرنا چاہئے کہ وہ ہمیں صداقت شعاری اور راست روی کی توفیق عطا فرمائے اور جن منصوبوں اور ارادوں کے ساتھ العصر کی ابتدا ہوئی ہے وہ بخیر و خوبی انجام پاسکین۔

ایڈیٹر

دائرہ عمل سے خارج ہونگے۔ ان کے علاوہ کسی پہلو سے بھی ہماری ناچیز کوشش کا دائرہ محدود نہ ہوگا۔ لٹریچر کی خدمت کا خیال خصوصیت سے لیا گیا ہو نظر بحالات موجودہ اسکی سخت ضرورت تھی۔

پالیسی یا معیار عمل کے متعلق اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ جانب دارانہ اصول سے قطعی گریز کیا جائیگا۔ نشاۃ قدیم و جدید کی عظمت کا قائل ہونیکے باوجود کوئی سبکدوشی، کوئی مضمون، کوئی خیال محض اسوجہ سے ناقابل قبول نہ سمجھا جائیگا کہ ہماری ذاتی رائے اُسکے برعکس ہے۔ مضمون نگاروں کو تبادلہ خیالات کی کامل آزادی ہوگی اور تمام معقول اور اعلیٰ مباحث کیلئے العصر کے صفحات کیسان وقت رہیں گے۔ ذات پات کی تفریق، مذاہب و عقاید کا اختلاف، کوئی بات بھی اہل قلم کو العصر سے کام لینے میں مانع نہیں آسکتی۔ العصر ہندو، مسلمان، سیھی، پارسی، سب کا پرچہ ہے اور اسکی کامیابی ان سب کی متفقہ مساعی پر موقوف ہے۔

تہیدی مضمون میں ہم بیدار خیال و عادی کا دہرانا پسند کرتے ہیں۔ بلاشبہ ہمارے ارادے ہند اور مقاصد بالائین۔ ہماری ناچیز کوششیں انھیں کی تکمیل کے لیے وقف رہیں گی۔ خدائے پاک سے دعا ہے کہ وہ ان پیچ میرز مساعی میں برکت دے، العصر کو



زمانہ کا دن رات ہے یہ اشارا
کہ ہے آشتی میں مری یان گزارا
نہیں پیروی جس کو میری گوارا
مجھے اُن سے کرنا پڑے گا کنارا
سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

دنیا کی بربادی

کی نسبت عالموں کے خیالات

سے تعلق رکھتی ہیں۔ محققان سائنس کے اشتیاق و تجسس سے زمین و آسمان کی شائد ہی کوئی چیز بچی ہوگی۔ بعض مسائل زمانہ قدیم سے ارباب تحقیق اور اہل فکر کی تحقیق و فکر کا مبحث چلے آتے ہیں۔ ہر مذہب ملک کے عالموں نے انکی نسبت دماغ سوزی اور انھیں حل کرنے کی کمال سعی کی ہے۔ ان معرکہ آرا اور کتنے سال مسائل میں آفرینش عالم اور اسکی تباہی کا مسئلہ بھی ہو۔ دنیا کس طرح معرض وجود میں آئی، اور کیسے طرح برباد ہوگی، جس زور و شور سے اس سوال پر بحث ہوئی ہے شاید ہی اور کسی مسئلہ پر ہوئی ہو۔ عالموں نے کائنات کے سلسلہ اور اسکے قوانین کے مشاہدہ کی روشنی میں اسے حل کرنا چاہا ہے۔ جو کچھ اب ہو رہا ہے اور جو کچھ ماضی میں ہو چکا ہے اسکی بنا پر اسکے آئندہ حشر کی بابت طرح طرح کے خیالات قائم کیے گئے ہیں۔

ماہیت مادہ کی نسبت خیالات | کئی برس ہوئے پروفیسر کلا رکیس ویل نے شہر ریڈ فرڈ (برطانیہ) میں برٹش ایسوسی ایشن کے سائنس دانوں پر لکچر دیتے ہوئے اپنا خاص نظریہ بیان کیا تھا۔ مگر یہ خیال مادہ کی ترکیب پر موقوف ہو یعنی کیا وہ ذراتوں سے مرکب ہے؟ پرانے زمانے کے بعض یونانی طبعی عالم مثلاً دمقراطوس اور رومی تھوٹ طبیعیات لکرسیمس وغیرہ سے پروفیسر کیس ویل کے خیالات بہت مشابہ تھے۔ نہ صرف یہی بلکہ کائنات کی نسبت انکے خیالات زمانہ حال کے عالموں کے قیاسات اور مفروضات سے بہت موافقت رکھتے تھے جو مائلٹ اور

دنیا کی تباہی کی عامیانا افواہیں | راقم مضمون پندرہ بیس سال سے دنیا کی بربادی کی بابت انواع و اقسام کی افواہیں سنتا چلا آتا ہے اور یہ افواہیں غیر ملکی عالموں کی اختراع نہیں بلکہ خالص سودیشی صنعت ہیں۔ ان افویات کے موجد اور شہسوار اگر ایک طرف خاص اہم غیبی کے مدعی تھے تو دوسری طرف جو تش و نجوم کے دعویدار پندت اور نجومی بھی تھے۔ بربادی کی مقررہ و مشہور تاریخ کے روز جو دردناک حالت عوام اور جہلا پرطاری ہوتی تھی اُس سے کچھ وہی لوگ بخوبی آشنا ہیں جو چنڈ و بازو کی ہزلیات سے کما حقہ واقف اور ان کی اصلیت کے محرم تھے۔ مگر جہلاہیں کہ جو تشی اور نجومی کی بات کو تھکر کی لکیر سمجھ لیتے ہیں اور کسی سمجھدار کے سمجھانے بھانے کی کوئی پروا نہیں کرتے۔ گذشتہ دس بارہ سال کے عرصہ میں یہ افواہیں بہت زور و شور سے گشت کرتی رہی ہیں۔ یورپ کے بعض حواس باختہ عالموں نے بھی انکی تائید کرنے میں تامل نہیں کیا تھا چونکہ اہل نظر ان تازہ واقعات سے اچھی طرح واقف ہیں اسلئے راقم انھیں نظر انداز کر کے اس مسئلہ پر سائنسی نقطہ نظر سے بحث کرنے کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ مضمون ہذا کے دوران میں یہ دکھانے کی کوشش کی جائیگی کہ بڑے عالمانہ طبیعیات جبکی عمر و نکا ایک حصہ کثیر سائنسی تحقیقات کی نذر ہو چکا ہو دنیا کی بربادی کی نسبت کیا کہتے ہیں۔ یہ خیالات توجہ کے قابل ہیں کیونکہ انکی بنیاد میں انکی مدتوں کی غور و فکر اور ساہا سال کی تحقیق و تدقیق منہی ہو۔ پچھلے چنڈ و خانہ کی کہیں نہیں ہیں بلکہ عقلاً

مشابہت ان قدیم و جدید خیالات کے درمیان پائی جاتی ہو اور سپر پروفیسر ٹنڈل نے اپنے پریسڈنٹل ایڈریس میں جولائی ۱۹۱۹ء کو شہر بلغاسٹ (آئرلینڈ) میں پرنس ایسوسی ایشن کے سالانہ جلسہ میں دیا تھا خوب بحث کی ہو اور یہ خاص دلچسپی لئے ہوئے ہو۔ پرنس نے زمانے کے علما کا یہ خیال تھا کہ موجودات ابتدائی اجزاء سے مرکب ہیں اور ان کے مختلف خواص کی وجہ اختلاف ترکیب ہونے ابتدائی اجزاء کے اختلاف سے اسے کوئی واسطہ نہیں ہو جن سے وہ ترکیب پذیر ہو کر وجود میں آتی ہیں۔ اور جدید خیال موجودات کی ترکیب اور ہستی کی بابت یہ ہے (اسے ذرا وضاحت سے بیان کرنا لازم ہے) کہ گیسوں گھری کے اندر پائی جاتی ہو کوئی مسلسل شے نہیں ہو اور نہ خلا اس سے پر ہے۔ یہ بیٹا رنٹھے رنٹھے ذروں سے مرکب ہو۔ کوئی آئینہ کا ہو اور کوئی نائٹروجن کا ہو۔

ماہ کی صورتیں اور اسکے آئینے کے عام ذرے وزن اور بناوٹ اجزاء ترکیب سے۔ میں ایک دوسرے کے نہایت قریب ہیں۔ یہ ذرے کمرے کے اندر ساکن نہیں ہیں۔ بلکہ سترویل فی منٹ کی رفتار سے ادھر ادھر دوڑتے پھرتے ہیں۔ ان کے رخ اور رفتار میں مخالف سمت کے ذروں کی گردش سے ذرا سا فرق واقع ہو جاتا ہو برعکس اسکے مائع کے ذرے اپنی جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اسکا آسان تجربہ یہ ہو کہ پانی کا برتن بھرا لو اور اسکے اندر ذرا سا نیلا رنگ ڈال دو پھر دیکھو کہ کتنی جلدی پانی میں نیلا ہٹ نظر آنے لگتی ہو۔ مائعات کے ذروں میں پھیلنے کی خاصیت نہیں ہو۔ وہ ہر وقت بدلتے اور ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ ٹھوس چیزوں کے ذروں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہو یعنی ہر ایک ذرہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہو۔ گو یہ اپنی جگہ بدلتا چاہتا ہو مگر ارد گرد کے ذرے مانع ہوتے ہیں۔

المختصر ترکیب مادہ کی نسبت آجکل کے علما کا یہی خیال ہو ان دونوں میں جو اختلاف ہو وہ مختلف تشریح نہیں ہو۔ جدید نظریہ بھی ڈانیل برنولی اور ڈالٹن کے زمانہ میں محض ایک قیاس تھا۔ مگر بعد ازاں عالموں کی مسلسل کوششوں اور ان کے مدت کے تجربات سے اسکی تصدیق و تائید ہو گئی۔ اسوجہ سے پروفیسر کلا رکنسکیل کا یہ خیال بہت معقول نہیں معلوم ہوتا کہ ذرے چونکہ ایک دوسرے کے مشابہ ہیں اور شروع سے آج تک ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی ہو اسلئے انکا عمل ارتقا سے وجود میں آنا معلوم نہیں ہوتا۔ اور عالم اس نظریہ کے حامی نہیں ہیں۔ ذرے کی شکل و صورت کیسی ہوتی ہو اور وہ کس قسم کی تحریک قبول کرتا ہو اور اتھیر کے مقابلے میں اسکی کیا حالت ہو اور نیز یہ کہ وہ کس طرح وجود میں آیا اسکی بابت عالم کچھ نہیں جانتے ممکن ہو کہ زمانہ آئندہ کی تحقیق اسپر خاطر خواہ روشنی ڈالے۔

مطلب اس بحث کا یہ ہو کہ موجودات کی موجودہ صورت آنا فنا نہیں ہوتی بلکہ اسے لاکھوں برس کا عرصہ درکار ہوا تھا۔ بیشک ابتدائیں مادہ تھا، اور وہ ذروں کی صورت میں بھتا۔ زمین کی مختلف حالتیں قانون قدرت سے ہو کر اسے صورت پکڑنا شروع کیا۔ اجرام فلکی اور زمین وجود میں آئی جو ابتدائی مرحلہ میں مانع تھی۔ سخت حرارت سے اسکا مادہ کھول ہا تھا پھر تدریج حرارت خارج ہوتی چلی گئی۔ اور آخر کار ایسی سرد ہو گئی کہ اس میں ہونیدگی پیدا ہوئی اور جاندار نمودار ہوئے۔ یہ ڈیڑھ دو کروڑ سال کا واقعہ ہو۔ لارڈ کیل دن وغیرہ اسی خیال کے حامی ہیں۔ مگر سر چارلس لائل وغیرہ محققان ارضیات اسکے خلاف ہیں۔ وہ پندرہ بیس کروڑ سال عرصہ قرار دیتے ہیں۔ دن بدن زمین سرد ہوتی چلی جاتی ہو

جسکا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جتنی زیادہ زمین کھودی جائے۔ وجہ حرارت بڑھتا چلا جاتا ہے طبیعیات میں ایک مسئلہ حرارت کی رفتار کا ہے۔ یعنی اگر آہنی سلاح کا ایک سراگ میں گرم کیا جائے تو باقی حصہ کس رفتار سے گرم ہوتا ہے اور جب باہر نکالا جائے تو پھر کس رفتار سے ٹھنڈا ہوتا ہے۔ اس اصول سے زمین کی مختلف حالتوں کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ کسی زمانے میں گیس تھی پھر مائع ہوئی اور بعد ازاں ٹھوس اور اب ٹھنڈی ہوتی چلی جاتی ہے جب اسے ان تین مرحلوں سے گزرنا پڑا تو ہر ایک مرحلہ کے اختتام اور دوسرے کے آغاز پر ایک خاص انقلاب وقوع میں آیا۔ اور یہی حال ہر ایک جسم کا ہوتا ہے۔ اگر اسکی حالتوں کا کھوج لگاتے چلے جائیں تو ایک ایسا مرحلہ آجاتا ہے جب ہذرؤں کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ ذرے ملے اور ایک نیا جسم وجود میں آگیا۔ اور پھر کوئی ایسا زمانہ آئیگا جب کسی سانحہ سے اسکے اجزاء ترکیبی منتشر ہو جائیں گے اور خلا میں دوسرے ذرؤں سے اختلاط پذیر ہو کر کسی نئے وجود کے موجب ہونگے۔ زمین پر روئیدگی اور جاندار سوچ کی روشنی اور حرارت کے عمل سے وجود میں آئے ہیں۔

دنیا کی بربادی کی نسبت خیالات اور فکری زیت سوچ ہی کی محتاج ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ سوچ کا حجم عمل انتباض سے گھٹتا جاتا ہے۔ جو حرارت اس سے خارج ہوتی ہو وہ کسی نہ کسی طرح پوری ہوتی رہتی ہو مگر یہ عمل ہمیشہ جاری نہیں رہیگا۔ جب حرارت کا منبع ختم ہو جائیگا تو آفتاب نظام شمسی کے لیے منبع حرارت نہیں رہیگا۔ اگر زمین آفتاب کے گرد گھومتی رہے اور وہاں سے حرارت آتا ہوگا جو جائے تو ہم ایٹھ کر مر جائیں گے علاوہ ازیں یہ بھی یقینی نہیں ہے کہ زمین کا محور مستقل اور مستحکم ہو۔ عالم کو یہ اندیشہ ہے کہ کوئی وقت ایسا آئیگا جب سیارہ فکری گردش کا حلقہ بہت تنگ ہو جائیگا

اور وہ آفتاب کے اتنے قریب پہنچ جائیں گے کہ اسکی کشش سے کچھ اسکی سطح پر جا گرین گے اور حلقہ خاک سیلہ ہو جائیں گے۔ عالموں کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ جیسے آفتاب و ماہتاب کی کشش سے ارضی سمندر و زمین مد و جزر پیدا ہوتا ہے اسی طرح سیارہ فکری کشش کے اثر سے سطح آفتاب پر جوار بھاتا آتا رہتا ہے۔ زمین کی کشش سے سطح آفتاب پر عین اُسکے بالمقابل کوئی لہر نہیں اٹھتی بلکہ وہ اسکی حرکت محوری کے سبب سے آگے کو بڑھ جاتی ہے جسکا اثر زمین کی حرکت کو تیز کرنا ہوتا ہے اور اسکا حلقہ گردش وسیع ہوتا جاتا ہے جسکی وجہ سے کرہ ارض سوچ سے پیچھے ہٹتا چلا جاتا ہے۔ اور بالآخر اس سے بہت دور ہو جائیگا۔ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ یا تو زمین کسی عظیم ادارہ گردو مدار تار سے ٹکرا کر تحس نخس ہو جائے گی اور یا حرارت شمسی سے محروم ہو کر سخت سرد ہو جائیگی اور عدم حرارت سے جاندار ایٹھ کر ہلاک ہو جائیں گے۔ یقین کے ساتھ یہ کہنا دشوار ہے کہ سچ کچھ کرہ ارض کا کیا حشر ہوگا اگر کشش شمسی سے متاثر ہو کر سطح آفتاب پر جا گرے تو ہم ہنگام کباب ہو جائیں گے۔ اگر زمین کشش سے برگشتہ ہو کر خلا میں آوارہ گردی کرنے لگے یا آفتاب کا ذخیرہ حرارت ختم ہو جائے تو ہم ایٹھ کر بجائیں گے ایک گروہ علما کا یہ بھی مانتا ہے کہ کسی نامعلوم قوت سے خلا میں ایک ایسا سانحہ پیش آئیگا جس سے تمام اجرام فلکی ایک جگہ اکٹھا ہو کر ایک نہایت ہولناک ڈھیر لگ جائیں گے۔ انکے تصادم سے حرارت پیدا ہوگی اور وہ کچھ عرصے تک رہیگی۔ بعد ازاں وہ خارج ہو کر خلا میں چلی جائیگی اور وہ عظیم انبار سرد ہو جائیگا۔ اسپر روئیدگی اور جانداروں کے وجود کا کوئی مکان نہ ہوگا لیکن آپس میں ملنے سے آناخوفاک زلزلہ آئیگا کہ جاندار طرفہ لعین میں عدم کاراستہ لینگے اور روئیدگی کثرت حرارت سے جل جائیگی۔ بعض فلکی عالم یہ کہتے ہیں کہ کئی دمدار تارے ایسے بڑے بڑے

ہیں کہ انکی زمین کروڑوں میل لمبی ہوتی ہیں اور بعض زمین سے یکایک تماشاً گاہ آسمان پر نمودار ہو جاتے ہیں چونکہ انکی حرکت بالکل بے قاعدہ ہوتی ہو کر ارض کو انہیں سے کسی کی دم میں الجھ کر کشان کشان عالم خلائق میں پھرنے کا بہت احتمال ہے۔ یہ بھی بہت سے احتمالات میں سے ایک ہے۔ دُوم دارتارونکی دُوم میں اتنی قوت کہان جو زمین ایسے بھاری بھر کم جسم کو اُلجھا کر خلا کے انتہائی گوشوں کی طرف لیجائیں کیونکہ عالمان فلکیات کہتے ہیں کہ دُوم دارتارہ کی دُوم اتنی تپلی اور ہلکی ہوتی ہے کہ اسے پھیٹ کر کسی بڑے ٹرنک میں بھر سکتے ہیں۔ چاہے وہ ہزاروں لاکھوں میل لمبی ہو بعض عالمان طبیعیات کہتے ہیں کہ کاربانک ایسڈ گیس زمین سے نکل کر اُڑھوایں جمع ہوتی جاتی ہے اور آخر کار وہ اتنی مقدار میں جمع ہو جائیگی کہ یکایک اوپر سے گرے گی اور اہل زمین کا دم ناک میں کر کے انہیں ہلاک کر دے گی۔ پروفیسر سائمن نیو کم کہتے ہیں کہ آفتاب مع ستارگان دیگر ککشتر کی طرف جا رہا ہے ممکن ہے کہ اثنائے مسافت میں کسی گنہام سیاہ ستارے سے جسکے وجود سے عالمان علم افلاک ناواقف ہوں وہ ٹکر کھائے اور ایک ایسا سانحہ وقوع میں آئے جسکی نظیر تاریخ آسمان کے اوراق میں ڈھونڈنے سے نہ ملے اور سطح ہماری بھی سی دُنیائیںست و نابود ہو جائے۔

مادین کی رے افرانس کے نامی فلکی عالم پروفیسر کیبل فے مرون جنکی رے کو مادین کی رے کا آئینہ سمجھنا چاہیے کہتے ہیں کہ اس سیارہ اور اسکی موجودات یعنی انسان و حیوان چرند و پرند سمندر و پہاڑ دریا، برائے عظم وغیرہ کا کیا حشر ہوگا؟ کیا یہ دُنیائیں پرانی عمارت کی طرح ٹکڑے ٹکڑے ہو کر برباد ہوگی۔ دُنیافانی ہونہ وہ ازل سے تھی اور نہ اب تک رہیگی۔ اسکی ابتدا ہوئی ہے اسلئے اسکا خاتمہ بھی ہوگا۔ مگر کیسے؟ ایک طرف پانی اور ہوا گھٹ رہے ہیں۔ دوسری طرف بر اعظم رفتہ رفتہ فرسودہ ہو کر پانی میں ملتے جاتے ہیں۔ پہاڑ بھی فرسودگی کی

نذر ہو رہے ہیں۔ کیا دُنیائیں پانی میں غرق ہوگی یا اسکی قلت سے برباد ہونیوالی ہے۔ زمین کی حرارت اور جانداروں کی زلیست پانی سے قائم ہے اگر وہ معدوم ہو جائے تو روئیدگی اور جاندار نابود اور قدرت کا گل بیکار ہو جائے اگر سمندر خشکی کو نکل جائے تو بھی حیوانات اور نباتات کی نیستی امر یقینی ہے۔ مریخ کے سمندر اور دریا اور جھیلیں وغیرہ خشک ہوتی جاتی ہیں اور پانی دن بدن گھٹتا چلا جاتا ہے۔ وہاں مطلع صاف رہتا ہے۔ بادل نمودار نہیں ہوتے کر اُڑھوایں طوبت سے خالی ہے۔ کیا یہی حشر ہماری دُنیائیں کا ایک زمانہ میں نہیں ہوگا؟

پانی ہمارے جسم میں جزو لازمی ہے جس سے تمام جسمانی عمل ہوتے رہتے ہیں۔ زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے۔ ہستیوں کے وجود و نمو کے لیے جو حرارت درکار ہوتی ہے وہ بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر پانی معدوم ہو جائے تو سمجھو کہ اسکے ساتھ زندگی کا چراغ بھی گل ہو جائے۔ پانی کی قلت کا ہوا پر چر اتر ہوگا وہ بھی ہماری بربادی کا موجب ہوگا۔ آئینجن اور ازوٹ کے دو سوڈون میں ایک ذرہ بھی پانی کا نہیں ہے۔ یہ ننھے شفاف ذرے کر اُڑھوایں سولج کی کرنوں کو روک کر مرکوز کر لیتے ہیں۔ لیکن جب یہ پردہ اُٹھ جائیگا تو پھر کیا ہوگا؟ کر اُڑھوایں کا ٹمپرچر ۲۷۳ درجہ صفر سے نیچے ہوگا بلکہ وہ زہر مریخا بیگا اور جاندار سخت سردی کے مارے ایشہ جائیں گے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں سے برف لندھک کر وادیوں میں چھا جائیگی۔ نیویارک، لندن، پیرس، لن سینٹ پیٹرسبرگ، وائنا، کلکتہ، ٹوکیو وغیرہ دائمی برف کے ڈھیروں کے نیچے دیکر غائب از وجود ہو جائیں گے۔ تمام جاندار اور نباتات نیست ہو جائیگی۔ حیات بخش عناصر معدوم ہوتے جاتے ہیں۔ ہوا کی آئینجن اور ازوٹ بھی ختم ہوتی جاتی ہے۔ ہر صدی کے بعد کر اُڑھوایں کے اجزاء میں معتدلتجلیف ہوتی جاتی ہے جس سے جانداروں کی زلیست قائم رہتی ہے۔ دس لاکھ برس کے بعد کر اُڑھوایں کا ایک بڑا

حصہ فرسودہ، بنجر اور نمسان ہوگا۔ اسکے شاندار ماضی کے کھنڈر اسکی سطح پر نظر آئیں گے۔ ایف ٹیلیوینٹن کہتا ہے کہ زندگی کی ابتدا ہوئی تھی اسکی انتہا بھی ہوگی۔

روحانی قوت کا اثر اگر کیا انسان میں ایسی قوت ہے جس سے وہ اس ہولناک سانحہ کی روک تھام کر سکتا ہو؟ اس سوال کا جواب اہل طبیعیات نفی میں دیتے ہیں۔ اسکی وجہ شائد یہ ہے کہ انکے دل مادیات میں اُلجھے رہتے ہیں۔ وہ روحانیات کے اسرار کو سمجھنے کے بالکل نااہل ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عقل کا عمل دماغ کے کیمیائی اثر دن سے پیدا ہوتا ہے۔ اسے مظاہر قدرت سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ جرمن عالم ماؤڈسے اس خیال کا زبردست حامی ہے، اور کہلے بھی اسی طرف مائل نظر آتا ہے مگر وہ ایک جگہ کہتا ہے ”انسان کے اندر قوت (انرجی) کا ایک ایسا ذخیرہ ہے جسکا عمل عقلی ہوتا ہے، اور جو تجربی عالم کے اندر ہے اس سے وہ ایسی مشابہ ہے کہ اسکی بدولت انسان اگرچہ تو عمل عالم کو متاثر کر سکتا ہے، انسان سوچتا ہے، کئی منصوبے باندھتا ہے۔ اسکے دلیمن انوکھی تمنائیں پیدا ہوتی ہیں جبکا اسے پورا علم رہتا ہے۔ وہ فعل مختار ہے۔ ارادت اور تمنا ہمارے اندر موجود ہے

جس سے کسی اہل مادہ اور اہل طبیعیات کو انکار نہیں ہے۔ کیا وہ ان قوتوں کو اپنی زبردست روحانی قوت سے مؤثر نہیں کر سکتا؟ عالم روحانیات اور روح کی مختلف قوتوں اور اسکے ظہورات کی نسبت تحقیقات کا سلسلہ جاری ہے۔ اسکے حامی بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں۔ اگر علمی اصول کی کسوٹی پر کسے سے وہ صحیح نکلے تو واقعی حیرت انگیز انقلاب واقع ہوگا اور انسان عمل عالم کو اپنی حسب نشار، ترتیب و ہدایت دے سکتا ہے۔ اہل دین مانتے ہیں کہ انسان خدا کا بندہ ہے اور کئی روحانی قوتوں کی بدولت خدا سے وصل کر سکتا ہے جو اسے خدا کے قریب پہنچا دیتی ہے۔ کیا انسان اس قوت کو کمال کے درجہ پر پہنچا کر عمل عالم پر اختیار نہیں چلا سکتا؟ یہ قرین قیاس ہے۔ چاہے دنیا کا کوئی حشر ہو۔ ہمیں عرصہ دراز تک اس کے دیکھنے کا کوئی موقع نہیں ملیگا، تا وقتیکہ کوئی خلاف توقع سانحہ پیش نہ آئے۔ ان واقعات اور خیالات کی روشنی میں آئندہ کوئی پڑھا لکھا اور صاحب فہم نجومیوں اور جوتشیوں کی ہزلیات پر دھیان نہ کرے اور نہ ایسی باتیں سنا کر گھبرائے۔

جے۔ آر۔ رائے

آن شوخ بس کہ پایہ سنش بلند بود
در شوق، پاس گرمی نازش بجا نماند
سنجیدہ ایم فتنہ محشر بہ قاشش
ہرگز حدیث شوق بہ یایان نہ بدست
می بینم این کہ قیمت دل تا گنجاشد
تو یک نگاہ ناز زیان کردی و مرا

ہر شیوہ اش بلائے دل درد مند بود
با آن کہ کار با صغمتے خود پسند بود
یک نیزہ قد فتنہ طرازش بلند بود
یار بکدام جا سر این رشتہ بند بود
پرسد ز من کہ نرخ متاع تو چند بود
سرمایہ کہ بود دل مستمند بود

شبلی زہیر دوست کہ ذوق سخن نماند
شکر فتانیم ہمہ زان نوشخند بود

شبلی نعمانی

قوت لاسہ

دلیل ہو کہ انسان بقا بذریعہ دوسری مخلوق کے بہت کچھ فضیلت اور کمال رکھتا ہو۔ یہ تمام قوتیں تمام طاقتیں تمام جذبات اپنے اندرون میں ایسی ایسی مخفی صفاقتیں رکھتے ہیں کہ ان کا ظہور رفتہ رفتہ اپنے اپنے رنگ میں ہو رہا ہو جو لوگ خوبی قسمت سے ان سے کام لینے کے عادی ہیں انکی کوششوں سے بازار عالم میں بہت کچھ ظاہر ہو رہا ہو اور اپنے اپنے وقت پر اس طرح ہوتا رہے گا۔

بعض وقت انسان غلطی سے بعض قوتوں اور بعض جذبات کی ضرورت اور افادت سے بیخبر ہوتا ہو اور انکے ضائع کرنے میں دریغ نہیں کرتا اور انکی ضرورت اور صداقت سے کسی حد تک منکر ہوتا ہو۔ یہ ایک کفران نعمت ہے صحیح معنی میں جذبات شریفہ اور قواسط لطیفہ سے کام لینا بھی ایک ریاضت ہے۔ اور نہ صرف اپنے لیے بلکہ انبائے جنس کے واسطے بھی ایک صحیح اور مفید خدمت ہے۔

قوت لاسہ یا قوت لاسہ بادی النظر میں ایک کم درجہ یا کم حیثیت قوت سمجھی جاتی ہے۔ یعنی قوت شامہ باصرہ، سامعہ وغیرہ قوتوں کے مقابلہ میں اس قوت کا ذرا نرمی سے ذکر کیا جاتا ہے، یہاں تک کہ گویا وہ ایک کس میرسی کی حالت میں ہو۔ اس کے استعمال میں بھی چندان دوراندیشی اور احتیاط سے کام نہیں لیا جاتا۔ لوگ سطح بصارت، سماعت، شامہ کی قوتوں کی خبر گیری میں مصروف رہتے ہیں اور انکی خدمات کا اعتراف کر کے انکی عظمت اور افادت کے مشکور ہیں، اس طرح اس شریف قوت کی بھی

ایک مذہبی کتاب میں یہ قیمتی فقرہ درج ہو کہ انسان کو بہت تھوڑا لم دیا گیا ہو۔ اگر انسانی تصرفات انسانی معلومات انسانی جذبات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہو گا کہ واقعی یہ فقرہ ایک صحیح اور جامع مفہوم رکھتا ہو۔

اگرچہ انسان کے جذبات اور تصرفات و معلومات بہت ہی سست لگتے ہیں اور انہیں دن بدن اور بھی زیادہ وسعت پیدا ہوتی جاتی رہے اور اس کے معلومات جدید کی طمانین روز بروز تیزی سے تیزی جارہی ہیں۔ بن غور سے دیکھنے پر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ باہر ہمہ قدرتی کمزوریات اور ان کے مقابلہ میں انسانی تصرفات اور انسانی جذبات کا تصاعد بہت ہی کم ہو۔ اور پھر باوجود ان تصرفات اور اس تصاعد کے انسان کا بڑھتے بڑھتے ایسی منزلوں پر پہنچ جاتا کہ اس کے آگے عقل بشری درمیان انسانی کا گذر ہی مشکل ہو ایک بین ثبوت اس بات کا جو انسانی جذبات اور انسانی عقل کی حد صرف حد بشری تک ہی ہو اس میں انسانی فضل و تقدیم کی کوئی کسر شان نہیں ہو۔ ہر جز اور ہر سستی کوئی نہ کوئی ظرف اور حد رکھتی ہو۔ اسی حد تک اسکی پہنچ درمیان ہو سکتی ہو۔ اس سے آگے گزرنے کی کوشش کرنا کششِ نفع سے مقابلہ کرنا ہے۔

خدا نے انسان کے حصے میں جو کچھ اندرونی و بیرونی قوتیں اور جذبات رکھے ہیں گو وہ حد بشری تک ہی محدود ہیں لیکن پھر بھی ان میں کچھ طاقتیں اور کمالات و مادہ رسانی رکھا گیا ہو وہ اس بات کی

معتد بہ خدمات ہیں جہاں آنکھ، کان، ناک، کام نہیں دیتے وہاں یہ قوت کام دیتی ہو چلن ناک، کان، اور آنکھ بیکار ہو جاتے ہیں یا جوہر دیتے ہیں، وہاں قوت لاسہ کی خدمات ایک بھاری احسان چاہتی ہیں قوت لاسہ کیا ہو؟ جو بغیر آنکھ، کان، ناک وغیرہ کی قوتوں کے محض اُس مادہ حساس کی بدولت زندگی کی خدمت گزار ہو، جو قدرت نے اُسے دست رکھا ہوا

یہ قوت اور یہ احساس انسان کے ہر حصہ بدن اور ہر حصہ جسم میں قائم و ساری ہو۔ گو حکیموں اور فلاسفوں نے اس قوت کی فضیلت اور ضرورت سے کسی وقت انکار نہیں کیا، لیکن عام طور پر اس کسی حد تک ایک انحطاطی حالت میں کام لیا جا رہا ہو۔ اگر علمی دائرہ میں لا کر اس قوت سے کام لیا جائے یا اسکو بیکار نہ چھوڑا جائے تو یہ قوت بھی دیگر شریف اور کارآمد قوتوں کی طرح بہت کچھ کام دے سکتی ہو۔ یہ امر پوشیدہ نہیں کہ پہلے ہی یہ قوت خود بخود بہت کچھ کام دے رہی ہو۔ اگر ہم غور کریں تو اسکی بدولت ہم دنیا کی اکثر صعوبتوں اور مشکلات سے محفوظ رہتے ہیں، اور بجائے خود یہ قوت ہماری خدمت کر رہی ہو۔ ہماری زندگی کے واسطے یہ ایک ایسا بدرقہ یا سہارا ہے جو عملی رنگ میں بہت ہی کارآمد اور مفید ہو۔ آگ، گرمی، سردی، خشکی، تری وغیرہ موثرات کا جہاں آنکھ اُس خوبی سے نہیں کر سکتی جس خوبی سے قوت لاسہ کرتی ہو۔ اگر بدن یا جزو بدن گرمی، حدت، خشکی، تری سے متاثر ہو تو آنکھ، کان، ناک کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ اُس وقت یہی قوت لاسہ سب سے پہلے احساس کر کے متنبہ کرتی ہو۔ خواب کی حالت میں اگر بدن پر کوئی چیز چڑھے تو یہی قوت ہوشیاری سے محسوس کرتی ہو۔ آنکھ غنودگی میں، کان بے خبری میں، ناک لاعلمی میں ہوتی ہو اور کسی کو خبر تک نہیں ہوتی، مگر قوت لاسہ بیدار رہتی اور خبر داری کے ساتھ اپنی خدمات ادا کرتی ہو۔ امراض اور خلوص میں بھی اس قوت سے ایک حد تک کام لیا جاتا ہو طیب اور

ڈاکٹر اس سے بہت کچھ کام لیتے ہیں۔ وہ امراض اور وہ عوارض جو اکا اجلا سے متعلق ہیں، قوت لاسہ کے احساسات سے بہت کچھ ادراک میں آتے ہیں اور اُن کے حق میں یہ قوت بہت کچھ مددگار ثابت ہوتی ہو۔ اُن ادراکات اور اُن دریافتوں میں بھی جو کسی حد تک مشکل اور بوق ہیں یہ قوت خوبی سے کام دیتی ہو۔ یورپ میں اندہ کے واسطے جو پڑھائی کا انتظام کیا جاتا ہو اُسکا اکثر حصہ قوت لاسہ سے وابستہ ہو جست یا سکھ کی سلیٹ اور اُس کے پڑنے اور اُپر پڑوں یا میخوں سے حروف اور ہندسوں کی شناخت جو انگلیوں پر ہر دن سے اندھے کرتے اور عبارت بنالیتے ہیں، اور پڑھتے چلاو ہیں، اس سب کمال کا موجب یہی قوت لاسہ ہے۔ اگر ہاتھوں کی انگلیوں کی پوروں میں ایسا احساسی مادہ اور پاور آف ٹچ ہو تو اندھے ہرگز ایسا نہ کر سکیں۔

جو کام اندھے اس طریق عمل سے اس قوت سے لیتے ہیں وہ آنکھوں اور کانوں سے نہیں لے سکتے۔ قوت لاسہ دراصل ایک خاص قسم کی قدرتی آنکھیں رکھتی ہو۔ گو وہ اصلی آنکھوں کی طرح نہیں لیکن انکی احساسی بنیادی سارے جسم میں پھیلی ہوئی ہو۔ ہر بدن کو یا ایک آنکھ یا چشم بصارت رکھی گئی ہو۔ جہاں آنکھ، کان، اور ناک سے کام نہیں لیا جاسکتا وہاں یہ قوت سلامتی کے ساتھ اپنے فرائض ادا کرتی ہو اور خوش اسلوبی سے نبھاتی ہو۔

انسان کی بعض خوشیوں اور احتیاطات کی بھی یہی قوت ہو۔ اور اسی پر بہت کچھ سلسلہ نسل کی ابتدا موقوف ہو۔ اگر لامہ، تحرک اور احساس نہ ہو تو بعض سرتوں اور بعض جذبات کا وجود نہ ہو۔ اگرچہ اور قوتیں موجود اور تندرست ہوں مگر اسکی عدم موجودگی یا کمزوری ایک خاص نقصان رکھتی ہو۔ اگرچہ خواب اور نیند کا با تعلق قوت لاسہ سے نہیں ہو، مگر پھر بھی اسکا بہت کچھ دار و مدار

بدن چھوٹی پھرتی ہو تو قوتِ لاسہ کے ساتھ ہی خیال کا رجوع بھی اُس طرف ہوتا ہو و دوسرے خیالات میں ایک تفریق پیدا کرتا ہو۔ ایسے حالات میں خیال عموماً قوتِ لاسہ کے تابع ہوتا ہو اور اُس کے متاثر ہونے سے خصوصیت کے ساتھ رجوع لاتا ہو۔

دماغ اور قوتِ لاسہ | دماغ اور قوتِ لاسہ میں بھی ایک قسم کی نسبت ہے۔ یہ امر حل طلب ہے کہ ایک تاثیر اول دماغ پر ہوتی ہو کہ قوتِ لاسہ پر؟ میری رائے میں پہلے قوتِ لاسہ متاثر ہوتی ہو اور اُس کے ساتھ ہی بعد میں دماغ پر اُس کا اثر ہوتا ہو۔

دل اور قوتِ لاسہ | دماغ کے بعد دل پر اثر ہوتا ہو۔

اگر قوتِ لاسہ کمزور اور سُست ہو تو اُسکی طاقت اور احساس ایک مُردہ حالت میں ہوتا ہو اور انسان اس سے وہ کام نہیں کر سکتا جو اس سے لینا چاہیے۔ ڈاکٹروں نے اس پر مفصل بحث کی ہے کہ قوتِ لاسہ میں کیونکر اور کن اسباب کے ماتحت فرق آجاتا ہو۔ بہت کچھ غذائی اور بنی اسباب ہیں لیکن ان کے سوا جو خیالی اسباب ہیں وہ بھی قابلِ غور ہیں۔

خیال یا خیالات بھی قوتِ لاسہ پر رنگ واسطیہ اثر پڑتا ہو۔ جب انسان کے خیالات میں تکرار اور اُتھن ہوتی ہو تو خیالی نظام میں فرق آنے کے باعث نظامِ لاسہ بھی کمزور ہو جاتا ہو۔ مثلاً اگر کوئی اندام ایک وقت خیالات میں مادون ہو تو اُسکی قوتِ لاسہ یا احساس قوتِ لاسہ بھی مادون ہو یعنی وجہ سے کام میں ناقص ہوگا، جیسے دماغ مادن ہو یا دماغ کوئی گھبراہٹ ہو تو آنکھ یا آنکھ کی بصارت خوبی اور لطافت سے کام نہیں کر سکے گی اور نظر عموماً متاثر تر ہوگی۔

یہ ایک بڑا نازک مسئلہ ہے۔ گوبادی النظر میں اسکی تصدیق میں تامل ہو سکتا ہو لیکن حقیقت میں یہ ٹھیک اور صحیح مسئلہ ہے بعض خیالی نظام کی خرابی بدن کے کل نظامات میں خلل انداز ہوتی ہو جس طرح

قوت پر ہے۔ اگر لاسہ درست اور صحیح عمل نہ تو انسان خواب میں اُن موثرات سے ہرگز چکنا چمن ہو سکتا جو بحالتِ خواب اُسکی طاری اور متاثر ہوتے ہیں۔

فنِ سمرنیم کا اکثر حصہ اسی قوتِ لاسہ سے وابستہ ہے بلکہ اُسکا بہت کچھ دار و مدار اسی پر ہے۔ عامل دوسرے شخص کو صرف لاس اور نظر ہی سے معمول بناتا ہو۔ اگرچہ بظاہر لاس بہت کم ہوتا ہو مگر معمول کے چہرے کے قریب ہاتھوں کا لیجانا ایک قسم کا لاس ہی ہے۔

قوتِ لاسہ میں مندرجہ ذیل اقسام کی طاقتیں یا حاستے ہوتے ہیں :-

الف - حاستہ جلدیہ

ب - حاستہ تجلیتہ

ج - حاستہ واسطیہ

جب کوئی چیز یا شے مثلاً تنکا، کنکار، روڑا، ہوا، چوٹی وغیرہ بدن سے مس کرتی ہو تو انسان کا سوتے جاگتے اُنکا احساس اور ادراک کرنا "حاستہ جلدیہ" کا کام ہے کیونکہ اُسکا ادراک محض بذریعہ جلد ہوتا ہو۔

ثانیہ تجلیتہ وہ ہے جب بدن کے اندرون سے ایک قسم کا احساس اور ادراک ہو جیسے بعض دفعہ بدن میں خود بہ خود ایک قسم کی کھبی وغیرہ ہو جیسے انسان خبردار ہو جاتا ہو۔

اور "حاستہ واسطیہ" وہ ہے جب آنکھ، کان، ناک وغیرہ کے ذریعہ سے احساس اور ادراک ہو۔ مثلاً آنکھ سے کوئی چیز دیکھنا اور مشاہدہ کرنا اور پھر اُسکے ذریعہ سے بدن میں ایک قسم کی تحریک احساس کا پیدا ہونا اور اُس سے انسان کا خوابی یا تاخیری رنگ میں متاثر ہونا۔

خیال اور قوتِ لاسہ | خیال اور قوتِ لاسہ میں ایک باریک لیکن کثیر الوقع نسبت ہے۔ جب کبھی قوتِ لاسہ اپنا عمل کرتی ہو تو خیال میں بھی ایک متوجہ اور تجاذب ہوتا ہو۔ مثلاً جب کبھی کسی کے

قوتِ لامسہ کی لطافت، وسعت، قوتِ قائم رکھنے کے واسطے بدن کی صفائی، صحت، خوبی قائم رکھنا ضروری ہو، ایسی طرح خیالات کی صفائی بھی لازمی ہو، اور یہ ایک اخلاقی مسئلہ ہو کہ قوتِ لامسہ، دماغ، اور دلمین ایک قسم کی نسبت ہو، اور خیالات کا دماغ اور دل پر بہت کچھ احاطہ اور اثر ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خیالات کی درستی اور صفائی دماغ، دل، اور قوتِ لامسہ کی صحت کا موجب ہو۔

چاند کے مشاہدہ سے دماغ اور دل پر جو اثر ہوتا ہو وہی اثر بدن پر بھی ہوتا ہو۔ خیال رفتہ رفتہ دل و دماغ سے ہو کر اجڑے بدن تک بھی آتا جاتا ہو۔ یہی صورت خیالات اور قوتِ لامسہ کی ہو۔ آنکھ، کان، شامہ کی غلطیاں بہ نسبت قوتِ لامسہ کے اگر کم کہیں ہیں مگر قوتِ لامسہ کی غلطیاں علی رنگ میں بہت کچھ صلاح اور نوش کے قابل ہیں۔

اگر ہم صحیح انداز پر کام کریں تو اس قوتِ لامسہ سے بہت کچھ کام

لے سکتے ہیں، اور وہ بہت کچھ مفید ثابت ہو سکتی ہو، نہ صرف اپنے مقابلہ میں بلکہ اوروں کے مقابلے میں بھی۔

ہر عضو کی قوتِ لامسہ جداگانہ ہو۔ ہاتھ کی قوتِ لامسہ کچھ اور طاقت اور کچھ اور کیفیت رکھتی ہو، اور پاؤں کی کچھ اور۔ آنکھ، کان، ناک میں بھی خاص قسم کی قوتِ لامسہ موجود ہو۔ آنکھ ایک واقعہ دیکھنے کے بعد جو بذریعہ طاقت دماغی ایک نقشہ مکرر اپنے سامنے لے آتی اور اس کا تماشا کرتی ہو، وہ بھی ایک قسم کا لمس ہی ہو۔ قوتِ شامہ کی قوتِ لمس ایک خاص قسم کی ہو۔ گو اس کو شامہ کہا جاتا ہو مگر دراصل اس میں بھی ایک قسم کا احساس پایا جاتا ہو۔ جانوروں، پرندوں، درندوں، چرندوں میں بھی یہ قوت ہوتی ہو۔ بلکہ بعض کے خیال کے مطابق جادات اور نباتات میں بھی قوتِ لامسہ رکھی گئی ہو۔

سلطان احمد



مغلون کی سوشل زندگی

(ڈاکٹر اے کے دتتا، ایم بی سی ایچ پی، پروفیسر مین کرچن کالج لاہور کے ایک لیکچر کا ترجمہ)

ہمارے لیے سب سے پہلے مغلون میں صرف تین افراد موجب دلچسپی ہیں۔ یعنی چنگیز خان، تیرنگٹ، یا تیمور اور بابر۔ اور یہ بھی اسوجہ سے کہ ان کا تعلق ہندوستان سے بہت گہرا رہا ہو۔ قدیم زمانہ میں جو خاصیتیں مغلون میں تھیں اور بعد میں بھی کم و بیش برقرار رہیں وہ ذیل میں درج کی جاتی ہیں :-

مغلون کی قدیم زمانہ کی تاریخ پر ایسا پردہ پڑا ہوا ہو کہ آجکل اس کا پتہ لگانا سخت دشوار ہے۔ ہمیں یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ انھوں نے اول اول جب صفحہ ہستی پر قدم رکھا تو کہاں رہائش اور بود و باش اختیار کی۔ وسط ایشیا میں مغلو تپا نے ایک ملک ہو۔ اس کے ایک طرف ترکستان اور دوسری طرف چین واقع ہو۔ مغلو تپا کے باشندے شگل کھلاتے تھے، انداز زمانہ سے

(۱) مغل جنگجو قومی ہیگل اور طاقتور تھے۔

(۲) اول اول وہ مذہب کے بہت پکے نہ تھے بلکہ مانٹس ونود کو زیادہ پسند کرتے تھے بعض مورخوں کا گمان ہے کہ بعض مجتہد اور علماء دین انکو مسلمان کہنے سے بھی انکار کرتے تھے اور اصل تعجب کی بات ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ حکومت تک کوئی بھی مغل شہنشاہ کٹر مسلمان نہ تھا یہ واقعی امر ہے کہ خاندان مغلیہ رسم سنت (رختہ) کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ سرطاس رونے ۳۰ اکتوبر ۱۶۵۷ء کو ایک خطا پر پشپ آف کٹر بری کے نام لکھا تھا۔ اس میں منجملہ دیگر ادر کے یہ بھی ذکر کیا تھا کہ جہانگیر کا ختنہ نہیں ہوا تھا۔ غدر سے ذرا پہلے شہنشاہ عین بہادر شاہ بادشاہ دہلی نے اپنے چھوٹے بیٹے شہزادہ جوان بخت کو ولیعہد بنانے کی کوشش کی تھی اور وجہ یہ بیان کی تھی کہ جوان بخت کا ختنہ نہیں ہوا ہے اس لیے اسکو وارث تخت و تاج ماننا چاہیے۔ چونکہ فخر الدین کی یہ رسم ادا کر دینی تھی اس لیے اسکو اس اعزاز کے ناقابل سمجھا تھا۔ مغل بادشاہوں کا اعلیٰ ترین وصف یہ تھا کہ وہ سلمان عیسائی ہندو وغیرہ ہر مذہب و ہر ملت کے لوگوں کو ایک آنکھ دیکھتے تھے بلکہ ان کے ساتھ بہت ہی زیادہ رابطہ اتحاد اور بے تکلفی پیدا کر لی تھی۔ جزیہ یک قلم موقوف کر دیا تھا، اور اگر اورنگ زیب بھی اپنے آباؤ اجداد کے نقش قدم پر چلتا تو سکھوں اور مرہٹوں کی طاقت کو کبھی بھی عروج نصیب نہ ہوتا۔

(۳) اسکی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ نخل کس حالت میں ہندوستان

میں منکمل رفتہ رفتہ منسل ہو گیا کبھی کبھی انھیں کوتاہی اور ترک بھی کہتے ہیں۔ عرصہ تک رہے یہ صحیح طور پر نہیں بتایا جاسکتا البتہ یہ قرن قیاس ہے کہ ان لوگوں نے یہاں کے قدیم باشندوں کے ساتھ زیادہ شادیاں کر کے تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ انھیں کی اولاد ترک کہلائی۔ اب اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ ہندوستان کے وہ بادشاہن کو ہم "مغل" کہتے ہیں حقیقت میں نخل نہ تھے بلکہ ترک (یعنی ترکستان کے باشندے) تھے۔ (ایڈیٹر)

میں داخل ہوئے؟ انھیں کون کونسی باتیں جلتی تھیں اور نسلاً بعد نسل چلی آئی تھیں، اور کونسی انھوں نے یہاں کے بادشاہوں اور راجوں کو دیکھ کر اختیار کیں؟ ابتدا میں وہ انگڑ بنکھو تھے۔ مزاج میں تند خو اور سریر حم تھے۔ پرلے درجے کے شرابخوار بھی تھے۔ گو وہ بہادر تھے لیکن تعلیم و تربیت کا شوق ابتدا میں ان کو بہت ہی کم تھا۔ اس زمانہ کے مغلوں کا ذکر امیر خسرو نے قرآن السعدین میں کیا ہے۔ اگر ہم شاعرانہ رنگ آمیزی اور بہالغہ کو چھوڑ کر دیکھیں تو شاید مندرجہ ذیل شعرا سے اسوقت کے مغلوں کی عادات جسمانی شباهت اور طریق و اطوار کا صحیح اندازہ لگا سکیں گے۔

کافر تار تار، بردن از شمار کردہ دگر گو نہ برا شتر سوار
اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب مغل ہندوستان میں آئے تو انکو اتنی تمیز بھی نہ تھی کہ اونٹ پر کیونکر سوار ہوں۔
سخت سرانے بونا سخت کوش ہر ہمہ پولاد تن و پنبہ پوش
یہ شعر ان کے جنگجو ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔ انکے جسم کی سختی اور گھیلے پن اور انکی پوشش اور لباس سے مطلع کرتا ہے۔

رے چو آتش و گلہ شہم میث آتش سوزان شدہ یا شہم فوش
یہاں ہلکے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چہرے کا رنگ سرخ انکارے کی مانند تھا اور وہ لوگ عموماً شہم کی ٹوپیاں پہنتے تھے۔ شہم خواہ بھنیں کی دُم کی ہو یا بھڑیا کبری کی اس کے ثبوت کی چند ان ضرورت نہیں سرتر اشید ز بہر مسلم زان قلم انکشت خذلان رقم
ان کے سرمندے ہوئے تھے۔

رخنہ شدہ طشت مس ز شہم سنگ دیدہ در انداختہ درخنہ سنگ
اس شعر سے انکی آنکھوں کی ساخت ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے یہ پتہ لگتا ہے کہ انکی آنکھیں چھوٹی چھوٹی تھیں۔

زشت تر از رنگ شدہ بوئے شان پست تر از پشت شدہ روئے شان

ہونکی وجہ سے وہ اکثر بہتادون کی لیا کرتے تھے۔ (اسمین شہہ نہیں کہ انکا شیخی گھارنا ایک حد تک بالکل بجا تھا۔ اس ضمن میں تو ایسے شیر شاہی میں یہ فقرہ لکھا ہوا ہے۔ ترجمہ ذیل میں دیکھو۔)

جب شہنشاہ ہمایون لاہور پہنچا تو اس سے چند ایسے مغل نے جو ان دونوں اپنے ملک آئے تھے اور اسوقت تک ان کو افغانوں سے جنگ کر نیکا اتفاق نہ ہوا تھا۔ انھوں نے ہمایون سے کہا ”آپ ہکو افغانوں سے لڑنے کے لیے بھیجے۔۔۔۔۔ یہ افغان کون ہیں۔ اور انکی کیا مجال ہو کہ یہ سے میدان جنگ

میں مقابلہ کرنیکی تاب لاسکین؟“

یہی لوگ ہندوستان کے حملہ آور تھے اور بعد میں یہی ہندوستان کے فاتح ہوئے۔ اب ہمارے سامنے غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اسوقت ہندو کی کیا حالت تھی جبکہ اول ہی اول مغلون نے اس سرزمین پر قدم رکھا تھا؟

(۱) یہاں اسوقت تک قدیمی تہذیب کا دور دورہ اور دیرینہ قسم کی تعلیم کا چرچا تھا۔ انتظامی اور سیاسی طریقے بھی پرانے ہی رہتے جاتے تھے۔ خاندان غزنوی اور خاندان غلامان اور خاندان تغلق کے بادشاہوں میں اتنی سوچ بوجھ کا مادہ کہاں تھا اور آخری زمانہ میں انہیں اتنی جسمانی شجاعت اور دلیری نہ تھی کہ وہ خود حکومت اور نظم و نسق کا کوئی نیا طریقہ ایجاد کرتے۔ انھوں نے وہی طریقہ حکومت برقرار رکھا جو معمولی سے معمولی آدمی کے لیے بھی کوئی خاص دلچسپی نہ رکھتا تھا بلکہ وہ ان لوگوں میں ایک طرح کا دستور چلا آیا تھا۔ یکے بعد دیگرے جو فاتح ہندوستان کا بادشاہ ہوتا گیا وہ قدیمی دستور حکومت کو قائم رکھتا البتہ فروعات میں کچھ تبدیلی کر دیتا تھا۔ لیکن چوٹی کے اصول و ضوابط ویسے کے ویسے ہی رہتے تھے۔ غرض اسی سسٹم پر حکومت ہوتی رہی۔ ترک بابر کے پڑھنے سے ایک حد تک یہ نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ اس زمانے میں بندوبست مالگذاری کا بھی ایک سلسلہ قائم تھا۔

اس شعر سے اس بات کا انکشاف ہوتا ہے کہ وہ جسمانی صفائی کی کچھ پروا نہ کرتے تھے۔ اور اسوجہ سے ان کے جسم سے بو آیا کرتی تھی۔ چڑھ شان دبہ نام یافتہ جاے بجا کجک و خم یافتہ ان کا چہرہ طیم طیم ہونکی وجہ سے ملائم تھا اور جا بجا بل پڑے ہوئے تھے۔ از رخ تاریخ شدہ بینی ہن وز کلمہ تا کلمہ بال لب دہن اس شعر سے انکے ناک کے چوڑا چکلا ہونیکا پتہ لگتا ہے اور یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ انکا دہن بہت کشادہ تھا۔

بینی پر رخ نہ چو گورے خراب یا چو تنور سے کہ ز طوفان پر آب اس شعر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکے ناک کے نتھنے بھی بہت کشادہ تھے۔ سوئے ز بینی شدہ برب فراز سبب شان گشت بنایت از مغلون کو اس زمانے میں بابون کی کاٹ چھانٹ اور تراش خراش کی بھی کوئی فکر نہ تھی۔ اگر ناک کے بال بڑھ کر ہونٹوں تک آگئے ہن تو آجائیں اور اگر مونچھیں ناموزون طریقے سے نہایت ہی دراز ہو گئی ہن تو ہوجائیں انکو اس قسم کے حسن و قبح سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ریش نہ پیرا ہن چاہ ز رخ سبزہ کجا برد ماز سے بچ یہاں معلوم ہوتا ہے کہ مغلونکی ڈاڑھی چھدری تھی۔

دو سفید آمدہ ہر یک برے خلق ز لا حول زہر چار سوے یہ شعر بتاتا ہے کہ وہ رنگ میں سفید تھے اور نہایت قوی الجستہ تھے۔ مندرجہ بالا اشعار سے مغلونکی جسمانی ہیئت اور طریق و اطوار کا بہت کچھ پتہ چلتا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اشعار اس زمانہ کے مغلونکی نسبت ہیں جو اول ہی اول ہندوستان میں آئے تھے۔ وہ یہاں اگر تہذیب یافتہ قوموں سے ملکر رفتہ رفتہ خوش پوش اور طریق و اطوار میں درست ہوتے گئے۔

لڑائیوں میں فتوحات حاصل کرنیکی وجہ سے یا یوں کہو کہ خود

(۲) قدیمی تہذیب کے ساتھ فارس اور عرب کی تہذیب کا بھی اعلیٰ جزو جوڑ

تھا جس کو اسلامی خاندانوں نے پھیلایا تھا اور جس تہذیب کو مغلوں

اور بھی ترقی دی تھی۔ ایک مصنف کا قول ہے کہ فارس شاعری اور

گلاب کے پھولوں کی سرزمین ہے سو طہوین صدی سے لیکر انگریزوں

کی ابتدائے حکومت تک ہندوستان کے اعلیٰ درجے کے لوگوں میں علمی مذاق

زیادہ تر فارسی کا تھا۔ عدالت کی زبان بھی فارسی تھی۔ مغلوں کے زمانہ

حکومت میں علماء و فضلا و مورخ و مصنف زیادہ تر فارس نژاد تھے۔

شاہی حکیم اور طبیب بھی فارس سے آئے ہوئے تھے۔ شاہجہان اور

اورنگ زیب کے زمانہ میں وینس کا رہنے والا مینکسی نام ایک سیاح

ہندوستان کی سیاحت کی غرض سے یہاں آیا ہوا تھا وہ لکھتا ہے کہ اس وقت

تمام بچپس کے بچپس شاہی حکیم فارس نژاد تھے مینکسی کی بھی ادب و بھکت

دربار میں اسوجہ سے ہوئی تھی کیونکہ وہ زبان فارسی خوب بول سکتا تھا

اور پرکے بیان سے ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ (۱) مغلوں کا طرز سیاحت

ہندوستان کے قدیمی ضوابط حکومت پر مبنی تھا۔ (۲) مغلوں کی تہذیب فارس

اور عرب کی تہذیب سے ملتی جلتی تھی۔ (۳) مغل شجاع اور بہادر تھے۔ (۴)

سے وہ ضعیف اسلامی حکومت پر غلبہ حاصل کر سکے۔

اب اس جگہ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم جس زمانہ کا آگے ذکر

کریں گے اس وقت کے بادشاہوں کا نام اور سن جلوس و سن وفات

تحریر کریں۔ دہوا ہذا۔

(۱) بابر شاہ ۱۵۱۹ء سے ۱۵۳۰ء تک تسخیر و فتح کا زمانہ۔

(۲) ہمایوں ۱۵۳۰ء سے ۱۵۵۰ء تک مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت

میں مزاحمت۔

(۳) اکبر ۱۵۵۶ء سے ۱۶۰۵ء تک سلطنت مغلیہ کا عروج۔ استحکام

اور امن کا زمانہ۔

(۴) جہانگیر ۱۶۰۵ء سے ۱۶۲۷ء تک تعلیم و تربیت اور تہذیب و اصلاح

کا زمانہ۔

(۵) شاہجہان ۱۶۲۷ء سے ۱۶۵۸ء تک تعلیم و تربیت اور تہذیب و اصلاح

کا زمانہ۔

(۶) اورنگ زیب ۱۶۵۸ء سے ۱۷۰۷ء تک ہندو کی طاقتوں

کے نشو و نما و عروج کا زمانہ۔

آگرہ دہلی اور لاہور کی تواریخ کا بغور مطالعہ کر فیہ مغلوں کی سیاسی

اور سوشل حالت کا پتہ لگتا ہے کیونکہ یہی تین شہر مغلوں کے زیر اثر زیادہ

رہے تھے۔

پریسی کے لیے نئے ملک میں آتے ہی سب سے پہلے اس جگہ کا لباس

باعث دلچسپی ہوتا ہے۔ اس کی نگاہ سب سے پہلے لوگوں کے لباس پر

پڑتی ہے۔ اس لیے ہم بیان سب سے پہلے لباس ہی کا ذکر کرتے ہیں۔

اکبر کے زمانے میں کپڑا ہندوستان میں بنایا جاتا تھا اور وہی ادنیٰ اور

اعلیٰ سب لوگ استعمال میں لاتے تھے۔ لیکن ابو الفضل کا بیان ہے کہ کپڑا

فارس، یورپ اور چین سے بھی ہندوستان میں آتا تھا۔ چنانچہ اسے

فرانس کی بانات کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اُن ایام میں جتنی قسم

کے کپڑے بازار میں فروخت ہوتے تھے ان کی فہرست معدنخ کے تین

اکبری میں مرقوم ہے۔ دہوا ہذا۔

(۱) سنہری زربفت اور کارچوبی کپڑے ۲۸ قسم کے فروخت ہوتے تھے۔

(۲) ریشمی کپڑے ۳۸ قسم کے فروخت ہوتے تھے۔

(۳) سوتی کپڑے ۳۰ قسم کے فروخت ہوتے تھے۔

(۴) ادنیٰ کپڑے ۲۶ قسم کے فروخت ہوتے تھے۔

لاہور میں مغل اور ریشمی کپڑے بنے جاتے تھے۔ ملتان چھینٹوں

اور درسیوں کے لیے مشہور تھا۔ چھینٹ اور دریس ہندوستان سے

غیر ملکہ نہیں بھی بھیجی جاتی تھی۔ ایک قسم کی مغل چند قسم کے ریشمی

کپڑے ملل اور بانات کی قسم کے کپڑے یورپ سے ہندوستان میں

آتے تھے۔ اُس زمانہ میں گڑیان، ڈوپٹے اور کشمیری ٹوپیاں معمولی لباس میں شامل تھیں۔ امیر لوگ دوشالے اور ہا کرتے تھے شہنشاہ اکبر کو شال دوشالوں کا بہت شوق تھا۔ ابو الفحل لکھتا ہے کہ ”جہان پناہ کو اونی کپڑوں کا بہت شوق ہی بالخصوص شال کا“ شال کشمیر میں بنائی جاتی تھی لیکن لاہور میں بھی شال بانی کے ہزار سے زیادہ کارخانے تھے۔ شال ہی گڑیوں کے طور پر سر سے باندھنے میں ہستمال میں آتی تھیں۔

باس لوگ بالعموم چنے اور کمریاں پہنتے تھے۔ شاہی توشے خانے میں جتنی قسم کے کپڑے تھے اُن کا ذکر ”آئین اکبری“ میں آیا ہے۔ بلحاظ لباس اُس زمانہ میں ہندوستان یورپ کے زیر اثر آچکا تھا۔ کیونکہ اس وقت ایک قسم کا روئی کا کوٹ یورپ سے منگا کر یہاں کے باشندے پہنا کرتے تھے۔ کہتے ہیں کہ جہانگیر بادشاہ کے مزاج میں جیسوئٹ (عیسائیوں کا ایک فرقہ) پادریوں نے بہت دخل پالیا تھا۔ اُس نے ایک مرتبہ یہ ارادہ کیا کہ وہ خود اور اُس کے دربار کے تمام اُمراؤں کو دولت یورپی فیشن کا لباس زیب تن کریں۔ چنانچہ کپڑے تیار کیے گئے اور پہلے بادشاہ نے خود یورپی سوٹ پہنا اور پنکر وزیر اعظم سے پوچھا کہ یہ کپڑے پنکر میں کیسا معلوم ہوتا ہوں؟ ڈاکٹر برنیر قطراز ہے کہ اس سوال کا جواب کچھ ایسا دلشکن تھا کہ بادشاہ نے فوراً کپڑے اُتار ڈالے اور بات مذاق میں آئی گئی ہو گئی۔

اُس زمانے کے درزیوں کی اجرت کا مقابلہ آجکل کے درزیوں کی اجرت سے کیا جاتا ہے تو یہ تپہ لگتا ہے کہ اس وقت سلائی کی اجرت نہایت ہی کم تھی۔ شاہی گھرانے کے کپڑوں کی سلائی بھی کچھ بہت زیادہ نہ تھی۔ بہت سے لیکر دور پہنے تک نفیس سے نفیس کپڑے کی سلائی لیجاتی تھی اور یہ اجرت غیر معمولی اور حد سے زیادہ شمار کی جاتی تھی۔ مینکسی گویم درزی تھا لیکن مجلسرا کے تقریباً تمام کپڑے وہی سلا کرتا

تھا۔ اُس نے اُن کپڑوں کا ذکر کیا ہے جو مالدار گھروں میں پہنے جاتے تھے اور جو خصوصاً شاہی محل کی محذرات ہستمال میں لاتی تھیں مینکسی لکھتا ہے کہ:-

ہندوستان کی تمام عورتیں ہاتھ پاؤں میں ایک قسم کی مٹی، لگاتی ہیں جبکہ وہ اپنی زبان میں ہندی یا حاکتے ہیں۔ اس سے اُن کے ہاتھ ایسے سُرخ ہو جاتے ہیں گویا انھوں نے ہاتھوں میں دستانے پہنے ہیں۔ وہ ہندی اسٹیل لگاتی ہیں کہ اس جگہ کی گرمی کی وجہ سے وہ دستانے یا مونے ہستمال میں نہیں لاسکتیں۔ وہ موسم گرما میں ازباج و حدت کی وجہ سے ایسا باریک لباس پہنتی ہیں کہ اس میں سے چھن چھن کر اُن کا جسم صاف نظر آتا ہے۔ یہ لباس ٹل وغیرہ باریک کپڑوں کا بنایا ہوا ہوتا ہے۔ وہ عموماً دو یا تین کپڑے پہنتی ہیں۔ کپڑوں کا وزن ایک اونس سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اور قیمت ہر ایک کی چالیس پچاس روپے ہوتی ہے۔ اس قیمت میں سُہری لیس یا گولے کناری کے دم شامل نہیں ہیں جو وہ اکثر اپنے لباس کو خوبصورت بنانے کے لیے لگاتی ہیں مٹی کپڑے پہنے جاتی ہیں اور چوہیں گھسنے کے بعد پٹتی ہیں۔ ایک دفعہ پہننے کے بعد وہی کپڑا پھر وہ کبھی نہیں پہنتیں بلکہ اپنی خواصوں بونڈی بونڈی کو نئے دلاتی ہیں۔ وہ اپنے بالوں کو خوب اچھی طرح سنوارتی ہیں چمیان جاتی ہیں اور بالوں میں خوشبودار تیل لگاتی ہیں۔ وہ زربفت کے دوپٹے سر پہاڑتھتی ہیں جن میں مختلف قسم کے رنگ اور گل بوٹے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ موسم سرما میں (یعنی کسی قدر کم گرم موسم میں) بھی وہ یہی لباس زیب تن کرتی ہیں۔ صرف اوپر سے نہایت ہی نفیس کشمیری اونی قبا پہن لیتی ہیں۔ وہ ان کپڑوں کے اوپر ایسا باریک شال اوڑھتی ہیں کہ وہ چھوٹی اٹلی کے چھلے میں سے باسانی گزر سکتا ہے۔

۱۷ ہندی یا حاکو مٹی بتانا مینکسی کی سراسر غلطی ہے۔

امیر گھرانوں کی عورتیں زیور با فراط پہنتی تھیں۔ وہ ہاتھ کی کلاہوں میں کرے اور پتے موتیوں کی پہنچان پہنتی تھیں۔ ایک خاص قسم کا چھلا قابل ذکر ہو۔ یہ دامن ہاتھ کے انگوٹھے میں پہنا جاتا تھا اور اس میں ایک شیشہ جڑا ہوتا تھا جس کے گرد موتیوں کا دائرہ نہایت خوش سلوٹی سے بنایا جاتا تھا۔ اس زیور کے پہننے والی بار بار اپنا منہ شیشے (اسکی) میں دیکھا کرتی تھی۔ جواہرات سے مرصع طلائی تاگری بھی استعمال میں لائی جاتی تھی۔ پاؤں میں ٹخنوں کے گرد موتیوں کی پازیب پہنی جاتی تھی۔ اور بعض اوقات ازار بند کے سرو میں بھی موتیوں کی بندہ پندہ لڑیوں کے گچھے ہوتے تھے۔

عام طور پر خوشبوئیات عطریات اور دیگر خوشبودار چیزیں برتنے میں آتی تھیں۔ آنکھوں میں سرمہ بھی لگایا جاتا تھا مینکسی (جس کے بیانات محل کی محذرات کی نسبت مستند سمجھے جاتے ہیں) تحریر کرتا ہے کہ گلاب کا عطر اہل ہی اول عجیب طریقے سے دریافت ہوا تھا۔ وہ اس ضمن میں ایک قصہ بیان کرتا ہے۔

ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ نور جہان دربار گیر کے دربار میں کچھ شاعر رنجی سی ہو گئی۔ آنحضرت دونوں ملای ہو تو صلح کی خوشی میں دعوت دہائی شاہی بارش کے نام موضع عرق گلاب سے بھر دیے گئے۔ دوسرے روز صبح انکار نور جہان نے دیکھا کہ گلاب کی سطح پر تیل کی سی جھلی ہو۔ یہ دیکھ کر اسے سمجھ گیا کہ ضرور اس عرض میں کوئی نہایا ہو چنانچہ اسکو برا غصہ آیا۔ اور اسنے ایک خواص کو حکم دیا کہ انکلی سے جھلی کو چھو پھر بیگم نے اس خواص کی انکلی کو سونگھا۔ اس بیگم نے نتیجہ نکالا کہ یہ تیل گلاب ہی میں سے نکلا ہو۔

عطر سو روپے کا ایک روپیہ بھروسہ زن میں آتا تھا لیکن بعد میں قیمت ٹھکر پندرہ روپے رہ گئی تھی اور اسکی وجہ یہی تھی کہ ملک میں گلاب بکثرت اُگتا تھا۔

اس زمانہ کے غربا کی حالت کا پتہ لگانا بہت مشکل ہو۔ ہیر (جسکی

شہرت اس کے سچے عشق کی وجہ سے غیر فانی ہے) اسی حسرت میں رہی کہ اسکو چند زیور مل جاتے اور اس کے گنوار عشاق کاڑھے اور گری کی چادر ہی میں خوشی کے مارے پھولے نہ سالتے تھے، اور موسم سرما میں کمل ہی انکے لیے نعمت غیر مترقبہ تھی۔

خوراک | مغلوں کے زمانہ میں اشیائے خوردنی کا نرخ بہت ارزان تھا۔ اس ضمن میں ہم نے بازار میں نرخ کا اقتباس آئین اکبری سے کیا ہے جو ذیل میں مرقوم ہے۔

گندم۔ تقریباً پونے پانچ آنے یا پانچ آنے فی من۔

چاول۔ ساڑھے تین آنے۔

گھی۔ دو روپیہ دس آنے۔

سفید کھانڈ تین روپے چار آنے۔

شکر۔ ایک روپیہ نو آنے۔

دال۔ پونے پانچ آنے سے سوا سات آنے۔

بھیر کا گوشت۔ ایک روپیہ دس آنے فی من۔ بکری کا گوشت اس

بھی زیادہ ارزان تھا۔

چپاتی چاول اور مختلف قسم کی کڑھی عام طور پر کھائی جاتی تھی۔

مسور کی دال اور سبزی ترکاری بھی کھانگی اشیاء میں شامل تھیں۔

آچار و نمکا استعمال بھی شروع ہو گیا تھا۔ اور مندرجہ ذیل آچار عوام

میں مستعمل تھے۔ آم کا آچار تیل یا سر کے میں۔ لیمو کا آچار تیل کا

یا سر کے کا۔ بانس کا آچار۔ ادراک کا آچار۔ تلخ نم اور گاجر کا آچار۔

غرابار و دودھ با فراط پیا کرتے تھے۔ سو جی کے لڈو مزید نعمت

سمجھی جاتی تھی اور شاؤ و نادر کھانے کو ملتے تھے۔ ایک دفعہ مشہور

سفیر طامس روار اس کے وفادار پادری ایڈورڈ ٹیری کو نور جہان

کے بھائی شہنشاہ خان نے مدعو کیا تھا۔ دعوت نہایت ہی خوبصورت

اور وسیع شامیانے میں دیگئی تھی۔ زمین پر قالین رومی اور عالیچے بچھے

تھے جن پر دسترخوانِ ناس خاص مقام پر پھیلا ہوا تھا جہاں کھانے کا سامان لا کر رکھا گیا تھا۔ دسترخوان بالکل سفید تھا۔ چاندی کی طشتیں اور رکابوئین کھانا چٹا ہوا تھا۔ ان رکابوئین کے کنارے سُہری تھے۔

طامس رء آصف خان کی دائیں جانب بیٹھا اور سُہری صاحب آصف خان اور طامس روکے سامنے بیٹھے۔ ان تینوں کے سامنے علیحدہ علیحدہ متعدد رکابیاں رکھی ہوئی تھیں۔ طیرسی رقمطراز ہو کہ

سفر کے سامنے آصف خان کی نسبت دس رکابیاں زیادہ تھیں۔ اور میرے سامنے آصف خان کی نسبت دس کم تھیں۔ میں نے اپنی رکابیوں کا شمار کیا تو وہ تعداد میں پچاس تھیں! ہماری رکابیوں اور طشتوں کے بیچ میں اتنی گنجائش تھی کہ خدام خوراک ہم پہنچانے لے پہل پھر سکیں۔ کھانا مسلمان طرز کا تھا۔ پلاؤ، کڑھی، متجن، زعفرانی چاول، سبز چاول، اور مرغوانی چاول، مرنے، کئی قسم کی کھیر، مختلف قسم کے پھلوں کے مرتبے، کچے پھلوں کے مرتبے، مقشر بادام، کشمش وغیرہ، خوردنی اشیاء، میاں کی گئی تھیں۔ ہکوان کھانوں کے تیار کر نیکاراز معلوم نہ ہو سکا۔ میں نے اپنے سامنے چنے ہوئے کھانے سب کھانے وہ سب کے سب نہایت لذیذ اور مزیدار تھے۔

کھانا کھاتے ہوئے ان کے درمیان کیا گفتگو ہوئی اس کا پتہ نہیں نہیں چلتا۔

بازار و نمین نانباؤن کی دوکانیں تھیں جہاں سے لوگ مول لیکر روٹی کھاتے تھے ڈاکٹر برنیر نے لاہور سے کشمیر جاتے ہوئے راستے میں ایک چٹھی لکھی تھی جس میں وہ اس بات پر نہایت افسوس کرتا ہے کہ اُس کے آقا دانشمند خان کا ایک اونٹ کھو گیا تھا جس پر لوہے کی اینٹیں تھیں لدی ہوئی تھی۔ وہ لکھتا ہے کہ ”مجھے یہ اندیشہ ہے کہ مبادا اب مجھے بازاری روٹی کھانی پڑے“ بازار کی روٹی عموماً بہت خراب بنا کرتی تھی۔ چنانچہ اس بات کی سچائی ڈاکٹر برنیر کے ایک اور مراسلہ سے بھی ظاہر ہوتی ہے

وہ تحریر کرتا ہے کہ ”مجھے دہلی کے بازار کی روٹی کھانے کی چنداں ضرورت نہ پڑی جو غیم پختہ اور جس میں برابر کی مٹی اور خاک بھی ملی ہوئی ہوتی ہو“

خوردنی اشیاء کے ذیل میں ایک شے قابل ذکر ہے وہ دہلی جو اس جگہ اُس زمانے میں بھی ہی ہمیشہ بہت کھایا جاتا تھا ڈاکٹر برنیر لکھتا ہے کہ اس ملک میں شربت لیون اور وہی سے بڑھ کر اور کوئی چیز مفرح نہیں خیال کی جاتی۔

اشیائے نوشیدنی | پانی میں کثافت جیسی اُس زمانے میں پانی جاتی تھی ویسی ہی آج تک گاؤں اور قصبوں میں موجود ہے۔ اس پر استعجاب کا کوئی مقام نہیں، کیونکہ اُس وقت جس گھاٹ سے انسان پانی پینے کے لیے بھر کر گھراتے تھے اُسی گھاٹ پر مویشی بھی پانی پیتے تھے۔ اور سطح پانی بیشمار قسم کی غلظت کا گھر بن جاتا تھا پینے کا پانی صراحیوں میں رکھا جاتا تھا۔ سفر کے لیے ٹین یا کسی اور روہات کی بنی ہوئی صراحی میں پانی رکھ لیا جاتا تھا۔ گنگا جل خاص اوصاف ہوئی وجہ سے شہنشاہ اپنے لیے منگوا کر محل میں ہر وقت موجود رکھتے تھے۔

سفر میں جاتے وقت گنگا جل کی صراحیوں اور ٹون پر لاڈی جاتی تھیں۔ پانی کو ٹھنڈا رکھنے کے لیے صراحیوں پر ترکٹر اپسیٹ دیا جاتا تھا اور پانچواں جگہ لکھا کہ صراحی کو ہوا میں ہلکا کر پانی ٹھنڈا کیا جاتا تھا۔ شورے کے ذریعہ بھی پانی ٹھنڈا کرتے تھے۔ یعنی پانی کی بھری ہوئی صراحی کو آب شورہ میں ڈبو دیتے تھے سطح مٹا پانی ٹھنڈا ہو جاتا تھا ابو الفضل نہایت مزے سے یہ لکھتا ہے کہ شورہ باروت میں ملکر ایسی گرمی پیدا کرتا ہے کہ ہر چیز کو بھکسے اڑا دیتا ہے وہی شورہ جہاں پناہ پانی ٹھنڈا کرنے کے کام میں لاتے ہیں اور اسکو سطح بڑاؤ پر سب کی خوشی اور آسائش کا ذریعہ بنا رکھا ہے۔ برف اُن وقتوں میں لاہور میں دستیاب ہوتی تھی اور اسکا بھجواؤ دو یا تین سیر فی روپیہ تھا۔ علاوہ ازیں دیگر طاقتور اور مفرح نوشیدنی اشیاء کے ذیل میں

گلاب اور بید مشک کا درجہ سب سے بلند تھا۔ یہ دونوں چیزیں بہت کیاب تھیں اور انکی بڑی قدر قیمت تھی۔ شربت لیمون بھی فرح ہنر اشیائے ذیل میں شمار ہوتا تھا۔

قہوہ بھی استعمال میں لایا جاتا تھا لیکن اسکا رواج خلایق عامہ میں نہیں تھا۔ ہندوستان میں قہوہ بصرہ اور ہرمز کے بازاروں سے ہندی جازون کے ذریعہ سے آتا تھا۔ ٹیری کا بیان ہو کہ لوگ شراب کے بجائے قہوہ استعمال میں لاتے تھے۔ اور یہی شے ایسی تھی جو تمام نوشیدنی اشیائے کی قائم مقام سمجھی جاتی تھی۔ ٹیری تحریر کرتا ہو کہ۔

ہتیرے لوگ جو اپنے مذہب کے بڑے پکے اور کٹر ہیں وہ شراب کو ہاتھ نہ لگاتا پاپ سمجھتے ہیں لیکن وہ ایک قسم کا عرق پیتے ہیں جو صحت بخش تو بہت ہوتا ہو مگر ذائقہ میں مزیدار نہیں ہو۔ اس عرق کو وہ قہوہ کہتے ہیں اسکے بنانے کی ترکیب یہ ہو کہ سیاہ دانوں کو نیکر پانی میں اُبال لیا جاتا ہو۔ اس طرح پانی سیاہی مائل ہو جاتا ہو لیکن پانی کا ذائقہ کسی قدر تبدیلی کے ساتھ برقرار رہتا ہو۔ قہوہ ہاضم ہو۔ دل کو طاقت بخشتا ہو اور خون کی اصلاح کر کے صاف کرتا ہو۔

شراب کیا امیر اور کیا غریب دونوں ہی طبقے کے لوگ عتدال سے زیادہ پیتے تھے۔ شراب کی عادت اسطرح مغلیہ بادشاہوں کے عہد حکومت میں ترقی کرتی گئی اور جب خاندان مغلیہ کا چراغ گل ہونیکے قریب تھا اسوقت اس عادت ذمہ نے خوفناک شکل اختیار کر لی تھی بار بادشاہ حد درجہ کا شراب خوار تھا لیکن وہ طاقت میں کم نہ تھا۔ اُس نے توڑک باربری میں یہ بات نہایت بے تکلفی کے ساتھ لکھی ہے۔

ہم نے آجکے بھیکو دن ڈھلے تک شراب پی۔ اس کے بعد ہم آگے روانہ ہوئے۔ ہماری جماعت کا کوئی شخص ایسا نہ تھا جو نشہ میں چور نہ ہو۔ اور سید کریم تو

نشہ کے مارے اتنا عقیل ہو گیا۔ اسکو دو نوکروں نے گھوڑے پر سوار کیا اور پکڑ کر شکل خرگاہ میں لائے۔ پھر صبح ہوتے ہی ہم نے اُسی خیمے میں شراب پینی شروع کی اور رات تک اسطرح علی التواتر بخواری جاری رہی۔ پھر صبح ہوتے ہی اور منہ اندھیرے ہی ہم نے پیادہ چڑھایا اور نشہ میں مہوش ہو کر سو گئے۔ فلہذا کی ناز کے قریب میں نے معجون کھائی۔

اکبر بادشاہ نے شراب کشید کرنے کی اجازت عیسائیوں کو دی تھی۔ اس سے شراب کی ناجائز تجارت اور بکری شروع ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچی کہ جب کوئی یورپین محل فرج سے یا محاسن کی ملازمت سے برطرف کیا جاتا تو وہ شراب کھینچنے کا پیشہ اختیار کر لیتا تھا۔ جہانگیر کا اکثر یہ دستور تھا کہ وہ کمال خانہ میں جا کر ادنیٰ سے ادنیٰ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر شراب پیا کرتا تھا۔ ایک دن وہ اسطرح ایک کمال خانہ میں جا کر شراب پینے لگا۔ جب نشہ نے رنگ جمایا تو اسکا جھگڑا ایک جلاہ سے ہو گیا جو پیے ہوئے تھا اور جس پر نشہ کا عالم طاری ہو چکا تھا۔ جھگڑا یہ تھا کہ جلاہ جہانگیر سے کہہ رہا تھا کہ تم مجھے سکندر اعظم کو لیکن جہانگیر کو سکندر اعظم کہنے میں غلطی ہو گئی۔ غلطی کے عہد حکومت تک شراب بخواری عوام میں نہایت ہی مکر وہ عادت بن گئی۔ اُس نے شراب بخواری کے نیست و نابود کرنے اور عوام کی عادت کی اصلاح کرنیکی اپنے امکان بھر بہت ہی کوشش کی لیکن کچھ نہ بنا۔ یورپ کی شرابین کو اسے ہو کر یورپی کو ٹھیکوئی و سلطت سے ہندوستان میں آتی تھیں۔ حقیقت الامر یہ ہو کہ شراب کا رواج اتنا زور پکڑ گیا تھا کہ اگر کوئی شخص تحفہ کے طور پر یورپ کی شراب کی بوتلوں کا ایک کبس شاہی دربار کے کسی امیر کی نذر کرتا تھا تو امیر اسکو خوشی سے قبول کر لیتا تھا۔ اس قسم کی رشوت ستانی عام طور پر دیکھی جاتی تھی۔ اس عبادت کو روکنے کے لیے نہایت ہی سخت قوانین بنے ہوئے تھے۔ اور اکثر سنگین سزائیں دی جاتی تھیں لیکن پھر بھی بخواری کا

قلعہ واقع نہ ہو سکا۔ جہانگیر کے وقت میں پان اور تبا کو بھی تکلفات کی فہرست میں داخل ہو گئے۔

مکانات مدت دراز تک مغلون کے طرز معاشرت سے یہ ظاہر ہوتا رہا کہ وہ ابتدائیں خانہ بدوش تھے۔ حالانکہ بڑے بڑے شہروں میں شاہی محل اور عمارتیں کھڑی تھیں لیکن پھر بھی اُمر اور اراکین دولت خیموں میں رہنے سے خوش تھے۔ یا ایسے گھروں میں قیام رکھنا پسند کرتے تھے جو قبولِ ٹیری جھونپڑیوں سے بھی بدتر تھے۔ مغلون کے ہندوستان میں آنے کے بہت مدت بعد شاندار عمارتیں تعمیر ہوئی تھیں۔ اُس زمانہ کی یادگار اور قابل ذکر عمارت رنگ محل لاہور میں جو حسین آجکل مشن سکول ہے یہ عمارت شاہجہان کے وزیر عظم نواب سعد اللہ خان نے بنوائی تھی۔

عمارات کی تعمیر میں جو مصالح کام میں آتے تھے انہیں سے بعض ہیں (۱) سرخ بھر بھرا پتھر (۲) تین قسم کی اینٹیں (۳) شیشم۔ بیر شہتوت سر دیار اور بجانن کی لکڑی۔ (۴) چونا (۵) لوہا مثلاً دروازوں کے لیے لہے کے کڑے اور کنڈے اور کیلین (۶) کھیرل (۷) چھت پڑا لسنے کے لیے بورے (۸) پلاستر (۹) شیشے کھڑکیوں اور دروازوں کے کواڑوں کے لیے غرابا، بانس کی جھونپڑیوں میں رہتے تھے جبکی چھت چھپر سے چھائی ہوئی ہوتی تھی چنانچہ ہیر اور رانجھے کے قصبے میں لکھا ہوا ہے کہ ہیر نے اپنے چچا کے تان مکانوں کے چھپرے میں آگ لگا دی تھی۔ اہل ثروت اپنے رہائشی مکانوں کے اندر سفیدی بھی کرا لیتے تھے۔

مغل اپنی زندگی خوشی سے گزارنے کے لیے عیش باغ لگاتے تھے اس قسم کا ایک باغ لاہور میں جو جبکا نام شالاباغ ہے۔ اس شہر میں اور کئی باغ ہیں جن کا مالک کوئی نہ کوئی صاحبِ دول ہے۔ ان باغوں کے دیکھنے سے اہل بصیرت کو یہ بات صاف عیان ہو گئی کہ مغل فاتحوں کے دلمین ہمیشہ فارس کی یاد دہی رہتی تھی اور وہ پنجاب کے گرم میدانوں میں بھی اس قسم کے باغ لگا کر خطہ فارس کی نظیر قائم کرنا چاہتے تھے چنانچہ

نہر آبشار و درخت، پھول اور پھل اس بات کی شہادت دیتے ہیں۔ گھروں کا اندرونی حصہ بہت قیمتی مگر سادہ سامان سے آراستہ ہوتا تھا قالین، پٹنگ، میز اور کرسی وغیرہ عام سجاوٹ کی چیزیں تھیں۔ قالینوں اور نقش و شجر پر دون پر روپیہ پانی کی طرح بہایا جاتا تھا کھانا کھانے کے برتن بہت قیمتی ہوتے تھے خصوصاً آصف خان ایسے امر کے گھر میں تو اس قسم کے برتنوں کی کان ہوتی تھی چینی کے برتن اور گلدان چین سے ہندوستان میں آتے تھے۔

سیر تفریح کھیل تانے (۱) مغلون کو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ تیر اندازی کی مشق بہت کرتے تھے۔ توپ و تفنگ، بندوق، تیغ بھی چلانا جانتے تھے۔ جہانگیر کے پاس ایک شکاری بندوق تھی جو دراصل اُس کے باپ کی تھی اور اُس کا نام ”درست انداز“ تھا۔ وہ اپنی توڑک جہانگیری میں لکھتا ہے کہ ”یہ بندوق نہایت ہی عمدہ ہے۔ میرے والد نے اس بندوق پر ۲۰ ہزار چاند پرند مختلف اوقات میں شکار کیا ہے۔ مجھے بھی اس بندوق کے چلانے میں خصوصی مہارت ہوئی کہ میں بھی ہر قسم کے شکار کا دل و جان سے شوقین ہوں۔“ (۲) کبوتر بازی۔

(۳) پناح اور نظر بندی کے کھیل۔ جہانگیر نے کالی بازیکو کے کھیلوں کا حال نہایت ہی شرح و بسط کے ساتھ اس طرح تحریر کرتا ہے کہ

بازیکو نے فکر ایک آدمی کے اعضاء صبا خدا کر دیے اور اُس کا سر کاٹ ڈالا۔ ان اعضاء کو انھوں نے زمین پر بکھیر دیا۔ جو دیر تک اس طرح پڑے رہے پھر انھوں ایک چادر ان اعضاء پر ڈال دی اور ایک بازیکو چادر کے نیچے گیا اور پھر چند ہی منٹ میں باہر نکل آیا۔ اُس کے بعد وہی شخص صحیح و سالم نکلا جس کے اعضاء کا ٹکڑا علیحدہ علیحدہ کر دیے گئے تھے۔ اُس کے جسم کے دیکھنے سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے کبھی زخم یا جوت لگی ہے۔

(۴) ایکٹنگ یا سوڈنگ کرنا۔ شاہجہان کی نسبت ایک عجیب واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دفعہ بادشاہ کو خبر ملی کہ چند عجیب سوڈنگ

نے یہ سنا تو اُسے منادی کرا دی کہ یہ نوحہ کوئی نہ گلے در نہ آئندہ جو شخص یہ نوحہ گاتا سنا جائیگا اُسکی زبان کاٹ لی جائیگی۔ لیکن نوحہ ایسا دروازہ نکیز تھا کہ پھر بھی لوگ چھپ چھپا کر گاتے رہے۔

(۱۰) زراعت پیشہ لوگوں کے لیے سال بھر ایک ہی طریق کی تھکانیوالی محنت سے ذرا سبکدوش کرینکے لیے ہندوستانی میلے یا تہوار ہی خوشی کے موقع ہوتے ہیں۔ آئین الہری میں اُن تیر تھو نکا ذکر ہے جہاں اکثر لوگ جایا کرتے ہیں۔ خلاصہ التواریخ میں ایک میلے کا نقشہ ایسا ہوہو کھینچا گیا ہے کہ پڑھنے سے بڑا لطف آتا ہو۔ یہ میلہ اچل واقع ضلع گورداسپور میں ہوتا تھا۔ لیکن ایسے میلے صرف عوام کی دل لگی کا سامان مہیا کرتے تھے۔ مثل مغل بادشاہوں کے بھی اولیاء کرام تھے مثلاً خواجہ حسین حسن چشتی۔ آپ صوبہ سیستان میں پیدا ہوئے اور اجمیر میں دفن ہوئے۔ آپ کے مرقہ منورہ پر ہزاروں بنی نوع انسان کا ہجوم ہوتا تھا اور اگر بھی خود بنفس نفیس آپ کے مزار کی زیارت کے لیے حاضر ہوا کرتا تھا۔

سواریان اور شاہراہیں تمدنی زندگی دور دراز خطوں تک پھیلانے میں سواریان اور شاہراہیں ایسے ذرائع ہیں جو اس باب میں مدد معادن ہو سکتے ہیں۔ لاہور کے بازار ابتدا سے ایسے ہی تنگ اور سکرٹے چلے آتے ہیں جیسے کہ آجکل ہیں۔ دہلی اور آگرہ کے نسبت اچھلے مکان بھی زیادہ اونچے تھے۔ ان وجوہ سے سواری کے لیے پالکیاں اور گھوڑے عام طور پر مروج تھے مینکسی جب کبھی اپنے مریضوں کو دیکھنے کو جاتا تھا تو گھوڑے پر سوار ہو کر جاتا تھا۔ امرا اور ذمی مقدار لوگ ہاتھیوں پر سوار ہوتے تھے۔ ہندوستان میں گھوڑے فارس، کج اور کابل سے آتے تھے۔ مال اسباب اور دیگر بوجھل اشیاء اونٹ گاڑی اور بیل گاڑی اور چھکڑوں میں آتی جاتی تھیں۔

سلطنت کی سڑکیں بڑی بڑی شاہراہیں تھیں جنکا ذکر بطور ذیل علیحدہ ہونا چاہیے۔ غالباً شیر شاہ عمدہ عمدہ سڑکوں کا بانی ہے۔

کرنیوالے آئے ہیں اور وہ اپنا کھیل بادشاہ کو دکھانیکے خواہشمند ہیں چونکہ شاہجہان کو اس قسم کی دل لگی دل سے بھاتی تھی اس لیے اجازت ہوئی کہ حاضر ہوں۔ ان کھیل دکھانیوالوں نے ریاست گجرات کی انتظامی کاکھیل دکھایا۔ وہاں کے ظلموں کی نقل دیکھ کر بادشاہ کو سخت حیرت ہوئی اور اُن سے پوچھا کیا دُنیا بھر میں کوئی ایسا ظالم ہو سکتا ہے جو اس درجہ ظلم کرے؟ تمام سوداگر جنھوں نے بھیس بدلا ہوا تھا زمین خدمت کو بوسہ دیکر بولے کہ 'جہان پناہ سے یہ بات مخفی نہ رہے کہ جو کچھ ہم نے کھیل کے طور پر حضور کی دل لگی کے لیے دکھایا ہے وہ دراصل گجرات میں وقوع میں آ رہا ہے اور وہاں کا حاکم ان ظلموں کا مرتکب ہے، چونکہ اس سے پہلے ہماری فریاد حضور تک نہ پہنچ سکی۔ اس لیے ہم نے اس طریقے سے اپنی شکایتیں حضور کے گوش گزار کرنا مصلحت سمجھا۔ اسکا نتیجہ یہ نکلا کہ ظالم کو کافی دوائی سزا دی گئی۔

(۵) اکبر ایک قسم کی باکی کھیلتا تھا جس کو پو لو نہیں کہہ سکتے۔ کھیل اسکو بہت پسند تھا۔

(۶) شطرنج یا چوڑ۔ آئین الہری میں اس کھیل کی بساط کا نقشہ دیا ہوہو (۷) ماش (مبشر) دیکھل ہندوستان میں قدیم زمانہ سے رائج ہیں (۸) رقاصہ عورتیں شہر کے بڑے بڑے وسیع چوکوں میں ناچ گاکر لوگوں کو محفوظ کرتی تھیں۔ ناچ ۶ بجے سے رات کے نو بجے تک مشعلوں کی روشنی میں ہوتا تھا۔ یہ عورتیں گانا بچ کر روزی کماتی تھیں۔

(۹) پیشہ ور عورتوں کے علاوہ عوام بھی گلے کے مشتاق تھے۔ دارالو کو بہت پیارا تھا جب اورنگ زیب نے اُسکو قتل کیا تو لوگوں نے ایک فوضہ بنایا اور وہ گھر گھر گلی گلی اور کوچے کوچے گاتے پھرے سمیں مضمون یہ باندھا تھا کہ "دولت و شہمت جاگیر اور ثروت سب ناپائدار ہیں۔ سمت نے اورنگ زیب کو بادشاہ بنا کر تخت پر بٹھادیا۔ شاہجہان کو زنجیر زندان کا اسیر کیا۔ اور دارا کو سهام اجل کا نشانہ بنایا۔ جب اورنگ زیب

بیان ہو کہ اس سڑک کو دیکھا کہ دل ذرا بھی مسرت و انبساط سے متاثر نہیں ہوتا۔ اور وہ یہ بھی لکھتا ہو کہ

اس سڑک کے کنارے پر چند واسطہ کی خوبصورت کاروائی ہیں جن جو ایک دوسرے سے ایک دن کے راستے پر واقع ہیں اور جانگیر کے حکم سے درختوں کی دوہری قطار ڈیڑھ سو فرسنگ تک لگائی گئی ہے۔ اس طریقے سے یہ سڑک اور دوسرے راستے آسانی سے پہچانے جاسکتے ہیں۔ سڑک پر تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلے پر کنوئیں کھدے ہوئے ہیں جنکا پانی مسافروں کی پیاس بجھاتا ہے اور چھوٹے چھوٹے درختوں اور پودوں کے سیخنے کا کام دیتا ہے۔ نیکسی اور بھی زیادہ تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہو۔ وہ لکھتا ہو کہ

متان سے آد آباد تک پانسو تیرہ سو فرسنگ کا فاصلہ ہے۔ اس فاصلے کو طے کرنے کے لیے ایک سڑک جاتی ہے جس پر ایک ایک فرسنگ کے فاصلے پر چوبیس مینار بنے ہوئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ مسافر نے کتنی مسافت طے کی ہے۔ اگر گیدن کی آسائش کے لیے ہر مینار کے قریب ایک گاؤں مہا آباد ہے۔ ان سڑکوں کے کنارے پر عمدہ عمدہ سرزمین اور باغات اور گاہن ہیں۔

اس جگہ یہ ذکر کرنا بے محل نہ ہو گا کہ پنجاب میں آثار قدیمہ کی چیزوں کے ذیل میں کوس مینار بھی ہیں۔ مندرجہ ذیل مینار اب تک موجود ہیں:-

| | |
|-------------------------------|---------|
| پھلورا ورنگور میں | ۷ مینار |
| لدھیانہ | ۲ مینار |
| سانوال ضلع لدھیانہ میں | ۱ مینار |
| سرلشکر خان (واقع لدھیانہ میں) | ۱ مینار |
| راجپوتانہ | ۱ مینار |

میزان = ۱۲-

انکی تعداد اس سے بھی زیادہ ہے۔ ایک مینار لاہور سے تھوڑے فاصلے پر واقع ہے۔ اور اسی قسم کے دیگر میناروں کا ذکر ضلع انبالہ کے گزٹیر میں قوم پر

توانیج شیر شاہی میں مندرجہ ذیل سطور مرقوم ہیں:-

غریب مسافروں کی آسائش کے لیے اُسے (شیر شاہ نے) ہر سڑک پر دو دو کوس کے فاصلے پر ایک ایک سڑک بنوا دی ہے۔ اور ایک سڑک رہتاس (پنجاب) سے لیکر نارگاؤں (بنگال) تک جو سمندر کے نزدیک تھا نکالی ہے۔ ایک سڑک اگرے سے برہان پور تک جاتی ہے۔ ایک لاہور سے متان کو بنوائی ہے۔ اس پر بھی سرزمین تھیں۔ ایک سڑک اگرے سے جو دھپورا و چتوڑ تک نکالی ہے۔ سڑک پر اسے ایک ہزار سات سو (۱۷۰۰) سرزمین تعمیر کرائیں تھیں جنہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے علیحدہ کرے تھے۔ سرد اور گرم دونوں قسم کے پانی کا انتظام تھا اور بچھپنے اور خوراک بھی دی جاتی تھی۔ ہر سڑک میں مویشیوں کے آرام اور خوراک کا بھی پورا انتظام تھا۔ سڑک کے وسط میں پکی اینٹوں کی بنی ہوئی ایک ایک مسجد تھی۔ مسجد میں ایک موزن اور ایک محافظ بھی ہوتا تھا۔ ہر سڑک کے ایک کنواں تھا۔ سڑک کے دونوں طرف درختوں کی قطاری تھی۔ ڈاک کا بھی انتظام تھا اور ہر سڑک کے لیے دو گھوڑے بندھے تھے۔

جہاں گیدنے سڑکوں کی مرمت کرائی اور انکو خوب ترقی دی خصوصاً اس ضمن میں لاہور سے اگرے تک جانیوالی سڑک قابل ذکر ہے۔ اُسے شہتوت اور دیگر گھنے پتوں کے درخت لگوائے۔ آٹھ آٹھ کوس کے فاصلے پر سرزمین بنوائیں۔ ان سڑکوں میں حمام کا انتظام کیا۔ تالاب کھدوائے اور مسافروں کے آرام کے لیے آدمی مقرر کیے۔ چھوٹے بڑے ہریار پتھر کے کٹوان بل تعمیر کیے۔ ۱۶۴۱ء میں سیاح ٹیوئریر لکھتا ہے کہ لاہور سے دہلی تک کی اور دہلی سے اگرے تک کی سڑک دونوں طرف کے خوبصورت درختوں سے ایسی چھائی ہوئی ہے کہ وہ باغ کی روش معلوم ہوتی ہے۔ چتر اور برتیر نے ان سڑکوں کے نقشے میں درخت خاص طور پر کھائے ہیں اور ٹیریر نے اس سڑک کا نام لمبی روش رکھا ہے۔ جب برتیر نے اس سڑک کو دیکھا تو اُسے اسکو بہت ہی رومی حالت میں پایا کیونکہ اسکا

یقینی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ ان میں سے بہت سے مینار شاہنشاہ جالگیر نے تعمیر کرائے تھے۔

سرائیونین اینٹ اور پتھر کی چٹائی ہوئی تھی اور انہیں سے بہتری ایک موجود ہیں۔ مثلاً سرے امانت خان منل سرے وغیرہ وغیرہ۔ غالباً ایک پڑاویا منزل بارہ میل کا ہوتا تھا۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ آٹھ آٹھ کوس کے فاصلے پر ایک ایک سرے بنائی گئی تھی۔ بنیر کو لاہور سے دیرا جانیمن چھ روز لگے تھے۔ وزیر آباد کا فاصلہ لاہور سے ۲۲ میل ہے۔ شکر کے کنارے ان سراون کا نظارہ بڑا دلچسپ اور دلخوش کن ہوگا۔ ان سراون میں رہائش اور طرز زندگی کا نقشہ ہو جو ذیل کی سطور میں کھینچا گیا ہے۔

وہ یعنی سرائین بڑی مستحکم اور محفوظ جگہ ہیں۔ انہیں سے بعض پتھر پائی اینٹ کی بنی ہوئی ہیں۔ ہر سرے میں ایک سرکاری گماشتہ ہو جس کا یہ فرض ہو کہ آفتاب غروب ہونے پر سرے کا دروازہ بند کرے۔ پچانک بند کرنے کے بعد وہ آواز بلند شخص کو آگاہ کرتا ہے کہ بھئی! اپنی چیزیں دیکھ لو کہ سب موجود ہیں! اپنا پتہ کھو نہ! باندھ دو جب صبح کے چھ بجتے ہیں تو چونکہ رات پچانک کھولنے سے چلے مسافر کو پتہ تائید کرتا ہے اور خوب چٹا کر کتا ہے کہ بھئی! اپنی چیزیں دیکھو! اگر کسی کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اس کی کوئی چیز خالی رہی ہو تو جب تک تم شدہ چیز نہیں مل جاتی سرے کا پچانک نہیں کھولا جاتا۔ یہ سرائین مسافروں کے لیے مخصوص ہیں۔ سپاہیوں کو انہیں جگہ نہیں دی جاتی۔ ہر سرے میں اتنی گجائش ہے کہ آٹھ سو سے لیکر ایک ہزار مسافر تک رہنے لگھوڑوں، اونٹوں اور گھوڑوں کے سائیکل اور بعض سرائین تو اس سے بھی زیادہ فراخ ہیں۔ سراون میں کمرے اور دالان اور برائے بنے ہوئے ہیں اور صحن میں سایہ دار درخت کھڑے ہیں۔ پرچونے کی بھی کئی دکانیں ہیں۔ زنانہ کمرے علیحدہ بنے ہوئے ہیں اور جو ملازمین مسافروں کے لیے کمرے سجاتے ہیں اور بچھونے وغیرہ بچھاتے ہیں ان کے رہائشی مکانات بھی بالکل جدا ہیں۔

کشتیوں کے کرایہ کا ذکر کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آئین اکبری میں کرایہ بھاڑے کی ایک فہرست ہے جو کسی شخص کو اس وقت یا جازت نہیں کرو دریا میں پایاب پار اتر سکے۔ کرایہ حسب ذیل لیا جاتا تھا۔

۱۴۔ ہاتھی۔

۲۔ لدا ہوا چھکڑا۔

۱۔ خالی چھکڑا۔

۱۰۔ لدا ہوا اونٹ۔

۱۔ خالی اونٹ۔

۱۰۔ لدا ہوا گھوڑا یا بیل۔

۱۔ خالی بیل۔

۱۔ لدا ہوا گدھا۔

۱۔ بیس آدمی۔

بہتری کشتیاں ایسی بھی تھیں جو مسافر کو مفت دریا کے پار لے جاتی تھیں کشتی کے ذریعے سے ایک ہزار میں بوجھ ایک کس تک ایک دے میں لیا جاتا اور گزیر کے زمانے میں مندرجہ ذیل سرائین شاہی سرائین کہلاتی تھیں۔

(۱) آگرہ سے دہلی تک۔

(۲) دہلی سے لاہور تک۔

(۳) لاہور سے گجرات اور اٹک تک۔

(۴) اٹک سے کابل تک۔

(۵) کابل سے غزنی اور قندھار تک۔

(۶) گجرات سے سری نگر تک۔

(۷) لاہور سے ملتان تک۔

مندرجہ بالا سرائین کشتیاں فاصلے پر چوکیان اور سرائین بنی ہوئی تھیں تعلیم اور دہنگاہیں البتہ لکھتا ہے کہ تمام تمدن تو موغلیں بچوں اور لے ایک درم ایک روپیہ کا چالیسواں حصہ ہوتا ہے اس پر کرایہ بھلا لیا ہے

نوجوانوں کے لیے درس گاہیں موجود ہیں اور ہندوستان خصوصیت کے ساتھ کتبوں کے لیے مشہور رہیں۔ کبر کے زمانے کے ایک کتب کی نسبت یہ مذکور ہے کہ اس کتب کے طلباء عام طلباء کی نسبت ہوشیار اور ذی لیاقت تھے پہلے دو دن حروف تہجی پڑھنے میں صرف کیے جاتے تھے۔ اور پہلے ہی ہفتہ میں حروف کی بندشیں اور الفاظ کی ترکیب بتا دی جاتی تھی۔ اسکے بعد نظم یا شعر کے ایسے فقرے پڑھائے جاتے تھے جن کے مطالب اخلاقی یا مذہبی نصیحت نکلتی تھی، اور بین وہ الفاظ شریک تھے جو وہ پہلے پڑھ چکے تھے معلوم شاگردوں کو موقع پر جمع کر لیا جاتا تھا۔ ہر روز کتاب کی نئی سطر پڑھانی جاتی تھی۔ اس سے طریقہ تعلیم سے معلوم بنتا ہی تھا کہ عرصہ میں اس قابل بن جاتا تھا کہ وہ ان نہایت صفائی کے ساتھ پڑھ سکے حالانکہ پڑھنے طریقہ پڑھنے والوں کو ایسی استعداد حاصل کرنے تک سالہا سال گزر جاتے تھے۔ اعلیٰ جامعہ میں مندرجہ ذیل علوم پڑھا جاتے تھے علم الاخلاق، علم ریاضی، علم حساب، علم زراعت، اقلیدس، پیمائش، علم ہیئت، علم رمل، علم خانہ داری، فن سیاسی، علم طب، علم منطق، طبیعی، علم الہیات، علم تصوف، علم توالیخ۔

سیالکوٹ تعلیم کیلئے بہت مشہور تھا۔ ۱۶۷۳ء میں مولوی کمال کشمیر سے سیالکوٹ آکر شاگرد پیشہ کو کوٹ پڑھانے لگا۔ شاہجہان کے عہد حکومت میں ایک مدرسہ سیالکوٹ میں قائم ہوا تھا جس میں صرف دینیات کی تعلیم دی جاتی تھی یہاں یہ ذکر کرنا موقع نہ ہوگا کہ سیالکوٹ لکھانی کے کاغذ کے کام میں مشہور چلا آتا ہو ان دقتوں میں علم یا علم ادب کا کتنا زور تھا اس بات کا اندازہ آج ہم نہیں لگا سکتے۔ لیکن البتہ ابو الفضل جیسے علما کا نام نامی ہر زمانہ کے لیے موجب عزت و فخر ہوگا اور مکتوبات اور نگ زیب مغلون کی توالیخ میں لازوال درجہ حاصل کر چکے ہیں۔ ڈاکٹر بریجر کا آقا دانشمند خان نہایت ہی فاضل اور قابل شخص تھا۔ بریجر لکھتا ہے کہ دانشمند خان سے پہر کو علم فلسفہ کا مطالعہ کیا کرتا

تھا اور صحیح وزیر دولت خارجیہ اور داروغہ اعظم کی حیثیت سے نہایت ہی ضروری فرائض ادا کرتا تھا۔ علم ہیئت، جغرافیہ اور علم تشریح کا اسکو کمال شوق تھا۔ اور وہ گیسٹری اور ڈکارٹ کی تصنیف کردہ کتابیں بڑے ذوق و شوق سے پڑھا کرتا تھا۔ مطالعہ کی وجہ سے دربار کی دوسری طرحی اسکو معاف تھی۔

سولخ تعداد میں بیٹا تھے انکی کتابیں انکی عام لیاقت تربیت اور واقفیت کا ثبوت دیتی ہیں۔ عام طور پر ہر عالم شخص کے پاس ایک بیاض ہوتی تھی جس میں وہ نادر خیالات اور عمدہ نظم نوٹ کر لیتا تھا اور نگویں کی بیٹی زیب النساء کی شاعری اور فضیلت کے چرچے بھی اسطر میں لکھتے۔ مردوزن پرے کے رواج کی وجہ سے مغلوں کی اندرونی اور خانگی زندگی کی نسبت رکنے زنی کرنا بہت مشکل ہو اس ضمن میں مورخ بالکل خاموش ہیں اور یہ محکم کلمہ توالیخ کے مطالعہ سے بہکوصرف اتنا پتہ لگ سکا کہ آصف خان اپنے احباب کی دعوت و موضع میں بڑی فراخ دلی سے کام لیتا تھا اور دشمنانِ خلق بڑا عالم و فاضل تھا۔ امر کے گھر و مکی نسبت یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بالعموم اس طبقہ کے لوگوں کے مکاناں اور محل بہت آراستہ و پیراستہ ہوتے تھے۔

اگر مجلس کا پڑھ اٹھا کر دیکھا جائے تو ایک جگہ جہاں گھر اپنے باپ اکبر کے ہر مرگ پر بیٹھا ہوا نظر آتا ہے اور دوسری جگہ وہ ایک حرم موسومہ انارکلی کے عشق میں والا و شیدانظر آتا ہے۔ اسکے علاوہ کمین کمین مثل محذرات اور گیات کا قافلہ کسی پیر فقیر کی زیارت کے لیے جاتا ہوا شرک پر دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ محو گیات کی خوشی و غم میلان طبع اور آرزو کی مناسبت و مناسرت کے حالات کی کچھ خبر نہیں بہکوصرف بچہ کے نئے اور نئے خوشی نہیں سنائی دیتے جرم سز کی نوڈی باندیوں کے قہقہے اور چہچہے ہمارے مشتاق کا نون کی شنوائی سے پرے ہیں۔

ڈپٹی لال نگم

بہادر شاہ ظفر

ایک قدرتی بات ہے۔

سیاسی نقطہ خیال سے ایک ایسے اسلامی خاندان کا خاتمہ یوں تو کچھ کم لٹاک نہوتا لیکن اس صدمہ کی تلافی اس صورت میں باحسن الوجہ ہوئی کہ قدرت نے ہماری قسمت کی باگ برطانیہ کے روشن ضمیر و آزاد خیال افراد کے ہاتھ میں دیدی ہے جنکی بالغ نظری اور منصف مزاجی نے اور تو اور خود مسلمانوں کو بھی قومی حکومت کا نقصان محسوس نہیں ہونے دیا بلکہ وہ تو عنان سلطنت کا انگریزوں کے تفویض ہونے کو قدرت کا ایک "اعلانہ منشا" سمجھتے ہیں اور گو نمٹ برطانیہ کو خدا کی رحمت خیال کرتے ہیں اسی طرح اور اقوام ہند بھی ان کی ہم نوا ہیں۔ البتہ جو علیٰ حسیان کسی زمانہ میں دہلی کو قرطبہ و نیشاپور بنائے ہوئی تھیں ان کا تذکرہ کرتے ہی بابر و ہمایوں کے نیک نیت اور سپوت اخلاق کی یاد دل میں پیدا ہو جاتی ہے انھیں علمی روایات کو انھیں اب دہلی کے گنڈروں میں تلاش کرتی تھیں اور نہیں پاتیں اور انھیں کے لیے ہم اپنی شفقت کو نمٹ کے گوشہ نشین کے ایک اشارے کے امیدوار ہیں۔

خاندان تیموریہ کی علم و دستی کے افسانے کسی تفصیل کے محتاج نہیں۔ بابر سے لیکر بہادر شاہ تک اپنی اپنی حیثیت سے معارف پروری کا مادہ اپنی طبیعت میں رکھتے تھے۔ محمد شاہ کے وقت سے سلطنت کی جز میں عشرت پسندی اور عیاشی کا گھن لگنا شروع ہو گیا تھا لیکن خود محمد شاہ کے عہد میں بھی علمی چربا کچھ کم نہ تھا جو اسکے جانشینوں کے وقت میں بھی برابر قائم رہا۔

شاہ عالم کی سرگزشت اور بھی دلچسپ ہے۔ حکومت تو جو کچھ تھی تھی لیکن اہل کمال کی جو پیشش اس عہد میں ہوئی اسکی مثال کہیں ویریں نظر آئیگی۔ سودا، میرانشاہ اور ان سوسیون شاعر شاہ عالم کے جوان کم

بعض آدمیوں کی سرگزشت کچھ اس قبیل کی ہوتی ہے کہ بے انتظام آہستہ تو ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے بہادر شاہ ظفر کی زندگی سے بھی واقعات کی بولمونی اور واردات کی گونا گونی اس درجہ وابستہ ہے کہ ان کا نام لیا جاتا ہے تو آنکھوں کے سامنے انقلاب عالم کی ایک عبرت انگیز تصویر بھر جاتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سب تقدیری امور ہوتے ہیں اور انسانی حیطہ اقتدار سے قطعی خارج، اور یہ بھی سچ ہے کہ ہر متعین کو اپنے سفر حیات میں عروج و زوال کی گھاٹیاں مل کرنا پڑتی ہیں لیکن نصیب ظفر کی داستان حسرت و دکا کچھ اور ہی عالم رکھتی ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی اہل دل اس سے متاثر ہونے بغیر رہ سکے۔

یہ ضرور ہے کہ بہادر شاہ کے وقت میں سلطنت نام کی سلطنت اب گئی تھی اور حکمران وقت کی حیثیت شاہ طبرخ سے زیادہ نہ تھی شاہ با حقوق میں فرق آگیا تھا اور حکومت کا رقبہ جو کبھی کابل و قندھار سے لیکر جنوبی ہند کی وسط تک پھیلا ہوا تھا اطراف دہلی تک محدود تھا تاہم دہ تخت دہلی کا مالک، خاندان تیموریہ کی عظمت جلال کا علمبردار اور اپنے اسلا کی ایک مٹی ہوئی یادگار تھا اور اس گئی گزری حالت میں بھی باشندگان ہند اسکا نام ادب سے لینا ضروری سمجھتے تھے۔

سلاطین مغلیہ کے وقت میں ہندوستان کو جو علمی، اخلاقی تمدنی اور اقتصادی فوائد حاصل ہوئے ہیں ان کے تذکرے سے فارسی اور انگریزی کی تاریخیں لمبریز ہیں اور آج بھی انکے انکار کرنے کی کوئی جسارت نہیں کر سکتا۔ انھیں کارناموں کی بدولت بابر و اکبر و شاہ جہان کے نام اس ملک میں اب بھی اسی طرح عزیز ہیں جیسے ان کی زندگی میں تھے اور چونکہ بہادر شاہ انھیں نیکل فرمان رواؤں کا جانشین تھا اس لیے باوجود بعض ذاتی کمزوریوں کے اسکے افسوسناک انجام پر تاسف کرنا

اشخاص کا مجمع تھا ان پر بھی بہادر شاہ کی نظر نہایت یکساں تھی اور سطح دربار شاہی و بزم ولیمہ ہی اچھے اچھے شاعروں کا مجمع بنی ہوئی تھی اور بڑے بڑے آدمیوں کو وہاں کے مشاعروں میں جو خاص اہتمام سے قلمی مہلی میں ہوا کرتے تھے شریک ہو سکی تیار رہتی تھی۔

بہادر شاہ کی شخصیت اور ان کے عہد حکومت کے واقعات کچھ ایسے نمایاں نہیں جو تاریخ میں ممتاز جگہ پاسکیں۔ مگر یہ ضرور ہے کہ چونکہ ان کے ساتھ مغلوں کے آخری تاجدار ہونے کی خصوصیت وابستہ ہے اس لیے ان کے متعلق چھوٹی سی چھوٹی بات تاریخی اہمیت کا درجہ رکھتی ہے۔ اس جگہ مختصر طور سے سمجھ لینا چاہیے کہ ۱۸۵۷ء ستمبر کی ۲۰ء کو اکبر شاہ کا انتقال ہوا اور تخت دہلی کے مالک بہادر شاہ بنے۔ ان کے زمانہ ولیمہ ہی میں اکبر شاہ خود اپنی ایک سگم کی خاطر انھیں حق سلطنت سے محروم کرنے پر تلے ہوئے تھے لیکن قسمت نے ان کا ساتھ نہ چھوڑا اور ایک دن انھیں شاہنشاہ ہند کا با عظمت لقب اختیار کرنے کا موقع مل گیا۔ ملکی واقعات میں سب سے وقیع خدائے شہ کا واقعہ ہے جسے ہندوستان کی آخیا کا پلٹ دی اور ہندوستان کی زمام حکومت خاندان تیموریہ سے لیکر انگریزوں کے سپرد کر دی۔

ہم اس مضمون میں اس آخری تاجدار دہلی کو بہادر شاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ظفر کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ دو مے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ ہمیں ان کی شاعری پر نگاہ تنقید ڈالنا منطوق ہے اس لیے غدر کے اسباب و نتائج پر اسے زنی کرنا ہمارے فرائض سے خارج ہے۔ یوں ہی اس پر آشوب زمانے کے دردناک اور دلشکن واقعات کا دہرانا کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔ بہادر شاہ تو کیا ان کا مقبرہ و خاک باقی نہیں۔ ان کی جگر خراش یا دھچر دل میں کیوں رہے۔ اب جبکہ زمانہ بدل گیا ہے نہ انکی سیاسی کمزوریوں اور لغزشوں کے دکھانے کی ضرورت ہے نہ ان کی بے گناہی ثابت کرنے کی۔ ہمیں تو

ریزہ چین تھے۔ اکبر شاہ جو شاعر تھے لیکن ان کا دربار ہی شعرا و کلام کا مجمع بنا ہوا تھا۔ یہی علمی شغف بہادر شاہ کو گویا بزرگوں کے ترکے میں ملا تھا۔ وہ خود بھی اعلیٰ درجے کے سخن فہم اور سخن سنج تھے اس لیے ان کے زمانہ میں باوجود تنزل پذیر ہونے کے دہلی پر عجیب جو بن تھا۔ یادگار غالب کے دیباچہ میں مولانا حالی بالقاب ہمسی منتظر کی وصف یہی بیان فرماتے ہیں:-

حیرتوں صدی جبری میں جبکہ مسلمانوں کا تنزل درجہ نہایت کم ہو چکا تھا اور ان کی دولت و عزت اور حکومت کے ساتھ علم و فضل اور کمالات بھی رخصت ہو چکے تھے حسن اتفاق سے دار الخلافہ دہلی میں چند اہل کمال ایسے جمع ہو گئے تھے جنکی صحبتیں اور جلسے عہد اکبر شاہ جہانی کی صحبتوں اور جلسوں کو یاد دلاتی تھیں اور جن میں سے بعض کی نسبت مرزا غالب مرحوم فرماتے ہیں:-

ہند را خوش نفسانند خنور کہ بود باد و غلوشان مشکشان از دم شان
موسن و نیز سہبائی و علوی الکا سترلی اشرف آذر و دود و عطشمن شان
اگرچہ جس زمانہ میں کہ پہلی بار اتم کا دتی جانا ہو اس ناغ میں بہت جھڑپ ہو گئی تھی کچھ لوگ دلی سے باہر چلے گئے تھے اور کچھ دنیا سے رخصت ہو چکے تھے مگر جو باقی تھے اور جسکے دیکھنے سے بجو ہمیشہ فرزدیگا وہ بھی ایسے تھے کہ نہ ضرر دلی سے بلکہ ہندوستان کی خاک سے پھر کوئی ویسا اٹھتا نظر نہیں آتا کیونکہ جس سانچے میں وہ ڈھلے تھے وہ سانچا بدل گیا اور جس ہوا میں انھوں نے نشوونما پائی تھی وہ ہوا پلٹ گئی

جن مشاہیر کا ذکر غالب کے فارسی اشعار میں آیا ہے ان کی فہرست میں اور کئی نام ایزا دہونے کے مستحق ہیں مثلاً ذوق اور خود میرزا غالب۔ بہادر شاہ زمانہ ولیمہ ہی سے اپنے علمی ذوق و شوق کے لیے نام پیدا کر چکے تھے۔ چنانچہ بہت سے شعرا خاص ان کے ملازم تھے جن میں دربار شاہی سے تعلق نہ تھا۔ اکبر شاہ کے دربار میں کئی قابل سخن سنج

جو غزل بادشاہ کو پسند ہوتی تھی وہ اُنسے لے لیا کرتے تھے یا یہ کہ بادشاہ اگر کبھی کچھ کہتے بھی تھے تو اسی قدر کہ کسی طرح پر دو ایک مصرعہ کہہ اُتار دے کہ پاس بھیج دیے اور اُنھوں نے اُسے ایک غزل کی صورت میں مکمل کر دیا۔ مولانا حالی مدظلہ نے بھی یادگار غالب میں جہان غالب کے بادشاہ کے

کلام پر اصلاح دینے کا حال لکھا ہے وہاں یہ سطور بھی موجود ہیں :-

ناظر حسین مرزا مرحوم کہتے تھے کہ ایک وزیر اور مرزا صاحب دیوان عام

میں بیٹھے تھے کہ چوبدار آیا اور کہا کہ حضور نے غزلین مانگی ہیں۔ مرزا نے

کہا ذرا اٹھ جاؤ اور اپنے آدمی سے کہا کہ پالکی میں کچھ کاغذ و مال میں بیٹھ

ہوئے رکھے ہیں وہ لے آؤ۔ وہ فوراً لے آیا۔ مرزا نے جو اسکو کھولا تو وہیں

سے آٹھ نوپے جن پر ایک ایک دو دو مصرع لکھا ہوا تھا انکالے اور بوقت

قلم دوات سنگو اکراں مصرعون پر غزلین لکھنی شروع کیں اور وہیں بیٹھے

آٹھ یا نو غزلین تمام و کمال لکھ کر چوبدار کے حوالے کیں۔

لیکن کلیات ظفر کے غایر مطالعہ کے بعد جو رے قائم ہو سکتی ہے

اُسکی بنا پر ہمیں افسوس کے ساتھ ان بزرگوں کے خیال سے اختلاف

کرنا پڑتا ہے۔ اول بات تو دیکھنے کی یہ ہے کہ اس طرح غزلین دوسروں سے

کہلا کر اپنے نام سے مشہور کرنے کی غرض سوائے نام و نمود کے اور کیا

ہو سکتی ہے لیکن ظفر کے لیے ولیمہ دی اور پھر ہندوستان کی شاہنشاہی

کی اضافی صفات ایسی تھیں کہ اُن کی شخصیت کے نمایاں کرنے کے لیے

کافی تھیں۔ خواہی نحوہا ہی شاعر بن بیٹھنے سے اُن کی عزت و شان میں

کیا اضافہ ہو گیا۔ اس کے ماسوا و اسباب خاص ایسے ہیں جو اس امر

کی زور کے ساتھ تردید کرتے ہیں کہ ظفر کی غزلین دوسروں کی کبھی ہوتی ہیں۔

اول یہ کہ آپ ظفر کے چاروں ضخیم دیوان غوث سے دیکھ جائیے لیکن

آپ کو زبان، تخیل، جذبات، طرز بیان، اسلوب عبارت، غرض کسی

اعتبار سے بھی کہیں امتیازی فرق نہ ظاہر ہوگا۔ حالانکہ جب مختلف غزلین

مختلف لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں تو ان کے درمیان کوئی نہ کوئی تفریق کا

صرف یہ دیکھنا ہے کہ حیثیت شاعر کے ظفر کا کیا درجہ تھا۔ اس لیے اس مضمون میں اُنھیں باتوں کا ذکر ہوگا جو کسی نہ کسی پہلو سے اُن کی شاعری سے متعلق ہیں۔

کسی قدر چہان میں سے پتہ چلتا ہے کہ ظفر کی تعلیم کا انتظام بہت

اچھا کیا گیا تھا اور اُنھیں فارسی وغیرہ معقول طور پر سکھائی گئی تھی۔ وہ

اعلیٰ درجہ کے خوشنویس بھی تھے اور علم و فن پر اُنھیں خاص توجہ بھی شاعر

کے ساتھ وہ طبعی مناسبت رکھتے تھے اور غالباً اوایل شباب سے اُنھیں

اسکا چسکا پڑ چکا تھا۔ صحبت بھی اُنھیں نامی گرامی شعرا کی نصیب ہوئی

جن میں ذوق و غالب و شاہ نصیر کے علاوہ حکیم شہناز الدخان فراق،

عبدالرحمن خان احسان، برہان الدین خان زار، حکیم قدرت اللہ قائم

میان شکیبیا شاگرد میر تقی، مرزا عظیم شاگرد سودا، میر قمر الدین منشا،

ان کے صاحبزائے میرمنون دہلوی خصوصیت نام لے جانے کے مستحق ہیں

ظفر آبدین شاہ نصیر کے شاگرد ہوئے اور بقول مولانا آزاد کے

پہلے دیوان کا ایک حصہ اُنھیں کی نظر سے گذرا ہے۔ شاہ نصیر جب

دکن چلے گئے تو صلاح سخن کی عزت میر کاظم حسین بقیار کو ملی اور اُن کی

علحدگی کے بعد یہ خدمت مستقل طور پر حضرت ذوق کے سپرد ہوئی۔ اور

عام طور پر ظفر کی استاد کا سہرا اُنھیں کے سر سجھا جاتا ہے جو سچ بھی ہے

البتہ تذکرہ طور کلیم میں اس امتیاز کا حصہ دار غالب کو بھی بتایا گیا ہے اور

اس بیان کی تصدیق یادگار غالب سے بھی ہوتی ہے کہ شیخ ابراہیم ذوق

کی وفات کے بعد غالب سے مشورہ سخن لیا کرتے تھے۔ لیکن بظاہر حال

یہ سلسلہ تھوڑے دن تک رہا ہے۔

اگر لوگوں کا خیال ہے کہ ظفر بڑا شاعر تھے بلکہ اُن کا جہد کلام

بے وہ ذوق وغیرہ کا کہا ہوا ہے۔ اب حیات میں شیخ ابراہیم ذوق کے

حالات میں جہان کہیں ظفر کا ذکر آیا ہے اُس سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے

بلکہ مولوی محمد حسین آزاد نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ استاد ذوق کی

ملکیت بلا شرکتِ غیر ہے۔

بہر کیف ہم ظفر کو شاعر اور فطرتی شاعر سمجھتے ہیں اور ان کے کلام کی تاثیر اور بھنگی سے ان کے ایک گران پائے سخن گو ہونے کا پتہ چلتا ہے۔
حُسن قبول بھی ایک خدائی عطیہ ہے جو ہر کس ناکس کے حصے میں نہیں آتا لیکن اس اعتبار سے بھی ظفر خوش نصیب ہیں کہ آج بھی ان کی بہت سی

غزلیں اور کثیر التعداد اشعار عام طور پر مشہور ہیں مثلاً

یا مجھے افسر شاہانہ بنایا ہوتا یا مرا تاج گدایا نہ بنایا ہوتا
اپنا دیوانہ بنایا مجھے ہوتا تو ملے کیون خروند بنایا نہ بنایا ہوتا
خاکساری کے لیے گرجہ بنایا تھا مجھے کاش خاک درجانا نہ بنایا ہوتا
نشہ عشق کا اگر طرف دیا تھا بھکو عمر کا تنگ نہ پیا نہ بنایا ہوتا
روز معمورہ دنیا میں خرابی ہے ظفر

ایسی بستی کو تو دیرا نہ بنایا ہوتا

کسی نے اُسکو سمجھایا تو ہوتا کوئی یا ننگ اُسے لایا تو ہوتا
مڑہ رکھتا ہے زخمِ خنجر عشق کبھی لے بوالہوس کھایا تو ہوتا
نہ بھیجا تو نے لکھکر ایک پرچہ ہمارے دل کو پرچایا تو ہوتا
دیا اپنی خودی کو جو ہم نے اٹھا وہ جو پردہ سیاہی میں تھا نہرا
رہے پرے میں اب نہ وہ پردہ نشین کوئی دوسرا اُسکے سوا نہرا
زخمی حال کی جب ہمیں اپنی خبر ہے دیکھتے اور دن کے عیب ہنر

بڑی اپنی بڑائیوں پر جو نظر نہر تو نگاہ میں کوئی بُرا نہرا
ظفر آدمی اُسکو نہ جانے گا وہ ہو کیا ہی صاحبِ فہم و کا

جسے عیش میں یا و خدا نہر ہی جسے طیش میں خود خدا نہرا

ظفر کی غزلیں پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے بھی معلوم ہو جاتا ہے
کہ انہیں مشکل اور طویل ردیف کی طرحوں سے خاص دلچسپی تھی اور یہ
صفت گویا اپنے استاد اولین شاہ نصیر سے مستعار لی تھی۔ لیکن ایک
خصوصیت انہیں ضرور ہے کہ زمین خواہ کیسی ہی ہو، یہ اپنے اندازِ گفتار کو

ہر ماضور تھا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ شاہ نصیر، بقیار، ذوق، اور
غالب جب اپنے لیے لکھیں تو ایک کا رنگ دوسرے سے نہ ملے
اور یہی لوگ جب ظفر کے نام سے کہنے میں تھے تو اس طرح کہیں کہ کوئی تہیاب
نہر جائے۔ اسی خیال کو مد نظر رکھ کر غالباً مولانا آزاد نے یہ لکھ دیا ضروری
سمجھا ہے کہ ذوق کے طرزِ اصلاح میں۔

خوبی یہ تھی کہ شاگرد کا کلام اُسکی حیثیت اور استعداد سے بڑھنے نہ پاتا تھا اور
کیفیت اُسکی مشاعرہ کی غزلوں میں کھلتی تھی۔ مثلاً بادشاہ کی غزل بناتے
تھے، دلی عہد کی غزل بھی بناتے تھے اور جب جدوجہد دیکھو تو صاف معلوم
ہوتا تھا کہ یہ بادشاہ کا کلام ہے یہ ولیعہد کا۔ اور ہر شاگرد کا کلام بعدِ اصلاح
کے اپنے انداز پر تھا۔ ویران اپنی جگہ، داغ اپنی جگہ، اور اپنی غزل دیکھو سب اُس

اس میں شک نہیں کہ قادر الکلام استاد ہونے کی سب سے بڑی علامت
یہی ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کی طبیعت سے پورے طور پر واقف ہو اور
کلام کی اصلاح ہر شاگرد کی قابلیت اور فکر کے اعتبار سے کیجائے لیکن مسلم
غزلوں میں شاعر کا اصلی رنگ ضرور جھلکتا ہے اور ذوق و شاعرانہ نصیر اور
سب سے زیادہ غالب کا انداز تو کبھی چھپا رہ نہیں سکتا۔ غرض کہ ہمارے
قیاس میں کلیاتِ ظفر تمام و کمال ایک ہی شخص کا طبعِ مزاج ہے۔ یہ اور
بات ہے کہ اُسے ظفر کہو یا ذوق یا نصیر لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ اُسے ذوق
نصیر وغالب کا مشترک سرمایہ فکر قرار دیا جائے۔

دوسری بابہ الامتیاز خصوصیت کلامِ ظفر کی سوز و گداز، درد مندی
ناکامی و محرومی کے مضامین اور جذبات ہیں جنکی نظیر ذوق اور شاہ نصیر
کے کلام میں تلاش سے بھی نہیں ملتی۔ بیشک اُردو نالی اور حسرتِ درد
کی تصویریں غالب کے یہاں ہیں اور بکثرت ہیں لیکن ان کا زائد استاد ہی
استد قلیل اور گریز بار ہا ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ظفر کے موقع میں بے رنگ
انہیں کی بدولت ہے اور لامحالہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شعر و سخن کے یہ
لعل بیہا جو کلیاتِ ظفر کے صفحوں پر بکھرے پڑے ہیں بہادر شاہ ظفر کی

ہاتھ سے نہ جانے دیتے۔ اکثر شاہیر شعرا نے نہایت ہی سنگدلانہ زمینوں
میں طبع آزمائی کی ہے لیکن بسا اوقات انھیں بھرتی کے مضامین سے
کام لینا پڑتا ہے لیکن طغفر نے اپنی امتیازی سلاست زبان کے ساتھ
تخیل کی شگفتگی بھی ہمیشہ نظر رکھی ہے اور ایسے اُن کی مشکل سنی کل دیوالی
غزل روائی بیان اور ترتیب خیال کا بہترین نمونہ ہے۔

دہان کی مخلصی لے لے تممت ہو تو کیو نہ کر
کہ میں آلودہ عصیان ہوں حمت ہو تو کیو نہ کر
ہو مکتی ہے چلن کے ہے حرط وہاں
تو کان ہو تو کیو نہ کر مہ قناعت ہو تو کیو نہ کر
کنار آب ہو متاب ہو ساغر ہو مینا ہو
جویر سامان گل ہو پھر تو چہلین ہوں شاہو
پڑا دریا میں عکس چراغان اور دوشوں
کھڑا بالے گل ہو پھر تو چہلین ہوں شاہو
پوچھتے ہو کج اگر ہے کیا اچھے تو ہو
یکو تم تھے کہاں لے نہ لبا اچھے تو ہو
زخم میرے چاہتے ہیں لے طغفر حبیبانگی
میں انھیں کہتا ہوں کہ بتو اور اچھے تو ہو
ابریج کہ ہم ہیں چشم بار پڑا ہے ہوئے
واہ کیا آہو کے سر پر سینگ آڑے ہوئے
سرست دروالم رنج و غم اندوہاں
ساتھ دل کے یکجا میں جمع کیا ڈھانچے ہوئے
ساتھ میرے پلے چلو چپ چپ
راہ میں تم نہ کچھ کو چپ چپ
راہ پہنان فغان سے کھلتا ہے
حضرت دل بس اب ہو چپ چپ
کلام نون کو طرح فرمانے ٹیرے
بوسید سے بھی ہوں تو کوئی جانے ٹیرے
عجب انقلاب آج ہے میکہ میں
کرنیشے ہیں اُٹے تو چہا نے ٹیرے
کہان وہ دور عیش افزا جہان ہم تھے وہاں تم تھے

نرہستے تھے کبھی تنہا جہان ہم تھے وہاں تم تھے
اگر ہم خار تھے تم گل تھے لیکن باغ الفت میں

جدا ہوتے نہ تھے اصلاً جہان ہم تھے وہاں تم تھے
رہائیت کی طہالت پسندی کے ساتھ کہیں کہیں اسکو بالکل اُڑا بھی
دیا ہے اور صرف قافیہ پر قناعت کی ہے۔ ہم اس جگہ چند اشعار
نقل کریں گے، ناظرین ملاحظہ فرمائیں کہ باوجود فارسیت کے قافیہ
کس خوبی سے جمائے ہیں۔

کتب عشق میں ہنگام شروع سبق
پہلے مجموعہ دل کے ہونے یگانہ لے
اپنے پیار کی آئے وہ عیادت کے لیے
جب یہ جانا کہ ہو جان میں تو شاید رمتے
کچھ عوض دل کے دیکھ کر سے تیلے کو
لے لے بر لے یا قلعے بر ستلے
رخ نگون پر ہے اُس گل کے نشے کی نغرا
جلوہ صبح بہار ان وہاں شفق
زبان کے اعتبار سے طغفر تعریف سے مستغنی ہیں۔ یہ ایک مسلمہ امر ہے
اور اس کا مولوی الطاف حسین حالی نے بھی اپنے مقدمہ دیوان میں کہی
جگہ اعتراض کیا ہے کہ موخرین میں جن لوگوں نے زبان کی صفائی کا زیادہ
خیال رکھا ہے انہیں طغفر کا بھی شائبہ ہے۔ اُن کی زبان بغایت فصیح و لہجہ
ہے اور سولے خال خال متروک الفاظ کے جبکہ استعمال تھوٹے عرصہ
پیشتر تک ملی میں ہوتا تھا مجموعی طور پر طغفر کا کلام موجودہ معیار کے
بالکل مطابق ہے۔ خصوصاً بحر خفیف میں تو اُن کے بیان و طرز ادا
کی لطافت کچھ اور ہو جاتی ہے۔

واہ تم سب کو نہ کھلے آئے
دن چڑھتے کمکے دن قسط آئے
آج کیا مجھ پہ مہربانی ہے
بن بلائے جو تم بچلے آئے
کوچا یا رین ہزاروں دل
لے طغفر انون کے تلے آئے

مرے ہی میں ہے پوچھو انجان بن
پہلے کسکے گھر آج مہان بن کے
مسی کل کے کابل لگا کر چلے ہو
کہان تم دھوان دھارا یا جان بن کے
ظفر ہے وہی اپنے نزدیک دانا
ہے ہے جو دنیا میں ناوان بن کے

دل کی مہان سراے خالی ہے
تم اگر آؤ جاے خالی ہے
نالہ وہ ہے کہ جسمیں ہوتا اثر
بے اثر اک مہلے خالی ہے
دین بجز نقد جان تھیں کیا ہم
کیسہ اپنا تو ہاے خالی ہے
بواہوس جانے درو عشق کو کیا
کر رہا ہاے واسے خالی ہے
نہیں تم کو لازم رانی کی باتیں
بھلون کو میں زیبا بھلائی کی باتیں

انسانی خصال کی گونا گونی اور طبائع کی رنگ برنگی کی تصویریں غزل
میں کتنی صحیح اور نچرل کھینچی گئی ہے ۷

ہمین میں رنج بھی ہے اور راحت بھی ہمیں میں ہے

ہنم بھی ہمیں میں اور جنت بھی ہمیں میں ہے

کسی سے دوستی ہم کو کسی سے دشمنی ہم کو

محبت بھی ہمیں میں اور عداوت بھی ہمیں میں ہے

کوہین مشہور ہم حالت کمین بہست لایستل

کہ ہشیاری بھی ہم میں اور غفلت بھی ہمیں میں ہے

کبھی ڈرتے ہیں پشے سے کبھی لوتے ہیں شیرون سے

کبے جرات بھی ہم ہیں اور جرات بھی ہمیں میں ہے

کبھی سرد در گریبان ہیں کبھی دست و گریبان ہیں

تخل بھی ہمیں میں ہے جہالت بھی ہمیں میں ہے

بھڑپن تو سو پہاڑ دن سے دین تو ایک تنکے سے

کبے طاقت بھی ہم ہیں اور طاقت بھی ہمیں میں ہے

نہیں غیر از سلاح و خیر و ان تو اور کچھ ہرگز

ظفر شر بھی ہمیں میں ہے شرارت بھی ہمیں میں ہے

تصوف اور اخلاق کے گرا نایہ نکلتے بھی کثرت سے حل کیے ہیں

اور اس میں شک نہیں کہ اگر اس قسم کے سبق آموز اشعار کا انتخاب کیا جائے

تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو جائے گی ۷

درد و ریشون کا خرقہ چاہیے نہ تاج شادانہ مجھے تو ہوش ہے اتار ہوں نہ تاج و پادانہ

غیر جانچ و دم گزندے کیفیت گلشن میں دیے جاساں پیاں شکن بھر کے پیاد

ندیکھا وہ کہیں جلوہ جو دیکھا خانہ دلین بہت مسجد میں سرا بہت آؤ نہ دھانی خانہ

کچھ الیا ہو کہ جس منزل مقصود کو پہنچون طریق پارسائی ہو سے یا ہواؤ مدانہ

یہ ساری آمد و شد ہے نفس کی آتش پر اسی تک آنا جانا ہے نہ چھڑانا نہ چھڑانا

خواب غفلت تری جوت کھن جائیگی کھ ہے جو کچھ اکھوں کے لگے جلوہ گر چھپ جائیگا

غضب ہے کذل میں تو رکھو کدو نہ کرو سونو پہم سے صفائی کی باتیں
لڑاتے ہو محفل میں غیروں سے آنکھیں صریحاً ہیں یہ تو لڑائی کی باتیں
جو کرتے ہو تم و لڑبائی کا دعویٰ کچھ آتی بھی میں لڑبائی کی باتیں
زبان کے بعد بکلام ظفر کی معنوی خصوصیات پر نگاہ پڑتی ہے تو سو گداز
درد مندی سے وفائی دنیا انقلاب عالم کے مضامین خاص طور سے
کیفیت انگیز اور موثر نظر آتے ہیں۔ دنیا کی نیرنگیوں کا تماشا چونکہ ظفر کے لیے
ایک آپ بیتی جیہتی تھی اس لیے اُس میں صداقت و تاثیر کا ناقابل بیان وصف
موجود ہے۔ حتیٰ کہ ان سے بہتر اور یوں کہہ سکتا تھا ۷
جہان ویرانہ ہے پہلے کبھی آباد گھریاں تھے

شغال اب ہیں جہان رہتے کبھی بستے بشریاں تھے

جہان پھرتے گولے ہیں اُڑاتے خاک صحرا میں

کبھی اُڑتی تھی دولت رقص کرتے سیمبریاں تھے

جہان سنان اب جنگل ہے اور ہے شہر خاموشان

کبھی کیا کیا تھے ہنگامے بیان، اور شور و شریاں تھے

جہان اب خاک پر ہیں نقش پائے آہوئے صحرا

کبھی محو تماشا دیدہ اہل نظریاں تھے

ظفر احوال عالم کا کبھی کچھ ہے کبھی کچھ ہے

کر کیا کیا رنگ اب ہیں اور کیا کیا پیشتریاں تھے

ذیل کی ایک منتخب قطعہ بند غزل کس رنگ کی ہے؟ آخری شعر

قلب پر عجیب کیفیت پیدا کرتا ہے ۷

لے ظفر جو شباب کے دن تھے بس وہی غور و خواب کے دن تھے

دو عشرت تھا اور عہد نشاط جام صہبائے ناب کے دن تھے

تھا کلو او شربوا پر اپنا غسل کہ شراب و کباب کے دن تھے

یہ نہ راتیں تھیں آہ و زاری کی اور نہ یہ پیچ و تاب کے دن تھے

سے پیری میں اس لیے جیتے دیکھنے کچھ عدا ب کے دن تھے

ان کی ایک تمنیں ۵

پے دنیا یوں ہی ایک بک کے بجائے گنئی
مگر اب جی میں ہے چھوٹے سبزہ دلائی
نروم من بجز ان دکاں نہ نلائی

ہنایت مشہور ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ عجیب چیز ہے، درد و تاثیر و صفت
اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اب بھی اکثر مناجات کے طور پر عام طور پر
پڑھی جاتی ہے مختصر یہ ہے کہ جہاں تک شاعری کو تعلق ہے ظفر ایک
خوش نصیب اور کامیاب شخص تھے اُن کی بادشاہی زری لیکن ملک خن
میں اُن کی عظمت مسلم ہے۔ اُن کا آخری دامن اُن کے لیے خوشگوار
نہیں رہا لیکن اُن کے یہی حالات دنیا کو عبرت کا سبق دے رہے ہیں۔
گویا جس طرح اُن کا کلام شاعروں کے لیے چراغ ہدایت ہے اسی طرح
انقلاب عالم کی حقیقت کے تجسمین کے لیے اُن کی ذاتی سرگزشت
بنزلہ ایک آئینے کے ہے۔ بلاشبہ اُن کا ایک ورد از مقام پر گناہی
کی حالت میں جان دینا تعلق پیدا کرتا ہے لیکن اس کی خواہش تو انھیں بھی تھی
شاہوں کے مقبرے الگ دفن کیجیو

ہم بکیوں کو گور غریبان پسند ہے

دوسرے اسکی تلافی اس خیال سے بھی ہو جاتی ہے کہ اُن کے دامن پر
فتنہ غدیر کی شرکت کے الزام کا جو اخلاقی دھبہ تھا وہ اُن کے بعد برطانیہ
کے نصف مزاج اور فراخ حوصلہ افراد کی کوششوں نے یک قلم دھویا
اور اُن کی بے گناہی ثابت کر دی ہے۔ کئی موقر انگریزی مورخوں نے
اُن کے بے قصور ہونے کا اعتراف کیا ہے بلکہ انھوں نے تو اس کے
برخلاف یہاں تک ثابت کر دیا ہے کہ بہادر شاہ نے بہت سے گرفتار
مسیبیت کے ساتھ عملاً ہمدردی بھی دکھائی تھی۔

سید محمد فاروق

اپنی ہمتی پر نہ ہنس انا کہ ہستی ہے فنا
دیکھتے ہنستے ہنستے ہی تھے شر چھپ چکا
زندگی جب تک کوئی عیب دیکھتا ہنر
ورنہ زرخاک بے عیب ہنر چھپ چکا
ہم نے دنیا میں آکے کیا دیکھا
دیکھا جو کچھ سو خواب سادہ دیکھا
ہے تو انسان خاک کا پتلا
لیک پانی کا بلبلا دیکھا

اخلاق و عظمت کے اشعار کا نمونہ حسب ذیل ہے ۵

نام سے کام کھلتا نہیں بے جوہر صل
تل سے عارض کے نہ ہرگز کبھی غن کھلا
دل کو تو گراپنے، دولت و قناعت کی غنی
بس بہت ہوس اتنا دے غافل بٹھا
اُسکو انسان سمجھو کشتی حسین ظفر
خاکساری کے لیے خاک سے انسان بنا
کون تھا بار امانت کا اٹھانے والا
گرچہ دنیا میں ہوتا ظفر انسان پیدا
مفصلہ ذیل اشعار کتنے پرکھتے ہیں ۵

کسی کو ہم نے یان اپنا نہ پایا
جسے پایا اُسے بیگا نہ پایا
کمان دھونڈا حال سے کس نہ پایا
کوئی پر دھونڈا سنے والا نہ پایا
اُسے پانا نہیں آسان کہ ہم نے
نہ جب تک آپ کو کھویا نہ پایا
ظفر دل جاسے یا ہم، کون جانے

کہ پایا اس میں کیا اور کیا نہ پایا

ناتوا دل سے ادھر آٹھون پہر امن ہے
تم نہ بیٹھے امین پڑھیاں اُٹھ رہے
جلو و گرہے تو بے پردہ پائے کیا نظر
جبکہ تم غفلت کی پٹی آنکھ پر بندھے رہو
گلشنِ یان میں جائے قیام لے غافل
غنیہ سان تم دوش پرخت مفرانہ رہو
فردین و فردیاسے جو بس وہ فردین
تم ادب سے ہاتھ پائے ظفر پاندہ رہو

آخری شعر کی طرح اور بھی میسوں مقطع میں حضرت فخر الدین کا ذکر آیا ہے۔
غالباً یہ ظفر کے پیروں کے ظفر کو فقرا سے بدرجہ کمال عقیدت تھی اور غالباً
اسی نے اُن کی طبیعت میں تصوف کا مذاق پیدا کیا اور اُسے بختگی کے درجہ
تک پہنچایا اُن کے کلام میں جہاں کہیں دنیا کا ذکر آیا ہے وہاں یہ
بوسے فقیرانہ رنگ میں نظر آتے ہیں اور کلام میں عجب تاثیر پائی جاتی ہے۔

خلیفہ مامون الرشید کے وقت میں مسلمانوں کی علمی ترقی

تالیفات ہوئیں اور خصوصاً فلسفہ و سائنس میں جو ترقی ہوئی اس کا اثر آج تک باقی ہے۔ مورخ سیدی یوزد فرخ لکھتا ہے:-

خلیفہ مامون رشید عباسی کے زمانے میں ترقی ادب - قیمتی ایجادوں کا وجود اور غرض ہر شعبہ علمی و علمی میں کمال اس بات پر مجبور آ رہا ہے کہ ہم مسلمانوں کو اپنا استاد مانیں۔ ایک لڑکے تو انھوں نے وسط زمانہ کی تاریخ - جغرافیہ سیر و سیاحت اور لوگوں کے حالات سے ہلکے مطلع کیا ہے اور دوسری جانب صنعت و حرفت انجینئری - اور دیگر فنون سے آگاہی بخشی ہے۔

مامونی زمانہ کا عالم ابو موسیٰ جعفر کو فی موجود علم کیمیا (کیمیائی) کا بانی ہے۔ اُس کے بعد اور لوگوں نے بھی اسی علم میں ترقی کی اور موجودہ زمانہ کے علماء اور کس قدر متعجب ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کا دماغ کیسا روشن اور زبردست تھا کہ انھوں نے ایسا علم ایجاد کیا طلب اور جہاد کی کو تو کمال پر پہنچا دیا تھا انھوں نے عالم اندک ایجاد کیا اور ہسپتالوں و دارالخانات کی بنیاد رکھی۔ موجودہ دوشن خانے و دارالخانات اسی نمونے کے ہیں۔ علم نباتات (دوبانی) کی علمی تعلیم کے واسطے بغداد اور اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں وسیع باغات لگائے گئے تھے اور علماء و بان تحقیقات کرتے تھے۔

اُس علمی تحریک کی وجہ سے جو نویں صدی میں علم کو درجہ کمال پہنچانے میں کامیاب ہوئی تھی، مسلمانوں کو سیر و سفر کا شوق ہوا اور انھوں نے جغرافیہ و سیر و سیاحت میں وہ بیش بہا کتابیں تالیف کیں جن پر یورپ باوجود ادما تحقیقات ناز کر رہا ہے۔ ان بزرگوں میں مسلم بن حمار جعفر بن احمد مزوری - ابن فضلان - ابن خرداد بہ - جہانی - مسعودی - الطبری - ابن حنبل - البیرونی - یاقوت حموی - البقری - المقدسی - اور یسعی کے نام بحیثیت جغرافیہ دان مشہور ہیں اور اکثر تصانیف ان کی یورپ کے مطبعوں میں چھپ گئی ہیں۔ بیرونی نے ہندوستان کا سفر کیا اور یہاں رہ کر سنسکرت زبان میں

انصاف سے دیکھا جائے تو آج دنیا میں جس قدر علوم و فنون کی گہما گہما ہے وہ سب مسلمانوں کے طفیل میں ہے۔ انھوں نے اپنے زمانہ میں جہاں اور امور عالیہ کی جانب توجہ کی وہاں علمی اشغال کو بھی لایا۔ تاریخین دیکھ لو کہ وہ سچ موجودہ زمانہ میں علمی دنیا کا سترانہ ہو رہا ہے سب مسلمانوں کا طفیل ہے ابو یوسف و فیروز بنیان - پروفیسر سیدیو - ڈاکٹر زاخو - سی ساسی وغیرہ جیسے بڑے ستارے اس امر کا اعتراف کر چکے ہیں کہ ہم نے جو کچھ جانا اور سیکھا سب مسلمانوں سے ہم پر ہوا صرف یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اسلام کے نامہ خلیفہ مامون الرشید عباسی کے وقت میں مسلمانوں کی علمی ترقی کی کیا حالت تھی اور اس کے پل کر دوسری سرسبز ہونیا منعم و ہارون الرشید وغیرہ نے مدینہ اسلام بغداد میں اگرچہ ہر طوط علمی چشمہ جاری کر دیے تھے لیکن عروج پر پہنچا نا خلیفہ مامون الرشید کا کام تھا ایسے خصوصیت سے یہ تذکرہ نامناسب نہیں ہے۔

لٹریچر کلب (علمی مجلس) خلیفہ مامون رشید کا ایجاد ہے جہاں علماء و فضلا و عوام جمع ہو کر مختلف مذاہب پر بحث کیا کرتے تھے۔ دنیا کے ہر حصہ میں مختلف اقسام کے علمی کلب جو جاری ہیں وہ سب مامونی کلب کے نمونہ پر ہیں۔ اسکے علاوہ کتب فروشی بھی معراج کمال پر تھی اور یہ تاجران کتب محض سوداگر ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ خود صاحب تصانیف بھی تھے۔ ان کے کارخانوں میں طلباء اور علماء کا ہجوم رہتا تھا اور لوگ آزادی کے ساتھ ہر قسم کی بحثوں میں مشغول نظر آتے تھے۔ فن کتابت کو بھی نہایت ترقی تھی یہاں تک کہ بعض کتابیں سودینا تک فروخت ہوتی تھیں۔ مامون رشید کے وقت میں صرف و نحو - علم فصاحت - ادب - جغرافیہ - تاریخ - احادیث وغیرہ پر بشیار

۱۔ مفسرین و مفسرین مندرجہ ذیل کتب سے امداد لی گئی ہے:-

تاریخ اسلام (ڈاکٹر سید امیر علی صاحب) تاریخ الخلفاء (علامہ سید جلال الدین سیوطی) صنایع الطب فی تصانیف العرب (علامہ نوفل آفندی)

بہت بڑا تجربہ پدا کر لیا۔ اسے ایک نیا تیش قیمت کتاب الہند لکھی ہے جس میں ہندوستان کے جغرافی و طبعی حالت کو شرح مفصل بیان کیا۔ اس کتاب کو ہر من مستشرق ڈاکٹر زانوں نے بہت محنت سے تلاش کر کے مفصل حواشی شائع کیا ہے۔

حکیم ناصرخسرو علوی آصفہانی بھی بہت بڑا سیاح ہوا ہے۔ وہ فلسطین میں مروست روانہ ہوا اور شاپور۔ قم۔ تبریز۔ خلعت۔ میافارقین۔ حلب۔ بعلبک۔ ہاشام۔ بونجا۔ اور طائر۔ سیدن۔ بروت۔ بیت المقدس کی گھر کے منہ اور وہاں سے حریم شریفین کی طرف روانہ ہوا اسکا سفر نامہ یہ ہے علامہ بلاذری کی بیش با تصانیف قابل قدر ہیں۔ فتوح البلدان (تاریخ) ایسی تحقیق و کمال کے ساتھ لکھی ہے کہ بے اختیار ول سے تحسین نکلتی ہے اور اسے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب اس فن میں کیا مرتبہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ہمدانی۔ طبری۔ ابن الاطهر۔ مقریزی۔ ابن خلدون۔ ابوالفدا کی تاریخیں بھی اس پایہ کی ہیں۔ شکر ہے کہ انہیں سے بعض کتابیں ہالینڈ کے مشہور مطبع برلین میں طبع بھی ہو گئی ہیں۔

مسنودی، اسلام کا مشہور و زبردست جغرافیہ دان ہے۔ اس کی لاجواب کتاب موج الذہب یا دکار زمانہ ہے۔ دوسری تصنیف، مراۃ الزمان بھی عجیب ہے۔

ابن الاطهر نے تاریخ الکامل ایک بے نظیر و نادر تاریخ لکھی ہے۔ یہ بھی یورپ میں طبع ہو گئی ہے۔

سائنس کی مختلف شاخوں میں بھی اہل عرب نے کمال حاصل کیا۔ مامون رشید کے زمانہ میں سیند بن علی۔ یحییٰ بن ابی منصور۔ خالد بن برمک۔ ایسے فخر روزگار ہندس و ہیئت دان گذرے ہیں کہ ان کا جواب نہیں

۱۱۔ الہند۔ لیوڈکل اینڈ کولڈن کے یہاں سے مل سکتی ہے ۱۲

۱۲۔ حکیم ناصرخسرو کے سفر نامہ کا ترجمہ میں نے شروع کر دیا ہے ۱۳

۱۳۔ یہ دونوں کتابیں ہالینڈ کے مطبع برلین میں چھپ گئی ہیں ۱۴

و شوہر۔ گرہین۔ سیاروں اور اجرام فلکیہ کے متعلق ان کی تحقیقات نہایت بیش قیمت ہیں۔ مامون کے حکم سے محمد بن موسیٰ خوارزمی نے سدھانتا کا عربی ترجمہ کیا۔ یعقوب کندی نے مختلف مضامین (ریاضی۔ اقلیدس۔ فلک۔ فہ۔ کرہ ہوائی۔ مناظر و مایا اور طب) پر قریب دو سو کے تصانیف کیں۔ ابومعشر فانی (موجودہ گھڑی) نے اجرام فلکیہ کی بہت بڑی تاریخ تحقیقات کیں۔ موسیٰ بن شاکر۔ ابوالحسن (موجودہ دوربین)۔ الفطیری۔ محمد بن عیسیٰ۔ ابوعبد اللہ علی بن الجور۔ ابوالحسن علی ابن الجوریہ سب سائنس دان گذرے ہیں۔

آئینہ اشاعت میں ”سلمان اور عم ہیئت“ کے عنوان سے ایک مفصل مضمون لکھا جائے گا جس میں ہر قابل شخص کا تذکرہ ہوگا، ابوالوفا۔ حسین بن سہیم۔ ابن شاطر۔ عم خیام۔ بہت نئے ہنسی ان تھے۔ ان کے بھی اکثر تصانیف یورپ میں چھپ گئے ہیں۔

علم با بعد الطبیعت و فلسفہ میں کندی۔ ابوالنصر فارابی۔ بوعلی سینا بہت مشہور ہیں۔ اہل عرب ابوالنصر کو ارسطو سے ثانی کہتے ہیں۔

فن شعور میں بھی عرب کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ ان کا فصیح و بلیغ کلام آج بھی کیا سے زمانہ ہے۔ ابونواسی، خلیفہ امین کا مشہور شاعر بڑا زبردست ناظم تھا۔ ابوتام حبیب ابونواسی سے دوسرے درجہ پر تھا ابن خلدان کی بابت لکھتا ہے ”الحاکم شگلی کلام۔ خوبی نظم طرز ادا اپنے تمام معصرون بہ سبقت لے گیا تھا“

الہندی۔ متنبہ۔ النعمانی بھی اسی ذیل میں ہیں۔

۱۴۔ عم خیام کی اکثر تصانیف فرانس میں طبع ہوئے ہیں اور اسکی اصل رباعیات میں نے بھی مرتب کیے ہیں ۱۵

۱۵۔ کندی کی دو ایک کتابیں برلین ہالینڈ میں طبع ہو گئی ہیں ۱۶

۱۶۔ ابوالنصر فارابی کی ایک کتاب اور بوعلی سینا کی دو کتابیں ہالینڈ میں طبع ہو گئی ہیں ۱۷

۱۷۔ الہندی کی ایک تصنیف ہالینڈ میں چھپ گئی ہے ۱۸

علامہ ابن الندیم کی کتاب الفہرست ایک عجیب تصنیف ہے جس میں ہر علم کی ہر شان پر بحث ہے۔

ابن خلکان کا قاموس اسماء و صیغ و واقفیت کا دریائے۔

ابوالفتح صفہانی مصنف الاغانی بھی نئے پائے کا شخص ہے کتاب الاغانی میں ان شعرا کا کلام درج ہے جو آگ میں کام آتے ہیں اور ہر شاعر

کی سوانح عمری کے علاوہ اس کے کلام پر پھر نئی و نئی بحث بھی ہے۔ اس مختصر مضمون میں اس قدر گنجائش نہیں کہ ہم مفصل طور پر علمی ترقی کا ذکر کر سکیں۔ جو کچھ لکھا گیا ہے سمجھداروں کے لیے یہ بھی بہت ہے۔

محمد شفیع الدین خان مراد آبادی

نواب سالار جنگ ثالث

سالار جنگ کا خطاب حب الوطنی، وفاداری، دلیری، اور اعلا انتظامی قابلیت کا مراد بن چکا ہے۔ یہ صفات سر سالار جنگ عظیم میں باقی جاتی ہیں۔ ان سے ورثہ میں نواب سالار جنگ ثانی کو ملین اور اب جب کہ ریاست حیدر آباد کا قلمدان وزارت نواب سالار جنگ ثالث کے سپرد ہوا ہے اس بات کی توقع بالکل قرین قیاس ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان عہدہ کے فرائض کی انجام دہی اور ان میں کامیابی کے ہر طرح اہل ثابت کر سکیں گے۔

یہ بات عام طور پر معلوم ہے کہ نواب سالار جنگ کا سلسلہ نسب عرب کے مشہور و معروف بزرگ شیخ اویس قرنی سے ملتا ہے۔ اس نشتہ کی توثیق ذیل کے شجرہ نسب سے ہوتی ہے۔

شیخ اویس قرنی

شیخ محمد علی

شیخ حیدر

شیخ محمد باقر (دیوان)

شیخ محمد تقی

شیخ شمس الدین محمد حیدر (منیر الملک اول، دیوان)

دیوان شیخ صفدر جان فصیح الملک

محمد تقی خان اکرم الملک

حسن رضا خان قسوت اللہ

سر سالار جنگ عظیم نواب میرزا علی محمد خان

نواب میرزا علی محمد خان سالار جنگ ثانی کی بی بی

نواب میرزا یوسف علی خان سالار جنگ ثالث

حضرت اویس قرنی نے اپنے فرزند کے نشتہ اسم سے نشتہ اسم کا نام بجا پور میں سلطان علی عادل شاہ کے دربار میں ہے۔ ان کے بیٹے شیخ محمد علی کی شادی دربار کے ایک منصبدار کی دختر سے ہوئی اور وہ سلطان عادل شاہ کے پرائیویٹ سکرٹری مقرر ہوئے۔ محمد علی کے بیٹے شیخ محمد باقر کے ساتھ چونکہ سلطان سکندر علی شاہ کے وزیر نے بدسلوکی کی تھی ایسے انھوں نے مسلمان مغلیہ سے تعلقات پیدا کیے اور اس زمانہ کی ان پریل گورنمنٹ نے انھیں دکن بھیج دیا۔ اس خاندان کا یہ پہلا شخص تھا جو منصب وزارت پر مامور ہوا۔

شیخ محمد باقر کے پوتے نے ہزار ہائیں نظام صفدر جنگ کی ملازمت اختیار کی جہاں سے انھیں منیر الملک کا خطاب اور بعد میں دیوان کا عہدہ ملا۔ اس کے بعد ان کا بیٹا صفدر خان جو ۱۷۳۲ء میں پیدا ہوا تھا دیوان بنا اور اسے شجاع الملک کا خطاب عطا ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ سالار جنگ کا خطاب اس خاندان کے ارکان کو اس وقت سے حاصل ہوا ہے جبکہ شیخ صفدر خان کی شادی ۱۷۳۲ء میں درگاہ قلی خان سالار جنگ کی دختر سے ہوئی۔ ان کے بعد ان کے تیسرے بیٹے علی زمان حیدر یا رخاں کو دیوان کا عہدہ عطا ہوا۔ انھیں اپنے دادا کا خطاب منیر الملک بھی حاصل تھا جو ان کے بعد ان کے بیٹے کو

۱ الفہرست مصر میں طبع ہو گئی ہے ۱۲

۲ کتاب الاغانی مصر میں طبع ہو گئی ہے ۱۲

ورثہ میں ملاجکی شادی اس زمانہ کے دیوان میر عالم کی دختر سے جو ایران کے ایک معزز خاندان سے تھے ہوئی۔ چنانچہ جب شہداء میں میر عالم نے رحلت کی تو وزارت کا عہدہ منیر الملک ثالث کے سپرد ہوا۔ ان کے بیٹے میر محمد علی خان کی شادی سید کاظم علی خان کی دختر سے جو پشاور کے خاندان سادات میں سے تھے ہوئی اور انھوں نے دوبارہ سالار جنگ کا لقب اختیار کیا جو اس کے بعد پشت در پشت قائم چلا آیا ہے۔ میر محمد علی خان کے گھر میں میر تراب علی خان (سالار جنگ عظم) پیدا ہوئے جنھوں نے نہ صرف اپنے خاندان بلکہ سب سے بڑھ کر لفظ "سالار جنگ" کا نام روشن کیا۔ حقیقت میں دیکھا جائے تو میر محمد علی خان سالار جنگ اول اور میر تراب علی خان سالار جنگ ثانی تھے لیکن چونکہ انھوں نے اپنے عہد میں وہ شہرت اور عروج حاصل کیا جو اس سے پیشتر اس مشہور خاندان کے کسی رکن حاصل نہ ہوا تھا اس لیے عام طور پر انھیں کا نام سالار جنگ اول یا سالار جنگ عظم پڑ گیا۔

اس جگہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس دانا اور نامور مدبر کے واقعات زندگی پر ایک سرسری نظر ڈالی جائے۔ سر سالار جنگ عظم لکھنؤ ہجری مطابق ۱۲۵۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ابھی بچے ہی تھے کہ آپ محرقہ میں مبتلا ہوئے۔ اس موقع پر ان کے دادا منیر الملک ثالث نے جو اس زمانہ میں ریاست حیدر آباد کے وزیر عظم تھے ان پر سے صدقہ اٹا مارا اور دعا کی کہ ان کی تکلیف مجھ میں منتقل ہو جائے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس روز سے ان کا مرض تبدیل ہو کر کم ہونے لگا اور ان کے جد منیر الملک ثالث نے چند ہی یوم بعد رحلت کی۔

منیر الملک کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے سراج الملک اپنے خاندانی اعزاز کے مالک ہوئے۔ یہ سالار جنگ عظم کے حقیقی چچا تھے چونکہ سالار جنگ بچپن ہی میں ایک حد درجہ کے خوفناک مرض میں مبتلا رہ چکے تھے اس لیے ان کی جسمانی حالت کمزور تھی اور اس وجہ سے

۱۳۔ سال کی عمر تک ان کی تعلیم باقاعدہ اور مسلسل طور پر جاری رکھی گئی۔ نواب سراج الملک نے ۱۷۰۱ء میں ۱۲۵۷ء کو انتقال کیا اور اس کے صرف پانچ یوم بعد نواب ناصر الدولہ فریدان رولے دکن نے سالار جنگ کو باوجود ان کی صغر سنی کے عہدہ وزارت پر مامور کیا۔ اس وقت نواب سالار جنگ کی عمر مشکل ۲۳۔ سال کی ہوگی۔

اس صغر سنی میں بچہ کہ تجربہ بہت ہی کم حاصل تھا اتنا وسیع بار کندھوں پر اڑنے سے اگر کوئی شخص ان سے کم ہوتا تو کھٹنے والا ہوتا تو قیاساً مضطرب ہو جاتا لیکن ان کی ہمت، بہت بلند تھی اور عزم استقلال ان کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ جن لوگوں نے ان کے تقرر کی اس خیال سے خامی بھری تھی کہ ان کے زمانہ میں ہنر مانی کا رروایان کر سکیں گے انھیں بہت جلد اپنی غلطی معلوم ہو گئی۔ انھوں نے اپنی زندگی میں جس قدر نمایاں کامیابی حاصل کی اس کا راز ایک انگریزی اخبار نے آشکار کر دیا ہے:-

وہ حد درجہ کے صابر اور مستقل مزاج تھے۔ انتہائی کا در وایوں سے انھیں ہمیشہ سے نفرت تھی۔ جہانگیر ممکن ہو مصلح اور آشتی سے کام لینے کی وہ کوشش کرتے وہ اپنے مخالفوں کو بڑی خوبی سے لاجواب کر دیتے تھے اور انھیں اصلاحات سے بوجہ ان کی جدت کے کسی قسم کی نفرت تھی ۱۲۵۷ء تک جب کہ ہندوستان میں غدر پھیلا ہے وہ لگاتار ایک مناسب سلسلہ کے ساتھ اپنی ریاست میں اصلاحات عمل میں لاتے ہے اور زمانہ غدر میں ہر چند کہ حضور نظام اور سالار جنگ کی جانوں کے لیے حد درجہ کا خطرہ بنایا گیا تھا تاہم آخر دم تک فادار اور مستقل مزاج ہے۔ اس موقع پر نظام دکن نے جو قابل ستائش خدمات انجام دیں انھیں کی بنا پر گورنمنٹ آف انڈیا نے ان کی نسبت "دھارا وفادار معاون" کے الفاظ استعمال کیے تھے۔

ریاست کے باشندوں کو سالار جنگ عظم سے جس قدر عقیدت تھی اس کا اظہار بخوبی طور پر قابل یادگار ہے۔ فروری ۱۲۵۷ء کو ہوا تھا جب کہ سر سالار جنگ نے بیفہ سے انتقال کیا۔ اس دن بقول ایک انگریزی

ہمعصر کے، شہر حیدر آباد مدینہ کا شہر نظر آتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر کس و نا کس پر کوئی ناگمانی اور غیر متوقع آفت نازل ہو گئی ہے۔

سرسالا جنگ عظیم کے دو بیٹے تھے۔ نواب میر لائق علی خان سالار جنگ اور نواب میر سعادت علی خان منیر الملک میر لائق علی خان جو سالار جنگ ثانی کے نام سے مشہور ہوئے پہلے پرائیویٹ طور پر اور بعد میں نظام کلچر میں نجوبی تعلیم حاصل کی اور آخر کار اسی جگہ سے امتحان میٹرک پاس کیا۔ ذہانت اور قابلیت انھیں بہت جلد ہی حد تک اپنے روشن خیالانہ لار جنگ عظیم سے ورثہ میں ملی تھی اور وہ ہر کام کو بڑی محنت اور سہولت سے انجام دیا کرتے تھے۔ ۱۹۲۰ء میں دونوں بھائی انگلستان کی سیر کے لیے تشریف لے گئے جہاں ہزار ایل ہائمنس پرنس لیوپولڈ ہراٹل ہائمنس پرنس آسٹریا مارکوئیس آف ہلسبری، ڈیوک آف سدرلینڈ، لارڈ میرٹن لندن اور ہنسٹا ایڈورڈ وکلاء لکزمبرگ سے جو اس زمانہ میں پرنس و پرنس آف ولز تھے شرف ملاقات حاصل ہوا۔

۱۹۲۱ء میں جب حضور نظام غفران مکان کامل اختیارات کے تھا گدی نشین ہوئے تو نواب سالار جنگ کو وزارت کا خلعت عطا ہوا بعض وجوہ سے جن کے اعادہ کی اس جگہ ضرورت نہیں وہ ۱۹۲۶ء میں اپنے عہدہ سے استعفی ہو گئے اور بغرض سیر و سیاحت انگلستان تشریف لے گئے۔ بہانہ ہر محشینہ مملکت مغظمہ و کثوریہ مرحومہ نے آسبوں میں انھیں کے سی آئی ای کا نشان عطا کیا۔ اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۳۳۵ھ ہجری مطابق ۱۹۱۹ء میں انھوں نے مقام پونا جہاں وہ تفریحاً مقیم تھے بیوقت انتقال کیا۔

جس وقت نواب سالار جنگ ثانی نے رحلت کی ہے تو نواب میر یوسف علی خان بہادر کی عمر جواب سالار جنگ ثالث کے خطاب سے وزارت حیدر آباد کن پرامور کیسے گئے ہیں صرف ۲۲ دن کی تھی کیونکہ ان کا یوم پیدائش ۲۲۔ شوال ۱۳۳۵ھ ہجری مطابق ۱۲ جون ۱۹۱۹ء تھا۔ بچہ جد بزرگوار کی طرح ان کی جسمانی صحت بھی یوم اول سے نازک ہی رہی ہے

یاد شک کہ ابتدائے کمالات تک ان کی صحت کے متعلق سخت فکر لگی رہی تھی لیکن جسمانی تربیت کی طرف پوری توجہ دینے سے اس قدر ہوا ہے کہ گھٹا شکل و صورت میں بدستور دبے پتلے بین باہم ان کی صحت خدا کے فضل سے بہت اچھی حالت میں ہے۔ وہ ایک سے زیادہ باتوں میں اپنے جد نامور سر سالار جنگ سے مشابہت رکھتے ہیں۔ آخر الذکر کی صحت بھی ۲۶ سال کی عمر کے بعد ہی اچھی حالت میں ہوئی تھی بچپن میں انھیں بہت سے حادثات پیش آچکے ہیں لیکن فضل ایزدی کے شامل حال ہونے سے وہ ہر حالت میں محفوظ و مصئون رہے ان کی عمر ابھی صرف پانچ سال کی تھی کہ بانی میں غرق ہونے سے بچے۔ اس کے بعد ۱۳۔ سال کی عمر میں گھوٹے پر سے گرتے اور ان کے بائیں بازو میں سخت چوٹ آئی ۱۶۔ سال کی عمر میں فٹ بال کھیلے ہوئے دائیں بازو کی ہڈی پر چوٹ آئی۔ اس کے دو ہی سال بعد پولو کے میدان میں ان کا گھوڑا ان پر لڑھک پڑا اور اگر اتفاق سے وہ نشیب زمین پر نہ گرتے تو شاید خدائے مہمکت جہنم لگتین۔ شروع ہی سے اس بات کا بڑی سختی سے خیال رکھا گیا تھا کہ ان کے ساتھ بٹھنے اٹھنے والے صرف اعلیٰ سوسائٹی اور ارفع خیالات کے لوگ ہوں اور اسی وجہ سے ان کی طبیعت میں وہ تمام محاسن اور خوبیاں پائی جاتی ہیں جن کا کوئی شخص ایک ایسے نامور خاندان کے رکن میں متوقع ہو سکتا ہے۔

چھوٹی ہی عمر میں انھیں مدرسہ عالیہ میں داخل کر دیا گیا اور حضور نظام غفران مکان نے ان کی پرائیویٹ تربیت کے لیے بھی قابل اتنا مقرر کر دیے۔ جب انھوں نے ہائی اسکول میں اپنی تعلیم ختم کر لی تو ہائمنس نے اس دور اندیشی سے کام لیکر جہان کا خاصہ تھایہ انتظام فرمایا کہ ان کی تعلیم خاص خاص لائینوں پر ہو۔ چنانچہ انھیں تاریخ، سیاست، فن، قانون، اور السنہ انگریزی کی تعلیم دی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی فارسی کی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رہا حتیٰ کہ آخر کار وہ اعلیٰ ترین انگریزی

پولو، اور نیزہ بازی کا شوق ہے۔ مصوری اور فنون لطیفہ سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں۔

سنہ ۱۹ء میں نواب سالار جنگ نے مالی اور عدالتی کاموں کی تعلیم حاصل کرنی شروع کی اور بہت جلد ہمارے نامہ جملہ کی، ۱۷ء، جادی الاول ۱۲۸۳ھ ہجری (۱۸۶۶ء) مطابق ۱۲۸۳ھ کو حضور نظام آن جہانی نے انھیں خطابات خان بہادر و سالار جنگ سے ممتاز فرمایا تھا۔ اب سات آٹھ ماہ کا عرصہ گزر رہا ہے کہ ان کی جاگیرات پر سے سرکاری نگرانی ہٹا لی گئی اور وہ اپنے علاقہ کا انتظام خود ہی کرتے ہیں۔

نواب سالار جنگ کی جاگیرات بہت بڑی یعنی پد کوٹیا کوچین سے بھی وسیع ہیں۔ وہ چھ تعلقات پر مشتمل ہیں اور ان کا مجموعی رقبہ ایک ہزار چار سو اسی میل مربع ہے اور سالانہ آمدنی کم و بیش ۱۰ لاکھ خیال کی جاتی ہے۔ ان جاگیرات کی مردم شماری ۲ لاکھ ہے اور انہیں بہت تاریخی دلچسپی کے مقامات مثلاً قلعہ کوسلی اور گوپال اور مشہور و معروف غار ہائے اجناد واقع ہیں۔

یہ بات قبل ادین بیان کی جا چکی ہے کہ وزارت حیدر آباد اس خاندان کا خاصہ اور حق ہے۔ لیکن اس بارے میں مسٹر راجا رام نے رسالہ ”انڈین ریویو“ میں ایک دلچسپ پوائنٹ کی طرف ناظرین کی توجہ منطقت کرائی ہے کہ

یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس خاندان میں ۱۷۲۲ء تا ۱۸۲۱ء اور ۱۸۲۳ء سال کی عمر میں منصب وزارت پر مامور ہوا۔

نواب موصوف کی روشن خیالی اور عملی قابلیتوں کے ثبوت ابتدائی سے ملتے ہیں وہ ملکی اور قومی تحریکوں میں اچھی طرح دلچسپی لیتے ہیں اور پچھلے دنوں مسلم یونیورسٹی فنڈ کو ایک لاکھ کی گران قدر رقم عطا فرما کر اس کی ایک روشن مثال قائم کر چکے ہیں۔

نواب سالار جنگ ثالث ایک فخر و زکا خاندان کے نامور رکن ہیں

سو سائینی میں حصہ لینے کے قابل ہو گئے۔ اسکول میں وہ بڑے ہونہار طالب علم سمجھے جاتے تھے اور اسکول کے پرنسپل مسٹر اسٹین نے خیال ظاہر کیا تھا کہ اگر ان کی صحت اچھی حالت میں رہے تو وہ ۱۹ سال کی عمر میں ڈگری حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک موقع پر مسٹر اسٹین نے جو نظام کالج کے پرنسپل تھے ان کی نسبت فرمایا تھا کہ

مدرسہ کے لڑکوں کے لیے جو عربی ضروری ہیں مثلاً باقاعدہ حاضری اپنے کا پر توجہ استادوں، اور اپنے ہم سبق طلبہ کے ساتھ متواضعانہ برتاؤ ان سب باتوں میں وہ دوسرے طلبہ کے لیے ایک بیش بہا نمونہ تھے۔ اس کی تقلید دوسرے لڑکوں نے کی مگر وہ اس میں ۶۷ برس برآں ہو سکے۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں انھیں ایک ”مچو تھی“ سے جتنی جماعت میں کر دیا گیا اور گو اکثر حالتوں میں ایسے موقعوں پر طلبہ اپنے آپ کو اس قسم کی غیر معمولی ترقی کے ناقابل ثابت کرتے ہیں تاہم انھوں نے بہت جلد اپنے آپ کو ہنرمندوں میں نمبر اول پر ثابت کر دکھایا۔ صاحب پرنسپل انھیں غیر معمولی طور پر ذہین طالب علم سمجھتے ہیں اور ان کا خیال تھا کہ وہ ملک کے بہترین طلبہ میں شمار ہو سکتے ہیں۔ وہ استقلال اور استعداد جوان کے جد بزرگوار کی خصوصیت تھی ان کے اندر زمانہ طالب علمی ہی میں نمایاں تھی۔

نواب سالار جنگ ثالث کے اخلاق و اطوار ہر پہلو سے حمیدہ و پسندیدہ اور ہر طبقہ میں مقبول اور طائیت بخش پائے جاتے ہیں جنھوں نے نظام خلد اللہ علیہ السلام کی سالگرہ مبارک کی تقریب میں ایوان شاہی میں پچھلے دنوں جو ڈرتھا اس موقع پر کرنل جنھے دررینڈ سے نواب سالار جنگ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ”بے داغ چال چلن“ کے الفاظ خصوصیت سے استعمال کیے تھے۔ ۱۰ سال ہی کی عمر میں ان کے اطوار ایک مسلمہ جنٹلمین کے سے ہو ا کرتے تھے۔

پڑا یوٹ زندگی میں نواب موصوف فطرتاً شرمیلے اور اطوار میں مجید سا دل پسند میں ورزشی کھیلوں میں انھیں کرکٹ، فٹ بال، ٹینس

ان میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو کسی اعلیٰ درجہ کے منتظم اور مدبر
میں پائی جاسکتی ہیں۔ اس حالت میں یہ توقع کسی طرح پر خالی از مہلک
یا بعید از قیاس نہیں سمجھی جاسکتی کہ وہ اپنے غرض زمان بزرگوں کے
میں پائی جاسکتی ہیں۔ اس حالت میں یہ توقع کسی طرح پر خالی از مہلک

حفظ صحت اور علاج

اپنی زندگی میں انسان میں اچھی اور نہایت قیمتی شے کی خواہش
کر سکتا ہے و بصحت ہے۔ ممکن ہے کہ ایک شخص کے پاس قانون کے
برابر دولت ہو۔ صطیل میں شیار گھوڑے اور گاڑیاں ہوں۔ اچھا کھانا
کھائے کو ملتا ہو اور نرم گدون پر سوتا ہو۔ لیکن اگر اسے صحت حاصل نہیں
تو یہ سب چیزیں بیچ دین۔ باوجود ان تمام اور اس قسم کی اور سدا
آسائشوں کے وہ رات کو اچھی طرح سو نہیں سکتا۔ بجا لیکہ اس کے
مقابلہ میں ایک غریب مزدور جو روز کھاتا اور کھالیتا ہے وہ مزے کی
نہیں سوتا اور اپنے کنبہ میں خوش رہتا ہے۔ چونکہ اسکی جسمانی صحت
اچھی ہے اس لیے لیتے ہی نیند خود بخود اسکی آنکھوں میں آتی ہے۔
اگلے روز جب وہ صبح کو بیدار ہوتا ہے تو نیند کی بدولت تازہ دم ہو چکا
ہے اور خوشی خوشی اپنے دن بھر کے کام میں مصروف ہو جاتا ہے۔ بناؤ
ان دونوں میں حقیقی راحت کسے حاصل ہے؟ میرا خیال ہے کہ وہ نیند
کا بس چلے تو وہ اپنی دولت کا کچھ حصہ دیکر غریب مزدور سے اسکی صحت
کا کچھ حصہ لینے میں ہرگز دریغ نہ کریگا بلکہ اپنے نفع کا سودا سمجھے گا۔ لیکن ایسا
ہونا بعید از امکان ہے۔ تم کہہ سکتے ہو کہ دولت مند اس غریب کی سادہ اور
ناکافی غذا کھانا گوارا کرے گا جسے وہ دیکھنا تاک نہیں چاہتا یا اس کے
برابر پیدل چلنا یا کام کرنا پسند کرے گا؟ ہرگز نہیں! اس صورت میں غریب
آدمی کا اسے یہ جواب دینا بالکل بنا برافضان ہے کہ صاحب تمھارا
میری حالت پر رشک کرنا فضول ہے جب تک تم عیش و عشرت اور
کامیابی کی زندگی بسر کرتے رہو گے صحت کا دروازہ تم پر بند رہے گا۔ رات
کے وقت تم اپنے بستر پر بے خوابی کے عالم میں لیٹا کر گئے اور صبح کے وقت

جب بیدار ہو گے تو طبیعت خوش ہونے کے بجائے کسلند ہوگی،
صحت قدرت کا انعام ہے۔ مول نہیں کہتی اور نہ مانگے سے لیتی ہے
تم اسے قائم رکھنا اور اس میں اصلاح پیدا کرنا چاہو تو صرف تھوڑی سی
سمجھ اور دراندیشی کی ضرورت ہے۔ تو ان میں قدرت کی پابندی کرو تو
وہ بھی ضرور تمھاری مدد کریگی۔ لیکن اگر تم اس کے قاعدہ سے ذرا بھی انحراف
کرو تو وہ تمھیں صحت کے بجائے بیماری دیگی بلکہ ممکن ہے کہ تمھاری موت
قبل از وقت ہو۔ قدرت کا قانون اٹل ہے۔ زمانے گزر جائیں سلطانوں
میں انقلاب آجائے، تو میں پلٹ جائیں، مگر اس کے قاعدوں میں
فرق نہیں آتا۔ جن لوگوں کے دماغ میں فتور آ جاتا ہے یا جن کی
ذہنی حالت کمزور ہوتی ہے لوگ انھیں پاگل کہنے لگتے ہیں۔ بیوقوف
لوگ! انھیں تو وہ پاگل کہتے ہیں مگر ان کو نہیں کہتے جو خود تو ان میں قدرت
کے انحراف سے بیماری اور موت مول لیتے ہیں۔ اگر تم دماغی فتور
والے شخص کو پاگل اور دیوانہ کہتے ہو تو اس سے کیوں ہمدردی اور
رحم کا اظہار کرتے ہو جسے اپنے ہاتھوں بیماری سہیڑ کر ڈال کر یا طبیب
کی تلماش شروع کی ہے۔ مغرور انسان! جسے اپنی تہذیب اور تمدن
پر اس قدر گھمنڈ ہے کس لیے اپنے بناؤ سنگھارا اور اچھی اور خوشنما پوشش
پر اس قدر توجہ دیتا اور اس قدر وقت صرف کرتا ہے جب کہ وہ ان بیماریاں
سامان کو جو قدرت نے اس کے جسم میں غلاطت اور کثافت کے
نکاس کے لیے دیا کر کے میں صاف نہیں رکھتا! کس لیے وہ چٹپٹے
اور لذیذ کھانوں کی دھن میں چپورا بنا پڑتا ہے جب کہ اس کے جسم
کو اچھی حالت میں رکھنے کے لیے صرف تھوڑی سی سادی غذا درکار ہے

وچیزوں میں جا کر دیکھنا کہ کیا ہے۔ وہاں ہے رات نصیب نہیں ہو سکتی وہ بچہ اسپہ گادی میں بیٹھ کر خوشنظران کی سیر دیکھنے جاتا ہے اس سے اسے آرام مہیا نہیں ہو سکتا!

قوانین قدرت کی پابندی سے صحت کو برقرار رکھنے کے علم کو ہاؤمین (حفظ صحت) کہتے ہیں مختصر طور پر ہم اسے ایک ایسا سائنس قرار دے سکتے ہیں جو ہمیں قاری صحت اور دفعہ امراض کا راستہ دکھاتا ہے۔

ہمیں اس جگہ یہ دیکھنا ہے کہ علم حفظ صحت کا علاج سے کیا تعلق ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ حفاظت کے اصول ہی علاج کی زمین نظر آتے ہیں۔ تو مریض کے پریٹ میں پابند ہوتی دوائیں ٹھونڈی اگر اصول حفظ صحت پر توجہ نہ دو گے تو مریض کی صحت سے اور شفا پانی سے ہاتھ دھو رکھوئی احتیقت حفظ صحت کے مقابل میں علاج کی کچھ

بھی حقیقت نہیں ہے۔ مزایہ ہے کہ حفظ صحت کے اصول اور اس کے لوازم بالکل سادہ اور آسان ہیں۔ اس کے واسطے جن میں چیزوں کی ضرورت ہے وہ صاف ہوا، صاف پانی، اور کافی روشنی میں اگر چیزیں میا ہیں تو اول تو مرض نمودار ہی نہ ہوگا اور جو ہوگا بھی تو آسانی سے دور کیا جاسکے گا۔ ایک وقت تھا جب ہر ایک مرض کے لیے لوگ

فصد لیا کرتے تھے۔ ہی طرح اب لوگ اطباء کے پاس اس غرض سے دوڑ جاتے ہیں کہ ان سے کھانے کی کوئی دوا لے آئیں۔ فصد لینے کے پڑانے طریقہ میں مریض کو اخراج خون اور بیماری دونوں کی رحمت گوارا کرنی پڑتی تھی۔ اگر مریض بچ جاتا تو جرح کو نہایت قابل اور اس پر

نصو کیا جاتا تھا۔ اگر مر جاتا تو اسے خدا کی مرضی پر محمول کیا جاتا۔ یہی بات زمانہ موجودہ کے طریق علاج پر بھی صادق آتی ہے۔ مریض کو مرض کی تکلیف، اور دوا پینے کی دقت دونوں باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں۔ طبیب کا کام اسی قدر ہے بچ گیا تو مریض کی خوش نصیبی اور مر گیا تو طبیب کی ہلاکت۔

لوگوں میں ایک عام اعتقاد یہ بھی پھیلا ہوا ہے کہ ہر مرض کا علاج صحت دوا ہی سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو معلوم ہوگا کہ کثیر القعد و جانوں میں ایسا نہیں ہوتا۔ اب سے چند صدی پہلے شتر لوگ نشتر پرانا ہی اعتقاد رکھتے تھے جتنا آجکل دوا پر رکھتے ہیں۔ امریکہ کے بہت سے بڑے بڑے ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ مہذب ممالک میں دوا کے استعمال کا جو رواج پایا جاتا ہے وہ حقیقت نشتر کے استعمال کا نعم البدل ہے لیکن ان کے نقطہ خیال سے یہ بدل کچھ اچھا نہیں۔ اگر قیمتی اور عمدہ دوائیں ہی انسان کو بچا سکیں تو امیرون میں کبھی موت ہی واقع نہ ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ جسے اصول حفظ صحت کی پابندی نہ کی اسے اگر قیمتی سے قیمتی دوائیں بھی کھائیں تو بے سود۔ اگر اسے تیل از وقت موت حاصل نہ کی تو یقیناً ہر کچھ حکایت تو ضرور اٹھائی ہوگی۔

بہت سے لوگ یہ دیکھ کر حیران ہوا کرتے ہیں کہ ایک شخص کی صحت اور طاقت دوسرے سے اچھی کیوں ہے! اس کا جواب سادہ ہے۔ صحت اس لیے کہ ان میں سے ایک تو قوانین قدرت کا پابند ہے دوسرا نہیں مہذب اور ترقی یافتہ ملکوں میں آجکل ڈاکٹر و ایض کو فوراً ہی دوا دینا شروع نہیں کرتے بلکہ کافی غور و پرداخت کے بعد قدرت کو مدد دیکر مرض کے بواعث کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان ڈاکٹروں کی دوائیں صاف ہوا، صاف پانی، اور روشنی، ایسے ہی تین چیزیں ہیں۔ دوا کے استعمال سے انسان کو صحت حاصل بھی ہو جائے تو وہ مکمل صحت نہیں کما سکتی۔ ایک نہ ہو کہ دور کرنے کے لیے دوسرا ہر جسم میں داخل کیا جاتا ہے تو ممکن ہے کہ اس زہر کا اثر بعد میں اور بھی خراب ثابت ہو۔

بچان اس کے علم حفظ صحت کی رو سے جس مرض کا علاج ہو اسے

Joy and Temperance and Repose,

تاریخ پر ثبت ہے۔ پس ہمیں سب سے اول اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ گھرون میں پاک و صاف ہوا کی بخوبی آمد و رفت ہو۔

(۲) پاک و صاف پانی بہت سے امراض پانی کے راستہ جسم میں داخل ہوتے ہیں جن میں سے قابل ذکر یہ ہیں تپ نوبتی، طحال اسہال، پیچیش، قبض، وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ مہینہ، تپ محرقہ، جیچک وغیرہ متعدی امراض بھی پانی ہی کے ذریعہ سے پھیلتے ہیں

بہت سے لوگ ان تالابوں سے جن میں آدمی نہانے کے پڑے دھوئے یا موشی پانی پیتے ہیں یا لے کر کنوؤں سے جن میں بچوں کا گند پانی ملتا رہتا ہے پانی پینے پر مجبور ہوتے ہیں، اس حالت میں انہیں لازم ہے کہ پانی کو جوش دیکر اور پھر سرد کر کے پئیں۔ جوش دینے سے نہ صرف بہت سی کثافتیں دور ہو جائیں گی بلکہ جو باقی بچ رہیں گی وہ بھی تپ پر بیٹھ جائیں گی۔

(۳) روشنی جو شخص تاریکی میں سنے کا عادی ہو وہ یقیناً امراض کا شکار ہوتا رہے گا۔ ضروری ہے کہ دن میں کم از کم ایک گھنٹہ دن کو دھوپ میں کھلا رکھا جائے اس سے یہ مطلب نہیں کہ انسان چلچلاتی دھوپ میں چل کر لو لگنے سے بیمار ہو جائے بلکہ مابعد صرف یہ ہے کہ بدن کو روشنی میں لایا جائے۔

تمام جسم کو براہ راست گرمی لگنے سے بچانا نہایت ضروری ہے۔ ممکن ہے اس سے بخار یا دم گھٹنے کی حالت پیدا ہو جائے تیز دھوپ میں چلتے وقت سر کو لگی ٹوپی یا پٹری سے محفوظ رکھنا ضروری ہے کہ بدن کے اندر فلائین کا کرتا اور سایہ کے لیے چھانہ ہاتھ میں رکھا جائے۔

(۴) مسکات، الکحل، تباکو، اور افیون نے بہت سے لوگوں کو صحت سے محروم کر دیا ہے۔ سیکڑوں ان چیزوں کی بدولت طاقت اور ہوش و حواس کھو بیٹھے ہیں۔ ان سب چیزوں سے حتی الامکان احتراز ہی واجب ہے۔

Slain the door on the doctor's nose.

مطلب یہ کہ راحت، اعتدال اور آرام یہ چیزیں ڈاکٹر کے لیے دروازہ بند کر دیتی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ مرض کیا ہے اور اسے کیونکر دور کیا جاسکتا ہے؟ ڈاکٹر جیمز ولسن نے لکھا ہے:۔

بیماری وہ سزا ہے جو قدرت ہمیں غلات و رزی قانون کے لیے دیتی ہے اس سزا پانی کے معاملہ میں کوئی شخص اس عذر پر بچ نہیں سکتا کہ وہ اس

قانون سے واقف نہ تھا

ہر ایک کا شکار جانتا ہے کہ کھیتوں کی کاشت کے لیے کونسا موسم موزوں ہے؟ وہ خوب اچھی طرح سمجھتا ہے کہ کب مجھے قلبہ رانی کرنا کھانا ڈالنا اور بیج بونا چاہیے۔ اس پر بھی اگر وہ وقت پر فصل کو پانی سے سیرجے یا دوسرے طریقوں پر اس کی حفاظت نہ کرے تو یقیناً فصل باری جائیگی۔ یہی حال انسانی جسم کی کاؤن کا ہے۔ وہ جو قوت ہے جو نہیں جانتا کہ اسے صاف ہوا میں سانس لینا، صاف پانی پینا، اور اچھا قابل ہضم کھانا کھانا چاہیے۔ انسان کو سردی اور گرمی سے بچنا اور امراض کے باعث کو دور کرنا لازم ہے۔

ڈاکٹر ولسن کا یہ بھی بیان ہے کہ قریب قریب ان تمام امراض کو جو انسانی زندگی کا سلسلہ منقطع کرتے ہیں یا اسے کم کرتے ہیں کھانے کی نالی سے تعلق ہوتا ہے اس نالی ہی کی صفائی کے ذریعہ سے امراض کو دور کر کے مریض کو شفا یاب، اور راحت اور طویل العمری کو بحال کیا جاسکتا ہے اس قدر تمہید کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اصول خفا صحت بیان کیے جائیں اور بتایا جائے کہ امراض کو کیونکر دور کیا اور صحت کو برقرار رکھا جاسکتا ہے؟

(۱) خاص ہوا کی ضرورت کثیف ہوا کے نقصانات بشمار ہیں اور اس سے صد ہا بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ کلکتہ کا سانحہ کلبہ تاریک رات

(۵) غذا | غذا بہا تک ممکن ہو سادہ ہونی چاہیے۔ ہندوستان ایسے روحانیت کے ملک میں سبزی خوری ہی بہترین غذا سمجھی جاسکتی ہے ایک ہی وقت میں بہت سا کھانا ٹھیک نہیں نہ کہ بہت سی چیزوں کو ملا کر پکایا جائے۔ غذا جس قدر سادہ ہوگی اسی قدر جلد ہضم ہو سکے گی۔ جلد جلد کھانا کھانے کی عادت نہ ڈالو بلکہ خوب اچھی طرح چبا چبا کر کھاؤ۔

(۶) غسل | روزمرہ کا غسل سب سے بہتر چیز ہے۔ اس سے نہ صرف بدن کا سیل دور ہو کر مسامات صاف ہوتے ہیں بلکہ جسم میں طاقت اور توانائی آتی ہے اور نظام جسمانی موسم کے اثرات بد سے محفوظ رہتا ہے پانی کا گرم شیر گرم یا سرد نہ پینا نہ والے کے مزاج پر موقوف ہے۔

(۷) پوشش | کپڑے صاف اور سادہ ہوں۔ ہندوستانی لباس پہانے بالکل موافق ہے۔ کپڑوں میں فلائین بہت اچھی چیز ہے۔

(۸) ورزش | برواری صحت کے لیے مناسب ورزش کرنا بھی ضروری ہے۔ جو لوگ باقاعدہ ورزش کرتے ہیں ان کی صحت سب سے اچھی رہتی ہے۔ معدہ کی باقاعدگی، دوران خون، جگر کی کارکردگی ان سب باتوں کا دار و مدار ورزش پر ہے۔ پیدل چلنا، زین سواری، پیرا کیٹس، کرکٹ کھیلنا، بائسکل کی سواری، یہ سب ورزش میں داخل ہیں۔ خواہ کسی قسم کی ورزش کی جائے وہ اپنی حد سے زیادہ فائدہ دے گی کیونکہ مکان پیدا کرنی والی ورزش بجائے فائدہ دینے کے مضرات ہوتی ہے۔

(۹) رہائشی مکان | مکانات کی کبھی آس پاس کی زمین سے چند فٹ اونچی ہونی چاہیے تاکہ مکان زمین کی نمی سے محفوظ رہیں اور ان میں

سانپ وغیرہ نہ رہیں جانور داخل نہ ہو سکیں۔ مکان کے کمرے بڑے اور کھلے ہونے چاہئیں دیواریں ۱۲- یا ۱۵- فٹ بلند ہوں اور کھڑکیاں اور دروازے بکثرت رکھے جائیں۔ صحت اسی حالت میں ہوا کی آمد و رفت اچھی طرح قائم رہ سکے گی۔ کمرون کو باقاعدگی سے دھوتے اور صاف کرتے رہنا چاہیے اور کوڑے کرکٹ کو تالاب یا کنوئین میں ڈالنے کے بجائے ایک جگہ جمع کر کے جلا دینا چاہیے۔ شاگرد پیشہ اور پانخانے مکان سے فاصلہ پر ہوں اور ان کو وقتاً فوقتاً جراثیم کش ادویہ سے صاف کرتے رہنا چاہیے۔

(۱۰) جذبات پر قابو پانا | تمام خواہشات اور جذبات میں اعتدال کو مد نظر رکھنا نہایت ضروری ہے۔ اسی طرح کھانے پینے، کاروبار یا خوشی میں، حد سے زیادہ جوش میں آنا بھی صحت کے لیے نہایت ضرور سان ہے۔

اخیر میں یہ جملہ ماضوری معلوم ہوتا ہے کہ میرا متناہر گزیہ نہیں کہ دوا کا استعمال بالکل ترک کر دیا جائے یا یہ کہ دواؤں میں مطلق کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوتا۔ فی الحقیقت دوسرے تمام علوم کی طرح علم الادویہ میں بھی ترقی ہوتی ہے اور فن جراحی کی بدولت حیرت خیز معجزات ظہور میں آ رہے ہیں لیکن اس میں شک نہیں کہ قوانین متذکرہ بالا کی پابندی استعمال ادویہ سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ اس بارے میں شخص مجھ سے متفق الراء ہو گا کہ دوا کے بغیر علاج کرنا استعمال ادویہ سے بدرجہا بہتر ہے اور جو بات خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ جن قواعد کی پابندی درکار ہے وہ نہایت سادہ عام فہم اور سہل ہیں۔

تیرتھ رام

منرو اپلشنگ کمپنی الہ آباد

کی معرفت ہر قسم کی کتب، اشاعت کا انتظام نہایت عمدگی سے ہو سکتا ہے۔ رنگین اور ہانٹون ہلاک بھی بہم پہنچائے جاتے ہیں۔ ہر کام میں خوش سلیقگی کا خاص لحاظ رکھا جاتا ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ صاحبان فرمائش کو کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ ملے۔ آزما کر دیکھیے!۔

رازداری

ادنی اور بے وقار آدمی ٹھہرا اور کوئی شخص فیما بین یہ پسند نہیں کرتا کہ اُسکی وقت ایک دنی اور کم ظرف آدمی کی سی ہو۔

اسکے برخلاف بعض آدمیوں میں خواہ مخواہ ہر بات کے چھپانکی عادت ہوتی ہے۔ اس سے بحث نہیں کہ وہ بات کس پایہ و کس وقعت کی ہو وہ اُسے چھپانے چاہئے۔ ہر موقع پر اور ہر وقت وہ رازداری کی سخت فہماری سر پہنے رہتے ہیں اس کی عادت کی نسبت ملائم سے ملائم الفاظ میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ وہ بے ضرورت ہر اکثر عادت طبعی شریعت میں اور بزدلی سے چڑھتی ہے۔ عادت اکثر ان لوگوں میں بھی پائی گئی ہے جنکے امر و خاص طور سے ننگی واقعہ میں ہیں۔ کبھی کبھی ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ جب کسی راز کیا بار بے ضرورت اور کثرت فاش ہو گئے اور ہر فشا سے اُسے دلی رنج ہو چکا تو یہ بے ضرورت رازداری اُسکی عادت ہو گئی۔ یا یہ کہ احتیاطاً اس بے ضرورت رازداری کا اُسے خود کو عادی بنالیا خواہ اس عادت کی کچھ ہی وجہ کیوں نہ ہو۔ یہ بات خود ایک تکلیف دہ کمزوری ہے۔

جسطح بعض لوگ چلا کی اور ہوشیاری کو ایک خاص طرح کی طاقت سمجھتے ہیں اسطرح ایسے لوگ اس قسم کی رازداری کو انانی خیال کرتے ہیں۔ یہ ضرور سچ ہے کہ جس آدمی کو تیز نہ ہو کس قسم کے سرکار کا کن شخص خاص کو اور کیسے موقع پر راز دار بنانا چاہئے اُسکے لیے یہی مناسب اور بہتر ہے کہ وہ بالکل ہی خاموش رہے یہی اُسکے لیے سب سے اچھی تدبیر ہے اور اُسے واجب ہے کہ اپنے طرز عمل کو کسی حال میں بدلنے نہ دے۔ ہاں اسے دانائی بھی نہ سمجھے۔ یہ ایک فائدہ مند احتیاط ہے و دانائی نہیں ہے کسی طبیعت میں صاف گوئی کم سخن اور تنجید کی کی وہ ترکیب واقعی قابل تحسین ہے کہ کوشش سے اپنا وہ خاموشی کے چرختے سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک قدرتی بات ہے اور اسے حاصل کرنے کی سعی بے سود ہے۔ جو آدمی فطرتاً معاملات کے سیدھے سادے طریقہ پر گزرنے اور دھڑکنے جذبات اور احساسات کا پورا پورا لحاظ رکھنے کے عادی ہوتے ہیں انھیں کے طبائع میں

وضوح ہو کہ جب کیا کوئی بات تم سے راز کے طور پر کہہ گئی تو ہر طرح سے اسکا مخفی رکھنا تمہارا فرض ہے۔ جو راز کسی نے تم کو اپنا دوست سمجھ کر کہا ہو وہ اس اعتبار پر کہا ہو کہ تم اُسے عام نہ ہونے دو گے۔ بہت سی باتیں جو تمہارا دوست کسی خاص تکلیف یا غصہ کی حالت میں یا کسی اور طرح سے دلی بھڑاس نکالنے کے لیے تم سے کہتا ہو مخفی رکھنے کے قابل ہیں۔ تمہاری ہمدردی کے بھرنے پر تم سے اس قدر صفائی سے گفتگو کی گویا تم اسکا دل اسکا ضمیر ہو۔

اوپس کی گفتگو میں جو کچھ تم سنتے ہو اسکو دوسری جگہ کہنا اکثر ایک فتنہ انگیزانہ راز ہوتا ہے۔ اسے اگر بیان شکنی نہیں تو نادانی ضرور کہینگے۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی سنی ہوئی بات کہو گے تو تم اُسے تمام و کمال تو کہہ نہیں سکتے ہر حال اُسکا کچھ حصہ ہی لکھ کر رہ جاؤ گے۔ بغرض محال ہے اُس خاص حصے کو نہایت عمدہ اور صاف پیرا میں اد بھی کیا تو بھی ممکن ہو کہ اُسکے معنی اور مضموم میں فرق آجائے۔ جسطح کسی خاص زبان کا یا معنی لفظ اپنے قریب الفاظ اور فقرات سے جڑا ہو کر اگر بے معنی نہیں ہو سکتا تو اُسکے معنی مطلب میں فرق ضرور پیدا ہو سکتا ہے۔

معمولی سے معمولی عام سے عام گفتگو میں بھی چند باتیں ایسی ہوتی ہیں جو مخفی رکھی جانیکے قابل ہیں۔ علاوہ ان باتوں کے جو بالخصوص راز کے طور پر کہی جاتی ہیں ایسی باتیں بھی ہوتی ہیں جو چھپانے کے قابل ہیں مگر راز نہیں کہلاتیں۔ مثلاً کسی شخص نے کوئی بات ایک خاص مجمع میں کہی۔ کیونکہ اُسے خاص طور سے راز دار نہیں بتایا اگر اسکا مدعا یہ ہو کہ وہ بات اُس مجمع کے بارے میں نہ چلے۔ ایسی حالت میں یہ خیال پہلے ہی سے کر لیا جاتا ہے کہ جو صاحبان موجود ہیں وہ بے گئے بھی اس مدعا کو سمجھتے ہیں کسی سنی ہوئی بات کو بالعموم کو کوئی کتے پھر ناگو یا اپنے ہاتھ اپنی بے عزتی کرنا ہے اُسکے یہ معنی ہوئے کہ جو کچھ اُس سے کہا گیا ہو وہ ادنی سے ادنی آدمی سے کہا جاسکتا تھا۔ تو گویا آدمی ایک بہت ہی

مذکور بالا خوبان مجتمع پائی جاتی ہیں اور ایسے شخص میں یہ تیز بالکل ظریفی تھی کہ اپنے معاملات میں کتنے اسرار مخفی رکھنے کے قابل ہیں اور کتنے رازداروں سے کتنے قابل اور اس طرح دوسرے معاملات میں کتنے ظاہر کیے جانے کے قابل اور کتنے چھپائے قابل ہیں پتھر حسین کچھ نہیں کھائی پڑا اور وہ وحالت حسین ہر چیز منطقی تھی جو بر بخت اور بے حس ہیں۔ ایک ضمیر جسکی ہر بات مخفی ہو اور ایک طبیعت جس سے رفقا کا مادہ بھی معدوم ہو برابر بنا کارو ہیں۔

جبکہ فی بات عام ہو جاتی ہو تو عموماً یہ بات بہت بری نہیں سمجھی جاتی اور عام طور سے لوگ ایسا کہ بھی گزرتے ہیں کہ فلان بات تو مجھے پہلے ہی سے معلوم تھی ممکن ہو کہ یہ کوئی بُری تفصیل نہیں رازداری کے خلاف نہو لیکن یہ تو دیکھو کہ تم ایسے وقت میں اس سے زیادہ فتنے راز کر ہی کیا سکتے ہو۔

اب ہی یہ بات کہ کس قسم کے آدمی قابل اعتبار ہوتے ہیں اور راز کو راز کے طور پر رکھ سکتے ہیں۔

یہ بات کہی جاسکتی ہو کہ سنجیدہ آدمی حسین ذرا خود بینی کی بو بھی ہونہا قابل اعتبار لوگ ہوتے ہیں اور اس طرح وہ شخص بھی معتبر ہوتے ہیں جنکو کبھی ایسے معاملات سے سابقہ پڑ چکا ہو جن میں خواہ مخواہ انکو رازداری کرنی پڑی ہو کیونکہ پہلے جس کام کو وہ فرض کے طور پر شروع کرتے ہیں وہی کچھ دنوں بعد انکی عادت ہوتی ہو یہ بات صحیح طور پر نہیں کہی جاسکتی کہ کم فہم مغرور کا راز جلدی فاش ہوتا ہو یا بیوقوف کا۔

اکثر لوگوں میں غیوت ہوتی ہو کہ اگر وہ کوئی راز جانتے ہیں تو اسکو صاف طور سے تو نہیں کہتے لیکن اسکے متعلق ایسی باتیں کہتے ہیں کہ سامعین میں سے کوئی تیز فہم شخص ضرور اسکو دریافت کر لیتا ہو۔

ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جنسے راز گناہی نہ چاہیے کیونکہ انسے راز گنا خطرہ سے خالی نہیں ہوا۔ اس میں کئی طرح کے لوگ ہوتے ہیں بعض ایسے ہوتے کہ کسی خاص راز کو جاننا اپنا اعزاز سمجھتے ہیں اور اس پر فخر کرتے پھرتے ہیں بعض میں رازداری کا مادہ ہی نہیں ہوتا وہ راز کو بوقرآنہ غلطی سے پکایا فاش کرتے ہیں بعض ایسے بھی ہیں جو کسی ایسے راز

کو دریافت کر کے اس سے بجا اور جائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں اور ان سے جدا ایک جہاں ایسے لوگوں کی بھی ہر جگہ دنیا کے فراز و نشیب کا کوئی تجربہ نہیں ہو چکا زمانہ ہمیشہ کیان موافق رہا ہو ایسے لوگ راز کو اسلئے نہیں افشا کرتے کہ وہ اس سے واقعی کسیکو نقصان پہنچا دیں بلکہ وہ بچار و سید سائے لوگ جانتے ہی نہیں کہ اسرار کے ظاہر ہو جائیے کیا کیا نقصانات ممکن ہیں بلکہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ راز فاش ہونے سے واقعی کوئی نقصان ہو سکتا ہو یا نہیں قبل اسکے کہ تم کسیکو پنا راز دار بنا دیے غور کر لیتا بہت ضروری ہو کہ

جو بات تم کہنا چاہتو وہ واقعی راز ہو یا نہیں اور کیا اس میں کافی ضرورت ہو یا نہ ہو لوگوں کا خیال ہوتا ہو کہ تھوڑے دنوں تک کسی راز کو مخفی رکھنا کو یا رازداری کا پورا پورا حق دار کرنا ہو۔ ایسے لوگ جب کچھ عرصے تک کسی بات کو چھپا چکے ہیں تو اسکے افشا کرنے میں انھیں کچھ پشیمانی نہیں ہوتا اور اس میں کچھ تعجب نہیں اکثر باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ضروری ہوتی ہیں کچھ عرصے کے بعد بھولنا بھی نہیں ہوتا کہ وہ کبھی ہمیں بطور راز کے کہی گئی تھیں

اکثر اپنے عزیز ترین دوست بھی بات چھپانے کی ضرورت ہوتی ہو یہ وہی کہ جب تم کسی خاص بات کو بھول جانا کی کوشش کر کے تو جلد بھول سکو گے اور پتھاری پرانی جلد ختم ہو جائیگی اگر عکس اسکے اگر تم نے دوست کوئی بات کہ دی اور کچھ عرصے بعد کو بھول جانا چاہتو تو یہ ممکن ہو کہ تم اسے اپنے دل سے نکال ڈالو لیکن دوسرے کے دل سے اسکا نکال ڈالنا خواہ وہ پتھار عزیز سے عزیز اور سچے سے سچا دوست کیون نہو اسان نہیں ہو۔ ایسی حالت میں پریشانی کا کاٹنا بالکل نہیں ممکن جاتا بلکہ قفاً فوقاً کھٹکا ہی کرتا ہو۔

یہ تیز بہت کم لوگوں کو ہوتی ہو کہ اسوقت سکوت اختیار کرنا چاہیو اور اسوقت نصیحت دے دے دی کی باتیں کہنی چاہیو۔ یہ بھی خیال رکھنا چاہیو کہ تم کسیکو بضرورت پنا راز دار بناؤ اور نہ ایسے شخص سے اپنے مخفی ہر راز کو بھولنا راز دار بنوا اگر ظاہر ہو جائے تو کسی کا دل دکھے۔ املو کی تنائو دے دی کی آرزو باتیں کسی ہی کیون نہو لیکن دوسرے کو خواہ مخواہ پی بصیبت کا شریک بنا یا اعتقاد دی کی بات نہیں ایسی داس جی نے کیا اچھا کہا ہو۔

تسلی ہر گھر جا کے دکھ نہ کیورے آپن بھر مگدولے کے بات نہ پوچھے کئے اپنے راز دوسرے کئے میں ایسی ہی نہ دی ہو جو جی و سر کے راز چلنے اور کئے راز دار بنو خاشی بہ کہ ضمیر دل خویش باکسے گفتن و گفتن کہ مگوے جگت موہن لال (درجہ)

در عشق

سحر حسن

اے در عشق! ہے گہرا آبدار تو ماحر مون میں دیکھ نہوا آشکار تو
پنهان تر نقاب تری جلوہ گاہ ہے ظاہر پرست محفل نو کی نگاہ ہے
آئی نئی ہوا چمن ہست و بود میں اے در عشق! اب زمین ت نمود میں
ہاں اغود نما نیون کی تجھے جستجو نہو منت پذیر ناہ لبس کا تو نہو
خالی تری شراب سے گلشن کا جام ہو پانی کی بوند گریہ شب بزم کا نام ہو
پروانہ سو سے شمع نہ قسمت کو روکے آئے ذوق تبش سے بزم میں آزاد ہو گئے آئے
پوشیدہ کنج دل میں کہیں نہ ہوتا آشاک جگر گداز نہ نماز بہر آرا
گویا زبانی شاعر رنگین بیان نہو آواز نے میں شکوہ فرقت نہان نہو
یہ دور نکتہ چین ہے کہیں چھپکے پھیرہ
جس دین تو کہیں ہے وہیں چھپکے پھیرہ

اے نو حسن قدرت میری دکھ بھی تو دیکھ تیری عشق انگیز نیسے کسا کٹائی ہو نہیں
آئینہ خانہ ہو دنیا کیوں نہ ہوجرت مجھے بکے بیخوشا بق اسرار و نامی ہو نہیں
کس قیامت کا تخیل خیر نکلا سحر حسن اے حسینون حسن عشق افزا کشیدنی نہیں
بند ہیں لب دل مگر منہ طرے فریاد ہو کیسی خاموشی ہو کسکی تاب گویا ہو نہیں
ہوں تو اک بیل مگر گلشن سے دور افتادہ ہوں
ہمنشین پنچلین کہیں فریاد پر آمادہ ہوں

چین میں بھی آکے بیٹے چین کچھ پایا نہیں جب سے دل ہاتھو نشے نکلا لوٹ کر آیا نہیں
کو نسا جلوہ ہو وہ جسے نہ دی حیرت مجھے وہ نظارہ کو نسا ہو جس نے تر پایا نہیں
عشق سامان سوز و دین آکھ ہو حوال مجھ کو جز حسن مقدس اور کچھ بھایا نہیں
اے کوئی دل جلا ہمساز ہو بس سو کا کیا کسی نے راز میرے درد کا پایا نہیں
جل ہو دل کہ کیوں ٹھنڈی ہوئی انجمن کیوں دلوں کو گرمی الفت گرایا نہیں
بھونکٹ لا اس چمن کو آتش بیکار نے
سرد مری کو دکھایا گرمی گفتار نے

ٹکڑے ہوئے وہ دل حب دین نامی نہو قوم وہ کیا ہو جسے احساس سوائی نہو
وہ دھرم کیسا ہو سکھلا جاو ہم نفرت میں دین وہ کیسا کہ جسمیں الفت افزائی نہو
اے برہمن مت سکھایا رو کونفر ک طاق شیخ تو نے بھی کہیں یہ آگ لگوائی نہو
چھوڑ کر سب کم کیوں میٹھا ہو و خلوت نشین بزم جانان میں کہیں ست تری آئی نہو
جگیا نہ ڈھنگ تیرا اور یہاں کامو کا زو تو نے بیکاری کی کیا کوئی قسم کھائی نہو

غافل ہے تجھ سے حیرت علم آفریدہ دیکھ جو یا نہیں تری نگہ نار سیدہ دیکھ
اس بزم میں کسی کو نہیں آرزو تری موتی ہے تو سٹے نہ کہیں آرزو تری
رہنے نے جستجو میں خیال بند کو حیرت میں چھوڑ دیدہ حکمت پسند کو
جس کی بہار تو ہو یہ ایسا چمن نہیں قابل تری نمود کے یہ انجمن نہیں
یہ انجمن ہے کشتہ نظارہ مجاز مقصد تری نگاہ کا خلوت سراز
ہر دل میں خیال کی مستی سو چو تہ کچھ اور آج کل کے کلیمو نکا طور ہو
محفل یہ مر مٹی ہو شراب مجاز پر ادراک طعنہ زن ہے سرور گداز پر
رہبر تو خضر فکر ہے اور ذوق نید ہو ہاتھو نہیں انجمن کے پرانی کلید ہو
نایاب ہو کے اپنی حقیقت دکھا انجمن جو عجز میں نہان ہے وہ دفت کھائیں
منکر بند غرق شراب غور ہے اس بے خبر کو راہ پہ لانا ضرور ہے
طے کر کے آسمان کو جو بے دعا پھر دیوانہ وار تیرا پتہ پوچھتا پھر ہے
نیاب پھر جہان ہو ترے اشتیاق میں

گرایاں جو شیم حسن بھی تیرے فراق میں اقبال

مدوح شرق و غرب شمال و جنوب تھے
تعریف تھی ہنر کی بری از عیوب تھے
اب کچھ نہیں تو کیا کہیں تھے کیسے ہیں
ان امین شک نہیں ہر کج تھے تو خوب تھے

”لیس لانا شام الاما سعی“ بھلا کیوں؟
ضعف دانش رسد راور اسپ تو بھلا کیوں؟

بے دینوں کو جوش مستی کیا ہے
بندون میں یہ خود پرستی کیا ہے
کستی ہر فلک کی گردش ان سے
تم کیا ہو تھاری ہستی کیا ہے

قاضی مرشد نشین اب رونق میخانہ ہو
بات دن لکھتا تھا جو زندگی میخوار کیا غم
پنی مے گل رنگ زاہد چھوڑ کر خود غلہ
کام دنیا سے نہیں شیخ مے سب شیخ کی
نقد کچھ پا کر کسی سے خوش بہت ہو جی
واعظا تو نے بھی دالی اس بھری خلق و حول
کیا بھائیگا تو زاہد میری دلکی آگ کو
کیوں برا مانینگے وہ نالوں سے تیرے حمید
سحر حسن عالم آرا سے جہان تیگر ہے
ہر وہی دانا جو رہے یا کادیا نہ ہو

زاہد ظاہر پرست از حال ما آگاہ نیست

(حافظ)

در حق ما بر جو گوید جلے پیچ اکرا و نیست

حمید کوٹلوی

اُبھرا ہر رنگ سودا دیوانگی ہری ہری
ہو جوش موسم گل جو پھول ہو پری ہری
شمع اور تپناک ہے ہر صبح و عطر عت
یہ بھی مے پئے ہیں وہ بھی کجی دھری ہری

چھائی جاتی ہو میری دل پادہی کیسی
ہم نشین ہے یہ بڑی بات ذرا سی کیسی
کیا ملے داو سخن بنگلہ نشینوں نے نبھے
وہ سمجھتے ہی نہیں قدر شناسی کیسی؟

نہ مسجد میں نظر آئے نہ بہتے ہیں مخلوق میں
ترقی پکے بس ملجاتے ہیں برگد کے گلون میں
یہی پوش رہی آزادی و تعلیم کی
تو غائب م کی تکمیل ہو دوچار ہون میں

ہم میں کو خوبی و کمزوری نہ رہی
پاکیزگی و خجستہ خوئی نہ رہی
تعلیم جدید سے ہوا کیا حاصل؟
ان کفر کے ساتھ بھجونی نہ رہی

کلام اکبر

روح پرور نہ سہی نشہ ذاتیر تو ہے
نوجوانوں کے لیے ولولہ انگیز تو ہے
نہ سہی معنی قومی فقط الفاظ سی
چند اجاب کا اکر شغل ال آویر تو ہے

صبح سرا کا ساقی نامہ

ساقی! بے دود آتش بھر کر پلا مجھے
گرمائے جس سے طبع وہ ساغر پلا مجھے
بیدر دتیز دتند و مقطر پلا مجھے
آتش لباس بادہ احر پلا مجھے
دلکی لگی بھجائے وہ دے آگ سا قیا
سوتا ہو کیا سحر ہوئی اب جاگ سا قیا

شیخ اپنی رگ کو کیا کرین ریشہ کو کیا کرین
نہ ہب کے جھکے چھوین تو پتے کو کیا کرین
فرادے کما کہ مناسب ہو تجھ کو صبر
کنے لگا ”بتائے آیتے کو کیا کرین“

اک برگ مضمل نے یہ سبج میں کہا
موسم کی کچھ خبر نہیں لے ڈالو اتھیں
اچھا جواب خشک یہ اک شاخ نے دیا
موسم سے باخبر ہوں تو کیا جو کچھ ہوین؟

چھٹی ہین ماہتا کے رخ پر جوانیاں ہین روزِ شمع کی گوری کلاسیاں
کبتک سہین خمار کی زور آ زانیاں کبتک بخار دل کا نکالین جانیان
لا جام آتشین ترے قربان ساقیا
تو روح دخت رزمی جان ساقیا
سرت کھوئے باتے ہین اے ہو جو اس سرایہ کبے پاس کہ سرمائی کی ہو اس
جاگے تمام رات کب خشک نہ ہو داس داتا ترا بھلا ہو بڑھا بھر کے اک گھاس
اعضا شکن ہے ہر نفس سرد ساقیا
رگ رگ میں بند بند میں ہو درد ساقیا
کلی کو بھی ترے ہین محتاج آب و نان لائین کہانے تال دتالے رضایان
اٹھ اٹھکے تاپتے ہے شب بھر نگہیں ان بیٹھے ہین دھوپ کھانیکو اب پر آسمان
کبے ہین منتظر ترے جام شراب کے
دے سب انتظار میں ہین آفتاب کے

جیب شفق سے تار شاعی کا ہو غلو کر نین سہری پھلتی جاتی ہین دردور
جنگل کا ہر شجر نظر آتا ہے نخل طور چھایا ہوا ہو دشت و در و بحر و زین نور
ساتی ایکس مہر میں سطح آب پر
قلعی چڑھی ہو سونے کی جام حباب پر
گرتی تھی برف جو کرہ ز مہر سے پانی ہوئی ہے شعلہ کاں ایش سے
ٹھنڈی ہو کے جھونکے جو چلتے تھے تیرے گرمائے اب حرارت مہر سے
بر زیتے جو لڑوئے درخشاں کے
بھر کر چمک گئے وہ کٹوئے کلاب کے
سبزے نے رکھ دی چادر بنم امار کلیان بھی مسکرائے لگین رو لکر گھر
زگس بھی نکھین مٹی جو اٹھتی ہے سر سوسن زبان دراز تھی بول اٹھی بے خطر
لے خفاکان خاک ادم نائے و نوش ہو
ہنگام گرم خیزی جوش و خروش ہو

میکش پکارتے ہین کہ فریاد ساقیا وعدہ نہیں ہو کل کا تجھے یاد ساقیا
زندہ بچ و غم سے کر آزاد ساقیا تو شا دیکھہ ترا آباد ساقیا
سرنائی پھر یہ صبح کہان پہ سان کہان؟
پھر تو کہان؟ یہ گل کہان؟ یہ گلستان کہان؟
روحی فداک جام صبحی پلا مجھے تازہ ہو جس سے روح ملے وہ مرا مجھے
کیا فکر راحتِ ادبی کے سوا مجھے دے موت میں حیات فنا میں بقا مجھے
زندہ شفق کا شام و سحر نام ساقیا
وہ جام دے بخیر ہوا انجام ساقیا

شفق عادی پوری۔

لطف دریا

نگاہ لوٹ ہے دریائی رسی وانی پر کسی جبین چٹکن ہو کہ لہریانی پر
بھنور سے گردش چشم حسین نظر آئی
یہیل چند جبا بونکا اور یہ سرگوشی جھلک کھائے یہ پتھر پھلیونگی رو پوئی
وہ سُرخ رنگ کی مچھلی ذرا بھرا آئی
وہ پرتی ہوئی قازین دھڑک جاتی ہیں بطن و دنتی ہوئی بال پر پلاتی ہیں
بڑا پہ جاگے وہ اک کنج پھرا تر آئی
جو بال دُرا بھی مچھلی کے واسطے ڈوبا تو شک ہو کہ یہ غوطہ آب اسکو لے ڈوبا
حباب بحر کی آنکھ اشک غم سے بھرائی
کہان سے ٹوٹ کے ابل پگلی بھری و بچ گیا مگر انجن کو پا گئی بحری
جو اسکے سر سے ملی بھی تو اسکے سر آئی
چہ بہت ہین وہ دریا کے اُس کنار پر سپید اور سیاہ انکے پائے پیارے پر
اُدھر سے اُدھر کے وہ اک مرگئی ادھر آئی

وہ سارے ورپڑکی وہ دوھیارنگت نظر فریبہ جو بچو کی خوش نمازگت
 سرونیہ آئی جو سُرخی تو کس قدر آئی
 وہ چڑچڑاہو نہ ہین اسکی ریت پر سرخاب دلبے بیٹھے ہین اپنے پروین سرسرخاب
 وہ چونک اٹھے کوئی تپٹ نہیں مگر آئی
 کنار سبز سوار اسین کچھ سیاہی ہو روئے آب پیدا اور گوٹ کاہی ہو
 سوار ہلکی۔ مچلی کوئی ادھر آئی
 ڈاکے ایک مگر نے کیا یہ اندھیر آج تڑپے آگیا کشتی میں اک ہاشیج
 جو آئی ناؤ میں مچلی قضا کے گھر آئی
 شمع مہر سے پانی ہے آب زر گویا ہو مچھلیوں کے رُخون پر نقاب زر گویا
 فلک سے دھوپ جو آئی تو لیکے زر آئی

وہ عکس مہر نے جلوہ دکھایا پانی میں کسی حسین نے غوطہ لگایا پانی میں
 نظریں موج سے اک برق جلوہ گر آئی
 ہوا جو کم ہو تو دریا خموش ہو اسوقت اُچھل رہے ہین مینڈھو نہ خوش ہو وقت
 سکون سو مری کشتی چڑاؤ پر آئی
 چمک ہو ریت کے ذروں میں دیکھنا انکو فلک پر شب کوہین تاک زمین پون
 چمک چلے یہ خوش گریزی اور سحر آئی
 وہ اک حسین کے گھونگٹ کا رخ سے ہٹ جاتا چھپا کے رخ کو وہ پھر شرم سے سمت جاتا
 نگاہ شوق مگر اپنا کام کر آئی
 چلی جو مچھپہ نگاہ اُٹکی آنکھ کے تل سے تو لگد لگا کے کہا عشق نے مڑول سے
 نظر کے تار پر کچھ حسن کی خبر آئی
 چمک کے سے چکا چوند میں پرین نکھین وہ صاف رنگ وہ ہلکی بڑی بڑی نکھین
 چلی نگاہ کی برہنہی تو تا جگر آئی

لے جاو نہیں جہاں بہت کاٹھنا ہو تب چھوٹے ٹکڑے ریت کے جہاں کھلتے ہین۔
 انھیں چڑچڑاہو نہ ہین لے سوار دیانی گھاس ہو لے ماٹیر ایک قسم کی مچھلی کا نام ہو نام کے ساتھ
 نہ لکیر ہے۔

لڑی یہ جن سے اُن آنکھوں میں آہی ہو شباب حسن کی انین شرب ایسی ہو
 نگاہ پھر مری تلیوں میں تر آئی
 مہر ہر ایک نفس میں تھی آہ در پردہ مین چاہتا تھا کہ جو رسم و راہ در پردہ
 مگر پٹ کے مری آہ بے اثر آئی
 اتر کے ناؤ سے شوق تنگی و شوق جو بڑھ چلا مین تو کتر کے کٹ گئی و شوق
 کہاں یہ دوسری جانب کی رہ گزرائی

شوق۔ قدوائی

رباعیات

(۱)

تسخیر کی تاثیر ترے نام میں ہو ڈوبا ہوا عالم ترے انعام میں ہو
 کیا شکر ہو مٹھ چھوٹا ہو اور بات بڑی اتنا ہو کہ بندے کی زبان کام میں ہو

تقدیر میں ہو زل سے لکھی گردش کیسا آرام جب ہو ایسی گردش
 گردش سے فلک کی آج تاکتے برباد اب خاک بنا دیگی زمین کی گردش

پہلی سی مسلمانوں کی شہرت بھی نہیں جاتی رہی دولت تو فرغت بھی نہیں
 نکبت کے گڑھے میں کیوں پڑے ہو مٹھو نا کہ حکومت نہیں ہمت بھی نہیں

قسمت میں جو ہو جو وہی ہوتا ہے حالت پہ مسلمانوں کی دل روتا ہے
 کیونکر لگے پار اب لے خدا یہ بڑا کشتی ہے بھنور میں نا خدا سوتا ہے

بے خالق بحر و بر خدائے دہاں جو جب کو عطا کیا وہ ہر نیک عذاب
 ہے بھی صفی خشک و تر عالم سے پائے ہین لب باطل چشم گرداب
 صفی حید آبادی

(۲)

نالہ بن کر دلِ حزین سے نکلے نکلتے تھے کہ زلفِ عنبرین سے نکلے
جی بھکے نہ دوستوں سے ملنے پائے کیا جلد وطن کی سرزمین سے نکلے

ایامِ نشاط و کامرانی کب تک آخر یہ غرورِ نوجوانی کب تک
گذری شبِ عیشِ صبحِ پیری آئی ہشیار ہو مستِ سرگرائی کب تک

بُٹل کو پڑھائی آہ و زاری کس نے بجلی کو بتائی بیکراری کس نے
ہین سوزِ دون سے شمعِ شبنم گریاں دونوں کو سکھائی انگلیاری کس نے

اندازِ واداد و درِ بالی دیکھی مخلوق میں شانِ کبرِ بالی دیکھی
بن ٹھنکے جو تیکدے میں جاے و صدم بت بول اُنھیں تیری خدائی دیکھی

اب ہے نہ شباب و نوجوانی باقی و عیش و طرب نہ شادمانی باقی
پیری میں شباب کی انگلیں کوثر طالع ہوئی صبح اور کمانی باقی
کوثر خیر آبادی

گلچین اہل

کون ہو جنہیں مضطرب و اٹھوئے اہل! کوہِ بویاکہ ہو صحرا و بوادشتِ جبل
باغِ عالم میں زوہرِ برگ بھی شاکی تیرا دیکھ تو کہتے یہ کیا ہیں کفِ حسرتِ لیل
تو نے اُن شاخوں کو افسوسِ اقلّم ڈالا جنہیں پھول آئے نہ پھل آئے نہ پھٹی کوئل
گوریا صفت ہو کیسی اسے کچھ فکر نہیں اپنے دامن کو بھرے لیتا ہو گلچینِ اہل
تو نے اُن پھول کو چن چن کیا پڑ مردہ پتے ڈالے تھے جدھر تہرِ تحفظِ اہل
گل بھی یا مال کیے سبزِ خوابید کے ساتھ تیری رفتارِ بڑی ہو یہ ذرا دیکھ لے چل

کیا تجھے ہاتا ہوا دیکھا نہیں ہاتھ جو کل جہان پر تھے قرینے سے گلِ برگ و تر
آج دیکھا تو وہ گنڈا رہے سارِ انگل خونِ دل سے نہیں سچا تھا کمانِ ہین گل
حق یہ ہو کہ دلِ انسان کا کاشا تو ہو نام لینے سے ترے جلتے ہیں دل کے بدل
تیری ہی وجہ ہو گلِ بُٹل میں فراق تیری ہی وجہ ہو باغِ جانینِ اہل چل
صبح کو شمع سے پروانہ خُدا کرتا ہے کیوں جے دلو جہاں تاجِ ذرا اب بھی سنہل
تجھے فریادِ ظلم کی کیا کوئی کرے جو عین ہر ترا وقت نہیں جاتا وہاں
کون سے دل پہ ترا خوف نہیں طاری ہو ملے ظلم و قعدی سے ترمیشتِ جبل
اس جہان میں کوئی کیا اس لگا کر بیٹھے دل تو رکتا ہو مگر موت کیستی ہو کچل
ایک حالت پسند اسکی بسرِ موتی ہو بی زمانے نے جو کروٹ تو گیا رنگِ لیل
دلکے دل ہی میں سب زمانے جاتے ہیں ظلم سے تیرے ہر اک عیش میں آتا ہو خل
نام جہاں نہیں باقی تو نشان پھر کیا خاک کا ڈھیر نظر آتا ہو کسری کا خل
ان مکانوں میں بس بوم سے آبادی ہو ایک ایک جہان ہے تھو علیٰ افضل
وان لکیر میں نظر آتی ہیں بجائے تحریر جانِ تصویرین تھیں سکتے ہیں ڈھنسل
کڑیاں جالا لگاتی ہیں ان آگے پرے رہتے تھے جہاں اور مٹھی تھی خل
دیکھنے کو نہیں اب قلب ترس جاتا ہو نئے تھے جو کبھی آنکھوں سے دم بھرا چل
اب کہاں آنکھوں کے تارے وہ نظر آتے ہیں ہر وہ کی بھی اُڑھو ڈھنڈیے لیکر سل
قبر میں پاؤں کو پھیلائے سوتے ہیں بسترِ خاک ہو اُنکے لیے فرشِ خل
سب کی لیتے تھے خبر جو نہیں سہل پنی نین ہائے کس خواب گران میں ہیں اہلِ دل

اس پہ بھی خواہش دینا یہ مرے جاتے ہیں
ساتھ کچھ بھی نہیں جاتا ہو جزئیکِ عمل
ماہِ عظیمِ آبادی

رباعی داغ

بیگانہ بیان ہر اک بیگانہ دیکھا اپنے مطلب کا سب زمانہ دیکھا
جس کو دیکھا غرض غرض کا اپنی دنیا کا عجیب کا رخا نہ دیکھا

تھیں کلام اکبر

نئی صوٹ نہی سیر کیے جب انسان دکھیں گے
تو پھر کس گنہگار بن ہوں قناعت کے ارمان دکھیں گے
کھلیں گی جبکہ نکھین جائے پکارا یاں دکھیں گے
سدا رہیں شیخ کعبے کو ہم انگلستان دکھیں گے
وہ دکھیں گے خدا کا ہم خدا کی شان دکھیں گے

دور شوق میں بان نذر شیر ہلالی کی
اور ب حسرت ہی حسرت ہو گئی کی پالی کی
بگڑے ہیں اپنے ولایت تصویر خیالی کی
جو انکو ذرا پروا نہیں ہے اعتدالی کی
بڑا ہے میں نتیجے اسکے یہ نادان دکھیں گے

تجھے کیا اسکی فکر ہے صاحب نادان کیا ہوگا
وہی ہو چکا ہے کچھ کچھ قیمت میں کھانا ہوگا
میری نظر وہیں ہر وقت ایک عالم دوسرا ہوگا
حسینان عدت اتقا کا سامنا ہوگا
میں دکھوں گا انہیں اور وہ مایاں دکھیں گے

یہ ناہوش کیسے موجب قبول مضطر
مگر تپندہ غرور جذب الفت دبسر
تکانت بر طرک کو دیا آزادی سے محشر
تری دیوانگی پر رحم آتا ہو میں اکبر
کوئی دن وہ بھی ہوگا جب تجھے انسان دکھیں گے

محشر لکھنوی

یتا کا بن باس

یہ تیرہ اثر نصیب میرا
یہ بخت ہے یار قریب میرا
میرے کہ جان میں پیازین
جنم ہی تھی کیوں جنم ملی میں؟
تھیں سے پیون رہی یہیتا
یتا کو جب ہے ہی میں میتا
تھی گرچہ اشوک و امکا میں
جب بچ گئی راج کی بددلی
نکاسے جب اودھ میں آئی
بخت بد نے دکھایا بن باس
گو آگے ہو نصیب جنگل
جنگل ہی میں مجھ کو اب جنگل

قناعت

دل مرا میرے لیے اک سلطنت کے کم نہیں
حکمرانی نفس پہ کرتا ہوں وہ محکوم ہے
زندگی اچھی گذرتی ہر مری کچھ غم نہیں
جانتا ہوں میں کہ دنیا ہستی سوہم ہے

میں قناعت سے بسر کرتا ہوں اپنی زندگی
اور اسی پر زندگی کا ہر مرے دار و مدار
کی ضرورت زیادہ کی نہ خواہش آج تک
میں حکومت کر نہیں سکتا کسی پر نیاز

جب کسی شے کی ضرورت ہو یہی جی ممال
قدرت حق سے مہیا اسکا سامان ہوگا
نفس کی خواہش کو کوڑیا ہو نہیں پانی حال
جس طرح تلوے سے نکلتا ہو دشمن کا گلا

منمو کو کثرت دولت سے گورجت ہوئی
زندگانی انکی کتنی ہو بہت آرام سے
جگوان جھگڑوں کبیرے بہت نفرت ہی
سابقہ و لکونہ تھان آفت آرام سے

دوسروں کے میں کبھی اعتدال کا بن نہیں
اور نہ ہر شک و حسد جنگ کسی سے نیاز
ہو سکون قلب یہاں میرا ہدم بخشین
عیش سے میں ہوتا ہوں نمکائی کی با

آہ انسان کو ہوس کہ دیتی ہر شکل خراب
گو کہ انکے واسطے سب کچھ ہم سامان نہیں
جانتے ہیں دولت دنیا کہ ہر شے سرب
رات دن چڑھتا ہو اسکی جڑے نادان ہیں

ہر طلسمی کا رخا نہ عالم ایجاد کا
کوئی قناعت ہو تو کوئی ہر ہوس کا ہنشین
تجربہ سے اوج کو یہ مسئلہ ثابت ہوا
تجربہ کے ہیں صبر قناعت کوئی دولت نہیں
(ماخوذ از انگریزی)

مازہ غزلیں

ہمارا راجہ بہادر راجہ کرشن پرشاہ جیسا تھا وہاں بھگت

شخص جو ایک عکس کی صورت مری آنکھوں میں ہے
کوئی آئینہ ہر یا حیرت مری آنکھوں میں ہے
فخلف اشکال ہیں ہر چند عالم میں
دزدہ دزدہ یار کی صورت مری آنکھوں میں ہے
دیکھا حیران ہو کیوں عالم تحیر میں
جلوہ دیدار کی حسرت مری آنکھوں میں ہے
شرم ہو آنکھوں کی حیل کی شب اور بیاں
مضطرب نظارہ کی حسرت مری آنکھوں میں ہے
پتلیاں اس واسطے روتی ہیں بی میم
دیکھ لوں پھر اسکو حسرت مری آنکھوں میں ہے
دیر و کعبہ میں تجھے ہی دیکھتا ہوں بڑا
ایک دم تیری ہی اک صورت مری آنکھوں میں ہے
ہے تماشا یا کوئی جلوہ جو کوہِ طور کا
بنگیا ہوں حیرت حیرت مری آنکھوں میں ہے
دونوں عالم میں نظر آتی ہو اپنی ہی بیاں
کیا ہاں گلشنِ قدرت مری آنکھوں میں ہے
کیون نہ عجب دین گردن اب جاننا حیرت شاد

خواجہ جمیر کی صورت مری آنکھوں میں ہے

مجدد الوقت مولانا سید احمد حسن حسنا شوکت (میٹھی)

مشر بہ جام و صراحیِ نقض آزادانہ تھا
دستِ ساقی رات رہنِ رحمتِ نچاڑ تھا
سنگِ ستغنا سے گو پیاں تنگن پیا نہ تھا
خود نگاہِ مستِ ساقی کیفِ صدیخا نہ تھا
لکے شوقِ تجلی سے ہزاروں خاکِ مین
طو سینا سے بھی بالاکس کا بالا خانہ تھا
اسو کی لہین گجائشِ منہی اے گنجِ حسن
سوزِ چشمانِ قارونِ وزن کا ناہ تھا
جان شیریں دی کھن شمعِ مین شیریں کو دیا
کوہن کتنا دلیر خونِ نامردانہ تھا
نام سے مرغِ تجلی کو مسح کر لیا
دامِ مژگانِ مین مہرِ لک کو ہر داہ تھا
خوابِ غفلت نہ تھیک کھا تھا گوشِ بہر کو
صن ایک افسونِ ہاری عمر کا فسانہ تھا
طفہ دانائی سے نادانوں کو کرتا تھا شکا
دامِ درخشِ کی تسبیح کا ہر داہ تھا
سُرمہ کرنا چشمِ خاموشی کا تھا نہ نظر
شمع کو کتنا غم خاکِ تر بردا نہ تھا
چشمِ پوشی شمع کی دیوارِ نظارہ نہ تھی
پردہِ قانوسِ نوید دیدہ پر و اندھا
کیون خجالت کش ہوا خمیازہ درویشی
غزل جب جمع کیا ہو گیا میخانہ تھا

جنگل جو نصیبِ بختِ جواب
پتھر کی چٹانِ تختِ جواب
لے پھلت دے شجرِ تناور
رہنا تم کو پسا پسا گیسٹر
بے جان ہوا و درختِ ہوم
انسان سے کم ہی سخت ہوم
تم حیرتِ لگا کے خسروانی
سیتا کو بناؤ بن کی رانی
لے شیر تو سنگ ہے دلاور
مین بھی تو سنگ کی ہونِ خنجر
بوٹی بوٹی مری چبانا
میری آنکھیں گزرتے کمانا
آنکھوں کو ہے آرزو دیا
دیکھیں یہ رام کو پیر اک بار
آئے اور آ کے بن کا چیتا
دیکھے دل داغِ داریستا
نا اہل ہے نابکار دنیا
ہے سنگِ ستم بیان بھلون پر
ہوتی ہے کس کی یار دنیا
دولت کی وفا و فائین ہے
پتھر کی مار ہے بھلون پر
آرام ہے رام کے الم سے
حصول کی دلا و لائین ہے
مچھلی کھانی سے پیاس
دل رام ہو رام کے کرم سے
سیتا کی پتی ہی سے گئی ہو
مر کر بھی ہے اسکو میت کی کس
لے باد صبا تو جا کے کنا
سیتا ہر حال مین ستی ہو
ان سے سیری سنا کے کنا
کنا لے خوش غرام میری
رگھنا تھ سے رام میری
فرمایا جو رام چند رہی نے
دی جانِ رضا مین جانے نے
لے سو را چکو را چاہ رکھنا
بارش سے اتر سے راہ رکھنا
دے ساتھ مرا تو لے پہیا
تو بھی پی پی سدا کیے با
جل جا! ان لے پشاجِ جل جا
اپنے پنیم کے سنگِ جل جا
دل انیٹ نہیں کہ ٹوٹ جائے
پتھر نہیں یہ کہ پھوٹ جائے
دل گوشتِ جلیگا، نرم ہوگا
جل بھن کر بھی یہ نرم ہوگا
سیتا کی سدا و فاشا رسی
گاسے گی مین ہر ایک رسی

سیتا بھی کا نام پہلے لیں گے

سیتا رام آدمی چین کے طالبِ ناری

آئے وہ دامن کشان تھاجن پر لگاؤغ خاک بت میں بھی میری مستحاضہ تھا
کجروں کو ہنستہ حیدر دم ہمداری کیا بستہ تسبیح تیر سینہ سدا نہ تھا
سخت جانی تھی کہ زہ تھا گونے شوق دانت سرستہ بیتی تھی تیغ میں دلا نہ تھا
انکے شمع کت کھلی دیکھے بتان ماسوا

کعبہ دل بابت تھے جس کو ہر بتنا نہ تھا

سید نظیر حسن صاحب نظیر

اسے بھی فوج نہیں کی طرح ستانے کی کبھی نہیں شب فرقت میں منید آنے کی
کبھی ہر دلمین او انکے شکر لے کی یہی تو دجہ سے پہلی کے لمبا نہ کی
کئے ہیں عاشق کیسوں خلق ارجان بائیں ایک جگہ یوگنیں زمانے کی
وہی حینال وہی برگمانیان بنک کچھ اتنا ہے کوئی حد سے آنے کی
ہزار آئی بھی آخر بھی سوہلی ستیادا زمین ملی نہ اجازت چمن میں جانے کی
پہاڑ غم کے جو ٹوٹیں تو کچھ نہ ہو پردا وہ کیا ہے جسے عادت ہونا نہ گھٹانے کی
وہ پہلے اپنی خبر میں کہ خود میں نقش آرب فضول چرخیں کوشش میں مٹانے کی
ہمارے زمین تھے درد نے کہا اٹھ کر یہی تو ایک جگہ ہر مرے گھٹانے کی
تعلقات کے پہچون کو دم نے توڑا ہر یہ وجہ ہر دم آخر عرق کے آنے کی

مرے قیام کو پوچھو نہ لے عدم والو

حباب نے تو بہت سیر کی نہ آنے کی

منشی عبدالحکیم صاحب حمید (میرٹھی)

ہوئی رسوائی بازار جہان میں حسنیت کی تماشائی نہیں نظریں نظر بازان الفت کی
کہان تصویر پرستی ہو تھاری بھولی صحت کی بنائیں لے رہو گھٹانے کا قہر ت کی
کسی سہم شکایت کیا کرین خوبی قیمت کی کہ دل بیٹھے جھٹلے کھو دیا اچھی محبت کی
نگاہیں مجھے پھیریں سو دشمن چشم الفت کی یکساں رسم وفا تو نے ادا او ہمدوت کی
قلق کی رنج کی خزان کی غم کی بدوقت کی محبت میں ہیں یاتین ملین کس کس مصیبت کی
نہیں چھپتی چھپنے سے نظر ہر محبت کی اثر ہر مہین جادو کا یہ بجلی ہر قیامت کی
بہت چاہوں ایسی کیا حضرت تھی عیادت کی مدد کے ساتھ آپے بڑی ٹھہر عنایت کی

ذرا شام چران کلا گری جھپک جائے تو ایسا ٹون ٹافل یون خبر صبح قیامت کی
رہم میں فرین جودہ کسی کا ہو تو جھکا کویا کرونگا خانہ دلمین پرستش تیری صوت کی
جو کھنے کا ہم کیا نقشہ نہیں بچپن کے ہوا کچھ اور ہی ہو جائے گی گلزارِ نبوت کی
وہ بچے بھی تو کیا بیٹھیں بچے والے تھے دولے بھی تو کیا لے ٹھہری جیانی نصرت کی
جنھیں سمجھا ہر قل میں موبے اپن دہن کے وہ میں گلکاریان خون شہیدانِ نبوت کی
شب وصل صدم ہو حضرت دل شاہو بچے ابھی دم پنا دگی گھڑی صبح قیامت کی

دفا پر اپنی آزان ہوں اور چارن تیا ہوں مروت اسے ہی ڈالیں گے جھکے مروت کی
تھارے کے سجدے پھر میرے کھٹے ہوئے متانوں آج ہی گھسار جہین تحریر محبت کی
جہاں آتی ہر چھپے بیٹھے کون تھا مجھے دامن قیامت کیا سہیلی بنگلی اس فتنہ قیامت کی
مری مینا بیان دیکھیں امر ناجی تو دیکھو ابھی آتے ہی ٹکڑی لے جانِ خصمت کی
بڑا کہنے لگے کوئے بتان کو کچھ غل آیا ہوا کھائیں کوئی دن شمع باغِ جنت کی
عدم تاکت ہی پہنچ گیا شہنشاہِ دشت پیاوی سلامت اگر گردش ہارو با دشت کی
مجھے دیوانگی کا شوق انھیں فنی خود آرائی یہاں ہر دم کا انان دیاغ مشنِ شہرت کی
خاندانہ مکے تاحشر میرے سو نوار دکانو سرانے بکسی ہر دگر این شمع تربت کی
جو پوچھا نہ ہو کیا سبب کیوں ستا ہے ہو تو بچے تم نہیں واقف یاتین میں محبت کی

حمید آئینہ میں شاید کوئی جادو کا پتلا تھا

وہ بسکاو دیکھتے ہی بنگلے تصویرِ حیرت کی

منشی دُرگاسہائی صاحب ستر اہلن آبادی (مرحوم)

نہ دو چر کارگ جان حزمین کو سنبھا لو شتر چین جہین کو
تھاری چال ہے آشوبِ محشر اٹھلے پھرتی ہے سر پر زین کو
کہو خالی نہ اغوش متنا دزا دیکھو مہر باد نشین کو
کوئی خار متنا چھ نہ جاے نہ چھو نام دل درد آفرین کو
ہوا اچھی مرے نالوں نہ بانڈھی کہ بھڑکایا مزاجِ آتشین کو
اگر پیہر کہن ہوتا نہ ظالم اٹھالیتا فلک سر پر زین کو
کنارہ کر کے بیٹھا ہر جان سے نہ چھڑو وحشت کو شہ نشین کو

ایڈیٹوریل

پکھ اپنی نسبت

توکل علی اللہ العصر کا پہلا نمبر یہ ناظرین کیا جانتا ہے۔ مضامین کے لحاظ سے پبلک خواہ کچھ ہی رہے قائم کرے، اسکو اختیار ہے، مگر ہم درخواست کرتے ہیں کہ سب پہلے اس امید میں مضمون کو حسین کسی حد تک توضیح مقاصد کی گئی ہے، ملاحظہ فرمایا جائے کہ العصر کے ذریعہ سے کن خدمات کی انجام دہی کا ارادہ کیا گیا ہے۔

یہ بات بے اہل یقین کر لینی چاہیے کہ میں معمولی استعداد کا آدمی ہوں۔ نہ تو مجھے زمانہ کافی کاغذ ہے، نہ تجربہ کاری کا ادعا۔ ہاں، چونکہ گزشتہ دس بارہ سال سے اخباری دنیا سے مجھے خاص تعلق رہا ہے اسلئے اب اسی کوچہ کی ہوا میں جا لگتی ہے، اور اس کا شوق بوجہ اتم دانگی ہو گیا ہے، اور اسی وجہ سے خیال ہے کہ ملک کے علم دوست حضرات کی بدولت شاید کسی قابل ہو جاؤں۔

ملک میں بہت سے موقت الشیوعہ رسالے شائع ہوئے اور ہوتے ہیں۔ مگر بات شمار چند، انکا جواز زیادہ تر تجارتی اغراض سے ہوتا ہے۔ یہ ایک بہت بھاری نقص ہے جو اخبارات و رسائل کے حق میں نہ قاتل کا اثر رکھتا ہے کیونکہ تجارتی پرچوں کے ایڈیٹر عموماً بدلتے رہتے ہیں، اور ایڈیٹروں کی تبدیلی کے ساتھ پرچوں کا مقدر معیار یا امتیاز خصوصی قائم نہیں رہتا، عہدہ کہ آمد عمارت نہ ساخت اس جگہ اس امر کا اظہار کر دینا نامناسب نہوگا کہ العصر میرا ذاتی پرچہ ہے یعنی شہر ایڈیٹر نہیں بلکہ میں ہی اس کا پروپرائیٹر بھی ہوں۔ پس اگر ملک نے اس کی قدر کی تو کچھ شک نہیں کہ کم از کم میری حیات مستعار تک العصر جاری رہیگا۔ انشاء اللہ العصر کو میں نے اپنی معاش کا ذریعہ نہیں بنایا ہے، بلکہ اسکو میں محض اپنا شوق پورا کرنے کے لیے خالص علمی ادبی خدمات کی غرض سے شائع کرتا ہوں۔ اس سے جو کچھ آمدنی ہوگی، وہ اسی کی بہتری میں صرف ہوگی۔ ہاں اس روز کا نہایت مینابی کے ساتھ انتظار کرتا ہوں کہ میں اپنا تمام وقت اسکو

زیادہ بہتر اور کارآمد بنانے کی سعی میں صرف کر سکوں۔

اب اس مختصر نوٹ کو ختم کر کے ملکی اخباروں، رسالوں، اور اہل قلم کی سچی راہوں کا انتظار کرتا ہوں، اور گوش برآواز ہوں۔ کاش! مدائین آئے لکین ان سیکم مشکور

ایک گزارش

ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے معاونین العصر کو اس حالت سے گرا ہوا ہوا ہیں جس کا اشتہار میں وعدہ کیا گیا تھا۔ ہم ترقی کی ابھی بہت گنجائش ہے، اور ہماری بھی یہ کوشش ہوگی کہ ہر نمبر گزشتہ نمبر سے بدرجہا بہتر ہو۔

تصاویر کے متعلق چند باتیں خاص طور پر قابل گزارش ہیں۔ ہمیں گندم جو فوٹو منظر نہیں، اس لیے ہم پہلے ہی اس بات کو بتادینا مناسب ضروری خیال کرتے ہیں کہ العصر کی تصاویر کی کوئی خاص تعداد مقرر نہیں کی گئی ہے۔ اس نمبر میں ایک ننگین اور چھ سادہ تصویریں دی گئی ہیں۔ ممکن ہے کہ آئندہ نمبر میں اس سے زیادہ تصویریں ہوں، اور اسی طرح اس تعداد سے کم تصویریں بھی بھی امکان ہے۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ ہم مصارف سے گھبرائے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ پرچے کے مصارف کا جو بحث تیار کیا گیا ہے، اس میں کسی طرح تخفیف نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی نمبر میں تصویروں کی تعداد کم ہوگی تو ہم اس کمی کو اس نمبر کے صفحات کی تعداد بڑھا کر پورا کر دیں گے۔ ہماری رائے مجموعہ عالمی کا اقتضا بھی یہی ہے!

العصر کے متعلق ہم نے ہر قسم کی خوش سلیقگی کا خاص لحاظ رکھا ہے۔ ہماری خواہش ہے کہ صورت و سیرت، دونوں کے لحاظ سے العصر بہترین سال ثابت ہو۔ اگر ہمارے معاونین کو کوئی نقص محسوس ہو، تو وہ صفائی کے ساتھ ہمیں تحریر کر دیں۔ ہمیں ان کے مشوروں سے فائدہ اٹھانے میں ہرگز عار نہوگا۔

ہمارے ارادے بہت وسیع ہیں! اور یہ ظاہر ہی ہے کہ ایسے تمام الشان مقاصد کی کامیابی کل انہائے وطن اور مایان اردو کی دستگیری پر منحصر ہے۔ جو

سہجاء خود مافی اعانت ذہانے کے علاوہ اپنے احباب کو بھی اسکی خریداری کی جاب
مائل کریں گے وہ ہمارے دلی شکر یہ کہ سستی ہون گے۔ اس طور سے وہ
صرف العصر کی مالی حالت کو بہتر کریں گے، بلکہ اس فائدہ کو بھی جو وہ ملک
کو پہنچانا چاہتا ہے وسعت دینے کا ذریعہ ہوں گے۔
دل کی قیمت اک نگاہ باز ہے آگے جو آئے ترے ایان میں

رد تحقیق

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

جو چیرا تو اک قطرہ غوث نکلا

ایک مشہور دعویٰ دہلی رسالہ کے ایڈیٹر نے ایک مضمون دوران میں
ہندوستان کے علمی رسائل کا ذکر فرماتے ہوئے تحریر کیا ہے :-
”سائنس میں پہلے پہل رسالہ اولگڈارنولا نا عبد الحکیم صاحب شری نے نکالا
تھا، اس لیے اولیت کا فخر مدوح کو ہے۔“

افسوس ہے کہ ہم اس بات کو ماننے کے لیے ہرگز تیار نہیں۔ وجہ یہ کہ ہم ان
علمی کوششوں سے بخوبی واقف ہیں، جو دلگداز کے ظہور سے پیشتر اردو زبان میں
کی جا چکی ہیں۔ سائنس میں پہلے ایک مضمون دہلی کے رسالہ زبان میں اردو
رسائل پر ایک سرسری نظر کے عنوان سے لکھا تھا، اُس میں ہم نے ان پر چون
کی ایک فہرست بھی دی تھی جو سائنس سے پیشتر خالص علمی مذاق کے لیے شائع
ہوئے تھے۔ ذیل میں ہم اُس فہرست کو نقل کرتے ہیں۔ اس سے ناظرین اس
فراموشی کے کہ دلگداز کے وجود میں آنے سے پیشتر علمی مذاق غفوق و نکلے۔

| نمبر | نام رسالہ | مقام اشاعت | نام ایڈیٹر | سنہ اجراء |
|------|----------------|------------|------------------|-----------|
| ۱ | مراۃ العلوم | بنارس | بابو بھیرن پرشاد | ۱۹۲۹ء |
| ۲ | مخزن علوم فنون | ” | منشی نیاز علی | ۱۸۵۵ء |

۱ جن پر چون کے نام کے ساتھ نشان دیا گیا ہے وہ اردو ادب نگاری
دونوں زبانوں میں شائع ہوئے تھے :-

| نمبر | نام رسالہ | مقام اشاعت | نام ایڈیٹر | سنہ اجراء |
|------|----------------|---------------|--------------------|-----------|
| ۳ | آب حیات ہند | آگرہ | بابو نبی دھر | ۱۸۶۲ء |
| ۴ | مخزن علوم | گوجرانوالہ | منشی گیان چند | ۱۹۶۶ء |
| ۵ | انسی بیوت | منظر نگر | لال نہال چند | ۱۹۶۷ء |
| ۶ | اتالیق پنجاب | لاہور | مولانا آزاد | ۱۸۶۷ء |
| ۷ | مخزن مہاجرات | آگرہ | لالہ جوا لال پرشاد | ۱۸۷۱ء |
| ۸ | دہلی سوسائٹی | دہلی | مولوی ذکا الدین | ۱۸۷۱ء |
| ۹ | معلم شفیق | حیدر آباد دکن | محب حسین محب | ۱۸۷۲ء |
| ۱۰ | احمد ذاکر علیہ | پٹنہ | حاجی سید لایت علی | ۱۸۷۲ء |
| ۱۱ | مخزن الفوائد | حیدر آباد دکن | مولوی سیح الزمان | ۱۸۷۲ء |
| ۱۲ | آستانہ حکمت | آگرہ | حاجی سید الطاف علی | ۱۸۷۹ء |
| ۱۳ | اشاعت حسنہ | امر تسر | مولوی محمد حسن | ۱۸۷۹ء |
| ۱۴ | تیرہویں صدی | آگرہ | خواجہ یونس علی | ۱۸۷۹ء |
| ۱۵ | زمانہ | آگرہ | خواجہ یونس علی | ۱۸۷۹ء |
| ۱۶ | منید عام | لاہور | منشی گلاب سنگھ | ۱۸۷۹ء |
| ۱۷ | منظر الزراعة | میرٹھ | حکیم مقرب حسین | ۱۸۸۲ء |
| ۱۸ | متھرا ساچار | متھرا | پنڈت اُم انجھارگو | ۱۸۷۲ء |
| ۱۹ | والا جاہی | ریاست بھوپال | نواب صدیق حسن خان | ۱۸۷۳ء |
| ۲۰ | علوم و فنون | حیدر آباد دکن | حافظ منسوب علی | ۱۸۷۳ء |
| ۲۱ | اشراق | لکھنؤ | مرزا ہادی | ۱۸۷۴ء |
| ۲۲ | ذخیرہ تعلیم | حیدر آباد دکن | منشی عزیز الدین | ۱۸۷۴ء |
| ۲۳ | زراعت | مجنور | پنڈت سری لال | ۱۸۸۴ء |
| ۲۴ | نور البصر | کلکتہ | مولوی غلام حضرت | ۱۸۸۴ء |
| ۲۵ | طبیب | لاہور | حافظ فخر الدین | ۱۸۸۵ء |
| ۲۶ | نفید المزارعین | کانپور | خواجہ محمد حسین | ۱۸۸۵ء |

| نمبر | نام رسالہ | مقام اشاعت | نام ایڈیٹر | سنہ اجرا |
|------|------------------|------------|--------------------|----------|
| ۲۷ | مرآۃ المؤمنہ | لکھنؤ | پنڈت لشن کمار | ۱۸۹۵ء |
| ۱۸ | افسانہ ایام | دہلی | مولوی نصرت علی خان | ۱۸۹۵ء |
| ۲۹ | زمیندار | لاہور | نقشبندی محبوب عالم | ۱۸۹۶ء |
| ۳۰ | باغبان | " | " | ۱۸۹۶ء |
| ۳۱ | شمس العلوم | احمد آباد | — | ۱۸۹۶ء |
| ۳۲ | مجمع علوم و فنون | لاہور | مولوی عبد اللہ خان | ۱۸۹۶ء |
| ۳۳ | مرحمت | انبالہ | پنڈت شیو پرشاد | ۱۸۹۶ء |

ہم نے عہد اُن رسالوں کے نام نظر انداز کر دیے ہیں جو ۱۸۹۵ء میں یا اس کے بعد شائع ہوئے ہیں۔ اس بات کا بھی دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ فہرست مکمل ہے۔ ممکن ہے، ان کے علاوہ اور بھی علمی مذاق کے پچھے جاری ہوئے ہوں۔ بڑا حال اب اس بات کو مان لینا چاہیے کہ اولیت کا فخر مولانا شری کو حاصل نہیں ہے۔ ہم ایڈیٹر صاحب موصوف کی اُن معلومات کی ضرورت اور ذمہ داری جو آپ کو تجربات اور تحقیق و تدقیق کے بدولت حاصل ہو گئی ہیں، مگر ہمیں سخت فیس ہے کہ اس تاریخی مضمون میں اور بھی چند غلطیاں اس قسم کی ہو گئی ہیں کہ ہم اُن کی بھی تردید کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ مثلاً آپ اویب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ اس نام کے دور رسالے جاری ہوئے تھے... ایک توحید آباد سے نکلتا تھا۔

اور دوسرا غالباً ۱۸۹۹ء میں فیروز آباد سے جاری ہوا تھا۔

اس بات کے ظاہر کرنے کی چند ان ضرورت نہیں کہ حیدر آبادی ادیب اب تک جاری ہے، اور کہ فیروز آبادی ادیب ۱۸۹۲ء میں نہیں بلکہ ۱۸۹۹ء میں جاری ہوا تھا، مگر ہم یہ دریافت کرنے کی جرات کرتے ہیں کہ لکھنؤ کے ادیب کیا قصود کیا جواب نے اُس کا ذکر نہیں فرمایا۔ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ ۱۸۹۲ء میں لکھنؤ سے بھی اسی نام کا ایک رسالہ مولوی ہدایت سول کی ایڈیٹری میں جاری ہوا تھا۔

آگے چل کر آپ فرماتے ہیں :-

ہندوستان میں موجود ہرگز کے رسالوں کا پیشرو ادیب فیروز آبادی تھا۔

”موجودہ طرز“ سے غالباً آپ کا منشا نظم و نثر کے مستقل الحاق سے ہے۔ مگر جاننے والے جانتے ہیں کہ معارف میں یہ خوبی موجود تھی، اور یہ ظاہر ہے کہ ادیب (فیروز آبادی) معارف کے بعد معرض وجود میں آیا اور معارف کے بند ہونے سے پہلے ہی ختم بھی ہو گیا۔ اور اگر ”موجودہ طرز“ سے آپ کی مراد جدید شاعری سے ہے، تو یہ نشاۃ بھی خالی گیا۔ ۱۸۹۵ء میں جب نقشبندی شاعر حسین صاحب شاعر نے پیام یار جاری کیا تھا تو مولوی عبد الحلیم صاحب شری کہ بھی اُس میں یورپ اور ایشیا کا رنگ ملا کر نظم لکھتے تھے، اور جب اُنھوں نے دلداز جاری کیا تو اس میں بھی جدید طرز کی نظموں درج کر کے لگے۔ انبالہ سے بھی ایک ماہوار رسالہ جاری ہوا تھا، جس کا نام غنچہ مراد تھا۔ غزلوں کے علاوہ اس میں جدید طرز کی نظموں بھی ہوتی تھیں۔ گویا علمی و ادبی مذاق کے علاوہ جدید شاعری کی بنیاد بھی فیروز آبادی ادیب سے بہت پہلے پڑ چکی تھی۔

ہم محقق نہیں ہیں، اور نہ ہمارا ”شاہدہ و تجربہ“ وسیع ہے، باوجود اس کے ہم نے جو کچھ لکھا ہے، نہایت تحقیق سے لکھا ہے، اور وہ بھی محض اس غرض سے کہ رسالہ مذکور کے مضمون زیر بحث کی وجہ سے بعض ناواقف حضرات مغالطہ میں نہ پڑ جائیں۔ امید ہے کہ ہماری اس نیک نیتی کو مخالفت پر محمول نہ کیا جائے گا۔

میکا ڈویوشی ہو (جدید شہنشاہ جاپان)

جدید شہنشاہ جاپان، یوشی ہتو، ۲۰۔ اکتوبر ۱۸۹۵ء کو پیدا ہوئے تھے۔ ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام، مغربی طریق پر، نہایت وسیع پیادہ پر کیا گیا تھا۔ چینی، و جاپانی لٹریچر سے خوب واقفیت رکھنے کے علاوہ، آپ انگریزی و جرمنی زبانیں بھی جانتے ہیں۔ پنج زبان میں تقریر بھی کر سکتے ہیں، جاپانی زبان سے انھیں کمال انس ہے، اور اپنے تمام کام اسی زبان میں کرتے ہیں۔

آپ کی صحت اچھی حالت میں نہیں ہے۔ عرصہ تک مرض تپ دق میں مبتلا ہے۔ اگرچہ ایک جرمن ڈاکٹر کے علاج سے آپ صحتیاب ہو گئے ہیں

ہم اب بھی کمزور ہیں۔ اپنے نامور والد کی طرح آپ تہمند نہیں بلکہ خفیف اجڑے

ہیں۔ سیر و سیاحت کے بڑے مشتاق ہیں۔ اسلام میں بہت دور دور کی سیر کی۔ طبیعت کے نرم ہیں۔

۱۔ اکتوبر کا دن جاپان میں اس خیال سے قومی دن منایا جاتا ہے کہ اٹھارہ روز بادشاہ نے چاول کی فصل کے بعد نئے چاول پہلی مرتبہ تناول کرتے ہیں۔

جدید شہنشاہ جاپان نے اس رسم کو ادا کرنے کے بعد اپنے مہتممون کو جنھوں نے بچپن سے اب تک آپ کو تعلیم دی انعام و اکرام بخشے، اور ان کی محنت کا شکریہ

واعتراف کر کے حق شاکر دی ادا کیا۔

۱۲۔ نومبر کو شہنشاہ مذکور نے ایک دوسری قومی رسم ادا کی۔ جاپان کے قریب دو سو جنگی جہاز بندر کو با میں جمع کیے گئے، اور بادشاہ نے ایک کشتی میں سوار ہو کر

انھیں ملایا، گویا انھیں برکت دی۔ اس عظیم الشان رسم کی ادائیگی کے لیے

نہایت اعلیٰ پیمانہ پر تیاریاں کی گئی تھیں۔

ہم کی وجہ سے آپ ابھی تک کاروبار سلطنت میں زیادہ حصہ نہیں لیتے

اس وقت ان کی عمر ۴۲ سال کی ہے۔ ان کے تین ارکان ہیں۔ رسم باجوشی

میں سابق دار السلطنت کیونین ادا ہوگی۔ جاپانی رسم کے مطابق نئے شہنشاہ کو

تخت نشینی کے بعد فوراً ہی اپنے بزرگوں کے مقابر پر جا کر اطہار اطاعت کرنا ضروری

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دربار باجوشی نوکیو کے بجائے کیونین ہوگا۔

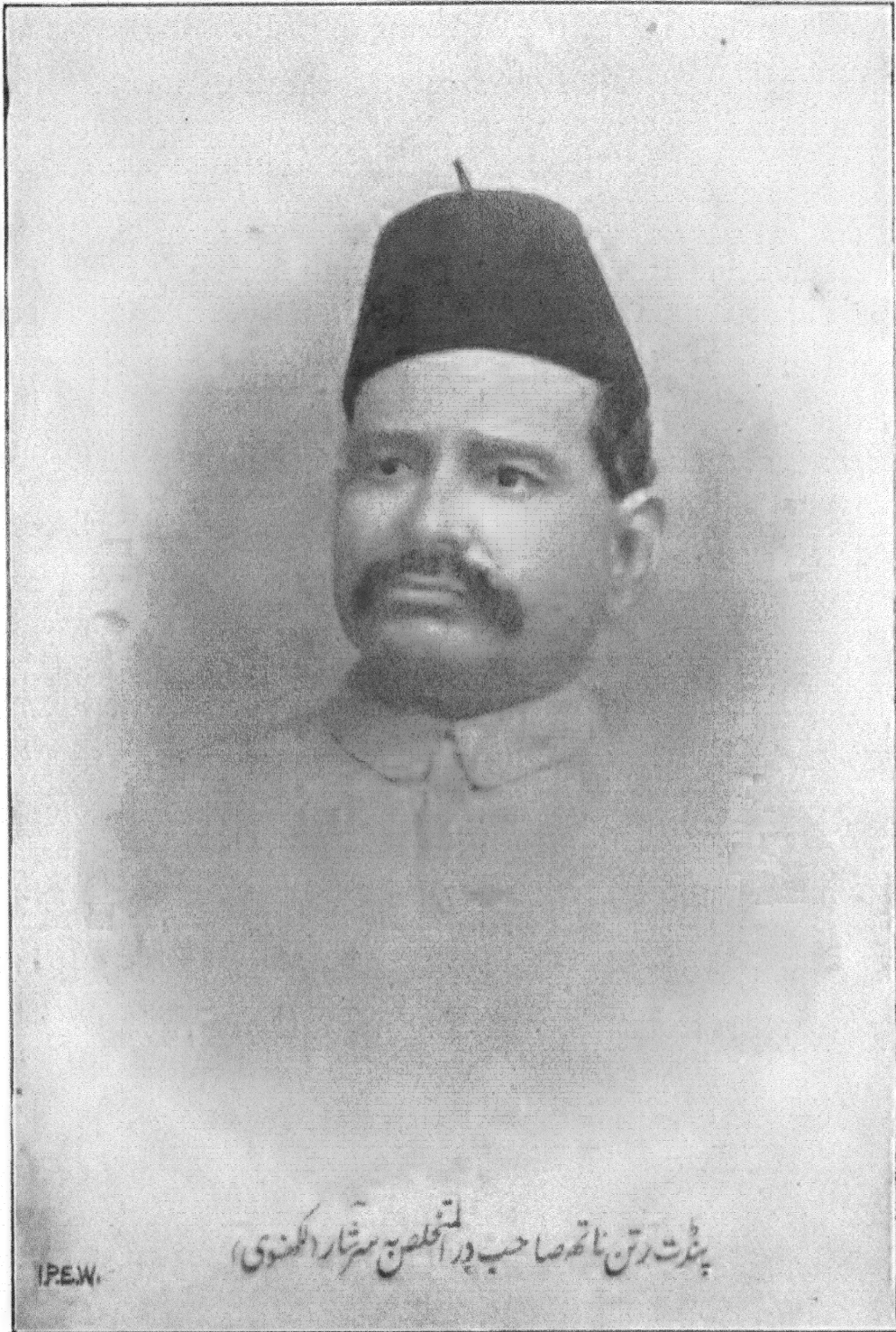
جدید شہنشاہ طبیعت و غیرہ میں اپنے والد مرحوم سے بالکل مختلف ہیں۔

مرحوم عمدہ صحت کے مستقل مزاج اور گوشہ نشین بزرگ تھے، اور جدید شہنشاہ

صحت کے کمزور، زمانہ حال کے خیالات کے دلدادہ، اور سیر و سیاحت کے

شائق نوجوان ہیں۔ جاپان کی آئندہ حالت کیا ہوگی؟ زمانہ دربار تک اس بحث

پر طبع آزمائی ہوتی ہے گی۔ ہندوستان پر پشادری از نو کیو



پنٹ رتن ناتھ صاحب در آئینہ شہزاد اکبر

I.P.E.W.

العصر

انتہائے سائنس

گذشتہ صدی عیسوی کی ابتدا سے سائنس نے اس قدر حیرت انگیز
 رزق کی ہے اور حقائق قدرت اس برق رفتاری سے سائنس کی جا دوڑنا
 تحقیق کے سامنے حضرت انسان کو شکست ہو رہے ہیں کہ بادی النظر میں
 خیال پیدا ہوتا ہو کہ سائنس اپنے معراج کمال کی انتہائی منازل کو عنقریب
 پہنچ جائیگی۔ ہمارا مقصد اس مضمون کی اشاعت سے اس غلط فہمی کا زوال
 کرنا ہے۔ سائنس نے فی الواقع انسانی علم کو بے انتہا وسعت دی ہے لیکن
 بعض سائل ابھی تک بالکل سائنس کی دسترس سے باہر ہیں اور جب
 تک سائنس ان سائل کو طے نہ کرے ہم ہرگز سائنس کو مکمل مجموعہ معلوماً
 کہنے کے مستحق نہیں ہیں۔ جو لوگ جانتے ہیں کہ سائنس نے کن کن سائل
 پر روشنی ڈالی ہے انکو خوب معلوم ہے کہ ابھی بہت سے مسائل سائنس
 کے حدود میں بھی نہیں آئے۔ آپ ترکیب مادہ ہی کو بغور سوچئے۔ پتہ نہ
 کتب یورپی زبانوں میں اس سبب پر شائع ہو چکی ہیں لیکن سب کا
 حاصل یہ ہے کہ مادہ کے متعلق کسی اصلی بات کا پتہ نہیں لگایا جاسکتا۔

مادہ کی ترکیب صرف ادھور سے طور پر بیان کی جاسکتی ہے۔ چونکہ اس مضمون
 پر حال ہی میں جدید انکشافات نے بہت سی نئی روشنی ڈالی ہے ہم
 چاہتے ہیں کہ ناظرین کو اس اجمال کی تفصیل سے آگاہ کر دیں۔
 قاعدہ کی بات ہے کہ انسان ان باتوں کے متعلق جو اسکے روزمرہ کے مشاہدہ
 میں آتی ہیں اور جن سے اکثر اسے واسطہ پڑتا ہو سب پہلے اور سب زیادہ
 تحقیق اور تفتیش کرتا ہے مختلف اشیاء کو اپنے گرد و پیش دیکھ کر شروع ہی
 شروع میں انسان کو جستجو پیدا ہوتی ہے کہ مادہ کی خواصیات عامہ کی کسی
 معقول پیرایہ میں تشریح ہو سکے۔ سب سے اول یہ خیال پیدا ہوا کہ مادی اشیاء
 نہایت ہی چھوٹے ذرات سے مرکب ہیں۔ اس خیال کا موجد یا قطرین تھا
 جو آج سے ڈھائی ہزار برس قبل انہی سخت ذرات کی توصیف بیان کر چکا
 ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ ذرے اور چھوٹے ذرات میں منقسم نہیں ہو سکتے
 اس لئے ذرات دو یا تھالیسیہ کو بعد ازاں اجزائے لائیٹجزی کہا گیا۔ تک
 پانی میں ڈالیے دو نو اشیاء مل کر ایک جسم ہو جاتے ہیں اور حجم میں بالکل

اضافہ نہیں ہوتا سخت سے سخت جسم میں بھی نوکدار بنی ٹھونگی جاسکتی ہے اس قسم کے مختلف مشابہات اور تجارب سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ذرات کے درمیان خالی جگہیں بھی ہوتی ہیں۔ فلائس کے فلسفیوں نے زمانہ قدیم میں اس امر کے متعلق اپنا اطمینان اس طرح کیا تھا کہ انھوں نے سونے کا ایک مجوف کرہ بنایا اور اس میں پانی بند کر کے گرد کی حسابت کو نہایت زبردست دباؤ سے کم کرنا چاہا مگر فی الاصل ان فلسفیوں کا مشا اس بات کی تحقیق کرنا تھا کہ پانی دباؤ سے حجم میں کم ہو سکتا ہو یا نہیں؛ لیکن تجربہ کا طریقہ غلط ہونے کی وجہ سے انھیں یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ سونا جس کو سب اشیاء سے زیادہ ٹھوس اور سخت سمجھا جاتا تھا وہ بھی مسامدار ہے۔ لیکن اس کے ذرات کے درمیان خالی جگہیں ہیں۔ کیونکہ حالت میں یہ تجربہ نہایت آسان ہے۔ اگر ایک ہند منہ والے بہت بڑے برتن میں جس میں سے آدھ مٹراج اداوت سے سوا خارج کر دی گئی ہو کوئی گیس مثلاً ہائیڈروجن یا ہلورین تھوڑی سی مقدار میں بھی داخل کر دی جائے تو وہ قابل مقدار گیس کی بن کے سب مصنوعات کیساں پھیل جاتی ہے۔ اگر اجسام ذرات سے مرکب ہیں اور ان کے ذرات کے درمیان کوئی خالی جگہ نہیں تو یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ قلیل مقدار گیس ایک بہت بڑی جگہ میں پھیل جائے۔

حاصل کلام۔ دیا فطری سے لیکر انیسویں صدی عیسوی تک یہ مسئلہ سالمات یعنی اشیاء تک تھیوری سائنس میں ایک مسئلہ تھیوری تھی۔ بیسویں صدی کے شروع میں ریڈیم کی دریافت کے بعد اور برقی رو (Electric Current) کے خواص کے مطالعہ سے جبکہ برقی زوائی ان ایٹم خلائی میں گزاری جاتی ہے بہت سی ایسی باتیں ثابت ہوئیں جنکی تسلی وہ تھیوری مسئلہ سالمات کی بنا پر کرنی ناممکن تھی اب سائنس دان اس امر پر مجبور ہیں کہ ذرات کو غیر منقسم مائیں بلکہ تازہ ترین قیاس

۱۰ Vacuum Tubes جن کو بعض اوقات

Giessler's Tubes بھی کہا جاتا ہے۔

جو کہ نظریہ برقیہ (Electron Theory) کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جو کہ مادی ذرات (Atoms) برقی سالیہ یعنی Negative Electricity کے نہایت ہی چھوٹے اور ننھے ننھے ذرات سے مرکب ہیں۔ اگر میں آپ کو بتاؤں کہ ایک پانی کے قطرے میں اربابا مادی ذرات ہوتے ہیں اور ایک مادی ذرہ بھی ہزار بار بقی ذرات سے مرکب ہوتا ہے اور پھر آپ کو یہ بھی بتاؤں کہ موجودہ سائنس نے اس قدر حیرت انگیز ترقی کی ہے کہ ہر ایک برقی ذرہ اور مادی ذرہ کا حجم اور وزن ہم کو معلوم ہو رہا ہے ضرور شروع میں میری بات کا یقین نہ کر سکیے لیکن اگر میں آپ کو ایک مثال سے ان ذرات کا صحیح اندازہ کرادوں تو شاید آپ کا تعجب و رعبی زیادہ ہو جائیگا۔ لارڈ کیلون ایک نہایت قابل اور زبردست سائنس دان ہو کر راجہ اسے ایک دفعہ تقریر کرتے ہوئے سامعین کو مادی ذرات کا حجم اور وزن سمجھانے کیلئے یہ مثال دی تھی۔ فرض کرو کہ پانی کا ایک قطرہ زمین کے برابر بڑا کیا جاتا ہے۔ اور اس قطرہ کے ذرات اس تناسب سے حجم میں جڑھتے ہیں تو اس زمین کے برابر بڑے قطرے پانی میں ذرات یعنی مائیکلو Molecules ٹینس بال کے برابر دکھائی دینگے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سائنس نے یہاں تک ترقی کی ہے کہ مادے کے چھوٹے سے چھوٹے ذرات تک کی ترکیب کا مطالعہ صحیح طور پر کر لیا ہے تو پھر مادہ فی الاصل کن اشیاء کا مرکب ہے مانا کہ مادی ذرات پانی ذرات (Electrons) کا مجموعہ ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ برقی ذرات یا وہ نامعلوم الہیئت طاقت جسے ہم لوگ عرف عام میں بجلی کے نام سے تعبیر کرتے ہیں کیا ہے بعض سائنس دان اس سے بھی آگے ایک قدم بڑھتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بجلی اس ایٹھ سے پیدا ہوتی ہے جو فضائے بسیط میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ تشریح اصلی مسئلہ پر بہت کم روشنی ڈالتی ہے کہ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہوتا ہے اور پانی کے قطر کا قطر زیادہ سے

زیادہ انچ کا بارھواں حصہ ہو سکتا ہے۔

سائنس دان نہیں جانتے کہ مادہ کا ایک ذرہ کس طرح بنا ہوا؟ اور یہ شکل ایسی ہو کہ باوجود اتنی ترقی کے سائنس دان اعتراف کرتے ہیں کہ سر دست یہ خیال بھی ان کے دماغ میں نہیں آ سکتا کہ مادہ کا ایک ذرہ کیسے بنا ہوا ہے جانیکیہ یہ دعویٰ ہو کہ ہم مادہ کا ذرہ بنا سکیں جب یہ حالت ہو تو آفرینش عالم کے متعلق ہزار تئیں ڈولنے جائیں سب کے سب محدود و غیر ملکتفی ثابت ہوں گے۔ ڈارون کا مسئلہ ارتقا بتاتا ہو کہ دنیا کی ترقی کس طرح ہوئی ہو۔ کس طرح چند سادہ قسم کے حیوانات سے ترقی کرتے ہوئے موجودہ زمانے کے بشمار مختلف الانواع چرند پرند وغیرہ مخلوقات پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن بتانا اصل ترین اور ناممکن ہو کہ کس طرح سب سے اول "چند سادہ قسم کے حیوانات" پیدا ہوئے۔

اس مقام پر پہنچ کر یہ بتا دینا لطف کے خالی نہ ہوگا کہ گذشتہ سال انگلستان کے سائنس دانوں میں اس امر کی ہل چل تھی کہ ایک صاحب مسئلہ حیات پر روشنی ڈالنے والے تھے جس طرح میں نے مادہ کے متعلق بتایا ہو کہ وہ برقی ذرات وغیرہ نامعلوم الہیت اجزاء سے مرکب ہے اسی طرح سائنس نے زندگی کے مسئلہ کے متعلق بھی بہت کچھ اختصار کی کوشش کی ہر شے کا تئیں الاوانی (Protoplasm) اور سیلون (Cells) کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہو لیکن جتنک مسئلہ حیات اور روح کے اصلی حل کے متعلق ہنوز روز اول کا معاملہ ہے اور نہ ہی سائنس کو امید ہو کہ صدیوں کے بعد بھی ایک ادنیٰ سے ادنیٰ کیرا پیدا کر سکے۔

یہی مسئلہ ارتقا نظام عالم کے مختلف افراد کی خلقت کے متعلق بھی بحث کرتا ہو۔ کہا جاتا ہو کہ اجرام سادی مثلاً ستارے سیارے آفتاب وغیرہ اجسام شروع میں گیس (Gaseous) یا بخور کی حالت میں تھے۔ صدیوں کے انجماد سے موجودہ حالت پر آئے ہیں ہمارے نظام شمسی کے متعلق یہ قیاس ہو کہ تمام سیاروں کی اصل

ڈال سکتی ہو اس واسطے کہ خود ایتھر کے متعلق ہماری معلومات نفی کے برابر ہیں نہ ہم اسے تول سکتے ہیں نہ جو سکتے ہیں نہ سگھ سکتے ہیں کسی جسے اسکا پتہ نہیں لگا سکتے اور نہ ہی کوئی اور سیدھا ذریعہ اس کے خواص کو مطالعہ کرنے کا ہمیں معلوم ہو۔ ہم چونکہ یہ بات مانتے ہیں کہ نور (Light) ایک طرح کا موج ہو اور موج کے لیے ضرور کوئی ایسی چیز ہونی چاہیے جس میں موج پیدا ہو سکے۔ اس لیے اس شرط کو مان کر بننے نوری موج کے میڈیم کو ایتھر کے نام سے لقب کیا ہو۔ اب صرف یہ کہنے سے کہ بجلی ایتھر میں ایک طرح کی مڑور (Strain) پیدا ہونے سے حاصل ہوتی ہو کہ کل یا مادہ کے متعلق ہماری معلومات میں ایک ماثہ بھر بھی اضافہ نہیں ہوا۔ بان ایک لمحہ کے لیے اگر یہ بھی مانا جائے کہ بجلی ایتھر پر مخصوص طریقوں سے عمل کرنے سے حاصل ہوتی ہو تو بھی سوال یہ باقی رہتا ہو کہ ایتھر کیا ہو؟ کیسے حاصل ہوتا ہو؟ اور کس چیز سے بنا ہو؟

اس لمبی بحث سے ہمیں چند ایک مفید مطلب نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ سائنس دان کا کام صرف یہ ہو کہ اشیاء اور حوادث کو ایک خاص حد تک لفظوں میں بیان کرے۔ وہ ہرگز اصلی اور حقیقی اسباب کی تحقیق نہیں کر سکتا۔ اس کا دریافت کردہ سلسلہ علت معلول کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ پس ہماری رسانی صرف ثانوی اسباب یعنی Secondary Causes تک ہو سکتی ہو۔ اصلی اسباب Primary Causes ہماری عقل و فہم سے بالاتر ہیں۔ ہم چیزوں کے متعلق کتنوں کا جواب دینے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ مادہ میں یہ خواص کیوں ہیں؟ ہم صرف اتنا بتا سکتے ہیں کہ یہ خواص اس طرح پر ہیں زیادہ سے زیادہ ہم ایک نظریہ (Theory) قائم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ چونکہ یہ خواص اس نظریہ کی رُو سے صحیح طور پر سمجھ میں آ سکتے ہیں اس لیے یہ نظریہ صحیح ہو۔ باوجود اپنی تمام کوششوں کے

۱۵۔ انگریزی اصطلاح میں ایسے جسم کو Medium کہتے ہیں جو دو مین ہیں کوئی اصطلاح اسکے مترادف نہیں ملتی۔

آفتاب کے حصے تھے جو کسی وجہ سے علیحدہ ہو گئے اور جسطرح کہ وہ ہے کا ایک گرم گیند ہوا مین پڑے رہنے سے ٹھنڈا ہو جاتا ہے اسی طرح سیال کرے ٹھنڈے ہو کر بجمد ہو گئے ہیں لیکن چونکہ آفتاب بہت بڑا ہے اسلئے ابھی تک اس کی حرارت بغیر کسی قسم کی نمایاں تبدیلی کے اسی درجہ حرارت پر قائم ہے۔ آپ کو تعجب ہو گا کہ آفتاب مین کو کسی ایسی چیز ہو جس کی بدولت یہ آگ سے زیادہ گرم رہتا ہو۔ پیشتر اس کے کہ مین حرارت شمسی کے سلسلہ بقا پر چند خیالات ظاہر کروں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حرارت شمسی کے متعلق چند اعداد و بتا دوں۔

مختلف دلائل سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہو کہ آفتاب ٹھوس نہیں ہو بلکہ اس کا اندرونی حصہ مائع اور سیال ہو اور بیرونی حصہ پر جلتی ہوئی گیسوں اور معدنی انجروں کے بادل مین جو سورج کے گرد بمنزلہ زمین کے کرہ ہوائی کے ہیں۔ بہت سے تجارب کی بناء پر یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ سورج کی گرمی ۶۰۰۰ سنٹی گریڈ درجہ حرارت کی ہو جس سے مراد یہ ہو کہ اگر برف اور بھاپ کی گرمی کے درمیان ۱۰ درجے سنٹی گریڈ کا فرق سمجھا جائے تو آفتاب کی گرمی اتنی تیز ہو کہ ۶۰۰۰ سے تعبیر کریں گے۔ اگر آپ کو مختلف معدنی اور غیر معدنی جسم کے پگھلنے اور کھولنے کے درجہ ہمارے حرارت کا اندازہ معلوم ہو تو آپ دیکھیں گے کہ سورج کی گرمی مین سب ٹھوس جسم مائع اور ہوائی حالت مین ہیں۔ سورج کی گرمی کا اندازہ ایک اور طریقہ سے بھی ہو سکتا ہے مختلف آلات کی مدد سے (جن کو مقياس حرارت الشمس کہتے ہیں) اس بات کا اندازہ لگانا کہ ایک مربع فٹ سطح زمین پر فی منٹ کس قدر حرارت پڑتی ہو چندین مشکل نہیں ہو لیکن ایک بڑی شکل یہ ہو کہ ہمارے اور سورج کی گرمی کے درمیان ہوائی ایک کثیف تہ ہو جو اس گرمی کا بہت بڑا حصہ یا تو جذب کر لیتی ہو یا فضا کے بیسیط مین منعکس کر دیتی ہو۔ بہر کیف یہ شکل بھی حل ہو سکتی ہو اور پھر ہم صحیح طور پر اس بات کا اندازہ لگا سکتے ہیں

کہ ۶ کروڑ ۲۴ لاکھ میل کی مسافت کے بعد ایک مربع فٹ پر کس قدر گرمی کی بارش ہوتی ہو۔ اب خیال فرمائیے کہ کرہ زمین کی سطح کے ہر ایک مربع فٹ پر کیسا مقدار مین گرمی کی بارش ہوتی ہو اور پھر خیال فرمائیے کہ سورج زمین کا خاص طور پر محافظ نہیں کرتا کہ زمین کی جانب زیادہ گرمی بھیجے اور باقی اطراف مین کم بلکہ امر واقع یہ ہو کہ گرمی کی بارش سورج کی سطح سے تمام اطراف و جوانب مین کیسا ہو رہی ہو گویا سورج کو مرکز مان کر ایک وسیع دائرہ کے اوپر جبکہ نصف قطر ۶ کروڑ ۲۴ لاکھ میل ہو مین اس حساب سے گرمی پڑتی ہو جس حساب سے کہ سطح زمین کے ایک مربع فٹ پر پڑتی ہو ۱۰ اس سے پوری مقدار گرمی کی جو سورج کی سطح سے باہر کی طرف آتی ہو معلوم ہو جاتی ہو۔ اب اگر اس مقدار کو سورج کی سطح سے تقسیم کر دیا جائے تو فی مربع فٹ سورج کی سطح سے جتنی گرمی فی منٹ نکلتی ہو اس کا اندازہ ہو سکتا ہو۔

صحیح تجربوں سے نتیجہ نکالا گیا ہے کہ فی منٹ سطح زمین کے فاصلے پر مین کیلوری گرمی پڑتی ہو جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہو اس دائرہ کا رقبہ جس پر اسی حساب سے گرمی پڑتی ہو (۳۱۴ × ۹۲۴۰۰۰۰۰) ۲ مربع میل ہو اور سورج کی سطح کا رقبہ (۳۱۴ × ۴۳۰۰۰۰) ۲ مربع میل ہو گویا کہ فی مربع فٹ سورج کی سطح فی منٹ ۳ × (۹۲۴۰۰۰۰۰ / ۴۳۰۰۰۰) ۲ کیلوری نکلتی ہو۔ لارڈ کیلون نے اندازہ کیا ہے کہ اگر سوا مربع گز سطح سورج پر ایک برتن رکھا جائے اور اس مین پانی کھولنے کے لیے ڈالا جائے تو فی منٹ جس قدر بھاپ اس برتن مین پیدا ہوگی اس سے ۸ ہزار گھوڑوں کی طاقت کے برابر کام لیا جاسکتا ہو۔ اب اگر اسی حساب سے تمام سطح ۱۵ ایک ہزار ایک کو ایک درجہ حرارت گرم کرنے کے لیے جتنی حرارت درکار ہوتی ہو اس مقدار کو گھوڑا کہتے ہیں ہرگز بی زبان مین ایک در کیلوری بھی مریج ہے جسے چھوٹی کیلوری کہتے ہیں اور اس کیلوری کا ہزار دان حصہ ہوتی ہو۔ ایک سیر پانی کو درجہ حرارت سے چھاپکے درجہ حرارت تک گرم کرنے کے لیے سو کیلوری کی ضرورت ہوگی۔

سورج کی گرمی کی طاقت کا اندازہ لگایا جائے تو عقل کو سخت حیرت ہوتی ہے۔ بعض سائنس دانوں نے حساب لگایا ہے کہ اگر سورج محض کوئلہ بنا ہوا ہو اور یہ کوئلہ آکسیجن گیس کی مدد سے پورے طور پر جلا یا جائے تب بھی جس حساب سے سورج میں گرمی خارج ہو رہی ہو اس حساب سے یہ کوئلہ کئی لاکھ برس تک تھوڑے عرصے میں جو چند ہزار سالوں سے زیادہ نہ ہوگا ختم ہو جائے گی۔ سائنس کے ذریعہ سے ہم کو معلوم ہے کہ سورج کی گرمی اسی طرح لاکھوں برس سے اسی حساب سے خارج ہو رہی ہے لہذا یہاں وہ نہایت اہم اور متمم بالشان مسائل حل طلب پیدا ہوتے ہیں۔ (۱) سورج کی گرمی کے ذخیرے کی بقا کن وجوہات پر مبنی ہو (۲) فی الاصل شروع میں یہ ختم ہو نہیو والا گرمی کا ذخیرہ کس طرح پیدا ہوا تھا۔ سائنس کی ترقی ملاحظہ ہو کہ ایسے ادق مسائل کا جواب ہم پہنچاتی ہے، وہ مسائل جو کہ قطعاً انسانی دسترس سے باہر ہیں۔ کہاں سورج اور کہاں چھوٹا سا انسان! لیکن خدا واد داغ کے کارنامے دیکھئے! یورپ والوں نے ایک بہت بڑی حد تک ان سوالات کا جواب بھی خاطر خواہ طور پر دیدیا ہے۔ اس تحقیقات کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ایک چھوٹے سے مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف اشارات کے طور پر اس تحقیقات کے نتائج بیان کرتے ہیں۔

کسی زمانے میں پہلے یہ نظریہ قائم ہوا تھا کہ بیرونی اجسام کے گرنے سے اور ان کی رگڑ سے سورج کی گرمی بڑھتی رہتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا شبابِ ثاقب جب زمین کے کرۂ ہوائی میں پہنچتے ہیں تو ہوا کی رگڑ سے جل اٹھتے ہیں اور ریزہ ریزہ ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اگر اسی طرح بیرونی جسام کافی مقدار میں سورج کی سطح پر گرتے ہوں تو سورج کی گرمی کے نقصان کی تلافی ہو سکتی ہے۔ لیکن مشاہدات سے ثابت ہوتا ہے کہ نظام شمسی میں اس قدر وافر مقدار میں ایسے مادی اجسام نہیں ہیں جو سورج کی گرمی کو اپنے صدیوں سے قائم رکھ سکیں کیونکہ حرارتِ شمسی کے سالانہ خرچ پورا کرنے کے لیے اتنے مادی اجسام کافی تیزی کے ساتھ سورج کی طرف گرنے

چاہئیں کہ ان کی مجموعی مقدار چاند کے برابر ہو جائے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی تشریحات شمسی حرارت کے بقا کے متعلق پیش کی گئی ہیں لیکن وہ سب کی سب فی زمانہ متروک ہیں۔ لہذا ہم ان سے قطع نظر کر کے موجودہ زمانہ کے آخری اور اغلب قیاس کو جسے سب سائنس دان تسلیم کرتے ہیں بیان کرتے ہیں۔ ایک جسم میں سائنس دان ہیلیم ہائیڈروجن کے داغ میں کیا ہی عمدہ خیال آیا۔ زمین کی کشش کی وجہ سے تمام چیزیں جو زمین کی سطح پر ہیں زمین کے مرکز کی طرف اس رفتار سے گرتی ہیں کہ ہر ثانیہ میں انکی رفتار میں ۳۲ فٹ کا اضافہ ہو جاتا ہو گا۔ ایک غیر متحرک جسم پہلے ثانیہ میں ۳۲ فٹ گرے گا۔ اسی طرح سورج کی کشش سے تمام جسم سورج کی سطح پر اس سے ۲ گنا زیادہ رفتار سے یعنی پہلے ثانیہ میں ۶۴ فٹ گرین گے۔ اس مقام پر ایک اور مسئلہ کا مختصر سا ذکر لازم آتا ہے۔ مائیکرو تھیوری (نظریہ اتصالی) کے مطابق جسام کے ذرے ہمیشہ متحرک ہوتے ہیں اور ان کی حرکت کا نام حرارت ہو گا۔ جتنی تیزی کیسا تھ جسم کے ذرے ہلتے ہوں اسی قدر زیادہ بڑھا ہوا اس جسم کا درجہ حرارت ہوتا ہے۔ اب خیال فرمائیے۔ گرمی کے اخراج یعنی شمسی حرارت کے سالانہ خرچ سے سورج کے مادہ کے ذرات کم تیزی سے حرکت کرتے ہیں لیکن سورج کی کشش کی وجہ سے یہ کمی پوری ہو ہی ہو۔ یہ اجمال بہت لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئیگا۔ اس کی توضیح اس طرح بھی ہو سکتی ہے کہ اگر ایک جسم ایک خاص فاصلے سے نیچے گرے تو اسکے صدمہ سے جو دسکی حرکت کے رکنے سے پیدا ہوتا ہے خاص مقدار گرمی کی پیدا ہوتی ہے۔ سورج چونکہ مائع اور ہوائی گرم اجسام سے بنا ہے، اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر ہر سال ٹھنڈا ہونے سے حجم میں جو کمی واقع ہوتی ہے اس سے سورج کا قطر صرف سوادد سو فٹ چھوٹا ہو تو جو اجسام بیرونی سطح پر واقع ہیں انکے مرکز کی طرف گرنے سے اتنی گرمی پیدا ہو سکتی ہے کہ سالانہ خرچ کو پورا کر سکے۔ یہ سوادد سو فٹ سالانہ قطر کی کمی اتنی قلیل مقدار ہے کہ

سوچ جیسے بڑے جسم میں صدیوں کے بعد بھی اس گھٹاؤ کا اثر ہلکا ہمارے
زبردست سے زبردست دور بیون کے ذریعہ سے بھی معلوم نہیں ہو سکتا۔
اس لیے اس قیاس کی براہ راست تصدیق ہونا مشکل ہے لیکن چونکہ
جو دلائل اس قیاس کے ثبوت میں پیش کی گئی ہیں سب نقص سے
مبرا ہیں اس لیے کسی اور بہتر قیاس کے نہونے کی حالت میں اسے عام
طور پر علمی دنیائیں صحیح مانا جاتا ہے۔

اب چھنے یہ تو ثابت کر دکھایا ہے کہ سوچ کی گرمی باوجود اس قدر
اصراف کے بھی کم ہونے سے محفوظ ہے لیکن دوسرا سوال باقی رہ جاتا ہے
کہ شروع میں یہ گرمی کیسے پیدا ہوئی؟ اس کے متعلق زیادہ رے زنی ابھی
تک نہیں ہوئی لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ اگر کرہ زمین سے نصف قطر کے
زمین کے مانند دو ٹھوس کرے ۹ کروڑ میل کے فاصلے پر واقع ہوں اور
بغیر کسی قسم کی مزاحمت کے وہ ایک دوسرے کے مرکز کی طرف کھینچ آئیں تو
پیشترع میں ان کی حرکت بہت سست ہوگی لیکن چھ ماہ کے بعد وہ
زور کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائیں گے کہ حرارت جو اس غم غناک
سدمہ سے پیدا ہوگی سوچ کی حرارت کے برابر ہوگی اور جو جسم صدمہ

کے بعد ان دونوں کے جماع سے پیدا ہوگا وہ حرارت کی شدت سے سوچ
کے برابر ہوگا اور اس کی گرمی کئی کروڑ سال کے لیے سوچ کی طرح کافی ہوگی
اس طرح بعض سائنس دانوں کا خیال ہے کہ ہمارے سوچ کی بھی ابتدا ہوئی
ہوگی کیونکہ اُن دن کے مشاہدات ثابت کرتے ہیں کہ ستاروں کی دنیائیں
نئے نئے سوچ پیدا ہو رہے ہیں جن کے ایک سخت غلوہ کی وجہ اسی طرح
بیان کی جا سکتی ہے۔

یہ ہیں حضرت انسان کے مزاج کی جو لانیان لیکن سائنس ترقی
کے باوجود یہ نہیں جاسکتی کہ وہ دو کڑے جن سے سوچ پیدا ہو سکتا ہے
میں کا ایک ذرہ بھی کس طرح پیدا ہوا؟ سائنس روح اور مادہ اور خلق عالم
کے متعلق آج اسی طرح عاجز ہے جس طرح صدیوں پہلے عاجز تھی۔ کیونکہ جو
سائنس آج اتنی ہی دور ہو جتنی ہمیشہ رہی ہو۔ گویا سائنس ان تینانی سال
پر کبھی روشنی نہیں ڈال سکی اور ہمارا یہ خیال ہے کہ کبھی بھی اپنی روشنی نہیں
ڈال سکے گی اور اسی طرح اب لا بات تک غیر مکمل رہیگی۔ البتہ سطحی معلومات
ہم پہنچاتی رہیں گی۔ ہمارے بعض ناظرین شاید اس مضمون کے مطالعہ سے ہمارا
ان یاسی نیز توقعات سے اختلاف کریں۔

فیروز الدین ملو

علم النجابت

چارلس ڈارون نے اپنی عمر بھر کی تحقیقات سے انسان کے
بسمانی قوا کے نمو اور ارتقاء کے تمام قوانین کو واضح کر دیا ہے اور اپنی وسیع
سائنس یعنی یوجینکس (Eugenics) کا ترجمہ ہے۔ یوجینکس یونانی زبان کی اصطلاح ہے جو "یوجن" سے نکلی ہے جس کے معنی "شریف زادہ اور نہایت شائستہ"
ہیں۔ ڈاکٹر فرانسس ڈالٹن نے سائنس میں پہلے پہل اس کو استعمال کیا۔ اس کے ذریعہ سے انھوں نے علم المعاشرے کا ایک جدید شعبہ کی بنیاد ڈالی اور اس کو ایک جدا گانہ شعبہ
علم سے موسوم کیا۔ اس کا مقصد ان اسباب و اثرات کی تحقیقات کرنا ہے جن کے طفیل سے بنی آدم کی جہلی غریبوں کی فوجہ کمال تک ہو سکتی ہے۔ یا بالفاظ دیگر یون
کے کہ نسل انسانی کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی جسمانی اور ذہنی تربیت و ترقی اس فوجہ علم کا مقصد اولیٰ ہے۔ اگرچہ علم النجابت کے حامیوں میں کلی اتفاق نہیں ہے کہ اس کے
بنیادی اصول کیا ہوں، مگر عام طور پر قانون توارث اور جدی اثر اسکی اصل ہیں۔

جسین انسان کے ہیٹ مین پڑنے اور مضغہ کے پردیش پانے اور پھر عالم موجودات میں غلو پر پیر ہو کر رفتہ رفتہ بڑھنے کا ذکر پایا جاتا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی اشاعت سے انسان کے علوم کی تاریخ میں ایک جدید دور کا آغاز ہوا اور بالکل نئے خیالات معرض وجود میں آئے۔ ارتقا کے دو مشہور اور معرکہ الآراء اصولوں کی اختراع بھی ڈارون کے نام سے ہمیشہ وابستہ رہیگی۔ ایک مشہور قانون نیچرل سلیکشن یعنی انتخاب طبعی یا فطری ترقی کا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قدرت نے جن جانداروں کو زیست کے واسطے منتخب کیا ہے انہیں اُسے سامان بھی دیا ہے جتنے ہیں اور جنہیں وہ زندہ اور قائم نہیں رکھنا چاہتی انہیں بسنے محروم کر دیا ہے اور وہ تھوڑے ہی عرصے میں نابود ہو جاتے ہیں۔ مگر وہ کس طرح ہلاک ہو جاتے ہیں یہ عمل کیفیات یعنی ارد گرد کے حالات اور اسباب کے ذریعے سے ہوتا رہتا ہے اور یہ قانون نباتات اور جانداروں پر یکساں عام ہوتا ہے کسکشن سلیکٹ یا جیولوجی کی طبعی صلاحیت جن جانداروں میں موجود نہیں ہو وہ اسباب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دوسرا قاعدہ انتخاب زناشوی (Sexual Selection) ہے یعنی جاندار اپنے حسبِ نسل اپنے واسطے زراور مادہ منتخب کرتے ہیں اور اس سے نوع یعنی اولاد کی جسمانی خوبیوں میں تغیر اور ترقی ہوتی ہے۔ انہیں دونوں اصولوں کی بدولت بن مانس اپنی حالت بدلتے بدلتے آخر کار انسان بن گیا، جو اشرف المخلوقات اور خداوند خلقت کہلاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ان ہر دو قدرتی اصولوں کے عمل میں رخنہ اندازی کرنا مناسب ہے؟ اس کا جواب ہم پہچانے سے پیشتر اسلاف کی تاریخ پر غور کرنا واجب معلوم ہوتا ہے انہوں نے اس مسئلہ کو کس طرح حل کیا تھا، اور ان کے ہاں افراد قوم کی جسمانی اور ذہنی تربیت اور ترقی کے لیے کیا انتظام تھا۔ تاریخ کے ابتدائی زمانہ میں ملک اسپارٹہ نے اپنی تمدنی ترقی اور ملک گیری کے لیے خاص شہرت حاصل کر رکھی تھی۔ اہل اسپارٹہ کا طرز معاشرت اور ملکی انتظام تھا

اعلیٰ سمجھا گیا تھا۔ وہاں لاکرگس نامے ایک نہایت مقتدر مقنن اور نہایت مشہور مدبر تھا۔ وہ سیاسیات کا ماہر اور موجد خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے تربیت جسمانی کا ایک طریقہ وضع کیا تھا جسکی رُو سے ان باب اپنے کمزور اور ناتوان بچوں کو جنگوں اور ہاروں میں بھینکنے پر مجبور کئے تاکہ وہ بھوک پیاس سردی اور گرمی کی شدت سے ہلاک ہو جائیں۔ اس مقصود یہ تھا کہ قوم کے درمیان دائم المرض اور ناتندرست افراد نہ رہنے پائیں جو اسکی قومی ملکی اور عام حالت کے زوال کے موجب ہو سکتے ہیں۔ لاکرگس کے قانون کے مطابق پیدا ہوتے ہی بچہ شہر یعنی ذیل میں تصور ہوتا تھا۔ سرکار کی طرف سے اسکی نگرانی اور پرورش ہوتی جب جوان ہو جاتا تو اسکی جسمانی قابلیت اور طاقت کا امتحان ہوتا۔ اس غرض سے اسے ارتس دیوی کے مندر میں لیجاتے اور کوڑے مار کر مار کر اسکی ہڈی اڑھیرتے۔ بہتے مرنے تک نہ کرتے اور اس آزمائش میں پورے کرنے والے شاہیر کے زمرہ میں شامل ہو جاتے۔ اسکی روزانہ زندگی سخت قواعد کے تابع رہتی اور جب پورا جوان ہو جاتا اور شادی کر لیتا تو اسے غلص قانون کی پابندی کرنی پڑتی۔ لاکرگس نے سب سے زیادہ زور تربیت جسمانی پر دیا تھا اور اسکا انجام یہ ہوا کہ وہاں نہایت قوی ہیکل اور توانا آدمیوں کی قوم پیدا ہو گئی۔ مگر انکی عقلی اور اخلاقی تربیت کا کوئی خاص انتظام نہ تھا جسکی وجہ سے وہ زہے جفاکش و لا در سپاہی رہے اور ملک گیری میں نام پیدا کیا مگر اپنے ہمسائے یونانیوں کی طرح علوم و فنون اور تمدنی لوازم کی ترقیوں میں غیر فانی شہرت حاصل نہیں کی اور اپنا اثر اپنے ارد گرد کی قوموں پر ڈالا۔ مگر جیسا زرق میصر (Xerxes) نے یونان پر بشمار فوج کے ساتھ حملہ کیا تو یونیند اس شاہ سپارٹہ نے دہڑا ملی میں صرف تین سو سپاہیوں کے ساتھ اس بقیاس لشکر کا مقابلہ کیا اور اسے ایک قدم آگے نہ بڑھنے دیا۔ ان جب ایک بے ایمان غدار ملک کی غداری سے ایرانی لشکر دوسرے راستے سے گزرا اور اسچان

مرد مٹھی بھر دستہ کے عقب پر جا پڑا تو ملک یونان کے ایک حصہ پر اسکا تسلط ہو گیا۔

طب کے وسیلے سے بنی آدم کو حید فائدہ پہنچا تو سیکڑوں امراض کی صحت ظاہر ہو چکی، اور ان کے مختلف علاج بھی معلوم ہو گئے ہیں۔ اسکے وسیلے سے انسان کو بہت آرام و آسائش پہنچ رہی جو دیگر کس بھی علم النجابت کے وسیلے سے اسے اس سے بھی زیادہ فیض پہنچنے والا ہو جن بیاریوں سے بنی آدم کو تکلیف پہنچتی ہو اسکے ذریعے سے انکا استیصال ہو جائیگا۔ اہل پارٹ نے تربت جسمانی کے وسیلے سے اس کٹھی کو سلجھایا تھا۔ مگر اس کا ایک جز انقص یہ تھا کہ اسکے روستے جن کمزور بچوں کو جنگل میں پھینک دیا جاتا تھا ان میں کئی ایسے بھی ضرور ہونگے جو اگر زندہ رہتے تو انکی غیر معمولی لیاقت اور دانائی نہ صرف اپنی قوم ہی کے لیے مفید ہوتی، بلکہ بنی آدم بھی مستقل فائدہ حاصل کرتے کیونکہ غیر معمولی ذہانت والے ہمیشہ توانا اور قوی ہیکل آدمی نہیں ہوتے۔

اب علم النجابت کے مسائل کی طرف رجوع ہونا چاہیے۔ کس وسیلے سے انسان کی عقلی اور جسمانی قوتوں میں ترقی ہو سکتی ہو؟ مرد و عورت کے تعلقاً کیسے ہونے چاہئیں؟ کیا مختلف نسلوں کے مرد و عورت کی شادی اس مقصد میں معاون ثابت ہو سکتی ہو؟ تمدنی معاملات میں حکومت کو کس حد تک دست انداز ہونا چاہیے؟ اور اس مقصد کی کامیابی کا معیار کیا ہو جس سے معلوم ہو کہ اس وسیلے سے ایک جماعت کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچا ہو؟ ان سوالات پر کیے بعد دیگرے بحث کی جائے گی۔

شادی | شادی کا دستور نہایت پُرانا اور واجب الاسترام ہے۔ اسے کچھ ایسے ادب کی نظر سے دیکھا جاتا ہو کہ بڑے سے بڑا رند بھی اسے ناپاک کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ گھر کے اندر جو راحت و آرام انسان کو حاصل ہوتا ہو اسے وہ بے زمین پر کسی دوسری جگہ یا کسی دوسری حالت میں ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ گھر اسکے خیالات کا مرجع اور اسکے جذبات کا مرکز ہو۔ دنیا کے دکھوں اور تکلیفوں سے بچنے کی پناہ یہی گھر ہے۔ یہاں سے

کیسے کیسے تجربے حاصل ہوتے ہیں جن سے وہ کسی، اور جگہ و جہان میں ہوتا ہو۔ ہر زمانے کے شاعر اور فلاسفہ گھر کی خوشیوں کا چرچا کرتے رہے ہیں۔ جابجا میان بیوی اور مان باپ اور اولاد کے نازک و زخموں اور تعلقات کی تعریف کی گئی ہے، اور یہ مضمون ہمیشہ تازہ اور پر لطف رہتا ہو، مگر زمانہ حال کے تمدن کی ضروریات اور نمود و نمائش کی وجہ سے رہتے رہنے کے اخراجات کچھ ایسے بڑھ گئے ہیں کہ شادی صرف امیروں کیلئے مخصوص ہو رہی ہے معمولی لوگوں میں یہ مقتدرت کہاں کہ وہ اس سے خطا اور خوشی حاصل کریں اور آرام و آسائش کی زندگی گزاریں بزدل مادہ کے درمیان جو کشش باہمی موجود ہو وہ قدرت کی طرف سے دلیت ہوتی ہو اور کشمکش نسل بڑھانے اور قائم رکھنے کی موجب ہوتی ہو۔ اگرچہ نہ تو تمام جاندار حیوان اور انسان نابود ہو جائیں۔ زنا شوقی کے جذبات قدرت کے عطیہ ہیں جنہیں اگر ناجائز طریقے سے پورا کیا جائے تو انسان کو اسکا خمیازہ اٹھانا پڑتا ہو اور قدرت کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہو۔

نہایت ابتدائی زمانے میں سب بنی آدم تمدن کے نہایت ابتدائی مراحل میں تھے تو عورت کو زبردستی پکڑ کر بیوی بنا لیا جاتا تھا۔ یہ کام صرف شہزادوں اور بہادر آدمی انجام دے سکتا تھا اور وہی اس سے مستفید ہوتا تھا۔ مگر جب اسنے شائستگی میں ترقی کر لی تو اسکے خیالات میں تبدیلی واقع ہوئی۔ تمدنی طریق میں بھی نمایاں انقلاب ہوا۔ عورت کو پکڑنے کے بجائے انتخاب اور باہمی رضامندی سے باقاعدہ بیاہ ہونے لگا اور یہ ایک دستور قرار پا گیا۔ مان باپ کو اپنے لڑکے لڑکیوں کے بیاہنے کا خاص اختیار مل گیا۔ اور انکی رضامندی اس معاملے میں ضروری قرار پائی۔ پردہت نے اپنی پرہیزی کا اسمین بھی دخل دیا اور اسے ایک مقدس رسم میں منتقل کر دیا۔ اسنے بیان تک اقتدار حاصل کر لیا کہ جسمیں وہ شریک نہ تو مادہ کام واجب اور درست نہ سمجھا جاتا۔ مسلمانوں اور مسیحیوں میں قانون کے وسیلے سے شادی منع ہو سکتی تو

اور میان بیوی کے تعلقات منقطع ہو سکتے ہیں مگر ہندوؤں میں یہ نہیں ہو۔ لیکن علمی ترقی کے ساتھ ساتھ شادی کو ہنگامی مذہبی اہمیت سے خارج کرنے اور اسے بالکل ایک معاہدہ بنانے کا خیال پیدا ہو گیا ہو۔ لیکن وہ زمانہ دور ہے جب مرد و عورت تھوڑے عرصے کیلئے ایک دوسرے سے تعلق پیدا کیا کرینگے۔ لیکن جب کبھی ایسا دستور رائج ہوگا اسوقت نظام تمدن میں عظیم تغیر واقع ہوگا۔ اسکی موجودہ صورت بالکل قائم نہ رہیگی۔ یہ گھر گھر نہ رہیگا بلکہ ایک قسم کا کلب ہوگا تعلقات زناشوی بالکل کمزور ہونگے۔ مان باپ اور اولاد کے تعلق ہی پرے نام ہونگے۔ مرد کے بجائے عورت کا درجہ ترقی پکڑے گا جس طرح اب عورت مرد سے ڈرتی رہتی ہے، اسوقت مرد کو کھایا کریگا۔ عورت کا جب جی چاہیگا کسی اور مرد سے تعلق پیدا کرے گی اور مرد کو دوسری جگہ جانا پڑیگا۔ زندگی کا کاروبار مرد کریگا۔ عورت گھر کی ملکہ ہوگی اور وہ جیسا چاہیگی حکومت کرے گی۔ جو عورتیں مان بننے کے ناقابل ہونگی وہ اپنی اور مرد کی خوشنودی طبع کے واسطے زندگی بسر کریں گی۔ افلاس عورتوں کو اس رشتے سے باز نہ رکھے گا۔ ولیز کہتا ہے۔ ”بچے جننا حکومت کی خدمت کرنا“ اور زندہ رہنے کا جائز استحقاق ثابت کرنا ہے۔ جو عورت مان ہو یا جو مان بننے والی ہو، وہ مشاہیر، عزت، آزادی اور پرورش کی ویسی ہی مستحق ہے جیسا پولیس کا کانسٹیبل“ مگر یہ ایسا خیال ہے جو صدیوں کے بعد پورا ہوگا۔

مختلف نسل کے لوگوں کیلئے مختلف نسلوں کے مرد و عورت کی شادی مصلحت کا ناظر رشتہ۔ آمیزہ ہو؟ اسکی بابت عالموں کے خیالات مختلف ہیں۔ ایک جا پانی مدبر نے چند برس ہوئے ہرٹ اسپنسر سے یہ مشورہ طلب کیا تھا کہ ہم جاپانیوں کی نسل بڑھانے کے لیے یورپین قوموں سے شادیاں کرینگے خواہشمند ہیں۔ آپ کی کیا رائے ہے؟ اسپنسر نے اس تجویز سے اختلاف کیا تھا۔ یورپ والے غیر نسلوں سے شادیاں کرنے کو تیار نہیں ہیں اور اسکی وجہ محض قومی گھمنڈ ہے۔ وہ خود کو دوسروں سے برتر

سمجھتے ہیں اور اسلئے ان سے شادی کرنے کے خلاف ہیں۔ آریہ قوم میں بھی یہ گھمنڈ تھا۔ جب وہ وسط ایشیاء سے نقل مکان کر کے جنوبی ملکوں کو آئے اصل باشندوں سے انہیں نفرت تھی اور آج کے دن تک یہی بات پائی جاتی ہے۔ مگر تاریخ سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ مختلف نسل کے مرد و عورت کی شادی سے بُرے نتائج نکلتے ہیں۔ انگریز تمدنی ترقیوں میں سب قوموں سے بڑھے ہوئے ہیں حالانکہ وہ کئی مختلف نسلوں کا مجموعہ ہیں صدیوں کے اختلاف سے یہ قوم وجود میں آئی ہے لیکن نتائج خلاف توقع نہیں نکلتے۔ اونچی ذاتوں کے ہندوستانیوں اور انگریزوں کی رشتہ داریوں سے کوئی برا نتیجہ برآمد نہیں ہوا ہے۔ مذہب آدمیوں کو خواہ وہ کسی ملک و نسل کے ہوں ایک نمونہ اور ایک ڈھنگ کا ہونا چاہیے۔ مناسب نہیں ہو کہ آریہ، سنگولین، ٹیوٹائی، اور سمیٹیلی نسلیں ایک دوسرے سے جدا جدا رہیں مگر بعض قومیں اپنے کو دوسروں سے افضل تر اور انکی حکمران سمجھتی ہیں اسلئے وہ سب سے الگ رہنا پسند کرتی ہیں لیکن جب ملک گیری کا خیال بالکل کمزور ہو جائیگا اور لشکر کشیاں بند ہوں البتہ شاہ پرستی اور حکومت کے گھمنڈ کا خیال بھی مٹ جائیگا۔ اسوقت ایسے لوگوں کی ایک عظیم قوم ہوگی جو معمولی نسلی تعلقات سے پاک اور نہایت شاندار ہوگی۔ وہ گھمنڈ اور غرور سے بیگانہ ہوگی۔ خون کے رشتہ کی اتنی قدر دان نہیں ہوگی جتنی فائدہ کے اشتراک کی۔ ولیز مشہور ناول نویس اس حالت کو کمائی تمدنی حالت قرار دیتا ہے۔

قربت کی شادیاں اگر اولاد میں کوئی خاص قسم کی خصوصیات پیدا کرنا چاہو، تو بہت قریبی رشتہ کے لڑکے لڑکی کی شادی کرنا چاہیے۔ لیکن اگر اس اصول کے عمل درآمد میں حداعت ال سے تجاوز کیا جائے تو نسل بگڑ جاتی ہے۔ بلکہ اسکے غائب ہو جائیگا اندیشہ ہے۔ مسلمانوں میں چھپرے بھائی بہنوں کی شادی جائز ہے۔ مگر اس سے جو نتیجہ نکلا ہے وہ بہت حوصلہ افزا نہیں ہے۔ قوی ہیکل اور قدر آور افغانوں کی اولاد کو

بعد بنون میں تبدیل ہو گئی ہو۔ گو اس امر کو بھی مد نظر رکھنا چاہیے کہ ہندوستان کی آب و ہوا کا جسم پر مضر اثر ہوتا ہے لیکن مسلمانوں کے اسو اور قومین بھی تو ہیں جن کی قوت جسمانی اور دماغی جون کی تون سے۔ آب و ہوا کے ناگوار اثر سے ان میں کوئی انقلاب واقع نہیں ہوا۔ چند اور بھی اسباب ہیں جنہوں نے افغانوں کی نسل کو بگاڑ دیا ہے اور انہیں سبک بڑا چھپرے بھائی بنو گئی آپس کی شادی ہو۔ خالہ ماموں، چھوٹی کی بیٹی سے بھی شادی روا سمجھی جاتی ہے اور اس کا فز یا جوگیل اثر نسلی زوال ہے۔

تمدنی معاملات میں | جون جن تہذیب ترقی کرتی ہے انسان کی آزادی پر حکومت کی دست اندازی | نئی پابندیاں عائد ہوتی جاتی ہیں جس سے مقصود فلاح عامہ ہے۔ مہذب حکومت کے زیر اثر رہنے والے آدمی بخوشی اپنی کوار کی آزادی اسکے پر کرتے ہیں اور اسکے قوانین و احکام کی بے چون و چرا متابعت کرتے ہیں۔ مگر تمدنی معاملات میں ریاست کی دست اندازی مناسب نہیں تاکہ افراد بطور خود اپنی انیوالی نسل میں جیسی خصوصیات چاہیں اپنے حسب منشا پیدا کر لیں مگر حفظان صحت کے قواعد پر عمل پیر ہونا تمام وفادار شہریوں کا فرض ہے، جو حکومت انکے فائدے کیلئے وضع کرتی ہے اور جب موجودہ نظام تمدن برہم ہو جائیگا تو حکومت کونسے قواعد وضع کر کے حق ملکیت اور شہان باپ کی آمدنی میں اولاد کے حصے کے متعلق نافذ کرنے پڑینگے حکومت کیلئے مناسب ہوگا اگر وہ شادی کی نسبت خاص قواعد جاری کرے تاکہ مرد و عورت قومی بہتری کی خاطر خاص مقصد سے شادی کریں۔ مگر گھر کے انتظام اور تعلقات زناشوی میں حکومت کو کوئی دخل نہیں دینا چاہیے۔ سردست یہ کہنا دشوار ہے کہ آئندہ زمانہ میں نظام مجلس کیا ہوگا۔ مگر رخ زمانہ سے اسکی نسبت کچھ خیال ہو سکتا ہے۔

مرد و عورت | آنے والے زمانے کے نظام تمدن میں مرد و عورت کا زیادہ مخت اور کے تعلقات | کے کام کرینگے جیسے انتظام ملک انجینری ریل کا انتظام

سپاہ بھرو وغیرہ، معلمی اور ڈاکٹری، فنون لطیفہ، پوشاک تیار کرنا اور اسی قسم کے ہلکے کام عورتوں کے سپرد ہونگے۔ زندگی کے تمام کاروبار مردوں اور عورتوں میں مساوی منقسم ہونگے گو اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ کوئی خاص کام مردوں یا عورتوں کے لئے مخصوص ہوگا۔ اس کا یہ انجام ہوگا کہ سوسائٹی کے تمام کام با حسن الوجہ انجام پذیر ہونگے۔ انتظام بہت عمدہ ہوگا کیونکہ مرد و عورت آپس میں ایسے کام بانٹ لیں گے جن کے انجام دینے کی ان میں طبعی قابلیت اور میلان ہوگا۔

آنے والے زمانے کے آدمی | دور راقتادہ مستقبل میں کیسے آدمی ہونگے؟ انکی عقلی اور جسمانی حالت کیسی ہوگی؟ اسپر غور کرتے وقت دماغ چکرتین آجاتا ہے وہ شہزوری میں اسفندیار اور وجاہت میں یوسف اور عقل میں خدا کی مانند ہونگے۔ اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ وہ پانی پر چلے گا۔ ہوا میں اڑیگا۔ منگل اور سر کے لوگوں سے نامہ و پیام جاری کریگا۔ عالم ایتھر کی سیر کرے گا۔ کائنات کے اسرار مخفی کو افشا کرے گا اور آب حیات ڈھونڈ نکالے گا۔ سنگ پارس بھی بنالے گا۔ الغرض ایسے ایسے کام کریگا جو اس وقت وہم و گمان سے بعید معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت علم کے حدود نہایت وسیع ہونگے۔ ٹینی سن کہتا ہے ”عورت کا جس بات سے بھلا ہوتا ہے اس سے مرد کا بھی بھلا ہوگا۔ وہ دونوں ایک ساتھ آسمان شہرت پر چڑھیں گے یا قعر سئلات میں گرین گے۔“ اس زمانے کے انقلاب میں عورت کو بڑا دخل ہوگا۔ اسکے توسط سے بڑے بڑے کام ہوں گے وہ حسن میں ماہتاب سے بھی بڑھ جائیگی۔ وہ اپنے شوہر کے لئے دیوی اور آنے والی بود کی مان، اور عیش پسند لوگوں کے لیے پری ہوگی۔ اپنی موجودگی سے زندگی کے تاریک حصوں کو روشن اور زحمتوں کو زحمتوں میں منتقل کرے گی۔ وہ ”زندگی کا تاج“ اور ”دنیا کا نور“ ہوگی۔

کاسیانی کا معیار | اہل استفادہ کہتے ہیں کہ زندگی کا مقصد سب زیادہ

فیض پہنچانا اور حاصل کرنا ہو مگر قدرت اسکی قائل نہیں ہو۔ وہ کیفًا اور کروہ میں کمال کے مطابق انواع تیار کر سکتی ہو۔ وہ ایک خاص نمونہ قائم رکھنے کے لیے سیکڑوں جانوں کو قربان کر دیتی ہو جیسے روزمرہ کمزور بچوں کے مرنے سے ظاہر ہوتا ہو۔ مگر جنہیں وہ زندہ رکھنا چاہتی

ہو، انہیں اسے جہد الحیوۃ کیلئے دیے ہی سامان بھی عطا کر رکھے ہیں، اور اسی طرح وہ ترقی کرتے ہیں۔ موجودات ایک منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں، جہاں وہ سب ایک نئی صورت اور ڈھنگ میں ظاہر ہونگے، شمس ابدی اور وہ کائنات اس سے بہت مختلف ہوگی۔

نظام شمسی

کی تازہ ترین صورت ہو۔ اس سے فرانسیسی فلکی لاپ لیس کے نظریہ کی تردید ہوتی ہو جس نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ آفتاب اور اس کے لواحقین گول قرص ایسی شکل کے سحاب سے پیدا ہوئے تھے، جو سورج کے کرہ کے ارد گرد پھیلا ہوا تھا مگر رفتہ رفتہ سرد ہو کر سکڑا گیا اور اس سے اجرام فلکی بننے چلے گئے اور کئی قسم کے خیالات بھی اجرام فلکی کی ابتدا کی نسبت مشہور ہیں جو ارتقا سیارگان میں مذکور ہو۔ مگر یہاں پر ان کے تذکرہ کی چندان ضرورت نہیں ہے البتہ سیاروں کا ذکر بہت ضروری ہے۔

نظام شمسی سورج کے قریب مختلف فاصلوں پر چار سیارے ہیں منگل (مرخ) کے چار گروہ ان چاروں میں آفتاب سے بہت دور ہو، یعنی چودہ کروڑ دس لاکھ میل اور بدھ قریب ترین ہو یعنی تین کروڑ ساٹھ لاکھ میل پر واقع ہو۔ گویہ چاروں سیارے جسامت میں ایک دوسرے سے بہت مختلف ہیں مگر یہ ایک جداگانہ طبقہ سے متعلق اور ایک دوسرے سے مشابہ ہیں۔ یہ اراکین نظام شمسی کا اول گروہ ہو۔ دوسرا طبقہ اس سے چونتیس کروڑ میل پر واقع ہو اور یہ فاصلہ بہت وسیع ہو۔ اس دوسرے طبقے میں چار سیارے ہیں بڑھت۔ سیچر۔ یورے۔ نیس اور پون۔ بڑھت کو ارض سے تیر سو گنا بڑا ہو۔ باقی سیارے اس سے بہت چھوٹے ہیں مگر سب بہت دور دور ہیں یعنی آفتاب سے تین ارب میل کے درمیان گردش کرتے ہیں۔ گویہ سیارے اس دنیا کے پیمانے کے مطابق ایسے ہونا کفایت پر

کائنات کے اندر جتنی عجیب و غریب اشیاء ہیں ان میں شاید آسمانی درخشان کرہ سب سے زیادہ عجیب جسمین بعض وقت گول چکر دار بادل دکھائی دیتے ہیں جو چکر دار سحاب کے نام سے مشہور ہیں جب انسان ان کے ہولناک حجم اور انکی ماسیت پر غور کرتا ہو تو عقل چکر میں آجاتی ہو۔ علمائے کتب میں کہ اجرام فلکی شروع میں اسی درخشان بادل سے ماخوذ ہوئے تھے اور افلاک ابتدا آئندہ زمانے کے سورجوں اور عالموں کی ہستی بھی اسی نورانی درخشان سحاب کا مادہ میں مضمر ہو۔ یہ خیال بظاہر بہت عجیب معلوم ہوتا ہو لیکن جب صلیت پر نگاہ ڈالی جائے تو اسکی معقولیت عیاں ہو جاتی ہو جب اشیاء اور طبیعیات کے اصول سے کام لیکر مشاہدہ فلکی کرتے ہیں تو یہ امر معقول معلوم ہونے لگتا ہو کہ اس سحاب میں نظام ہائے شمسی اور عالمات لگان پہنان ہیں۔ مسٹر ولیم سدر لینڈ نے حال ہی میں مشاہدوں کی بنا پر استدلال کر کے یہ ظاہر کر دیا ہو کہ شروع میں ہمارے نظام شمسی کا مادہ بھی ایک اسی قسم کا سحاب تھا جسکے دو بازو تھے۔ وہ اندرونی حرکت کے سبب رفتہ رفتہ سرد ہو گئے اور اس کے حصے الگ ہو کر خامین اور اُٹھڑا دھڑ پھیل گئے جیسے بدھ جو نظام شمسی میں سب سے چھوٹا ہو، اور سبکی کثافت آٹھ نیلٹن اور بڑھت جو عظیم ترین ہو، اسکی کثافت اس سے بھی کہیں زیادہ ہو اور آفتاب جو مرکز میں ان کو سمیٹھالے ہوئے ہیں ان سب لاکھوں گنا زیادہ کثیف ہو اور یہ سب جرام اسی عظیم الوسعت سحاب سے بنے ہیں۔ یہ خیال مسئلہ سحاب

واقع ہیں لیکن اگر ان کے اپنے کے لیے آسمانی پیمانہ سے کام لیا جائے تو یہ فاصلہ ایسا ہو جیسا دس پندرہ گھنٹے کا تیز رو ریل گاڑی کا سفر کیونکہ دوسرا نظام شمسی (الفا سنٹور) ہمارے آفتاب سے دو پدم ساٹھ کھرب میل کے فاصلے پر واقع ہے اور اس سے ادھر اور کوئی آفتاب نہیں ہو سکتا۔ نہ چوں سے پندرہ سو گنا بڑا ہے، اور نہ پھر سے صرف دو چاندیوں کہنا بجا ہوگا کہ برہسپت (مشتري) سورج کو چھوڑ کر باقی تمام اراکین نظام شمسی سے کچھ سو گنا بڑا ہے اور آفتاب ان سب سے سیکڑوں گنا بڑھکر ہے۔

ان دونوں قسم کے سیاروں میں جن کا ذکر ہوا ہے، نہ صرف جسامت ہی کا فرق ہے بلکہ انکی طبعی حالت بھی بہت مختلف ہے یعنی چھوٹے سیارے بہت وزنی اور ٹھوس ہیں اور بڑے سیارے اپنے حجم کے مقابلے میں ہلکے ہیں۔ یا یوں کہیے کہ سیارگان میں کثافت میں بڑے بڑے سیاروں سے بڑھکر ہیں۔ مثلاً اگر کوئی ایسا عظیم الحجم تالاب ہو جس کا طول و عرض لاکھوں میل کا ہو اور اُس میں سینچہ کوڈالا جائے تو وہ تیرتا رہیگا اور مشتري آہستہ آہستہ ڈوب جائے گا۔

ان دونوں طبقوں کے درمیان جو فاصلہ ہے اس میں چھ سو کے قریب دو چھوٹے چھوٹے سیارے ہیں۔ ان میں جو سب سے بڑا ہے اس کا قطر پانچ سو میل اور خورد ترین کا دس میل ہے۔ یہ اسٹارٹ (Asteroids) کہلاتے ہیں۔ یہ متعلقین آفتاب کا تیسرا گروہ ہے جو کئی باتوں میں دوسرے طبقوں سے مختلف ہے یہ نئے نئے سیارے ایک دوسرے کے مرجع آپ ہی بنے ہوئے ہیں۔ چوتھا طبقہ متعلقین شمسی کا مدار ستارہ میں جنکی سفید سفید چوٹیاں گاہ بگاہ ہزاروں لاکھوں میلوں تک پھیلی ہوئی نظر آکر کرتی ہیں۔

آفتاب عالم تاب | آفتاب کا درجہ نظام شمسی میں وہی ہے جو ایک خاندان میں باپ کا جیسے باپ کے بغیر اولاد ناممکن ہے اسی طرح اراکین نظام شمسی کا وجود و قیام سورج کے بغیر محال ہے۔ اس کا حجم دیگر سیاروں کے مجموعی حجم سے

آٹھ سو گنا زیادہ ہے، اور کرہ ارض سے تین لاکھ تیس ہزار گنا بھاری ہے۔ اسکی جسامت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نظام شمسی کے اراکین آفتاب نے ایک نہایت شاندار اور ضروری حصہ لیا ہے عالموں کا یہ خیال ہے کہ سورج کا انقباض ہنوز جاری ہے اور اب تک بالکل دھانی حالت میں ہے اور اسکی جو قوت انتشار حرارت سے ضائع ہوتی ہے اسکی کمی اسکے عمل انقباض سے پوری ہوتی رہتی ہے۔ اسکی موجودہ کثافت پانی سے کچھ آگنا ہے۔ عالم کہتے ہیں کہ انتشار حرارت کا خسارہ عمل انقباض سے اسی صورت میں پورا ہو سکتا ہے کہ ڈھائی سو فٹ قطر ہر سال سکڑتا رہے چونکہ آفتاب کا قطر آٹھ لاکھ ساٹھ ہزار میل ہے، اس لیے اسکے انقباض کا اثر دس ہزار سال تک ہمارے آلات پر ظاہر نہیں ہو سکتا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اسی طرح آفتاب سکڑتا چلا جائے تو کتنے ہزار سال بعد اس کا منبع حرارت ختم ہو جائیگا۔ اگر حرارت موجود شرح سے خارج ہوتی رہی ہو تو حساب سے یہ ظاہر ہوگا کہ ڈھائی کروڑ سال سے عمل جاری ہے اور اگر آئندہ بھی اس کا سلسلہ اسی طرح جاری رہے تو پچاس اور ستر لاکھ سال کے مابین اس کا قطر سکڑ کر نصف ہو جائیگا انقباض کے ساتھ اسکی کثافت اب سے آٹھ گنا ہوگی اور درجہ حرارت اتنا بڑھ جائیگا کہ اراکین نظام شمسی تک اتنی حرارت نہیں پہنچے گی کہ وہ آبادی کے قابل ہوں۔ عالمان ارضیات کا یہ خیال ہے کہ کرہ ارض دس کروڑ سال سے جانداروں کی زندگی کی پرورش اور قیام کے قابل پہلی آئی ہے۔ اس تضاد کے رفع ادا کے لیے فلکیوں نے خیال قائم کیا ہے کہ سورج کی حرارت اگلے زانوں میں اسی شرح سے خارج نہ ہوتی تھی، جس سے آج کل ہو رہی ہے۔ حال ہی میں عالموں نے سورج کی معزول قوت کی بہم رسانی کی بابت یہ قیاس لگایا ہے کہ اس کے اندر ٹیم ہے جسکی بدولت اس کا وجود لاکھوں اور کروڑوں برس تک قائم رہے گا۔

تھوڑے عرصے سے بعض عالموں نے یہ اندازہ لگا دیا ہے کہ سورج کی حرارت زمین پر کیساں نہیں پہنچتی بلکہ اس میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہوگی اور یہ تفاوت دس فیصدی ہوتی ہوگی۔ یہی حال آبی اور اکیں شمسی کا بھی ہوئے سورج کی گرمی ان کے ہاں بھی اسی حساب سے نہیں پہنچتی۔ اسکی ایک وجہ وہ داغ ہیں جو کبھی کبھی سطح آفتاب پر ظاہر ہوتے رہتے ہیں اور کبھی کبھی عجیب قسم کی گیسوں بھوت نکلتی ہیں، جیسے آتشخیز ہار سے آگ اور دھواں نکلتا ہے۔ اس سے سورج تغیر پذیر ستارہ معلوم ہوتا ہے مگر یہ تبدیلیاں آسانی سے نہیں پہچانی جاتی ہیں یہ تبدیلیاں آئندہ بھی ہوتی رہیں گی لیکن وہ کیسی ہونگی؟ اسکا جواب دینا محال ہو لیکن عالموں نے حال میں یہ دیکھا ہے کہ تارہ مارہ سیٹی (Miraceti) کے تبدلات سورج کے نسبت ہزاروں گنا زیادہ وسیع دیکھے گئے ہیں اور وہ اپنی نوعیت میں شمسی انقلابات کے بہت مشابہ پائے گئے ہیں۔

ستارہ عطارد (عطارد) سب سیاروں میں چھوٹا ہے۔ نظارہ آفتاب کے کچے بچوں میں سب سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ مگر اسکو سن رسیدہ بونہ کہنا چاہیے۔ اسکی حرکت کی تیزی کا سبب اسکی قرب آفتابی ہے۔ اسکا دائرہ گردش بے ٹھکانے ہے۔ اسلیئے چھ ہفتوں کے اندر اسکی رفتار تیس اور پینتیس میل فی سکند کے درمیان رہتی ہے اور اس انسان میں جو حرارت اور گرمی آفتاب سے نکل کر اس کے ہاں جاتی ہے وہ کبھی دو چاند اور کبھی نصف ہو جاتی ہے۔ بدھ کہہ ہوا سے محروم ہے اسلیئے وہاں پانی کا وجود عقلاً سمجھا جاتا ہے۔ اسکی کثافت سیسہ اور پارہ کے برابر سمجھی جاتی ہے۔ یہ اپنے محور پر ایسی تیزی سے نہیں گھوم سکتا جس سے دن اور رات پیدا ہوتے ہیں چونکہ سورج کے بہت قریب ہے اسلیئے اسکی سطح سخت اور خشک ہو گئی ہے۔ ان باتوں سے فلکیوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ بدھ ارتقا کے آخری مرحلہ میں ہے۔ مگر اس سے یہ نہیں مفہوم ہو سکتا کہ بدھ آفتابی خاندان میں پہلوا ہے۔ بلکہ اسکا اصل سبب یہ ہے کہ اسکا حجم بہت چھوٹا ہے اسلیئے

بہت جلد سجائی بجائے اُڑ گئے اور یہ ٹھوس ہو گیا۔ اسکا قطر تین ہزار میل اور اسکا سال اٹھاسی دن کا ہوتا ہے۔

زہرہ کی سرگشت (شکر) آفتاب اور چاند کے سوا سب سے زیادہ درخشان ہے۔ صبح یا شام کو نظر آتا ہے۔ کرہ ارض سے دوسرے درجے پر اگر کوئی سیارہ جائزہ لے کر دیکھے کہ اس کے لیے موزوں ہے تو وہ شکر ہے اسکا قطر سات ہزار سات سو میل ہے۔ گویا یہ کرہ ارض کا توام بھائی ہے۔ اسکی کثافت زمین سے کچھ کم ہے یعنی اگر ہم میں سے کوئی آدمی سطح زہرہ پر جاسکے تو اسکا وزن یہاں سے قدرے زیادہ ہوگا۔ یہ سیارہ سورج سے پونے سات کروڑ میل ہے۔ وہاں پر سورج کی حرارت اور روشنی زمین کی نسبت دو چاند پہنچتی ہے۔ چونکہ اسکا دائرہ گردش سب سیاروں سے زیادہ مدور ہے اسلیئے سالانہ تبدیلیاں بہت کم ہوتی ہیں۔ علاوہ ازیں اسکا کرہ ہوا بہت وسیع ہے جسکی بدولت وہ آفتاب کی تیزی سے بچ سکتا ہے۔ اسکی سطح دور بین سے دکھائی نہیں دیتی۔ اسلیئے اس کے جغرافیہ سے ہم ناواقف ہیں۔ پروفیسر رچی ول ٹول کا یہ خیال ہے کہ یہ سیارہ اپنی محوری قوت سے اتنا محروم ہو گیا ہے کہ وہ آفتاب کے گرد صرف ایک مرتبہ چکر لگاتا ہے جسکی وجہ سے اس کے ایک حصہ پر دائمی رات اور دوسرے پر استمراری دن رہتا ہے۔ مگر اور عالم اس خیال کو تسلیم نہیں کرتے۔ بولسکی روسی فلکی نے اپنے مشاہدوں سے یہ اظہار کیا ہے کہ شکر کا دن ساڑھے چونتیس گھنٹے کا ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ ہو سکتا ہے کہ وہاں ہم سے زیادہ ذہین ہستیاں رہ سکتی ہیں جب شکر زمین اور آفتاب کے درمیان سے گزرتا ہے تو اسکا فاصلہ صرف دو کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہوتا ہے۔ اس سے نزدیک تر کوئی سیارہ نہیں آتا ہے۔ اس سے بعض دل چلے عالموں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ایتھر تار برقی کے ذریعے سے شکر کے باشندوں سے نامہ پیام کا سلسلہ قائم کرنا چاہیے۔ مگر سائنس ایسی باتوں کا قائل نہیں ہے۔

میرخ کا قصبہ (منگل) اول طبقہ میں سب سے دور افتادہ اور بڑھ کے سوا سب چھوٹا ہے۔ اس کا قطر بایلیس سو میل ہے اور اس کی مساحت کرہ ارض کے ۰.۰۲۸ کے برابر ہے۔ اس کی کثافت زمین کی کثافت کے ۰.۷ مساوی ہے یعنی پانی سے چار گنا زیادہ اور کشش کا تناسب ۱۳۸ اور ۱۰۰ کا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی جانور سطح میرخ پر چلا جائے تو اس کا وزن دو تہائی کم ہو جائیگا۔ اس امر کو مد نظر رکھ کر یہ خیال کیا گیا ہے کہ منگل میں انسان کا قد بارہ تیرہ فٹ ہوتا ہو مگر اس سے اس کی چستی چالاکی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر یہ گمان کیا گیا ہے کہ منگل میں دیو بستے ہیں جنہوں نے عظیم الشان نہرین تیار کی ہیں مگر درختی فلکی ایسی قیاسی باتوں کو چند ان اہمیت نہیں دیتے۔ اصل یہ ہے کہ منگل کی حالت جانداروں کے قیام و وجود کے متناقض ہے۔ منگل میں کرہ ارض سے آدھی شمسی روشنی اور گرمی جاتی ہے۔ اسپکٹرو اسکوپ اور دوربین سے ظاہر ہوتا ہے کہ میرخ کی ہوا بہت لطیف ہے اور وہاں کی سردی و گرمی کا درجہ صفر سے بھی نیچے ہو گا۔

عالم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ منگل کے ڈھانچے میں کوئی ایسی خاص چیز ہے جس سے مظاہر طبعی یعنی فطری انقلابات وقوع میں آتے رہتے ہیں ایک تو یہ امر خاص توجہ کے قابل ہے کہ وہاں قطبین میں برف پڑتی ہے جو موسم گرما میں پگھل جاتی ہے جیسا کہ ہمارے ہاں شمالی اور جنوبی قطبوں میں دیکھا جاتا ہے۔ وہاں برف ضرور جمتی ہے اگر یہ نہ تو کد ہو گا۔ دوم سطح میرخ پر زمین کے ایسے قطعات نظر آتے ہیں جیسے ہمارے ہاں ہیں جس کے رنگ مختلف ہوتے بعض نیلگون جس سے سمندر وں اور جھیلوں کا گمان ہوتا ہے اور بعض زرد گویا پیچر خطے اور ماناں ہیں اور وہاں روئیدگی بھی دکھائی دیتی ہے۔ نہروں کا جال انہی لال پیلے خطوں میں نظر آتا ہے۔ ٹول اور اس کے ہم خیال کہتے ہیں کہ بحیرے تو خشک ہو چکے ہیں مگر اتنی رطوبت باقی ہے جس سے قطبوں میں برف پیدا ہوتی ہے اور سبزی کے قیام کی موجب بنتی

ہے جس سے جانوروں کی زندگی قائم ہو بشرطیکہ وہ وہاں پر ہوں اس نظریہ کے رو سے جب برف گھلتی ہے تو پہلے پانی ایک حصہ میں اور پھر دوسرے میں جمع ہوتا ہے۔ اور پھر نہروں کے وسیلے سے ”میرخی باشندوں“ شہروں اور کھیتوں میں لیجاتے اور سیراب کرتے ہیں۔ یکھیت سنا دھاریوں کی صورت میں دور میں میں نظر آتے ہیں۔ جسکی بنا پر اہل میرخ کرہ ارض کے باشندوں سے زیادہ ذہین اور عقلمند سمجھے جاتے ہیں۔ نہروں کی بناوٹ سے انکی عجیب و غریب انجینئر عقلمندی اور تواطبی سے کام لینے کی بے مثال دانائی اور علم عیاں ہوتا ہے۔ مگر یہ محض قیاس ہے میرخی سال ۶۸ دن کا ہوتا ہے اور موسمی تبدیلیاں ہمارے ہاں کے موسمی تبدلات سے مشابہ ہوتی ہیں۔ اس کا دن چوبیس گھنٹے، ۳ منٹ کا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرخ کی سطح بہت اچھی طرح نظر آتی ہے۔

سیارگان صغیر آفتاب کے لواحقین کے گروہوں میں ایک طبقہ سیارگان صغیر کا ہے جو تیسرے طبقہ میں ہیں۔ ان کا شمار کئی سو ہزار سال نہیں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان میں بڑے چار ہیں۔ تیس اس کا قطر ۴۰۰ میل پلاس اس کا قطر ۳۰۷ میل، دس کا قطر ۲۳۹ میل اور جو نو کا ۱۲۰ میل ہے۔ اور باقی کا قطر بیس میل بھی نہیں۔ گویا وسیع خلا میں یہ ننھے ننھے مونگے کے جزیرے ہیں۔ انکی شکل و صورت ببقاعدہ ہے جو زمین عالم آل برکی راے میں یہ سیارے کسی بڑے سیارے کے پھٹنے سے پیدا ہوئے تھے۔ ان کے گرد کے دو اور بہت غیر معین ہیں۔ یہ سب سب میرخ کے دائرہ گردش کی حشر سے لیکر مشتری کے گھومنے کے خط کے مابین واقع ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مشتری کے چاند بھی انہی صغیر سیاروں میں سے ہیں جو اسکی کشش سے ہنچکر اس کے قریب چلے گئے اور گھومنا شروع کر دیا۔ اسی طبقہ میں اروس نامی چھوٹا سیارہ ہے جو گردش کرتا ہوا زمین کے پاس ایک کروڑ چالیس لاکھ میل پہنچ جاتا ہے۔

مشتری کا مال مشتری (برہسپت) سیارگان نظام شمسی میں عظیم ترین ہے۔

مین سخت نظر آتے ہیں، مگر دراصل گیس کے بنے ہوئے ہیں جو کہ زحل کے ارد گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب زحل کے مرکز کا حساب سکر کیا تو یہ حلقے اس سے باہر رہ گئے۔ اسکے کرہ پر بھی ویسے ٹکے نظر آتے ہیں جیسے مشتری کے قرص پر دکھائی دیتے ہیں۔ زحل کی کثافت پانی کی کثافت سے ۸ حصہ کم ہے۔ زحل کے ارد گرد دس چاند گردش کرتے ہیں۔ انکا حجم ایک سرے سے مختلف ہے اور یہ مختلف فاصلوں پر واقع ہیں۔ اسکا فاصلہ آفتاب سے اٹھاسی کروڑ ساٹھ لاکھ میل ہے۔

یورے نس اور نیپ چون | یورے نسل اور نیپ چون نظام شمسی کے پچھڑے ہوئے بجائی ہیں۔ تھوڑے ہی عرصے سے انکے وجود کا پتہ عالموں کو لگا ہوا۔ اول الذکر کا فاصلہ سورج سے ایک ارب ۸ کروڑ بیس لاکھ میل اور دوسرے کا دو ارب ۹ کروڑ بیس لاکھ میل ہے۔ یہ دونوں سیارے اُس عظیم انجم حساب کے بیرونی حصوں سے بنے ہیں جس سے نظام شمسی کے باقی اراکین وجود میں آئے تھے۔ اسکی کثافت پانی سے بھی کم ہے۔ یورے نس کا قطر تیس ہزار اور نیپ چون کا بیستیس ہزار میل ہے۔ اول الذکر کے چار اور موخر الذکر کا صرف ایک چاند ہے۔ نیپ چون کے وجود کا پتہ اسکے اُس اثر سے چلا تھا جو یورے نس کی حرکت پر نمایاں ہوتا تھا۔ انکے چاندوں کی گردش سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انکی حرکت محوری اسی سمت میں نہیں ہوتی۔ جو ہمیں باقی سیاروں کی ہوتی ہے۔ نیپ چون کی گردش مشرق سے مغرب کی جانب اور یورے نس کی قائم الزواہیہ کے ٹخن پر ہوتی ہے۔

یہ مختصر داستان متعلقین آفتاب کی مفصل کیفیت تو بڑی بڑی علمی کتابوں ہی میں مل سکتی ہے لیکن ناظرین انصاری کی معلومات میں اس سے خاطر خواہ اضافہ ہو سکتا ہے اور فلکیات کی کل باتوں کا لطف اس خلاصہ سے حاصل کر سکتے ہیں۔

جے۔ آر۔ ریلے

سورج سے اسکا فاصلہ اڑتالیس کروڑ بیستیس لاکھ میل ہے۔ زمین سے یہ تیرہ سو گنا بڑا ہے مگر اسکی کثافت زمین کا چوتھا حصہ ہے۔ اس یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسکا وزن زمین سے صرف ۳۱۶ گنا ہے۔ اسکی حرکت محوری بہت تیز ہے یعنی دس گھنٹے میں گھومتا ہے۔ قطبوں کے پاس چپٹا اور خط استوا کے قریب باہر کوا بھرا ہوا ہے۔ اسکی گردش محوری اسکے مختلف حصوں میں مختلف ہوتی ہے۔ سورج کی بھی یہی کیفیت ہے جو اس امر پر دلالت ہے کہ وہ لگا پر ٹکے یا پچھلے نمودار ہو جاتے ہیں۔ مگر قطبوں کے پاس دھاریاں ظاہر نہیں ہوتی ہیں۔ عالم خیال کرتے ہیں کہ مشتری ہنوز ارتقا کے تمام مراحل طے کرنے میں کامیاب نہیں ہوا ہے۔ چونتیس سال کا عرصہ گزرا کہ مشتری کے جنوبی ٹکے کے پاس ایک شرج داغ نمودار ہوا تھا جسکا طول تیس ہزار میل تھا۔ فلکیوں نے اسکی ہر چند تحقیقات کی مگر اسکی نوعیت معلوم نہ ہو سکی اور آج کے دن تک وہ ایک راز سر بستہ ہے۔ عظیم داغ مختلف قسم کی تبدیلیوں سے بھی دو چار ہو چکا ہے۔

مشتری کے حصہ میں آفتابی حرارت اور روشنی کرہ ارض کے مقابلے میں صرف پچیسواں حصہ آتی ہے اگر کچھ عرصہ کے بعد وہ سخت ہو جائے تو وہاں کسی جاندار کا زندہ رہنا محالات ہے ہوگا کیونکہ سردی کی کثرت وہ ایٹھ کمر جائیگا۔ مشتری کے چار بڑے اور چار چھوٹے چاند ہیں۔

عجیب غریب سیارہ زحل | مشتری سے دوسرے درجہ پر جسامت میں زحل (سنیچر) ہے جو سب سیاروں میں عجیب و غریب ہے۔ اسکے کرہ کے ارد گرد کئی درختان حلقے اور پچھلے ہیں جو مسلسل ایک دوسرے کے اندر واقع ہیں۔ اسکا قطر ۸۷ ہزار میل ہے۔ اگر درختان چھٹوں کو بھی کرہ کے ساتھ شامل کر لیا جائے تو قطر کا کل طول ایک لاکھ اڑسٹھ ہزار میل جاتا ہے۔ زہنی چھلا زحل کے استوا کے پاس دس ہزار میل ہینچتا ہے اور اسکا بیرونی کنارہ ساڑھے سولہ ہزار میل چوڑے پچھلے میں لجا تا ہے۔ گویہ طے دور ہیں

مایا کی فلاسفی

ایک اور موقعہ پر مذکور ہے:-

وہ چیز جو کبھی تبدیل ہونے والی نہیں قابل تبدیل چیزوں کے ذریعے حاصل نہیں ہو سکتی۔

بس یہی ہندوؤں کے تیاگ کا راز ہے۔ قایت یا روحانی زندگی کی تکمیل ان دنیاوی اسباب کے ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتی جو لازم طور پر بدلنے والے اور غیر حقیقی ہیں۔ ایک انگریزی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:-

ترجمہ۔ صرف ایک باقی رہتا ہے۔ کثیر التعداد چیزیں جو نظر آ رہی ہیں تبدیل ہوتی اور گزر جاتی ہیں۔ آسمان کی روشنی ہمیشہ چمکتی ہو۔ زمین کے سائے تیزی سے گزرتے جا رہے ہیں۔ زندگی بہت سے رنگوں والے شیشے کے گنبد کی مانند بقا کی سفید روشنی کو داغدار بناتی ہے

ان صرف ایک ہی باقی رہتا ہے۔ کثیر التعداد چیزیں تبدیل ہوتی اور گزرتی جاتی ہیں۔ وہ اس حقیقت کے محض سائے ہیں۔ تم اگر حقیقت کے خواہشمند ہو تو ان سایوں کی طرف دلچسپی کی نظر سے نہ دیکھو۔ دوسرے لفظوں میں دنیا جو نظر آ رہی ہے حقیقت کے نقطہ نظر سے محض ایک نظری دھوکا یا مایا ہے۔ اسی لیے تیاگ کی ضرورت ہے ہندوؤں کی تمام مجلسی ساخت کا دار و مدار صرف اسی بات پر ہے کہ انسان ان چیزوں کو جو محض مائشی ہیں تیاگ کر اس چیز کے حصول کے لیے جو بقا کی حقیقت رکھتی ہے کوشش کرے۔ اُنھوں نے زندگی کو چار منازل پر تقسیم کیا جن میں سے ہر ایک میں یہی راز مخفی ہے۔ طالب علم (ودیا رتھی) یا بڑھچاری کا کام ریاضت اور محظوظ نفسانی کو ترک کرنا ہے جس وقت طلب علم کا زمانہ گزر چکے تو اس وقت وہ گہرے آئینہ میں داخل ہوتا ہے۔ اس وقت اس کا فرض ہے کہ

مغرب کے بڑے سے بڑے محقق اگر ہندو فلسفہ کے رموز و اسرار کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں تو اسکی وجہ یہ سمجھنی چاہیے کہ اول الذکر کی قابلیت میں کچھ کلام یا آخر الذکر کی فضیلت میں سطح کا شک ہے۔ اس کا باعث اگر کچھ قرار دیا جاسکتا ہے تو یہ کہ دونوں قوموں کی تہذیب کی بنیادی اصول میں بعد المشرقین ہے۔ دنیا کے ہر حصے میں ہر زمانہ کے اندر بشیاء ہندو مت میں اقوام ہو گزری ہیں لیکن شاید یہ کہنا بیجا ہو گا کہ ان سب میں ہندوؤں ہی نے حقیقت کا سمیادہنی قائم کرنے اور سمیادہنی کے مطابق امور کو حقیقت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ ہندوؤں کی تہذیب لازمی طور پر ایک روحانی تہذیب تھی اور اس اعتبار سے ان اقوام کی تہذیب جو اس کے مقابلے میں جو ان کھلا سکتی ہیں بدرجہا آگے بڑھی ہوئی تھی۔ بس یہی وجہ ہے کہ لوگ اسکے اسرار کو سمجھنے سے قاصر و معذور ہیں۔ بڑے بڑے راجاؤں کا ذرا سی بات پر راج پاٹ چھوڑ کر فقیر ہو جانا اعلیٰ قابلیت اور فضل لیاقت کے آدمیوں کا سنیا س اختیار کر کے جنگوں اور خون میں رہنا ہزاروں کی تعداد رکھنے والی فوج کے مقابلے میں مٹھی بھر جو انوں کا محض اپنی آن کو بچانے اور تلوار ہاتھ سے نہ دینے کے لیے لڑ کر کٹ مرنا سینکڑوں عورتوں کا بڑے استقلال اور ثابت قدمی سے پروانہ دار آگ کے شعلوں میں جل کر بھسم ہو جانا یہ اور اسی قسم کے بیسیوں عجیب و نادر قابل فہم ظہورات ہندو تہذیب کی واحد خصوصیات ہیں۔ غرض یہ کہ اس تہذیب کا منشا ہے بڑھکر انسان کو تیاگ اور روحانیت کے لیے مادیت سے دست بردار ہونے کا سبق سکھانا ہے۔ آپ نشدین آیا ہے:-

غیر قایت کام سے انداز لا دے اند دلت سے بلکہ صرف تیاگ سے حاصل ہو سکتی ہے۔

وہ تحصیل علم و ملت میں اس طرح تنہا رہے گویا کبھی بوڑھا نہ ہوگا اور نہ مریکا اور دھرم پر اس خیال کو مد نظر رکھ کر عمل کرے کہ گویا موت نے اسے باون سے بچو رکھا ہے۔

گر بہت کا زمانہ صدمہ کی محنت کا زمانہ قرار دیا گیا ہے جس میں انسان کو کمال اٹھانا اور بے غرضی سے کام لینا چاہیے۔ گویا ایک طرح پر اس زمانہ میں اسے آنے والے زمانہ بان پستھ اور سنیاں کے لیے تیار کیا جاتا ہے۔

چونکہ روحانی تکمیل کو مدعائے زندگی قرار دیا گیا ہے اس لیے ظاہر ہو کہ نفسانی زندگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ اسی اعتبار سے بیوہ عورت کو اس کا عمدہ موقع حاصل ہوتا ہے کہ وہ محفوظ نفسانی کو خیر باد کہہ کر تجر کی زندگی بسر کرے، خدا کی یاد میں اپنی ذات کو بھلا دینا اس کا فرض ہو، مختصر یہ کہ وہ اپنی زندگی کو پورے طور سے روحانی بنائیکی کوشش کرے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہندوؤں کا مذہب کبھی عقد بیوگان کی اجازت نہیں دیتا بلکہ اسے قطعاً ممنوع قرار دیتا ہے۔ بیوگان کی شادی کے خلاف یہ ایک قسم کا غیر تحریری حکم ہے۔ برہمن کیلئے جو مجلسی طور پر تمام ہندوؤں میں اعلیٰ درجہ رکھتا ہے لازم ہے کہ وہ ساوہ زندگی بسر کرنے اور اعلیٰ خیالات سوچنے کی ایک شاندار مثال ہو۔ ہر چند کہ علم و اثر اس کے اختیار میں ہیں تاہم ضروری ہے کہ وہ دنیاوی جاہ و حشم کے معاملے میں غریب ہو۔ روحانی پاکیزگی اور نفاست کے لیے ضروری ہے کہ وہ افلاس ہی کی حالت میں قانع رہے۔ جو شخص دولت کا شہنشاہ ہو اسکے اندر صداقت کید نہر موجود رہ سکتی ہے؟ اور علم کے لیے تو سب سے بڑھ کر ضروری ہے کہ وہ صداقت کا پرستار ہو۔ اسی ضمن میں ہارڈر کے پروفیسر جیمز کے مندرجہ ذیل خیالات قابل ملاحظہ معلوم ہوتے ہیں۔

درحقیقت افلاس ہی جدوجہد کی زندگی ہے۔ وہ افلاس جس میں باجی آواز، شاخ اور وردی، پردوش، اٹھاؤ، نشو ویدی، یا جھوٹ یا فریب کو دخل

نہ ہو جس وقت ہم دیکھتے ہیں کہ دولت کمانے کی دھن کس طرح ہماری موجودہ نسلوں کی ہڈیوں کے عرق تک میں اپنا از قائم کر چکی ہو تو یہ سوچ کر تعجب ہوتا ہے کہ آیا اس اعتقاد کی از سر نو شاعت کہ افلاس ایک مستحسن شے ہے وسیلہ نجات ہے اس روحانی صلاح کے لیے ضروری بھی جاسکتی ہے جس کی ہمیں بے حد ضرورت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خصوصیت سے ہم لوگوں میں جو انگریزی زبان بولنے والے ہیں سب بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ افلاس کی تعریف میں پھر ایک بار راگ گائے جائیں۔ ہم ایک طرح پر افلاس سے خوف کھانے لگ گئے ہیں۔ جو شخص اپنی زندگی کو سادگی سے بسر کرنے یا اپنی اندرونی زندگی کو بچانے کے لیے غریب رہنا پسند کرتا ہے ہم اسے نفرت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص عوام میں ملکر دبیہ پیدا کر نیکی جدوجہد میں شریک نہ ہو تو ہم یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ بے حوصلہ اور قسم کی خواہشات سے عاری ہے۔ ہم اب اس بات کا اندازہ ذہنی طور پر بھی نہیں کر سکتے کہ زمانہ قدیم میں افلاس کا جو معیار مقرر تھا اسکے معنی کیا ہو سکتے ہیں اور نہ ان فوائد کو سمجھ سکتے ہیں جن کا اس معیار سے لازم طور پر تعلق ہے یعنی مادی تعلقات سے آزادی، روحانی پاکیزگی، سفلی باتوں کی صحت مردانہ وار عدم توجہی کا اظہار زندگی کا میسرانہ کے بجائے کاموں کے ذریعے سے کام کرنا، غیر ذمہ دارانہ طریق پر اپنی زندگی کو جس وقت جی میں آئے خیر باؤ کم دینا، اور وہ تمام اخلاقی آزادیاں جو اس سے تعلق رکھتی ہیں۔

لیکن ہر سالہ کے لازمی طور پر دو رخ ہوتے ہیں اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم اس دوسرے رخ کو بھی شروع ہی میں پیش کر دیں۔

ہندوؤں میں دو جہد کا نہ طبقہ موجود ہیں جو ان کی تہذیب کے دو مختلف پہلوؤں کے نمائندے سمجھے جاسکتے ہیں۔ انھیں عام طور پر اعلیٰ اور ادنیٰ طبقات کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں ان کے اندر اختلاف

اس قدر حلقہ معترضانہ کے بعد اب ہم پھر نفس مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ مایا کے عجیب و غریب مسئلہ کی ابتدا کے متعلق لوگوں کے خیالات مختلف ہیں کوئی اسے "شیطانی تعلیم" سے منسوب کرتا ہے، کوئی "آب و ہوا کے اثر" سے۔ غرض لوگوں کے اندر اسی قسم کے صدامتضاد خیالات اس کے متعلق پھیلے ہوئے ہیں۔ ممالک غیر کے نکتہ چینون میں سے بعض نے بڑے غور و فکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ یہ ہندوؤں کی ہر بات کو اندیشہ کی نظر سے دیکھنے کے مسئلہ کا انتہائی پہلو ہے۔ ایک انگریزی شاعر کہ گیا ہے۔

نقاب کا فخر، طاقت کا غور، اور دولت اور حسن کا ناز یہ سب باتیں
کیاں طور پر اس اٹل گھنٹہ کی منتظر ہیں۔ فتح اور شان و شوکت کے
راستے بھی آخر کار قبرستان ہی کو جاتے ہیں۔

ان غیر ملکی نکتہ چینون کا خیال ہو کہ جس بات کو مد نظر رکھ کر شاعر نے یہ الفاظ لکھے ہیں انہی کو بدرجہ اتم بڑھا کر ان کی فلسفیانہ صورت کا نام "مایا" رکھ لیا گیا ہے۔

بعض یہ کہتے ہیں کہ انسان نے زندگی کی عارضی فائش کو دیکھ کر اپنی ذات کو اس کے مطابق بنانے کے لیے اس مسئلہ کو اختراع کیا ہے۔ دوسری طرف بعض کا خیال یہ ہو کہ جس وقت ہندو فلاسفر زندگی کی مختلف حالتوں کی غیر کیسانیت کو نظر انداز کرنے سے قاصر رہے تو لوگوں نے اپنے خیالات میں بہت بڑی رنگ آمیزی کر کے اس مسئلہ کو مایا میں لایا۔ ان لوگوں کے نقطہ نظر سے اس مسئلہ کو اختراع کرنے والوں کی مایوسی کہلے کی اس مایوسی کے مانند تھی جس سے مجبور ہو کر اسے لکھا تھا۔

اگر یہ سچ ہو کہ اضافہ تعلیم قدرت پر ایک وسیع قبضہ جو اسکا لازم نتیجہ ہے اور حصول دولت جو اس کے قدم مقدم ملتی ہو عوام کی حاجتندی اور اس کے ضروری لازم طبی اور اخلاقی تنزل میں کسی قسم کا اختلاف پیدا نہیں

صرف تعلیم کا ہو۔ قدیم موروثی تہذیب دونوں میں موجود ہے جس سرق اگر ہر شخص اتنا کہ تعلیم یافتہ فریق میں اسکا اثر محلول ہو کر پوسے طور سے بس چکا ہو لیکن غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے کثیر التعداد گروہ میں اسکا اثر صرف خارجی ہو گا اسکا وجود دونوں صورتوں میں پایا جاتا ہے۔

تہذیب کا خود بخود پیدا ہونا اسکی جان ہے۔ جو باتیں لوگوں پر محض رد اجاعائد کی جائیں وہ ایسی ہی ہیں جیسے اصلی پھول کے بجائے کاغذی پھول لگا دیا جائے یعنی محض اس قسم کی جن سے دیکھنے والوں کو یقین پیدا ہو سکے۔ اس صداقت کی کیفیت ہندوستان کے اندہ تیری نظروں سے گذرتی ہے۔ ہر چند کہ ہندو دیت نے صدیوں کے عرصے میں اس زبردست آلہ رواج کے ذریعہ سے اپنی تہذیب کو عوام کے اندر داخل کرنے کی کوشش کی، اور گو اس تہذیب کا اثر لوگوں کی ہڈیوں تک میں بس چکا ہو تاہم اس سے ان کا دلی جوش اب تک متاثر نہیں ہوا۔ کثیر التعداد ہندوستانیوں میں تہذیب موجود تو ہے لیکن وہ جستی نہیں رواجی ہو۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ خود رو نہیں آلوٹیک ہے۔

اسکی تشریح اس طرح ہو سکتی ہے کہ کیا باعث ہو باوجودیکہ ایک ہی خمیر کے سارے آٹے میں موجود ہونے کے اسکا اثر صرف جزوی ہوا ہے؟ جو حصہ اس خمیر سے اثر پذیر ہوا وہی ہے جو تعلیم کی برقی چمکی میں سے گزر چکا ہو۔ اس حصہ کی نسبت مختصر الفاظ میں کہلجاسکتا ہے کہ وہ رکاوٹ پیدا کر نیوالے مادہ سے پاک آزاد ذمہ دار اور ترقی یافتہ ہے۔ دوسرا حصہ روایت کی دقیاوسی پن چمکی کے نیچے دبایا ہوا ہے۔ قرنا قرن سے عوام کو اس تعلیم سے محروم رکھا گیا ہے جو ان کے اندر روشنی کا باب کھول سکتی تھی۔ بس یہی فرق ہے اور اسی نے ہندو قوم کو ایک قوم کی حیثیت میں کسی قابل بننے نہیں دیا۔

ہم نے اوپر کہا تھا کہ انسان مایا کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اس خیال سے کہ ناظرین اتنا پڑھ کر گھبرا نہ جائیں اور گھبراہٹ میں ادھر سے اپنی توجہ مٹالیں ہم اس کے ساتھ ہی یہ بھی بیان کر دینا چاہتے ہیں کہ انسان ایسے سمجھنے میں صرف اسی درجے تک قاصر ہے جیسے کہ وہ تمام بنیادی خیالات کو سمجھنے کے معاملے میں ہوتا ہے۔ اسکی مزید توضیح کے لیے ذیل کی عبارت انگریزی کی کتاب "عجیب و غریب صدی" میں سے "مادہ کے گردابی مسئلہ" کے متعلق ترجمہ کر کے درج کی جاتی ہے:-

اس مسئلہ کی رو سے ایٹم کو ایک اس قسم کی رقیق چیز تصور کیا جاتا ہے جو نہ تو دباؤ میں آسکتا ہے اور نہ اس میں رگڑ پیدا ہوتی ہے۔ سارے برہانڈ میں ایک اور صفت وہی ایک چیز ہے۔ وہ چیز جسے مادہ کہتے ہیں وہ حقیقت ایٹم کی حرکت کی ایک صورت ہے۔ سالمات و حقیقت نہایت چھوٹے چھوٹے گرداب یا ایٹم کی تیزی سے گردش کرنے والے اجزا ہیں اور یہ اجزا اس قسم کے ہیں کہ جب ایک بار اس رگڑ سے خالی رقیق چیز میں ان کے اندر حرکت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ دوامی اور ناقابل اتلان ثابت ہوتے ہیں۔ خیال ہو کہ ان گردابوں کی ایک کافی (قرب قریب بے انتہا) تعداد جن میں سے ہر ایک کی جسامت مختلف ہوتی ہے جو مختلف تیزی سے حرکت کرتے ہیں اور گیس کے ذرات کے مانند ہر ممکن سمت میں پھیلتے ہیں، جسامت اور حرکت کی مشابہت کے اعتبار سے مختلف مجموعوں کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس اجتماع کے عمل سے عناصر پیدا ہوتے ہیں اور جب یہ عناصر کیمیائی ترکیب سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو اس سے مادہ کی مختلف صورتیں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن ان سالمات اور ان کے مجموعات کی مسلسل حرکات غیر مرہم ایٹم کے اندر حرارت اور بجلی کی خاص جنبشیں پیدا کرتی ہیں جس کا اثر دوبارہ مادہ پر پڑتا ہے تو ان باہم پیوست شدہ تبدیلیوں کا ظہور ہوتا ہے جنہیں قوانین و ظہورات فطرت خیال کرتے ہیں۔ یہ مرہم شے ہو کہ آیا کشش اس سے ابتدائی حرکت سے پیدا ہوتی ہے جو ایٹم میں لائی جاتی ہو یا نہیں۔

کر سکتے تو ہیں اس بات کو بڑی خوشی کی نظر سے دیکھوں گا کہ کوئی ہرمانڈ مارہ زمین سے ٹکرا کر اسکی ہر چیز کی صفائی کر جائے۔

مایا کی ابتدا کے متعلق یہ اور اسی قسم کے اور خیالات جن کا اظہار وقتاً فوقتاً کوئی طرف سے ہوتا ہے اس کو ثابت کرتے ہیں کہ جس چیز کو محسوس کرنے کے قابل نہیں ہوتا دماغ اسکی بڑی بھلی تشریح کر کے اس سے سمجھا چھڑانے کا کس قدر آرزو مند ہوتا ہے۔

لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مایا کا خیال نہ تو ہندوؤں کی ہر چیز کو اندیشہ نظر سے دیکھنے کے باعث پیدا ہوا اور نہ ان کے اس چیز سے اپنے آپ کو چھپانے کی فکر سے جس کی تشریح ان کے لیے ناممکن تھی۔ دینا میں مایا کا جو ذکر آیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض جہالت کا نام ہے۔ نہ تو اسکا کوئی خاص وجود ہے اور نہ یہ بالکل ہی عدم ہے۔ یہ ایک طاقت ہے جو اپنے وجود کے لیے دنیا کی نمائش پر منحصر ہے۔ یعنی وہ طاقت جو ان صورتوں کے نمودار ہونے کی ذمہ دار ہے جنہیں نامعلوم مقام سے تعلق رکھنے والے فن اور مادہ کہتے ہیں۔ مایا ہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے ہم آتما کے بجائے برہانڈ کو دیکھتے ہیں ہم اسکی طریق وقوع کو سمجھنے میں اس لیے قاصر ہیں کہ ہم خود اسکی پیداوار ہیں اور نتیجہ کبھی اپنے باعث سے فوق الاثر نہیں ہو سکتا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ مایا کو دور کرنے کے لیے علم برہم گیان اور وجود حقیقی کی واقفیت کی ضرورت ہے۔ اسکے دور ہونے کے معنی یہ ہیں کہ انسان روشنی کے اس اعلیٰ ترین درجے کو حاصل کر لے جو اس کے دائرہ میں موجود ہے یعنی یہ کہ وہ اپنی پوری طاقت تک پہنچ جائے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ انسان اس معراج کو حاصل کرے جس میں تلون اپنی جگہ خود کو دیتا ہے۔ یعنی یہ کہ اس حقیقی علم کے دروازے کھل جائیں اسکی غلطی کا پردہ آنکھوں کے آگے سے اٹھ جائے، اور اسکا غم ہمیشہ کیلئے تلف ہو جائے۔

اس مسئلہ سے اس خیال کی تشریح ہوتی ہے کہ خدا کا وجود برہان سے باہر ہو اگر وہ برہان سے باہر تو وہ لامحدود نہیں اس لیے خدا نہیں۔

اگر خدا سارے کے اندر موجود ہو تو ضروری ہو کہ وہ ذرہ میں بھی ہو اگر نہیں تو اسکی اس صفت میں فرق آتا ہے کہ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ پہلے پامک نہایت دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کیا ذرہ خدا سے کب قدر کم یا اس سے زیادہ درجہ رکھتا ہے؟ دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ کیا ذرہ ایک غیر ترقی یافتہ خدا ہے یا مرکب یعنی خدا یا کچھ اور چیز؟

اگر ذرہ غیر ترقی یافتہ خدا ہو تو وہ خدا کا جز ہو کیونکہ وہ سالم خدا نہیں ہو سکتا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ترقی کے مختلف درجے کے اجزاء سے مرکب ہے۔ اگر اس اصول کو مان لیا جائے تو ثابت ہوتا ہے کہ خدا کے وجود میں ترقی اور اسکی موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔

اگر ذرہ خدا سے مختلف کچھ چیز ہو جس پر خدا کا وجود محیط اور اس کے اندر جان ڈالتا ہو تو اس کے لامتناہی اور ہر جگہ موجود ہونے کی صفت میں فرق آتا ہے ذرہ کا خدا سے مختلف ہونا اسے محدود کرتا ہے۔ خدا چونکہ ذرہ میں موجود نہیں اسلئے وہ ان اجزاء میں بھی موجود نہیں جن سے ذرہ مرکب ہے۔ اگر وہ ہوتا تو ذرے سے بھی جدا ہوتا۔

غرض یہ کہ عالم کی دو نوع صورتیں ناقابل تسلیم ہیں۔ اگر ہم خدا کو ترقی کن یا محدود سمجھیں تو اسکی خدائی صفات میں فرق آتا ہے۔

ایک فرق ان سائنس دانوں اور مسئلہ ارتقاء کے مویدوں کا پیدا ہو گیا ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ خدا وہ نامعلوم کامل وحدانیت ہے جس کے دو پہلو مادی اور روحانی عالم ہیں۔

اگر ہم ان دونوں عالموں کا اس نامعلوم کامل وحدانیت کے ساتھ اس قسم کا تعلق تسلیم کریں جیسا اس میں بتایا گیا ہے تو یہ ماننا پڑتا ہے کہ اس میں بھی یقیناً تبدیلی واقع ہوتی ہے اور اس سے خواہ کچھ اور ثابت ہوتا ہو کہ خدا کی صفت ”خدائی“ ثابت نہیں ہوتی۔

بہر حال اگرچہ ہر ایک انسان میں اس گروہی حصہ کے سب سے بڑے نتائج ہیں انکی اس تھیوری کو زیر نظر رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ برہان کی ابتدا کی دریافت کے متعلق جعفر کوشتین کی گئی ہیں بن سب میں یہ نہایت اہم ہے۔ لیکن تمام بنیادی خیالات کی طرح یہ مسئلہ بھی اس قسم کا ہے کہ ذہن انسانی بشکل اسے قبول کر سکتا ہے۔ دباؤ میں نہ آنے اور نہ رگڑ کھانی والی رقیق شے جیسا کہ برہان پر حاوی اور محیط ہر سالماتی گروہی حرکات کے سلسلہ نامتناہی کی ابتدا قبول حرکات اجتماعات کا نہ ختم ہونا اسلسلہ کیمیائی حرکات کی پیچیدگی، ایتھر کی مختلف قسم کی جنبشوں اور کشش کی طاقت کا پیدا ہونا یہ سب باتیں فہم انسانی میں نہیں آسکتیں۔ اگر آج بھی جائیں تو سب سے بڑی ناقابل فہم بات یہ رہ جاتی ہے کہ ایتھر کے ان گروہی حلقوں کے اس طرح آپس میں ٹکراتے رہنے کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ میں سے زندگی بیداری، محبت اور ذہانت کیونکر پیدا ہو گئی۔

مکن ہے کہ ناظرین میں بعض یہ اعتراض کریں کہ ایک سائنٹفک طور پر مستند ناقابل فہم مثال پیش کرنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کوئی اور ناقابل فہم بات تسلیم کر لی جائے۔ ہم ان کے اس اعتراض کو تسلیم کرتے ہیں سچ پوچھو تو مایا کا مسئلہ بجائے خود ایک مستحکم بنیاد پر قائم ہے۔ ہم نے ڈاکٹر والیس کی کتاب کا مندرجہ بالا اقتباس محض اس لیے پیش کیا کہ دکھایا جائے کہ بعض باتیں ہمارے فہم و قیاس سے بعید ہیں تاہم اس وجہ سے ہم انھیں ناممکن نہیں قرار دے سکتے۔

مایا کے مسئلہ کو مختلف نقاط نظر سے مختلف دلائل کے ذریعے ثابت کیا جاسکتا ہے ذیل میں ایک پہلو کو لیکر اس کے متعلق وہ دلائل جو فروری سن ۱۹۲۲ء کے رسالہ ”پرہہ بھارت“ میں پیش کیے گئے تھے درج کیے جاتے ہیں:-

اگر خدا اپنی دنیا میں نہیں ہو تو ہم اسے کسی دوسری جگہ تلاش کریں ضرورت نہیں۔ نئی حقیقت اور کوئی جگہ ہی نہیں جان اسے تلاش کیا جائے۔

ہم اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ جہلا کے ہاتھوں پر نے کی وجہ سے اس مسئلہ نے بہت سی خرابیاں پیدا کی ہیں جہلا کے ہاتھ سے جو کچھ نہ ہو تھوڑا ہے۔

مایا کا مسئلہ ہمیں سکھاتا ہے کہ جو کچھ ظہور میں آ رہا ہے اس میں سے کچھ بھی کامل طور سے حقیقی نہیں لیکن ساتھ ہی کوئی بھی چیز نسبتاً غیر حقیقی نہیں ہے۔ ہر ایک حالت یا ہر ایک چیز محض ظاہری جو صرف اس کا وجود ہی ہے۔ لیکن ظاہرات کا عالم ہی قانون کا عالم ہے جب تک کوئی شخص کامل پاکیزگی، نیکی، ضبط، و خوداری کے ذریعے سے اندرونی روشنی کو جان کر وجود نہ پہچان لے تب تک وہ طبقہ ظاہرات سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا اور نہ کرم کے زبردست اور غلطی نہ کرنے والے قانون سے بچ سکتا ہو پس ظاہر کہ ان حالتوں میں صرف جاہل لوگ ہی اپنی کمزوریوں کے لیے مایا کی پناہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔

ہم دکھا چکے ہیں کہ تیاگ جو ہندو تہذیب کا اصول ہے براہ راست مایا کے مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے، اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر ہم بعض اور اہم نکتے کا جو اس سے پیدا ہوتے ہیں ذکر کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

زندگی میں کوئی بات کامل طور پر بری یا صرف جزوی طور پر اچھی نہیں ہو کیونکہ تمام چیزوں کے عنصر حقیقی کے علاوہ جو لامحدود اور ناقابل بیان ہے اور کچھ کامل طور پر حقیقی نہیں ہے۔ ہر ایک طور کو اگر اس کی حقیقی قدر کے اعتبار سے دیکھا جائے تو اس کے ہمیشہ ملتے رہنے والے نظر فریب لباس سے قطع نظر وہ حقیقت میں وجود لامحدود ہے۔ اس اعتبار سے اس نہ ختم ہونے والے برہما نہ میں کوئی چیز ایسی نہیں جس کا اپنے باعث وجود سے برکت حاصل کرنا یقینی نہ ہو۔ لامحدود اُمید نہ ختم ہونے والی طاقت، خارج از حدود تکمیل، سب کا قدرتی استحقاق ہے، اور اس استحقاق کو سب تک پہنچانا ہی مسئلہ ارتقا کی جان ہے۔

مایا کا سوال اخلاق کے بنیادی اصول کو قائم کرتا ہے۔ کیونکہ وہ

اسکی وجہ ہے کہ سب کی صورت اختیار کرتے ہوئے اس ذات نامعلوم کو وہ بننا پڑا جو پہلے نہ تھی یعنی اس میں تبدیلی واقع ہوئی۔ تبدیلی ایک نتیجہ ہے جو واقعات کے شروع ہو کر ختم نہ ہونے والے سلسلہ میں ظہور پذیر ہوتا ہے جس نتیجے میں اس ذات نامعلوم کو سب بنایا اس کا خود کوئی سبب موجود تھا اور بجائے خود نتیجہ رہ چکا ہوگا۔ علیٰ ہذا القیاس اس سلسلہ کو حادثاتی کہہنا چاہا جاسکتا ہے۔ اس طرح اگر اس ذات نامعلوم میں کسی تبدیلی کا وقوع تسلیم کر لیا جائے تو وہ ایک اثر یا نتیجہ ثابت ہوتی ہو گی یا اسکی حالت متبدل ماننی پڑتی ہو جو واقعات کے شروع ہو کر ختم نہ ہونے والے سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

اس صورت میں پھر اس ذریعہ کو جس نے اس ذات نامعلوم میں تبدیلی پیدا کی جس کے باعث آخر الذکر نے نتیجہ کا درجہ حاصل کیا ایک ایسی صفت ماننا پڑتا ہے جو یا تو اس ذات نامعلوم کے اندر موجود تھی یا باہر۔ اگر اندر موجود تھی تو تبدیلی کا باعث اس ذات نامعلوم کی کوئی اندرونی ضرورت ہوگی۔ اگر خارجی تھی تو وہ ذات نامعلوم بغیر کسی پراختصار رکھتی ہوگی اور اس پر کسی قسم کا اثر یا دباؤ پڑ سکتا ہوگا۔ لیکن جس میں ضرورت کی وجہ سے یا دباؤ کے باعث کوئی تبدیلی ہو سکتی ہے وہ خدا نہیں ہو سکتا۔

پس ہمیں دو میں سے ایک بات ماننا پڑتی ہے یعنی یا تو ادویت یا مایا کا مسئلہ جس کا نشانہ ہے کہ جو کچھ نظر آتا ہے محض نظری دھوکا ہے اس مسئلہ کو تسلیم کرنے والے اعتراف کرتے ہیں کہ ہم برہما نہ کی ابتدا کے متعلق کچھ نہیں جانتے، کیونکہ ہماری عقل ہمیں یہ بتانے سے قاصر ہے کہ کیونکر اس کامل طور پر نامعلوم ذات نے روحانی اور مادی عالم پیدا کر دیے اور خود اس عمل میں تلف نہ ہوئی۔ ہمیں دو میں سے ایک کے حق میں فیصلہ دینا ہوگا۔ اگر ہم اہل الذکر کے حق میں فیصلہ دین تو بھی ماننا پڑے گا کہ یہ برہما نہ کا ظہور محض دھوکا ہے۔

یہ مسئلہ دوسروں کو نجات دلانے، کسی قوم کے ٹٹا ہی اختیارات تسلیم کرنے، یا ایک کو دوسرے سے برتر و بہتر سمجھنے کے اصول کو سختی سے رد کرتا ہو۔ اسکی روشنی میں جو کام کیا جائے وہ صرف ایک ہی معنی رکھتا ہے یعنی یہ کہ انسان خدمت کر رہا ہے، اس ذات واحد کی خدمت جو لا انتہا صورتوں میں موجود ہے۔ مایا کو مٹانے والا کسی کی شخصی فضیلت، خدائی اوصاف، دوسروں کو حقیر و گنہگار تسلیم کرنا ان باتوں کا مطلق قائل نہیں۔ وہ تو فطرت انسانی کی نیکی پر بے انتہا اعتقاد رکھتا ہے اور کل بنی نوع کے لیے لامحدود خیرات کا معترف ہے۔

تیرتھ رام

تفریق اور ظہور پر سے حقیقت کا احساس ہٹا کر اسے اس ناقابل تقسیم ذات پر ڈالتا ہو جو سب کے اندر ایک ہے۔ اخلاق سے عاری ہونے کا امکان اس تفریق کو تسلیم کرنے پر حصر رکھتا ہے کسی دوسرے شخص کو ضرر پہنچاتا ہو کیونکہ وہ جانتا ہو کہ میں اس طرح اپنے آپ کو تکلیف نہیں پہنچاتا۔ مایا کے مسئلہ کی رو سے یہ تفریق محض ظاہری ہے حقیقی نہیں۔ ظاہری ہلہ پر زور دیکر وہ حقیقی سے جدا ہو جاتا اور اس طرح اپنے آپ کو خسرو پہنچاتا ہے۔

کیا وجہ ہو کہ ایک شخص اپنے ہمسایہ سے اپنے برابر محبت کرے؟ ایسے کہ اسکی اور اسکی حقیقت دراصل ایک ہی ہے۔

پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنوی

اثر اردو ادب کیلئے بہر نفع منفعت بخش ثابت ہوگا۔ یہ ادبی انقلاب جسکی طرف ہم اُدھر اشارہ کر چکے ہیں حقیقت میں اُس وقت سے شروع ہوا ہے جب سے ہمیں انگریزی تعلیم کی بدولت مغربی خیالات پر عبور کرنیکی قدرت حاصل ہوئی ہے لیکن اسکی اصل بنا اُسی وقت پر چلی تھی جب کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر جان گلکرسٹ اور ان کی پُر جو ش جاعت نے اول، اول اردو کے خزانہ کو جن جن گرانمایہ جواہر سے لبریز کیا ہے اسکی شکر یہ آمیز یا وہی خواہاں ملک کے دنوں سے کبھی محو نہیں ہو سکتی۔ آج بھی ہمارے ملک میں جو اور جب قدر علمی تحریریں قوت سے فعل میں آرہی ہیں وہ سب کی سب ڈاکٹر صاحب موصوف کے مقرر کردہ معیار پر چھلنی جاتی ہیں۔ فروعات میں اگر کوئی اختلاف ہو تو وہ چند ان قابل وقعت نہیں۔

ڈاکٹر صاحب موصوف کی مساعی جمیلہ اور ان کے کار آمد

اردو علم ادب نے ابتدا سے آج تک کئی چولے بدلے اور تغیرات کی مختلف منزلیں طے کیں لیکن ماہران علم اللسان واقف ہیں کہ اس قسم کی تبدیلیاں ہر زبان کیلئے لازمی ہیں البتہ فی زمانہ اردو کی ادبی دیباچہ خیالات کے اعتبار سے جو خوشگوار انقلاب نمودار ہو رہا وہ بلحاظ اپنے مستقل فوائد کے قابل قدر چیز ہے حقیقت یہ ہے کہ برٹش گورنمنٹ کے زیر سایہ جہاں ہمیں اور بہت سی برکات سے متمتع ہونے کا موقع ملا ہے وہاں ایک یہ بھی ہے کہ ہمارے خیالات و جذبات مغربی خیالات و جذبات سے متاثر ہو رہے ہیں اور یہ ملکی لٹریچر کے حق میں ایک مبارک قال ہے۔

بیشک اسکا فیصلہ وقت کرے گا کہ مغربی تاثیرات نے ہمارے علم ادب کو واقعی کوئی نفع پہنچایا ہے یا نہیں لیکن ارباب نظر موجد وہاں سے آئندہ نتائج کے اخذ کرنے سے قاصر نہیں اور ان کا خیال ہے اور اسکی صحت کے کئی قابل قبول ثبوت بھی موجود ہیں کہ مغربی لٹریچر کا

شائع کا اعتراف کر چکے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اُن کے اہتمام سے جس قدر بھی کتابیں نکلیں وہ بجائے خود خوبیوں کا مجموعہ ہونیکے سرتاپا مشرقی رنگ میں تھیں اور مغربی خصوصیات سے وہ بالکل بے تعلق اور علیحدہ تھیں اور شاید یہی سبب ہے کہ اس زمانے میں جبکہ خیالات کی رد ایک دوسرے جانب کو جا رہی ہو، طوطا کہانی، باغ و بہار، بیتا اور عیسیٰ کے صفحات ہمارے لیے مستقل دلچسپی اور دلچسپی سے قطعاً خالی نظر آتے ہیں۔

علم ادب اُردو کی شاندار شہ نشین میں جس نئے ستون کی کمی تھی وہ دراصل پنجاب کے نامور ڈاکٹر تعلیمات کرنل ہارلڈ کے ہاتھوں اضافہ ہوا۔ ہمارا مطلب اس سے یہ ہو کہ مغربی لٹریچر سے مشرقی طبائع کو مانوس کر نیکی اہم لیکن دشوار خدمت سب سے پہلے کرنل موصوف نے اپنے ذمہ لی ہو اور انصافاً کہا جاسکتا ہو کہ ہمارے خزانہ ادب میں جس قدر نئی نئی چیزیں یورپ وغیرہ سے لا کر رکھی گئی ہیں وہ سب انھیں کے حسن تدبیر کا نتیجہ ہے۔

یہ بات بھی اکثر دیکھی گئی ہو کہ ابتدا میں خواہ کوئی کام کتنا ہی مشکل کیون نہ ہو لیکن اگر اسکی تحریک جاری رہے تو باوجود خارجی اسباب کے مخالفت و متضاد ہونیکے کچھ نہ کچھ آدمی ہاتھ بٹانے والے پیدا ہو جاتے ہیں خصوصاً ایسی حالت میں کہ وہ کام سرسبز انھیں لوگوں کے قاعدہ کا ہو۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کرنل ہارلڈ کی تحریک و تشویق نے اُنکے گرد ایسے بہت سے آدمی جمع کر دیئے تھے جو پہلے پہل اُن کے مددگار تھے لیکن آخر کار وہ اُردو لٹریچر کے اول محسنوں میں شمار ہونے لگے۔ نہیں پروفیسر آزاد اور مولانا خالی خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں۔

قاعدہ کی بات ہو کہ جب تک کسی تحریک کا آغاز نہیں ہوتا اسکی مخالفت اور موافقت ہونا یا اسکی ترقی کے اسباب کا فراہم کرنا ایک غیر یقینی امر ہوتا ہو لیکن جب تحریک چل نکلتی ہو تو یہ باتیں خود بخود

پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ بھی کچھ خدا ہی کی طرف سے ہوتا ہو کہ مفید اور نفع رسا کاموں کے ہمدرد بسا اوقات اُس طبقے سے نکل کھڑے ہوتے ہیں جن سے اسکی خواب میں بھی توقع نہیں ہو سکتی۔ اسی کچھ دیکھ لیجئے اُردو علم ادب میں جتنی نئی نئی چیزیں آپ کو ملین گی وہ تقریباً سب کی سب ایسے لوگوں کی محنت شاقہ کا ثمرہ ہونگی جنھیں اپنی عمر کا معتد بہ حصہ قدیم تعلیم و تربیت کے نذر کرنے کے علاوہ یورپین علم ادب وغیرہ سے آگاہی حاصل کر نیکام موقع تک نہیں ملا۔ مولانا آزاد، مولوی حالی، پروفیسر ذکا، اللہ مولوی نذیر احمد، نواب محسن الملک، انہیں سے کون بزرگ کس کالج کے تعلیم یافتہ تھے اور کسے یورپ جا کر یا ہندوستان میں بیٹھ کر مغربی خیالات پر عبور کر نیکی نوبت آئی تھی لیکن یہی لوگ ہیں جنکے زورِ قلم نے اُردو ادب کی کایا لپٹ دی اور یہی وہ مبارک نفوس ہیں جنکی زبردست داعی کاوشوں نے اُردو لٹریچر کی تاریخ میں ایک شاندار اور روشن باب کا اضافہ کیا ہے۔

بہر کیف اسے اتفاقی بات سمجھ لویا کسی خاص سبب کا لازمی نتیجہ کرنل ہارلڈ نے جو پودھا نصب کیا تھا اُسکے سینچنے والے بہت جلد کئی ایک پیدا ہو گئے اور گواہی تک اس پودھے میں پورے طوبہ پھل نہیں آئے لیکن کوئی یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ یہ خشک ہو جائیگا۔ سر سید آزاد، حالی، مہد علی خان، چراغ علی، شبلی، ذکا، اللہ نذیر احمد، سبھون نے اپنا پسینہ اس ہونہار نہال کی آبیاری میں صرف کیا اور اُسکی نشوونما کا سامان ہم پہنچایا۔ مذہبی، وطنی، ادبی، معاشرتی، تاریخی، سوانحی مضامین و کتب جو ان حضرات کے قلم سے نکلے اس درخت کی مختلف شاخیں سمجھی جاسکتی ہیں۔ ان مضامین پر ان ہر گان قوما نے جو کچھ لکھا خوب اور بہت خوب لکھا کہ اخلاف کے لیے اُنکی پکتہ بین نمونہ کا کام دیتی ہیں لیکن ابھی ایک چیز کی کمی تھی یعنی جدید اصول پر قضاے اور فسانے لکھ جانے کی ضرورت تھی۔ گو یہ ضرورت ایک

حد تک مولانا نذیر احمد کی بعض کتابوں از قسم مرقۃ العروس وغیرہ سے پوری ہو گئی تھی لیکن انصاف یہ ہو کہ یہ کتب عورتوں کیلئے لکھی گئی تھیں اور اسلئے عمداً انہیں بعض اُن اُصول سے احتراز کیا گیا تھا جو مغربی ناولوں کے بنیادی پتھر تسلیم کیے جاتے ہیں۔

اس مسئلہ پر رائے زنی کرنا تحصیل حاصل ہو گا کہ اُردو میں قصہ نگاری کا قدیم رنگ کیا تھا کیونکہ جو لوگ اُردو جاننے اور پڑھنے والے ہیں ممکن نہیں کہ انھوں نے خود طلسم ہوشربا، بوستان خیال، یا فسانہ عجائب کی بعید از خیال اور خلاف عقل و قیاس سرگزشتوں کا مطالعہ کیا ہو یا کم از کم اُنکی حالت سے آگاہ نہوں۔ ان کتابوں کے مصنفین کی جد اور مضمون آفرینی میں کسکو شک ہو سکتا ہو لیکن اسکے باوجود کہنا پڑتا ہو کہ یہ فسانے اصلیت سے خالی تھے اور اسوجہ سے اُن سے وہ کام نکل گیا جو یورپ میں آج ناولوں کے ذریعہ سے ہو رہا ہو۔ وہاں ان ناولوں اور قصوں سے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فوائد حاصل ہوئے اور ہو رہے ہیں اور ہمارے یہاں ان پرانے افسانوں سے صرف تفریح طبع مقصود سمجھی جاتی رہی ہو۔ اسی شوق نے جو زیادہ تر اُمراء اور حکمرانوں کے دلوں میں جا گزین تھا ہمارے یہاں داستان گو یوں کی ایک خاص جماعت پیدا کر دی تھی جسکے ”باقیات الصالحات“ آج بھی ہندوستان کی اسلامی دیسی ریاستوں میں اپنے اسلاف کے کمال کا علمی ثبوت دینے کے لیے موجود ہیں۔ لیکن اب ان باتوں میں کوئی لطف نہ رہ گیا تھا اور خیالات اور مذاق کے تغیرات کے ساتھ ضروری تھا کہ اس صنف خاص میں بھی کچھ مسالہ اُن لوگوں کی ضیافت طبع کی غرض سے دیا گیا جاتا جن کا وجدان صحیح دیو جن بھوت پریت کے دور از خیال اور غیر سبق آموز قصص میں کوئی دلچسپی نہیں لے سکتا تھا۔ اس اہم ضرورت کی تکمیل کے لئے سب سے پہلے پنڈت رتن ناتھ سرشار لکھنؤی کو ہوا اور وہی اُردو

کی جدید طرز کی فسانہ نگاری کے موجد ہیں۔ ہم ادھر کیسے قدرت و استجاب سے اس امر کا اظہار کر چکے ہیں کہ اُردو زبان کے اولین مصلحون میں جنہیں نام نظر آتے ہیں وہ سب کے سب قدیم تعلیم و تربیت کے نمونے تھے۔ پنڈت رتن ناتھ بھی پرانے زمانے کی یادگار تھے۔ انہیں اتنی بات ضرور تھی کہ وہ انگریزی بھی جانتے تھے اور غالباً مطالعہ کے زور سے اُس میں مہارت کامل پیدا کر لی تھی۔

یہ امر ابھی تک ما بہ النزاع ہو کہ جدید فسانہ نگاری میں اولیت کا سرشار کے سر ہو یا سرشار کے۔ قدر دانان اُردو کے دو گروہ ہو گئے ہیں ایک شر کی فضیلت کا مدعی ہو دو سر سرشار کی۔ ہمارے یہاں اُصولی اور علمی بحثوں میں بھی ذاتیات تک نوبت آجاتی ہو ورنہ اس قسم کے مسائل پر رائے زنی کرنا نہ صرف دلچسپی کا موجب ہوتا ہو بلکہ مفید بھی کیونکہ کسی زبان کی تاریخ ان واقعات کے فیصلہ کن تملک بغیر کسی طرح مکمل نہیں کی جاسکتی۔ بہر حال یہ بحث ایک عرصے تک جاری رہی اور دونوں گروہ اپنے اپنے عقائد کی تائید عقلی و نقلی دلائل سے کرتے رہے ہم کو اس جگہ ”سرشار و شرشار کے قضیہ کو از سر نو تازہ کرنا منظور نہیں لیکن ہماری ذاتی رائے اس باب میں یہ ہو کہ اگر مولانا حکیم برہم کی منطق کی رعایت سے یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ”فسانہ آزاد“ جو سرشار کی شہرت علمی کی بنیاد ہو بعض اسباب سے جدید طرز کے ناولوں کی فہرست میں جگہ پانے کا مستحق نہیں تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ سرشار اُصولاً اُردو ناول نویسی کے موجد ضرور ہیں۔ اس سے ہمارا منشاء یہ ہو کہ سرشار سے پہلے ہندوستانی فسانہ نگار جن جنھوں نے اُردو قصوں سے مولوی عبدالحکیم صاحب شروع سرشار کو مخاطب کر کے فراتے ہیں مصرع

تم نے نئی نکالی فسانہ کی راہ واہ

اور یہ اس بات کا تین ثبوت ہو کہ جدید فسانہ نگاری میں اولیت کا سرشار کے

سر ہے۔ (اڈیٹر)

کو مافوق العادت واقعات سے ہرگز کرینکی جگہ انہیں اصلیت کا رنگ پیدا کیا ہے۔

سرشار کی اولین تصنیف جس نے دنیائے ادب میں انکی ناموری و عظمت کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں ”فسانہ آزاد“ ہے۔ اسکو اردو قصص اور ناولوں میں باعتبار مضمون کے وہی درجہ حاصل ہے جو انگریزی میں ”ٹوان کوکیزاٹ“ کو ہے۔ فسانہ کی شان نزول بھی یہی ہے کہ سرشار کے کسی دوست نے اس طرز کی کتاب تصنیف کرینکی فرمائش کی تھی۔ سرشار نے مستقل کتاب مرتب کرنے کی جگہ پہلے جداگاہ مضمون کی حیثیت سے اسے اودھ اخبار میں چھپوانا شروع کیا اور جب انھیں معلوم ہو گیا کہ پبلک کو اس سے بے انتہا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے تو اسے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔

”فسانہ آزاد“ میں جدید و قدیم رنگ کی آمیزش اس تناسب کے ساتھ کی گئی ہے کہ دونوں مذاق کے لوگ اسے پسند کرتے ہیں۔ ہم اسجگہ فسانہ آزاد کی خصوصیات کو نمبر وار قلمبند کرنا چاہتے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلی اور مفید ترین خصوصیت ”فسانہ“ کی یہ ہے کہ اس میں جس قدر واقعات ہیں وہ سب کے سب بلا استثناء انسانی طاقتوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ہمارے پڑنے پڑھنے میں روحانی قصرات کا منظر بہت دلکش الفاظ میں پیش کیا جاتا تھا لیکن یہی ایک بات ایسی تھی جو قصے کو صرف قصہ کی وقعت دلاتی تھی نہ اس سے اخلاق و آداب پر کوئی اثر پڑتا تھا نہ کوئی تاریخی یا تمدنی منافع مرتب ہوتے تھے اور نہ کسی معاشرتی یا منزلی تنازع کا استنباط ہوتا تھا۔ کیونکہ جب پڑھنے والا یہ سمجھ لے کہ اس کتاب کا ہیرو محض روحانی طاقتوں کی بدولت اپنی مشکلات سے عمدہ برآیا ہے اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا تو اس سے اسکی ہمت و جرأت و استقلال میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ ہر سلیمانی یا الہ دین کے چراغ کا حاصل کرنا انسانی طاقت قطعاً خارج ہے۔ لیکن اگر اسکی کامیابی اور مقصدوری خود

انسانی کوششوں کا نتیجہ ثابت کی جائے تو یقیناً اس کے عزم اور ارادے بلند ہوں گے اور وہ یہ خیال کرے گا کہ اس شخص کی طرح میں بھی اپنے دماغ اور ذہن سے کام لیکر مقصد ور ہو سکتا ہوں۔

۲۔ دوسری خصوصیت فسانہ کی یہ ہے کہ اس میں جس قدر باتیں لکھی ہیں وہ ایسی ہیں کہ انکی اصلیت سے کسی کو انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ کوئی منظر کوئی سین کوئی واقعہ ایسا نہیں دکھایا گیا جسکی ہوبہو تصویر نہ کھینچ دی ہو۔ مثال کے لیے ”فسانہ آزاد“ کے ابتدائی صفحات دیکھیے جہاں آزاد کتب وغیرہ کی سیر کرتے اور وہاں کی کیفیت باعنا نظر دیکھتے پھرتے ہیں۔ یہ حالات مطالعہ کیجئے تو ممکن نہیں کہ وہی سامان آنکھوں کے سامنے پھر نہ جائے۔

۳۔ ناول کی کئی قسمیں ہیں کسی میں کوئی تاریخی واقعہ درج ہوتا ہے، کسی میں رسم و رواج کی کیفیت دکھائی جاتی ہے، کوئی کسی خاص زمانے کی عام معاشرتی و تمدنی حالت کا آئینہ ہوتا ہے۔ فسانہ آزاد اوست کی لکھنؤ کی سوسائٹی کا دلچسپ ترین مرقع ہے۔ سرشار کی دو ایک اور تصانیف (سیر کسار وغیرہ) اس خصوصیت کی مشترکہ طور پر حصہ دار ہیں۔ سرشار لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ محمد شاہ کا زمانہ تھا اور یہ زمانہ عروج کا تھا۔ لیکن اسلامی سوسائٹی میں جہاں تک اسکا تعلق اودھ سے ہے وہ لہریب خوبیوں کے ساتھ بعض قابل صلاح عیوب بھی موجود تھے اور تعجب معلوم ہوتا ہے کہ ان باریک باریک باتوں کو جن پر اکثر خیال بھی نہیں جاتا سرشار نے نہایت غور و خوض سے دیکھا اور جانچا۔ انھوں نے کسی پر کوئی اعتراض نہیں کیا، کسی قسم کا الزام نہیں لگایا، لیکن محاسن کے ساتھ معایب کا ذکر اس انداز سے کر گئے ہیں کہ نکتہ سنج طبائع ان کا مشافور اور یافت کر لیتی ہیں۔

۴۔ اردو شریں بیگمات کی زبان خاص وقت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے اور اس امر خاص میں دہلی اور لکھنؤ والے دونوں ہمنوا ہیں کہ جس

باقاعدہ طریقے سے اصولاً نہ وہ اس قسم کے جذبات کو کبھی اپنے دل میں جگہ نہیں دیکھتیں۔ تاہم تصویر کا یہ رخ گویا ہنرات کا شاہد ہو کہ آزادی نسوان کی جو ساعی آج کل بعض اسلامی حلقوں میں ہو رہی ہیں اگر یہ کامیاب ہوئیں تو تقریباً ایک صدی کے بعد عذرات اسلام کی معاشرہ منزلی یا جذبات اخلاقی میں جو تغیر ہوگا وہ غالباً اسی قبیل کا ہوگا۔

۵۔ زبان کی خوبیوں کا ایک پہلو ادب پر دکھانے کے بعد صرف اس قدر کہنا رہتا ہے کہ بیگمات کی گفتگو سے قطع نظر دوسری صورتوں میں بھی فناء آزاد کے مصنف نے اپنے شخاص افسانہ کے طرز کلام کی نقل اتارنے میں کمال کر دکھایا ہے۔ ملاحظہ فرمادیں اور اعظا سے افیونی اور سرے کی بھٹیاری تک کی بول چال اس صفائی سے دکھائی گئی ہے کہ باید و شاید۔

۶۔ یہی مکالموں کا حال ہے۔ ناول نویس کے لیے یہ منزل بہت دشوار گزار ہوتی ہے کیونکہ اُسے اپنا مافی الضمیر دوسروں کی زبان سے ادا کرنا پڑتا ہے کہ سننے والوں کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ مشکل اور مخاطب کے درمیان کوئی توسل اور بھی ہو۔ سرشار اس وقت پر بھی بخوش اسلوبی غالب آئے ہیں اور انھوں نے اس راستے کو اس طرح طے کیا ہے کہ کسی جگہ تکان کے آثار نہیں پائے جاتے۔

۷۔ سرشار کے فناء کے کیرکٹر پوتے ہوئے ہیں اور یہ صفت بھی بہتر ناولوں کا حصہ سمجھی جاتی ہے۔ آزاد اور خوجی پران کا طبعی رنگ اتنا گہرا ہے کہ وہ جہاں کہیں اور جس جگہ بھی نظر آتے ہیں دور سے شناخت ہو جاتے ہیں آزاد اور خوجی کی جو شہرت اب علمی و ادبی دنیا میں پائی جاتی ہے اُسکی مثال الف لیلة کے خاص خاص کیرکٹروں کے سوا اور کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ یہ بھی سرشار کے باکمال ہونے اور انکی تصنیف کے قبولیت عامہ کا فخر حاصل کرینکی ایک واضح دلیل ہے۔

۸۔ اس میں شک نہیں کہ تاریخی ناول فن فناء نگاری کا بہترین عنصر سمجھا جاتا ہے لیکن بسا اوقات اس میں صحیح اور مستند واقعات کے ساتھ

محاورے کا ثبوت محلات کی گفتگو سے نہ ملے وہ قابل سند نہیں۔ ایک جُدا گانہ بحث ہو ورنہ ہم اسکے متعلق کچھ عرض کرتے۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ بیگمات کی زبان کی نقل ہر شخص آسانی سے نہیں اتار سکتا۔ آج کل صرف دو چار آدمی ایسے گذرے ہیں جنھوں نے اس میں کمال کر دکھایا ہے اور ان میں سرشار یقینی طور پر ممتاز ہیں۔ اس کا ثبوت ”فسانہ آزاد“ اور ”سیرکسار“ کے صفحے صفحے سے ملتا ہے۔ وہی الفاظ، وہی محاورے، وہی لب و لہجہ، وہی انداز تقریر، وہی لوجہ دار باتیں، وہی فصاحت، وہی لطافت گویا آپ اپنے کانوں سے کسی خاتون کو گفتگو کرتے ہوئے سن رہے ہیں۔

پروہ نشین مستورات کی زندگی مغرب کی نگاہوں پر ان لوگوں کی نظروں میں جو اسلامی طرز معاشرت سے واقفیت نہیں رکھتے ایک سرسبز راز بنی ہوئی ہے لیکن سرشار کے فناء آزاد میں اسکے چہرے سے پروہ اٹھا دیا گیا ہے۔ اور کم از کم لکھنؤ کی بیگمات کی سوسائٹی کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ صحیح اور بالکل صحیح ہو قجب معلوم ہوتا ہے کہ جو کام ایک مسلمان اہل قلم عمدگی کے ساتھ کرنا وہ سرشار نے کر کے اپنی واقفیت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ وصف اُسی شخص میں ہو سکتا ہے جسے اپنی آنکھوں سے محلات کی زندگی کا طور طریق دیکھنے کا موقع ملا ہو۔ کہا جاتا ہے کہ سرشار کو ایسے مواقع خوش نصیبی سے ملے تھے۔ پڑوس میں مسلمانوں کے مکانات تھے۔ اُس زمانہ میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات بالکل برادرانہ تھے۔ سرشار کو اپنی عمر کے ابتدائی حصے میں ان گہروں میں جانے کا اکثر اتفاق ہوتا تھا اور یہی تجربہ اور مشاہدہ جو ان کی تصویر میں اصلیت کا رنگ پیدا کرنا والا ہے یہ ضرور ہے کہ اس موقع میں بعض نقش و نگار خیالی اور فرضی ہیں مثلاً حسن آرا اور سپہ آرا کی آزادانہ معاشرت اور ان کے ساتھ آزاد کے تعلقات کا اس درجہ بے تکلف ہونا۔ یہ باتیں بہت قبل از وقت ہیں اس طرح آزاد کو ان کی محبوبہ کی جانب سے جنگ میں شریک ہو کر داد مردانگی دینے کی صلاح ایک ایسا فعل ہے کہ تا وقتیکہ عورتوں کی تعلیم و تربیت

عشق و محبت کی سرگزشت کا فرضی بیوند لگایا جاتا ہے جس سے اصل کتاب پایہ اعتبار سے ساقط ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ نقص اُن ناولوں میں نہیں ہوتا جنہیں کسی خاص ملک، قوم، ملت، یا کسی خاص وقت کے مراسم اور رواج یا سوسائٹی کی عام حالت دکھائی جاتی ہے۔ اس قسم کی تصانیف ہر زمانہ میں دلچسپی کی چیز سمجھی جاتی ہیں کیونکہ اُن کے ذریعے سے سچے حالات بلا فرق معلوم ہونے کی وجہ سے آنیوالی نسلیں بھی اُن سے دلچسپی لے سکتی ہیں اور اس طرح کتاب کی عمر غیر محدود ہوتی ہے۔ سرشار کا فسانہ اور سیر کسار اسی قسم کے ناول ہیں جنہیں اگر واقعات سب فرضی ہیں لیکن انھیں گرد و پیش کے جن حالات و واردات کے ساتھ منسلک کیا ہے اُن کے صحیح اور دلپسند ہونے میں کلام نہیں جس طرح ہم ان کتابوں کے مطالعہ سے لکھنؤ کی قدیم سوسائٹی (جسکی کچھ جھلک اس زمانے میں بھی وہاں پائی جاتی ہے) کے متعلق آگاہی حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح آئندہ زمانے میں بھی اگر کسی کو یہ شوق ہو تو اس کیلئے معلومات کا بہترین ذریعہ فسانہ آزاد یا اسی قسم کا اور ٹریسچر ہوگا۔ اس نتیجہ پر پہنچنے کے بعد غالباً سب کو اعتراف ہوگا کہ ”فسانہ“ کا شمار جائز استحقاق کے ساتھ کم از کم اُردو کی اُن زندہ جاوید کتابوں میں ہونے کے لائق ہے جو اپنی مستقل دبستگی اور دائمی مفاد کے سبب خاص و عام سے قبولیت کا شرف لیکر مدت مدید تک رواج پذیر رہتی ہیں۔ اس قسم کی تصانیف مصنف کیلئے عموماً سرمایہ ناز ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے اگر سرشار کو فسانہ آزاد پر فخر ہو تو کچھ نازیبا نہیں۔

اگر مقررین کا خیال ہے کہ بہت سے محاسن کے ساتھ فسانہ آزاد میں چند عیوب بھی ایسے موجود ہیں جو نظر انداز نہیں ہو سکتے مثلاً کتاب کی ضخامت اس قدر ہے کہ طوالت بعض مرتبہ مطالعہ کی دلچسپی کو کم کرتی ہے۔ اس طرح مضامین اور واقعات کا غیر مسلسل ہونا بھی اصول تنقید کے لحاظ سے قابل اعتراض ہے۔ بعض اہل نظر فسانہ آزاد کو جدید ناول

نویسی کا نمونہ ہی نہیں سمجھتے۔ یہ باتیں ایک زمانہ تک معرض بحث میں رہ چکی ہیں اور یہاں اُن کا اعادہ تحصیل حاصل ہوگا۔ فسانہ آزاد کے علاوہ سرشار کی اور تصانیف بھی ہیں لیکن حقیقت اُن کا علمی امتیاز فسانہ آزاد سے قائم ہوا ہے۔ تصنیفات مابعد میں سے سیر کسار جام ششرا اور کامنی خصوصیت سے قابل تذکرہ ہیں لیکن انہیں سے کوئی فسانہ کے رتبہ کی نہیں۔ سیر کسار تک تو خیر لیکن اسکے بعد شاید ضرورتاً انھیں ایسی کتابیں لکھنا پڑیں جو عموماً ”بہرئی“ کے لقب یا دیجاتی ہیں۔ پی کہان، ہشو، بچھری ہوئی دھن وغیرہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قلم برداشتہ لکھی گئی ہیں۔ ان سے تفریح کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں متصور ہو سکتا۔

ایک رے سرشار کی کتابوں کے متعلق یہ بھی ہو کہ اُن کے تمام ناولوں میں فسانہ آزاد سے لیکر ”ہشو“ اور ”پی کہان“ تک ایک ہی قسم کی سوسائٹی کا رنگ دکھایا ہے اور ایک ہی طرح کے کیرکٹر پیش کیے گئے ہیں۔ یہ خیال بالکل صحیح ہے۔ لیکن اسکی وجہ یہ تھی کہ جس معاشرت کی تصویر انھوں نے دکھائی ہے اُسکے اور صرف اُسے ہی کے خط و خال سے وہ بخوبی واقف تھے۔ اگر دوسری راہ وہ اپنے لیے نکالتے تو شاید انھیں بھی اس قسم کے الزامات کا ہدف بننا پڑتا کہ

عرب میں دہشون کا کیا ذکر یا

مغربی ہیر و مین کی سیاہ اور چمکدار زلفیں کہان۔

ہمارے خیال میں اگر سرشار تاریخی ناولوں کی طرف توجہ کرتے تو غالباً اپنی قابلیت سے اُس میں بھی مرد میدان ثابت ہوتے لیکن رنگ اُن کے طبعی مذاق کے بالکل مخالف تھا اور ابتداء انھیں اس دُشوا گذار گھاٹی کے طوکر نے بین ناقابل بیان مشکلات کا سامنا ہوتا اور ان پر غالب آنے کے بعد بھی یقیناً انھیں پبلک میں یہ سوخ نہ حاصل ہوتا جو فسانہ آزاد کو جوہ سے ہوا۔

کسی کتاب یا کسی مصنف کی تصانیف کی قدر و منزلت یہ دیکھنے سے بھی معلوم ہو سکتی ہے کہ اُس کتاب یا اُن کتابوں کی وجہ سے اُس زبان کے عام علم ادب پر کیا اثر پڑا۔ سرشار نے ناول نویسی کی جدید شاہراہ دکھا کر اُردو اہل قلم کا ایک معقول گروہ اُس پر چلنے کیلئے تیار کر دیا ہے اور اب حقیقتاً نئے ناول لکھے جاتے ہیں وہ اُصولی طور پر سرشار کے نمونے پر ہوتے ہیں۔ اُصول سے ہمارا یہ مطلب ہے کہ اگرچہ سین، پلاٹ، اور واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے بعض جدید ناول فسانہ آزاد سے افضل ثابت ہوئے ہیں، لیکن فی حقیقت یہ فسانہ آزاد کے تابع و تقلید سے اس لئے باہر نہیں کہے جاسکتے کہ سب سے پہلے فسانہ آزاد ہی نے جدید قصہ نویسی کا نمونہ پیش کر کے دکھایا تھا کہ قدیم و جدید افسانوں میں ماہ الامتیاز فرق کیا ہے اور فطرت انسانی کے کارنامے کس طرح آشکارا کرنا چاہیے۔ بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سرشار کی تصنیفات نے اُردو کے فن افسانہ نویسی کو خاص تقویت پہنچائی ہے اور اس کا اعتراف تو اُن لوگوں کو بھی ہے جو سرشار کو اُس عزت کا مستحق نہیں سمجھتے جو انھیں ملک نے دے رکھی ہے۔

جدید طرز کے افسانوں کے ماسوا سرشار کی علمی خدمات کی تفصیل کچھ اور بھی ہے جو جسے ہم اختصار کے ساتھ اس جگہ قلم بند کریں گے۔ سب سے پہلے اُن کے مضامین مراسلہ کشمیر اور اودھ پنچ وغیرہ میں نکلتے اور مقبولیت حاصل کرتے رہے۔ ۱۹۱۵ء میں انھوں نے علم طبیعیات کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ کر کے شمس الضحیٰ نام رکھا۔ انگریزی انھوں نے کیننگ کالج لکھنؤ میں پڑھی تھی اور گودہ کسی امتیازی ڈگری کے مالک نہ تھے لیکن ذاتی لیاقت اس پایہ کی تھی کہ شاید ہر قسم کا کام وہ انگریزی میں کر سکتے تھے۔ ایڈوکیٹ اور پائیرین اُن کے مضامین وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے تھے۔ مراسلات ڈفرنہ کے نام سے انھوں نے لارڈ ڈفرن کے خطوط کا ترجمہ بھی کیا ہے۔ خطوط مطالب کے اعتبار سے بہت دقیق ہیں اور اس کا صاف و صحیح ترجمہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ سرشار

قابلیت انگریزی دانی میں "فاضلانہ" ضرور تھی۔

عربی فارسی کی تعلیم اُس وقت شرفا سے ہندو میں عام طور پر رائج تھی اور سرشار بھی ان دونوں زبانوں میں یدِ طولیٰ لکھتے تھے۔ چار برس کی عمر میں ان کے باپ پنڈت بیچ ناتھ کا انتقال ہو گیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شفیق باپ کا سایہ سر سے اٹھ جانیکے باوصف تعلیم اُنکی باقاعدہ ہوئی۔ اس کا ثبوت اُن کے علمی مضامین سے بھی ملتا ہے۔

۱۸۷۱ء میں مٹی نو کشور نے اودھ اخبار کا انھیں ایڈیٹر مقرر کیا۔ اُنکے زمانے میں جو شہرت اور ہر دلعزیزی اس اخبار کو حاصل ہوئی، اُنکی نظیر اسکی پچھلی اور مابعد کی زندگی میں نہیں ملتی۔ خصوصاً جس زمانے میں فسانہ آزاد با قسط اُس میں شائع ہوتا تھا اُس وقت اودھ اخبار کی مانگ بہت بڑھ گئی تھی اور شاید یہ پہلی کامیابی تھی جو کسی اُردو اخبار کے حصہ میں آئی۔

اودھ اخبار سے قطع تعلق ہو جانیکے بعد وہ اپنا خاص رسالہ عکد شرشار نکالنے لگے جس میں یہ التزام رکھا گیا تھا کہ اُسکے ہر نمبر میں ایک مکمل ناول نکلتا تھا۔ پی کمان، پچھڑی ہوئی دُھن، اور کڑم دہم اسی میں نکلتے تھے۔ ۱۹۰۵ء میں جب میں حیدر آباد گیا تو حضرت سرشار وہاں پہلے سے موجود تھے۔ مولانا عرشی جو دربار صفی کے نامور فارسی گو شاعر گویا ہیں اُن سے سرشار کے رواج بہت بڑھے ہوئے تھے اکثر آیا جایا کرتے تھے۔ مجھے بھی عرشی صاحب کے توسط سے اُن کی خدمت میں نیاز حاصل کر نیکا موقع بار بار عجیب طبع اور بذلہ سنج آدمی تھے جب تک بیٹھے رہتے حاضرین کو اپنی دھچپ باتوں سے محظوظ کیا کرتے کسلبیسی ہمارا راجہ کشن پرشاد اُس زمانے میں وزیر افواج نظام تھے۔ اُن کے دو لنگہ پر حضرت سرشار رہتے تھے۔ ہمارا راجہ بہادر اُن پر بہت عنایت کرتے تھے۔ آخر دم تک سرشار پھر اُن سے جدا نہ ہوئے۔ حیدر آباد میں بھی حضرت سرشار نے اپنے علمی مشاغل کا سلسلہ از سر نو جاری کیا تھا۔

حضور نظام مرحوم کی سالگرہ کی یادگار میں دبیبہ صفی اور محبوبا لکھام
نثر اور نظم کے پرچے ہمارا جہاد کی سرپرستی میں حضرت سرشار کے اہتمام
سے شائع ہوتے تھے۔ بالخصوص دبیبہ صفی ان کے مضامین سے لبریز رہتا
تھا لیکن اکثر مضامین دوسروں کے نام سے چھپتے تھے تاہم طرز تحریر سے
یہ ثابت ہو جاتا تھا کہ اسکے مصنف حضرت سرشار ہی ہیں۔

سرشار اسم باسمی سرشار تھے۔ آب آتشین سے انھیں اس وجہ
اُس تھا کہ کسی وقت اُسکی کیفیت سے خالی نہوتے تھے۔ جان کہیں
جاتے تو ملازم کے ساتھ ایک بوتل ضرور ہوتی۔ مینوشی کا شغل اُن کی
خلوت و جلوت کا رفیق تھا۔ اس بے اعتدالی نے جان ایک طرف اُنکے
قولے جہانی کو صد مہینچا یا دہان دوسری طرف اُنکے آفتاب کمال کو
بھی گھن لگا دیا تھا۔ قاعدے کی بات ہو کہ انسان جب قدر معمر اور سن ہوتا
ہو اس قدر اُسکا ہنر چنگی پاتا جاتا ہو لیکن سرشار کی جُداگانہ کیفیت
تھی جیسے جیسے وہ بڑھتے گئے ویسے ویسے اُن کے جوہر فن کی جلانامد
پڑتی گئی اور اگر سبب غائر نظر سے دیکھا جائے تو سب سے قوی ہی ہو گا
کہ اُنھوں نے ”نبت العنب“ کو منھ لگا کر خود کو تباہ و برباد کر دیا تھا۔

سرشار کا اصلی نام پنڈت رتن ناتھ در تھا لیکن وہ زیادہ تر اپنے
تخلص سے مشہور ہیں۔ اسکے باوجود بہت کم لوگوں کو معلوم ہو گا کہ فن
شعر گوئی میں بھی اُنھیں ہمارت تھی۔ بیشک وہ شاعر تھے اور کبھی کبھی
شعر بھی کہتے تھے لیکن اُنکی علمی عظمت کی کفالت اُنکی دوسری تصانیف
سے ہوتی ہو نہ کہ اُن کے چند متفرق اشعار یا دو ایک مختصر مثنوی اور
نظموں سے جن کے کہیں کہیں کے اشعار اکثر لوگوں کو یاد ہیں تھہ سرشار
ایک مثنوی ہو لیکن اُس سے بچنگی کلام اور رنگینی خیالات کا ثبوت کچھ
زیادہ نہیں ملتا۔ تاہم قیاس سے کہا جاسکتا ہو کہ اگر سرشار نے شعر گوئی
کی طرف کچھ اور توجہ کی ہوتی تو وہ اپنے زمانے کے ایک اچھے شاعر ہوتے
ایک شعر اُن کا یہ ہو۔ ناظرین مضمون کی نزاکت کا اندازہ کریں ۵

حال سب میری بخت جانی کا بازہ کستی ہے مڑ کے خنجر سے
دو شعر اور دستیاب ہوئے ہیں جو تبرک سمجھے جانے کے قابل ہیں ۵
پتے پہ جب آتے ہیں تو چہ بس نہیں کتنے میخانے میں سنتے نہیں سرشار کی
سیاہ بخت و تہ روزگار ہم بھی ہیں جواب زلف پریشان یا ہم بھی ہیں
شاعری میں حضرت اتیر لکھنوی کے شاگرد تھے۔ لیکن اُنکے اشعار
گواہ ہیں کہ اُنھوں نے ضائع و بدائع کی پابندی میں اپنے اُستاد کی پیروی
نہیں کی بلکہ صاف اور شستہ زبان کو ترجیح دی ہو تھہ سرشار کی تمہید
اسکے ثبوت میں پیش کیا جاسکتی جو حسین کہتے ہیں ۵

لندن کی پلا دو آتشہ سے آپر مغان کہ صر چھپا ہے
داتا پو شراب اچھوتی خوشبو خوش رنگ تیز چوکی
سر خوش شراب ناب لایے بوتل منھ سے مرے لگا دے
بدست ہوں پی کے ایک چلو زاہد کو بنا میں خوب اُلو
ہر سائے شراب ناب ساتی دکھلا دے آفتاب ساتی
فتوئے کاشی کا کون مانے لاکھ نمین پیوں کھلے خزانے
رم جھم بے بس رہا ہے پانی بے مے ہے حرام زندگانی
ساتی نامہ سرشار سے اچھا کون لکھ سکتا تھا جکے گھر کی شراب نوٹھی
تھی۔ ظرافت کا مادہ اُن کی طبیعت میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا اس کا رنگ
اُن کی تمام تصانیف میں موجود ہو اور اوپر کا چو تھا شعر بھی اُنکی شوخ
کلامی اور آزاد منشی کا ثبوت ہو۔ مندرجہ ذیل شعرو میں صبح صادق کی
کیفیت کس دلکش پیرائے میں دکھائی ہے ۵

جھلکا جھلکا سپید صبح ہلکا ہلکا سپید صبح
تارے چھپتے ہیں جھلکا کر ہے نور سا جلوہ گر فلک پر
بھینی بھینی مک گلونی اور نغمہ زنی وہ بیلون کی
اے ساتی مہ لقابہ مے لے مرد خدا بنجواب تاکے
وقت سحر اور خنک ہوا ہو بے مے سب کر کر امر لے

اک چلوک دینے میں بہ تکرار اٹھو جاگو سحر ہوئی یار
مرغان چین بہ نکتہ رانی چون برہمن بدیدہ خوانی
نوبت رنگت جمار ہی ہے شہنائی مزا دکھا رہی ہو
بعض مختص المقام تشبیہیں اور استعارے نہایت پُر لطف ہیں
مثلاً طیور کی خوش الحانی کی مشابہت برہمنوں کی دیدہ خوانی سے کس قدر
کیفیت خیر ہو اس طرح "کاشی کا فتویٰ" جو کہیں گنڈر چکا ہو نئی چیز ہو اور لطف
سے خالی نہیں۔ اگر ہندو شعراء اپنے مذہبی اور قومی خصوصیات کو اس طرح
اُردو ملیحات و استعارات میں داخل کر سکیں تو یقیناً عجیب و دلپسند
اضافہ ہوگا۔

اسی مثنوی میں ہندوستان کی گزشتہ عظمت کا فوٹو ان الفاظ
میں پیش کیا ہے ۵

اب ہند میں کیار ہا ہر بھائی فریاد ہے ہندو دھائی
مصری اسی باغ کے تھے اک گل شاگرد تھے ہند کے جزو گل
اک پھول اسی چراغ کے تھے اک بوند اسی باغ کے تھے
سقراط سے لیکے تا بلقان طفل مکتب تھے اہل یونان
آگے اسکے زین سے تامہ سب کرتے تھے زانوئے ادب تہ
رامائن میں دکھائے وہ ڈھنگ ہو مرکا بھی جم سکا نہ کچھ رنگ
رنگت مٹن کی بھی ہو پھیسکی سُجھان اللہ والیسکی
کالیداس آن خدائے بنیش سرمایہ ناز آسنر بنیش
جھنڈو بیدک میں بھی گڑھو تھے یونانی جیب میں پڑے تھے
دعویٰ جس کو ہو جان مل کا دیکھے وہ فلسفہ کپل کا

وہ علم وہ فضل اب ڈبویا

جو کچھ سیکھا تھا اب وہ کھویا

غزلیات کہنے کے سرشار معمولاً عادی نہ تھے لیکن اکثر ان کے
زمانہ حیات میں انھیں کے اہتمام سے بمقام حیدر آباد ہمارا جہاں آباد

کی ڈیورھی میں مشاعرے ہوا کرتے تھے۔ سرشار خود تو کچھ نہ کہتے تھے
لیکن مقامی شعرا کو اصرار کے ساتھ شرکت کے لیے مدعو کرتے تھے اور
ان کی خاطر سے اکثر مشاہیر کو وہاں جانا پڑتا تھا اور اس طرح مشاعرے
نہایت رونق سے ہوا کرتے تھے۔

تاہم کچھ تو شاید اس وجہ سے کہ حیدر آباد میں انھیں باوجود
علمی مذاق کی کثرت کے اپنے ہم خیال نہ مل سکے اور کچھ اس وجہ سے
کہ شراب خانہ خراب نے اُن کو زیادہ تر گزشتہ نشینی کی زندگی چھوڑ
کر دیا تھا اُن کے دم سے وہاں وہ علمی چرچا نہ ہونے پایا جس کی
اُمید سرشار ایسے مشہور رنشار کی موجودگی سے بہر صورت ہو سکتی
تھی۔ خود محبوب الکلام اور دبیرِ صافی جو ایک معنی میں اُن کے
ذاتی رسالے تھے اُن کی عدم توجہی سے کچھ زیادہ ہر دلِ سنیر
نہو سکے مضامین وغیرہ کے اعتبار سے بھی وہ بہت کم رتبہ تھے
البتہ کبھی کبھی کوئی مضمون ایسا نکل جاتا تھا جس کی طرز بیان
کہ اُٹھتی تھی کہ یہ حضرت سرشار کی جو دت طبع کا نمونہ ہے۔

حیدر آباد انھیں موت کھینچ کر لگتی تھی اور وہ پھر وہیں کے
خاک کے پیوند ہوئے۔ ۲۶۔ جنوری ۱۹۰۷ء کو حیدر آباد میں اس
خبر نے حیرت و استعجاب کی ناقابل بیان کیفیت پیدا کر دی تھی
کہ بڈت رتن ناتھ سرشار مرگ ناگہانی کے شکار ہوئے۔ چونکہ
اس سے پہلے اُن کی علالت کا حال بھی کسی کو نہ معلوم ہوا تھا
اس وجہ سے غیر متوقع انتقال سے سب کو سکتہ سا تھا۔ بہر کیف جس
مٹی میں اتیر و داغ کی بڈیوں کا پیوند ہونا مقدر ہو چکا تھا وہی شر
ایسے اہل کمال کا بھی مدفن بنی۔ ع

خدا بخشنے بہت سی خوبیاں تھیں مرثویا میں

سید محمد فاروق

مصنوعی انسان

سوشل سائنس میں بہت سے ایسے اخبارات ہیں جن میں ایک سائنسی خبر شائع ہوتی تھی کہ کلکتہ کے مشہور و معروف پروفیسر کیلاش چند اس نے مصنوعی طریق پر بعض جاندار کو ٹھکانا جن سے اجسام حیوانی مرکب ہوتے ہیں اور نیز اسی قسم کی جاندار چیزوں کی ابتدائی صورت تیار کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہو۔ اس سے پہلے ہر چند کہ پروفیسر موصوف اپنی سائنسی تحقیقات اور تجربہ علمی کے لیے ہندوستان کے ہر حصہ میں پوری شہرت حاصل کر چکے تھے تاہم بہت سی تعلیم یافتہ آبادی نے اس خبر کو حد درجہ کی بے اعتباری کے ساتھ سنا۔ لیکن اخبارات کے ایڈیٹر عجیب خیالات کے انسان ہوتے ہیں جس اخبار سے میرا مضمون نگاری کا تعلق تھا اس نے پروفیسر اس کی علمی تحقیقات کے متعلق مزید حالات دریافت کرنے کی غرض سے مجھے بلا کر کلکتہ جانے پر رضامند کیا۔ اس کے چار روز بعد جب میں لنڈ سے اسٹریٹ میں پروفیسر موصوف کے مکان پر پہنچا تو وہ اپنی لیپورٹری میں تھے۔ نوکر کی معرفت اطلاع کرائی۔ میری ان سے برسوں پہلے کی جان پہچان تھی اس لیے معمولی علیک سلیک کے بعد میں نے ملا تامل ان سے اپنے حاضر ہونے کی وجہ بیان کر دی۔

پروفیسر اس نے جن کی عمر کم و بیش چالیس سال کے قریب ہوگی میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ کیا اور مجھے شیشہ کی ماربوں کی ایک لمبی قطار دکھائی جن میں میں نے بہت سے چھوٹے چھوٹے جانور کھئی کے برابر یا اس سے چھوٹے زندگی کے لیے جدوجہد کرتے دیکھے اس خیال نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا کہ وہ ہمارے ایسے ہی ایک انسان کی ذہانت کا نتیجہ تھے۔ میں نے اس نئی دنیا کے خالق پروفیسر اس کی طرف دیکھا اور بے اختیار میرے منہ سے ان کے لیے کلمات تحسین

نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے سب سے بڑا جاندار کونسا پیدا کیا ہے؟ اسکا اُنھوں نے کچھ جواب دیا چپ چاپ مسکراتے ہوئے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔

چند قدم چلنے کے بعد اُنھوں نے دبی زبان سے میرے کان میں کہا ”میں تمہیں ایک بالکل نئی چیز دکھاتا ہوں مگر اس بات کا صدق دل سے اقرار کرو کہ تم اسکا ذکر کسی سے نہ کرو گے۔“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ جواب دیا ”میں آپ سے اس بات کا وعدہ کرتا ہوں۔“

وہ جادوگر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا ”یہ میری لیپورٹری کا حصہ خاص ہو اور میں اس وقت تک اس کے اندر کسی کو جانے نہیں دیتا جب تک میں خود اس کے ساتھ نہ ہوں جن خوش نصیب لوگوں کو اس کے اندر داخل ہونے کا موقع حاصل ہوا ہو وہ اُنکلیوں پر گئے جاسکتے ہیں۔ میں نے اس رعایت کے لیے جو خاص طور پر میرے ساتھ رہتی جانے لگی تھی شکر یہ ادا کیا اور ہم ایک تنگ گرم کمرہ میں داخل ہوئے جہاں لمبی لمبی میزوں پر بند کبسون کی قطاریں دکھائی دیں۔ کمرے کے وسط میں ایک بڑی سی مربع میز پر چند اس قسم کی ٹالیان سلڈ اور آلات موجود تھے جن کے لیے اردو زبان میں ابھی تک نام بھی ایجاد نہیں ہوئے۔ دیواروں میں جابجا خانے بنے ہوئے تھے اور ان خانوں میں قطار در قطار چھوٹی بڑی بوتلیں اور سائنس کے متعلق مختلف آلات سجے ہوئے تھے۔ کمرے میں روشنی ایک عُرغ لمپ کی تھی جو چھت سے آویزان تھا اور کمرہ ہوائی میں اس قسم کی بو تھی جیسو کسی تیز عرق کو جوش دینے سے پیدا ہوتی ہو۔

یہاں پہنچ کر پروفیسر نے ایک شیشہ کے کبس کا ڈھکنا اٹھایا۔ میں نے

خوش و خرم نہ ہوگا۔ اگر میں اس طریق پر انسان کو پیدا کرنے میں کامیاب نہایت ہوا تو میں اس کے اندر اعلیٰ قسم کا احساس پیدا کروں گا۔ بہترین ذہانت و نگاہ اور اس کے اعضا بھی ایسے بناؤں گا جیسے ارتقا کی بدولت ہمیں اب تک حاصل نہیں ہوئے۔ پندرہ مہینے سے یہ تخم سطح ترقی کر رہا ہے۔

میں خاموش سنا کیا۔ پروفیسر نے اپنے سلسلہ کلام کو جاری رکھ کر کہا ”آپ اس بات کو ذرا یاد رکھیے گا کہ یہ مصنوعی بچہ ہو بین جڑنا پیدا کرنا چاہتا ہوں اس کے متعلق میری آرزو یہ ہے کہ اس کے لیے کسی قسم کا حیوانی مادہ نہ برتا جاوے۔ ہر چیز بیان تک کہ وہ جو ہر لطیف جو بجائے خون کے اس کی پرورش کرتا ہو، بناتا ہے۔ ہمارے رشتی منی گھاس کے پتلون میں جان ڈال دیا کرتے تھے۔ کیا ہم اس گئے گزرے زمانے میں اتنا بھی نہ کر سکیں گے؟“

میں نے اس تھیلے کی طرف جو باقاعدگی سے حرکت کر رہا تھا، اشارہ کر کے پوچھا ”یہ کون سی کل ہے جس میں آپ نے اس تخم کو محفوظ رکھا ہے؟“

پروفیسر صاحب نے کہا ”مرعی کے انڈے سینے کی مشینیں دلائی سے آتی ہیں۔ تم نے ان کے نمونے کسی نہ کسی نالی میں ضرور دیکھے ہونگے۔ بس انہی کے اصول پر یہ انسانی انکیوبیٹر (سینے کی مشین) تیار کی گئی ہے۔ اس نالی میں سے ہو کر خون اُس ذخیرہ میں سے جو چھت پر ہے اس کے اندر پہنچتا ہے۔ اب تک سارا کام بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام پاتا رہا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ اگلا چھ ماہ کے عرصے میں بچہ پیدا ہو جائیگا۔ موجودہ حالت میں تخم چھ پونڈ ونی بچہ کے برابر ہو گیا ہے۔“

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا ”یہ ایجاد واقع میں جرت خیز ہے۔ سفری دنیا اس کا ذکر سن کر کیا کہے گی؟ لیکن آپ یہ تو بتائیے کہ اس کے

انداز نظر ڈالی تو اس میں تریز کے برابر ایک بڑا اور سیاہ بیضوی تھیلہ پڑا تھا۔ اس تھیلے کو ایک چمکدار نالی کے ذریعے سے ایک لمبے سُرخ سلنڈر کے ساتھ ملایا ہوا تھا جس میں برقی تار لگے تھے۔ اس کے اندر دل کی مانند باقاعدہ حرکت ہوتی تھی بس اس کے سوا اور کوئی غیر معمولی بات اس میں نظر نہ آتی تھی۔ چونکہ مجھے اس میں کوئی عجیب بات دکھائی نہ دی اس لیے میں نے پروفیسر اس سے کہا کہ آپ مہربانی سے اس کی تشریح کر دیجیے۔

وہ تھوڑی دیر خاموش رہے گویا جو کچھ کہنا تھا اس کے اثر کو دہلا کرنا چاہتے تھے۔ پھر بولے جو کچھ میں کہنے کو ہوں تم اُسے شاید باور نہ کر سکو۔ اس کے بعد وہ پھر اس طرح رک گئے گویا میرے خیالات معلوم کرنا چاہتے تھے۔

میں نے اطمینان سے لہجہ میں جواب دیا ”پروفیسر صاحب! میرے دل میں آپ کا بڑا ادب و احترام ہے۔ آپ جو کچھ کہیں گے میں اُسے صحیح تسلیم کروں گا۔“

انہوں نے جواب دینے سے پہلے ایک کرائو میٹر سے اس کی حرکات گنیں پھر اس پر ایک اس قسم کا آلہ لگایا جیسے سٹیتھسکوپ (دل کی حرکات معلوم کرنے کا آلہ) ہوتا ہے پھر میری طرف بڑی سنجیدگی سے دیکھا اور اس چیز کی طرف اشارہ کر کے کہا ”یہ ایک مصنوعی بچہ ہے۔“

(۲)

میں یہ بات سن کر حیران و ششدر رہ گیا اور بے اختیار میرے منہ سے نکلا ”کیا؟ انسان کا بچہ؟“

پروفیسر اس نے اپنی سنجیدگی میں کسی قسم کا فرق نہ آنے دیا اور کہا ”ہاں مجھے زندگی بھر اسی کی آرزو رہی ہے کہ مصنوعی انسان پیدا کر سکوں۔ میری دولت اور صحت اسی ایک خیال کے نذر ہو چکی ہے۔ اور جب میں اس میں کامیاب ہو گیا تو یقیناً مجھ سے بڑے دُرُئیائیں کوئی

اندرونی بھی ہوگا؟ اور ان اس مصنوعی انسان کی شکل و صورت کیسی ہوگی؟

پروفیسر صاحب نے جواب دیا ”میں چاہتا ہوں میرے بچے میں (کیونکہ حقیقت میں میں اسے اپنا ہی بچہ سمجھتا ہوں) وہ تمام باتیں موجود ہوں جو موجودہ نسل انسانی میں معدوم ہیں مثلاً وہ کس شعاعیں، مقناطیسی لہریں، ہیناٹرم اور روحانیت کی موجیں، نظروں سے پوشیدہ عالم اور ان کے موجودات ان سب کو دیکھ سکے گا۔ وہ عالم اور زمانہ کے اندر اس طرح پرواز کر سکے گا جیسے پرندہ ہوا میں کرتے ہیں یا ہم سمندر پر غرض وہ تمام اسرار قدرت سے واقف ہو سکے گا۔ آپ ایک موٹی سی مثال نیند اور خواب کی لیجئے۔ سانس باوجود اپنی صد ہا کوششوں کے اب تک ان نلوا کا تہ چلانے سے قاصر رہا ہے۔“

پروفیسر اس نے یہ الفاظ بڑی سنجیدگی کے لہجہ میں کہے تھے اور اس وقت ان کے چہرے پر اس قسم کا فلسفیانہ اطمینان ہو رہا تھا کہ میں بے اختیار ان کی ذہانت کی دل ہی دل میں تعریف کرنے لگا۔ اتنے میں انہوں نے اپنا ایک اور چھپا ہوا انکو بیٹھ نکالا۔ میں اس کے اندر کا نظارہ دیکھا کہ حیران و ششدر رہ گیا۔ اس چھوٹے سے شیشے کے بنے ہوئے آئینہ میں مجھے ایک نہایت چھٹا بندر اور دھڑا دھڑلتا پھرنا نظر آیا۔ آپ شاید اسکو بار نہ کریں گے لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ وہ قد میں میری انگلی سے بڑا نہ تھا۔ اس کی چار آنکھیں اوپر ہی کان تھے اور ان کے علاوہ اس میں بعض ایسے اعضا بھی دیکھے گئے جو اور کسی حیوان میں اس سے پہلے میں نے نہ دیکھے تھے۔ پروفیسر صاحب نے میرے چہرے سے میری حیرت کا اندازہ کر کے مسرت آمیز لہجے میں کہا ”چین میں جو بونے درخت ہوتے ہیں انہی کے اصول پر میں بونے بندر پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ گو یہ جانور جس کو تم اپنے روبرو دیکھ رہے

ہو قطعاً مصنوعی نہیں ہے۔“

میں نے حیرت و استعجاب کے لہجہ میں پوچھا ”پروفیسر صاحب! کیا دنیا میں اس قسم کی مخلوقات بھی موجود ہیں جس سے سانس بالکل بے خبر ہو؟ انہوں نے جواب دیا ”لا انتہا تعداد میں اگر ہم ان سے واقف نہیں تو تصور صرف ہمارا ہی کیونکہ قدرت نے ہمیں ان اعضاء سے محروم رکھا ہے جن کی مدد سے ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں۔ میں بذات خود پر یون فرشتوں جنوں، بھوتوں اور ارواح خبیثہ کے وجود کا قائل ہوں۔ یہ بندہ جسے تم دیکھ رہے ہو ایکس شعاعیں اور مادی وجودات کو دیکھ سکتا ہے۔ یہی اور اس سے بھی زیادہ صفات اس لڑکے میں ہوں گی جو میں مصنوعی طور پر پیدا کیا چاہتا ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا بالیسی کی نے ایک موقع پر کٹاکے تنکوں سے ایک لڑکا بنا کر اس میں جان ڈالی تھی اور پھر اسکا نام کش رکھ دیا تھا۔ میں چونکہ اس بچے کو نباتاتی مادہ سے پیدا کرنے کی فکر میں ہوں اس لیے میں نے اسکا نام بھی ”نبیسی“ تجویز کیا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ بڑا ہو کر وہ ہمیں نامعلوم عالموں اور ان کی مخلوقات کے متعلق بہت سی عجیب و غریب باتیں بتا سکے گا۔“

اس کے بعد پروفیسر صاحب اس بارے میں ذکر کرتے رہے کہ میں کیون اپنی اس ایجاد کا ذکر مخفی رکھنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ میں ساری مذہب دنیا کو حیران کر دوں گا۔ مغرب والے باوجود اپنی صد ہا دیافوتوں کے ابھی ہمارے سامنے طفل مکتب ہیں۔ میں اپنی اس دریافت کا ذکر اس وقت تک پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں جب تک کہ یہ بچہ پورے طور سے بالغ نہ ہو جائے۔

اس قسم کی باتیں سن سن کر میرا دماغ چکر میں آنے لگا لیکن میں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ اس لیے جب میں اسے رخصت ہوا تو دلی مسرت کے ساتھ مجھے پورے طور پر اطمینان بھی حاصل تھا۔

۲۰ سال کا عرصہ گزچکا تھا اور میں نے انکی کامیابی کی توقع دے بھلا دی تھی کہ ایک روز ایک بالکل غیر متوقع امر ظور میں آیا۔ میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک خوب روذو جوان اندر داخل ہوا اور میرے ہاتھ میں ایک بند لفافہ دیکر خود ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ خط کا مضمون چکر میں لانے والا تھا۔

میرے عزیز دوست۔

حاصل رقم میرا بیٹا نسبتی جو غیر من تعلیم دینا بھر کا سفر کر رہا ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں وہ تمہیں بہت سی عجیب و غریب باتیں سنائے گا اور تم کو اس کی شخصیت سے یقیناً دلچسپی ہوگی۔ اگر تم کسی طرح اسکی مدد کر سکتے تو میں ممنون احسان ہوں گا۔

تمہارا صادق
کیڈاش بیج۔ دوس

میں نے دوبارہ اس کے خوشنما سٹول بدن اور خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا۔ اسکی آنکھوں میں اس شخص کی سی جھلک پائی جاتی تھی جو دنیا کا بہت بڑا حصہ دیکھ چکا ہو۔ اس کے بعد عالم تحریر میں کرسی پر بیچھے کی طرف جھک گیا۔

دل میں خیال آیا۔ ”پروفیسر داس بھی ہندوستان کا ایڈمین ثابت ہونے والا ہے۔ دیکھو تو آخر مصنوعی انسان پیدا کر ہی لیا۔“

میں نے اس سے کہا کہ ”جب تک آپ ممبئی میں رہیں میری ہمانی قبول فرمائیے میں جس طرح آپ کی خدمت کر سکتا ہوں حاضر ہوں۔“

اس نے کہا میں نے ایک قصہ لکھا ہے۔ اسے کسی انگریزی یا انگریزی پرچہ میں ”رج کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا عنوان ”دو سرے عالم کی رعون سے میری ملاقات“

اس بات نے میرے یقین کو اور بھی پختہ کر دیا کیونکہ پروفیسر نے مجھ سے ذکر کیا تھا کہ میرا پیدا کیا ہوا مصنوعی بچہ ان تمام باتوں سے واقف ہو گا جو ہمارے لیے بمنزلہ اسرار ہیں۔ میں نے پوچھا

جو کچھ میں پروفیسر داس کی لیبرٹری میں دیکھ آیا تھا اگر اس کے وقت دیکھنے کا اتفاق ہوتا تو میں یقیناً اسے ایک پریشان خواب سمجھتا لیکن میں مصنوعی بچے کو اسکی ابتدائی حالت میں دن کے وقت خود اپنی آنکھوں سے دیکھ آیا تھا۔ اس کے علاوہ پروفیسر داس کی شہرت ہندوستان میں بہ اعتبار ایک محقق سائنس کے کچھ کم نہ تھی۔ ان حالات میں میرے لیے سولے اسکے چارہ ہی کیا تھا کہ جو کچھ دیکھ آیا تھا اسے بالکل صحیح اور درست سمجھتا۔

ممبئی واپس جا کر میں نے پروفیسر صاحب سے اپنی ملاقات کا کچھ مختصر بیان اپنے اخبار کے لیے لکھ دیا مگر اس معرکہ کی بات کو عمداً اس سے حذف کر دیا کیونکہ میں معاملے کو پوشیدہ رکھنے کا وعدہ کر آیا تھا۔ اس کے چند ہفتے بعد پروفیسر موصوف کا ایک خط میرے نام اس مطلب کا آیا کہ ”میں نے اپنی رہائش کا انتظام پوٹامین کر لیا ہے۔ اس معاملے کے متعلق جب کوئی خاص بات ظور میں آئے گی میں اس کی اطلاع تمہیں دوں گا۔“

اس کے بعد کئی سال گزر گئے۔ اس اثنا میں چند مرتبہ پروفیسر صاحب سے میری ملاقات ہوئی مگر سرسری اور کچھ عرصہ تک خط و کتابت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ ایک بار جب میں دوڑ کے موقع پر پوٹامین گیا تو اس ارادہ سے پروفیسر صاحب کے مکان کی طرف روانہ ہوا کہ ان سے اس معاملے کے متعلق ضرور کوئی پختہ بات دریافت کرونگا مگر آپ میری مایوسی کا اندازہ کر سکتے ہیں جب وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ وہ چند ماہ پیشتر چین و جاپان کی سیاحت کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔ میرے لیے اب سولے اس کے کیا چارہ تھا کہ ان کے نام ایک خط لکھتا اور اسکے جواب کا انتظار کرتا۔

(۳)

لنڈن سے اسٹریٹ کلکتہ میں پروفیسر صاحب سے ملاقات کیے اب

آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ حقیقی تجربہ کی بنا پر لکھا ہوگا؟“
اس نے جواب دیا ”بس ایسا ہی سمجھئے کیونکہ جو بات ہم فرض کر لیتے
وہ ایک حقیقی تجربہ کے برابر درجہ رکھتی ہو۔ تمام باتیں اصل میں ہن
انسانی ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔

مین نے کہا ”آپ بجا فرماتے ہیں مگر اخبارات یا رسالوں کے
ایڈیٹر معاملہ کو اس نقطہ نظر سے نہیں دیکھتے“

وہ بولا ”اس کا مضائقہ نہیں۔ مین اپنے قصہ کو ان کے مذاق
کے مطابق بنا کر لایا ہوں۔ مین نے جو قصہ لکھا ہے وہ نہایت پر معنی
اور با اثر ہو اس میں اگر کوئی اور غیبی نہیں تو آرجنٹٹی ضرور ہے۔
علاوہ برین میرے والد کی شہرت ہی اسے کامیاب بنانے کیلئے
کیا کم ثابت ہوگی“

مین اسکی طرف غور سے دیکھتا رہا مگر اسکا لہجہ بالکل سنجیدہ تھا۔
دل میں سوچا ”کیا عجیب و غریب انسان ہے“ مگر بظاہر صرف سچا
کہا ”مسٹر اس آپ کا فرمانا بالکل بجا ہے۔ اس صورت میں تو ایڈیٹر
جو کچھ بھی آپ لکھیں اسے چھاپنے کیلئے تیار ہوں گے۔ آپ کے پاس
اس قصہ کا مسودہ تیار ہے؟“

میرا دل قصہ کا مطلب معلوم کرنے کو سخت بے چین ہو رہا تھا۔
اسنے مسودہ نکال کر میرے حوالہ کیا اور کہنے لگا ”اس میں عالم اعلیٰ و
اسفل دونوں میں میری سیاحت کا ذکر درج کیا ہے“

مین نے مسودہ کے ورق کھولے اور پڑھنا شروع کیا مضمون نہایت
شستہ انگریزی میں لکھا ہوا تھا۔

۱۰۰۰۔ اور بہشت اور دوزخ کی کوئی شکل یا صورت نہ تھی اور

روشنی اور تاریکی دونوں زمانہ کی سطح پر ملی ہوئی تھیں۔ انسان کی
روح تصور کی سطح پر پھر رہی تھی۔

”تخیل کے پیٹ فارم پر کوئی وجود موجود نہ تھا اور ظہورات فطرت

کی گونج میں حصہ لینے والا کوئی نہ تھا۔ اور انسان نے کھانسی اور
بدی کا وجود پیدا ہوا اور ایسا ہی ہوا۔

”انسان نے خواہش ظاہر کی کہ خیال، تصور، انگ، عقل، باعث
اور اثر نمودار ہو اور اس نے محسوس کیا کہ ایسا ہونا بہتر ہے۔ جب مین

زمین پر پیدا ہوا اور اس بات کو محسوس کرنے لگا کہ مجھے اپنی کوئی
عمر بھر غم کے ساتھ کھانی ہوگی اور کہ میرے رستے میں خار اور کانٹے

بچھے ہوئے ہیں تو مین نے بہشت اور دوزخ کی سیاحت کا حزم کیا۔“

مین مسودہ کو پڑھتے پڑھتے یکایک رگ گیا اور اپنے نوجوان
ملاقاتی کی طرف دیکھنے لگا وہ اسوقت ایڈوکیٹ آف انڈیا کا پرچہ
دیکھ رہا تھا۔ مین نے اس سے پوچھا جو کچھ آپ نے لکھا ہے بالکل
راست ہے؟ کیونکہ اس زمانے کے لوگ ایسی باتوں کے باور کرنے

کے لیے یکایک تیار نہیں ہوتے۔ اس نے شانے ہل کر جواب دیا
”اگر آپ قدرتی انسان کی صورت اختیار کر سکیں اور فطرت آپ کو

اس بات کی اجازت دے کہ آپ انقلاب اور زمانہ سے بالاتر ہو
ان عالموں میں جو ہماری نظروں سے غائب ہیں پرواز کر سکیں

تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ حقیقت جس پر زمانہ موجودہ کے لوگوں کو
فخر ہو محض ایک اصطلاحی گورکھ دھند اور مستحضر ہے۔“

مین نے سر ہلایا اور اس سے کہا آپ اچھی طرح کھل کر مٹھیں
اور مسودہ کو پھر پڑھنا شروع کیا۔

”جب مین بہشت میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہ ایک عجیب و غریب
عالم ہے۔ اس میں نہ کوئی شہر تھے نہ کسی قسم کے فرائض نہ گناہ نہ ثواب۔

اس دنیا میں مندر، اسکول، محتاج خانے، جیل خانے، عدالتیں، شفاخانے
کہیں موجود نہ تھے۔ مین جدھر رخ کرتا پر لطف وہی نظارے اور

سبزہ زار نظر آتے تھے۔ ہر طرف امن و ہم آہنگی، صحت، اور خوشی
کا راج تھا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بہت بڑا

میں چونکہ دوزخ بھی دیکھنا چاہتا تھا اس لیے انھیں الوداع کسکر رخصت ہوا۔

”شیطان کی نگری میں پہنچنے کے لیے مجھے کسی قسم کی دقت پیش نہیں آئی۔ جب میں اسکی حدود میں داخل ہونے لگا تو قریباً ایک دھن آدھی بن کے منہ کتوں کی تھو تھنی سے مشابہ تھے میرے گرد جمع ہو کر پوچھنے لگے تمہارے پاس کوئی قابل حصول شے تو نہیں ہے؟ میں چونکہ دوزخ کے قوانین سے واقف نہ تھا اس لیے میں نے جواب دیا کہ میرے پاس جو اسباب ہیں وہ صرف روحانی ہیں۔ معلوم نہیں وہ کہاں تک قابل حصول سمجھا جاسکتا ہے؟“

”انھوں نے بڑے غور سے میرے کپڑوں کی تماشائی لینا شروع کی اور جب کچھ برآمد نہ ہوا تو ایک مشتبہ سی صورت کا آدمی مجھے ایک تنگ مکان میں لے گیا جہاں سے نیچے اُترنے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ نیچے اُترا تو ایک ریل کا اسٹیشن نظر آیا جو آدمیوں سے کھچا کھچا ہوا تھا۔ گرمی اور بدبو اسقدر تھی کہ میرا دماغ چکر کھانے لگا۔ کچھ حصہ اٹھا کر نیکے بعد ایک بہت بڑی ٹرین دہان اکھڑی ہوئی۔ میں حیران ہو گیا کہ اس زمانے کی تہذیب کا اثر دوزخ پر کسقدر بڑھ چکا ہے۔ میں طوعاً و کرہاً اس ٹرین کے ایک خانے میں بیٹھ گیا لیکن مسافروں کی وہ کثرت تھی کہ دم گھٹا جاتا تھا۔ راستے میں کئی اسٹیشن آئے کئی مسافر چڑھے گزرتے بہت کم نتیجہ یہ ہوا کہ ہم بالکل بھیج کر بیٹھے رہے۔ آخر کار اس وقت جب کہ میں بیہوش ہونے کے قریب تھا گاڑی پھر رکی اور میں اس میں سے نکل آیا۔“

”سیڑھیوں پر سے چڑھ کر اوپر آیا تو ایک شہر غدار میری نظر پڑا۔ اس کے بازار میں کھیلے اور کانات بدلتے تھے۔ ہر طرف مائے شور و غل کے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔“

”میں نے ایک ریلکے سے جو اخبار بیچ رہا تھا پوچھا اس شہر کا نام

شامرا باغ ہے۔ کہیں کہیں فرشتے اُڑتے نظر آتے تھے۔ باا من جھوٹے بوٹے اندر سے تسکین بخش موسیقی کے سُر سطح سنائی دیتے تھے جیسے موسم بہار کی آمد پر خوش گلو پردازوں کے چہچہے۔ درختوں میں بڑے لذیذ پھل لگے ہوئے تھے جو چاہتا انھیں توڑتا، کھاتا یا پھینک دیتا تھا۔ راستے میں مجھ کو چند آسمانی وجود ملے تو میں نے ان سے پوچھا کیا میں یہاں سے کسی قسم کی سوغات اپنے ہمراہ دنیا میں لے جاسکتا ہوں؟ انھوں نے میری طرف بڑی حیرت کی نظر سے دیکھا اور جب میں نے انھیں سمجھایا کہ میں یہاں کی بعض چیزیں قیمتاً خریدنا چاہتا ہوں تو انھوں نے بڑی حیرانگی کے ساتھ اپنے ہاتھ اور پر کوٹھالیئے اور کہنے لگے اس ملک میں تو روپیہ کا رواج ہی نہیں۔ ہم لوگ اس کے بغیر ہی بہت ہی خوش ہیں۔ ان کی زبانی مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا نہ تو کوئی بادشاہ ہے نہ ملکہ۔ میں نے حیران ہو کر پوچھا تم لوگوں کا بادشاہ یا اس قسم کے کسی اور اعلیٰ اگر کوئی غیر کے بغیر کام کیونکر چلتا ہے؟ کیا یہاں پر زمانہ موجود ہے ترقی یافتہ ممالک کی طرح پارلیمنٹ، رائے دینے کا حق، اور اور اسی قسم کی باتیں موجود نہیں؟

”فرشتے نے مسکرا کر سر ہلایا اور جواب دیا بالکل نہیں۔ اس قسم کی دنیاوی فضولیات کی نہ یہاں ضرورت ہے اور نہ وجود۔ اس عالم میں نہ کوئی قانون ہے نہ کوئی قانون ساز۔ ہم اپنے دلوں کی آواز سن کر اس پر عمل کرتے ہیں۔ ہمارے ضمیر مردہ نہیں۔ اس لیے یہاں کسی قانون یا قانون ساز کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے؟ اس امن و ہم آہنگی کو دیکھئے جو آپ کو یہاں ہر طرف نظر آتی ہے۔ یہ سب اس بناوٹی قانون کی عدم موجودگی ہی کا نتیجہ ہے۔“

”میں نے اس سے پوچھا کیا میں اس جگہ کی سکونت اختیار کر سکتا ہوں؟ اسے جواب دیا کہ آپ کو پہلے مایا کا تیاگ کرنا ہوگا۔ جب تک آپ دوت یا خواہشات نفسانی کے پھندے میں پھنسے ہوئے ہیں یہاں نہیں رہ سکتے۔“

کیا ہے؟ اس نے جواب دیا یہ نرک دیش کا صد مقام ہے۔ کیا تم کوئی اجنبی ہو؟

”اس نرک دیش میں جان تک میں نے دیکھا ان تکلیفوں کا نام و نشان بھی نہ تھا جو ہمیں بتائی جاتی ہیں۔ وہاں پہنچنے کے لیے ہمیں کوئی خون کی ندی عبور نہ کرنی پڑی تھی نہ وہاں کسی کو آگ میں جلایا یا تل میں بھونا جاتا تھا۔ یہ کچھ تو جدید ترقیات کے اعتبار سے یورپ اور امریکہ کے شہروں کا مقابلہ کرتی تھی۔ لوگوں کے لباس بڑے شاندار اور فیشن کے مطابق تھے۔ جا بجا دھوئیں کی بیڑ اور گوشت کی سٹرانڈ آرہی تھی۔ بازاروں اور گلیوں کے کنارے پولیسین جعین تھے۔ بہشت کے بخلاف اس شہر میں عدالتیں، جیل خانے، تھیٹر، ہوٹل، مندر اور بڑی بڑی دکانیں موجود ہیں۔ میں نے دیکھا کہ جا بجا لوگ گہری نظروں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا معاملہ ہو مگر بھلا ہوا اس پولیس دے کا جس نے مجھے جلدی ہی پکڑ کر ایک تارک کوٹھری میں اس جرم پر بند کر دیا کہ میں آداب تہذیب سے ناواقف ہوں۔ دراصل بات یہ تھی کہ میں چونکہ سیدھا بہشت سے وہاں پہنچا تھا اس لیے بوٹ پھنایا نہ رہا سنگے پاؤں ہی چل نکلا تھا۔

”میں نے اس کوٹھری کے محافظ سے پوچھا تمہارے یہاں روپیہ کا چلن ہے؟

”اس نے جواب دیا یقیناً ہے۔ روپیہ پر ہی تو یہاں کے سارے کاروبار کا دار و مدار ہے۔ یہاں ہر شخص کی عزت کا اندازہ اسکی دولت سے ہوتا ہے جس کے پاس روپیہ نہیں وہ کمزور ہے۔ روپیہ دے کو سبھی عیش اور آسائش مہیا ہیں۔

”میری جیب میں چند روپے تھے۔ میں نے محافظ کے ہاتھ میں تھوڑی نقدی دیکر کہا ازراہ عنایت یہ تو معلوم کر اپنے کہ ڈینیٹلٹن وغیرہ

وہ لوگ جنہوں نے دوزخ کے متعلق بڑی بڑی لمبی چوڑی نظمیں لکھی ہیں اس ملک میں رہتے ہیں یا کہیں اور؟ اس نے ٹیلیفون کے ذریعے سے اپنے افسر سے پوچھ کر جواب دیا کہ یہاں چونکہ نوآباد گاروں کے لیے بڑی سختی سے نگرانی ہوتی ہے اس لیے ان انا رکسٹون کو اس ملک میں رہنے کی اجازت نہیں۔

”میں نے پھر پوچھا یقیناً اس کچھ کہلے ڈارون، اسپینوزا، سائبرالٹ اور اور اس قسم کے لوگ جو دنیا میں خدا کی ذات سے منکر تھے اور جنہیں لوگ دھرتی ہونے کی وجہ سے بہشت میں جانے کے ناقابل ٹھہرائے تھے رہتے ہوں گے۔

”وہ بولا ہرگز نہیں۔ یہاں تو صرف بڑے بڑے سود خوار ساہوکار رشوت خوار جج، نمائشی فلاح خواہ، دھوکہ باز مقنن، جیتون کو مارنے والے، خطرہ جان ڈاکٹر، اور عیاش اکیڈ بستے ہیں۔

”اس سے اگلے روز میرا مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تحقیقات کے بعد حکم سنایا گیا کہ سو روپیہ جرمانہ ادا کرے یا ۱۰ دن قید رہے۔ میرے پاس چونکہ روپیہ کافی نہ تھا اس لیے مجبوراً جیل خانے کی سیر کرنی پڑی۔

”ایک شخص پر خون کا مقدمہ تھا۔ اس کے دوستوں نے مجھے اس شرط پر چھوٹی گواہی دینے کے لیے رضامند کر لیا کہ وہ میرا جرمانہ ادا کر دیں گے۔ میں بھی جیل میں رہتا رہتا عاجز آ گیا تھا۔ اس تجویز کو منظور کر لیا اور رہائی حاصل کی۔

”اس کے چند روز بعد مجھے ایک تھیٹر میں جانے کا اتفاق ہوا۔ ہاک بال، فکس اور فٹ بال تھا۔ میں تنگ آ کر کہیں یہ کہہ دیا کہ دوزخ بھی کیسا خوفناک ملک ہے۔ اس پر ایک شخص نے جھٹ مجھے ایک پولیس والے کے حوالے کر دیا۔

”میرا مقدمہ دوبارہ عدالت میں پیش ہوا۔ ذرا سی بات کا بتکر

ملاقات کا خواہشمند ہو گا کیونکہ میری ہی وساطت سے لوگ تنہائی سے ملاقات کر سکتے ہیں۔ بعض اسے بے وقت کا اپریل فول سمجھیں گے بلکہ میں تو خود اپنی آنکھوں سے پروفیسر واس کی لیبررٹری میں اس شخص کو جنین کی حالت میں دیکھ آیا ہوں۔

اس قسم کے خیالات کو دلمین نے ہوسے اٹھا۔ اپنے ملاقاتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا کل خدانے چاہا تو میں آپ کی ملاقات کے لیے تمام بڑے بڑے ایڈیٹروں اور ان کے دوستوں کو بلواؤں گا کیونکہ نامور آدمیوں کو انٹر وڈیوس کرنا ایک ہی طریقہ ہے۔ ہم دونوں اکٹھے تاج محل ہوٹل میں گئے۔ مل کر کھانا کھایا اور پھر میں نے اسے کمرہ تک پہنچا دیا۔

جب میں شب بخیر کہہ کر گھر کی طرف لوٹا تو میرے دماغ میں ہا سنسی خیر تجا ویز کا جھوم تھا۔

(۴)

اگلے روز سہ پہر کو بمبئی کے تمام اخبارات کے قائم مقام میری ملاقات کو آئے اور اس وقت اول مرتبہ میں نے انھیں ان واقعات سے باخبر کیا جو ۲۰ سال قبل میں نے پروفیسر واس کی لیبررٹری میں دیکھے تھے۔ اپنے بیان کی تصدیق میں میں نے اس کے مصنوعی جانور دن اور جنین کے فوٹو گراف بھی دکھائے لیکن میری پاس چونکہ فوٹو کی تصاویر کے علاوہ اس مشہور و معروف موضوع کے وہ خطوط بھی تھے جن میں اس نے اپنی اس ایجاد کا اشارہ ذکر کیا تھا اس لیے ان سب کو میری باتیں صحیح تسلیم کرتے ہی بن پڑیں۔ نوجوان ”ہنستی“ سے انکی ملاقات کے لیے میں نے اگلا دن مقرر کیا لیکن ساتھ ہی ان سے طے کر لیا کہ اس کے لیے میں ایک معقول فیس چارج کروں گا۔ بہر صورت ان کے اطمینان کے لیے میں نے انھیں اس کا فوٹو لینے کی اجازت دیدی اور اسکی زبان سے یہ

بنایا گیا۔ دونوں جرح قلع ہوتی رہی۔ آخر فیصلہ یہ سنا یا گیا کہ مجھے پنجاب میں سے جلا وطن کر دیا جائے کیونکہ میں اس میں رہنے کے قابل نہ تھا۔ میں نے لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اس آسانی سے دونوں سے نجات حاصل ہوئی۔

”اس کے بعد جب میں نے دوبارہ اس دنیا کا رخ کیا تو معلوم ہوا کہ میرا خاکی جسم مدت ہوئی جلا دیا گیا تھا۔ ناچار ایک نئی ہستی کی مختلف منازل طے کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ جب میں دنیا میں نمودا ہوا تو مجھے اپنے لیے نئے فرائض، نئے نواح، اور نیا ہی جسم نظر آیا۔ لیکن یہ میں اچھی طرح جانتا تھا کہ میری روح وہی ہے۔“

جب میں اس قصہ کو پڑھ چکا تو نظر اٹھا کر دیکھا کہ میرا ملاقاتی گھر کی میں کھڑا سویرج کو غروب ہوتے دیکھ رہا تھا۔

میں نے کہا ”یہ ایک غیر معمولی طور پر دلچسپ قصہ ہے لیکن ملاقات اس قدر عجیب ہیں کہ اگر اس کے لکھنے والے آپ نہ ہوتے تو اس کو شائع کرنا بالامحالہ مشکل ہو جاتا۔ میں اُمید کرتا ہوں، میں آپ کو اسکی اُجرت اس قدر دلا سکوں گا کہ جتنی آج تک ہندوستان کے کسی ایڈیٹر نے کسی کو نہیں دی۔“

اس نے سر ہلایا مگر جواب کچھ نہ دیا۔

میرے دلمین رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ میرے لیے اس شخص کی بدولت دولت اور شہرت حاصل کر نیکا کیساعمدہ موقع ہے۔ سی دھن میں میں نے زمانہ مستقبل کے متعلق دل ہی دلمین طرح طرح کی تجا ویز سوچنی شروع کر دیں۔ میں نے اس بات کا ارادہ کیا کہ تمام اخبارات میں اس مطلب کا نوٹ چھپوا دوں کہ میرے پاس زمانہ موجودہ کا ”کنش“ ٹھہرا ہوا ہے، جو مان کے بطن سے پیدا نہیں ہوا۔ لوگ جس وقت ٹائمز آف انڈیا، سانچہ ورتان، اندر پرکاش، وغیرہ چوٹی کے اخبارات میں اس کا ذکر پڑہیں گے تو ہر ایک میری

معلوم کرنے کی بھی کہ آیا "نسپتی" اسی کا نام ہے۔

آپ میری خوشی کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اگلے روز تمام صبح کے اخبارات میں اس نوجوان کا ذکر بڑی تفصیل سے چھاپا گیا اور بعض اخبارات نے اس کے فوٹو بھی درج کیے۔

"نسپتی" شاید ابھی بیدار بھی نہ ہوا ہو گا کہ میرے پاس ایک سو کے قریب نام مختلف لوگوں کی طرف سے آئے۔ ایک بھائیہ سیٹھ نے مجھ سے اس روز کی آمدنی کا ٹھیکہ دس لاکھ کی معقول رقم کے عوض کرنا چاہا۔ بعض لوگ اس کے بارے میں مزید کیفیت معلوم کرنا چاہتے تھے بعض خاص طور پر خلوت میں ملاقات کرنے کے آرزو مند تھے۔ میں نے اس نوجوان کا لکھا ہوا قصہ گجراتی کے ایک ماہوار سالہ کے ایڈیٹر کے ہاتھ ایک پونڈ فی سطر کے حساب سے فروخت کر دیا، اور ساتھ ہی یہ شرط قرار پائی کہ آئندہ وہ جو کچھ لکھے وہ اسی نرخ پر خریدا جائے گا۔ پچھلے سے پہلے پہلے ہوٹل میں لوگوں کا اس قدر ہجوم ہو گیا کہ تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اخبارات کے ایڈیٹروں اور خاص رپورٹروں کے علاوہ بڑے بڑے مالدار مارواڑی سوداگر، پارسی سیٹھ، بھائیہ لکھپتی، خطاب یافتہ ہندو مسلمان، اعلیٰ طبقے کے انگریز لیڈیان، پارسی اور مرہٹہ خواتین، غرض کہ ہر عمر، ہر جنس اور ہر رنگ کے آدمی جمع تھے مجھے اتنا راستہ نہ ملتا تھا کہ گذر کر اس معاملہ کی خبر اس واقع کے ہیرو کو فے سکتا۔

آخر کار جب میں اس بھیڑ کو چیرتا ہوا اس کے کمرے میں پہنچا تو وہ بیدار ہو چکا اور کپڑے پہن رہا تھا۔ میں نے صبح کا ایک اخبار اس کے ہاتھ میں دیکر کہا "مسٹر نسپتی ذرا اسے دیکھنا" اس نے بجا احتیاطاً عنوان کی سرخیان پڑھیں اور اس کے بعد جون جون باقی مضمون پڑھتا گیا اس کے جوش میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کا رنگ رد ہو گیا ہاتھ کا پھنے لگے اور سر گرسی کی پشت سے جا لگا۔

میں نے حیران ہو کر پوچھا "کیا ہوا۔ آپ بیمار تو نہیں ہیں؟" اس نے کنت کے ساتھ جواب دیا "غضب ہو گیا! اب کیا ہو گا؟" میں نے کہا "آپ کیا کہتے ہیں؟" اس میں قابل اعتراض کونسی بات ہوئی؟ اس نے سر کے بال نوچتے ہوئے جواب دیا "یہ جو کچھ لکھا ہے سنا پڑھوٹ ہو۔ یہ اخبار جب میرے والد کی نظروں سے گذرے گا تو وہ کیا کہیں گے؟" اُن اخلاقی انداز تیری پناہ!"

میں نے کہا "آپ خواہ مخواہ مضطرب ہوتے ہیں۔ اس ملاقات کی کیفیت میں کونسی بات جھوٹی درج ہوئی ہو؟" وہ بولا "آپ سے ایک خوفناک غلطی سرزد ہوئی ہو۔ بڑا مغالطہ یہ ہوا کہ میں مصنوعی آدمی نہیں ہوں۔"

اتنا کمزور گھبراہٹ کی حالت میں کھڑا ہو گیا اور پھر بولا "آپ کی یہ گمان کیونکر پیدا ہوا کہ میں مصنوعی انسان ہوں؟"

میری آنکھیں پتھر گئیں۔ خون ٹھنڈا پڑنے لگا۔ پیشانی پر ریشم کے قطرے نمودار ہو گئے اور پوچھا "تو یہ کیا تمہارا نام 'نسپتی' نہیں ہو؟" میں بائیس سال گذرے جب کلکتہ میں تمہارے باپ نے مجھے انکو بیٹر کے اندر ایک جین ڈکھایا تھا کیا تم اس سے پیدا نہیں ہوئے؟" ایک دیوانہ کی طرح اپنے بالوں کو کھینچتے ہوئے اس نے جواب دیا "نہیں بھلا ہوا بیچ! بیچ! بیچ! میں تو اپنے باپ کا قدرتی بیٹا ہوں اور اس وقت پیدا ہوا تھا جب پونا میں رہتے ہوئے ایک سال بعد اس نے ایک دکنی لیڈی سے شادی کر لی تھی۔ اس نے بار بار مجھے بتایا تھا کہ وہ جنس جسے تم بھی دیکھ آئے تھے آخر بڑھتے بڑھتے ایک کو کر موتا بن گیا" میں چکر کھا کر دیوار سے جا لگا اور چلا کر پوچھا "کو کر موتا؟" سچ کہتے ہو؟"

وہ بولا "میں اسے ثابت کر سکتا ہوں۔ اُن امیرے خدا اب کیا ہو گا؟ غضب ہو گیا! ستم ہو گیا!"

ہم دونوں اس کمرے میں ادھر ادھر دیوانوں کی طرح چھپتے پھرتے تھے۔
 باہر سے بار بار ٹیلیفون کی گھنٹی کی آوازیں آتی تھیں اور نوکر ہر لمحہ حیرت
 ملاقاتی کارڈ لالاکر اندر ڈال جاتا تھا مگر ہمیں ان کی کچھ خبر نہ تھی۔
 روشن لال

انزبیل مولوی سید حسین بگرامی

مملکت حنفیہ اس خیال سے کہ اُس کے حکمران اسلامی روایات کے علم برادرین اور اس کا خاصہ کہ وہ ان اس گئی گذری حالت میں بھی معارف شناسی اور علم پروری کی وہی خصوصیات نمایاں ہیں جو کسی زمانے میں دولت عباسیہ اور فرمانروایان قرطبہ کے ساتھ مختص سمجھی جاتی تھیں قطعاً ہندوستان میں بانمود سمجھی جاتی ہو۔ شروع سے لیکر اب تک دولت نظام میں ترقی و اصلاح کے کئی دور ہو چکے ہیں لیکن مورخین کا اجتماع ہو کہ سرسار جنگ عظیم کا زمانہ حیدر آباد کا ”عہد زرین“ تھا حقیقت حال بھی یہی ہو کہ اس دانشمند مدبر کے وقت میں حیدر آباد کے سیاسی اقتدار اور ملکی عظمت کا دائرہ اس قدر وسیع تھا کہ آج ہماری نگاہیں اُن کا حصر کرنے سے عاجز ہیں۔ اُن تمام تاثیرات کے اعتبار سے جو وزارتِ عظمیٰ کی بدولت دکن کو نصیب تھو اُس شہرت اور وقت کو دیکھتے ہوئے جو اُس عہد میں حیدر آباد کو شاہی خاندان کو حاصل ہوئی اور علم دوستی اور معدلت پروری کے اُس جوش کا اندازہ کرتے ہوئے جس سے اپنے اپنے وقت پر شخص نے فائدہ اٹھایا، بے جا نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ حیدر آباد میں شاہجی کارنامے اُسی عزت و شان سے دیکھے جاتے ہیں جو کبھی بغداد میں بابر کے اور دارالسلطنت سلاجقہ میں نظام الملک طوسی کے حصے میں آئی تھی۔

سرسار جنگ کے عملیات کی نمایاں کامیابی کا ایک گہرا اور سچا راز یہ بھی تھا کہ اُنھوں نے اپنے گرد ہندوستان کے تمام لائق و

یکتا افراد جمع کر رکھے تھے۔ حیدر آباد کی تعلیمی حالت اُس وقت ایسی نہ تھی کہ وہاں کی آب و ہوا سے قابل جو ہر پیدا ہو سکتے اور اسکی ضرورت تھی کہ بیرونی حصص سے ایسے اشخاص چیدہ، بلائے جاتے جنکی دماغی قوتیں حیدر آباد کے عروج کا مرکز قرار پائیں۔ سرسار جنگ کا سادہ درہن آدمی اس ضرورت سے قطع نظر کہ نہیں سکتا تھا چنانچہ اُنھوں نے شمالی ہند کے بہت سے نامور لوگوں کو ازراہ قندوا حیدر آباد طلب کیا اور اُن کے سپرد وہ گرانبار فرائض کئے گئے جن کے انجام دینے کی اُنہیں فطرتی قابلیت موجود تھی۔ ان لوگوں میں جو بزرگ سب سے پیشتر حیدر آباد کے سیاسی پلیٹ فارم پر نمودار ہوئے وہ انزبیل مولوی سید حسین صاحب بگرامی تھے جن کے چل سالہ کارنامے اس بات کے شاہد ہیں کہ سطح وہ ارکان و دولت نظام کے زمرہ میں اپنے اور ہم عصرون سے پہلے شریک ہو کر الفضل للمقدم کے مصداق ہوئے اس طرح بے لوث کارگزاری اور مستقل شہرت کے میدان میں بھی وہ کسی سے پیچھے نہیں رہے۔

مولوی سید حسین صاحب بگرامی ہندوستان کے اُس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں جنکی قابلیت اور علمیت اور اُسی کے ساتھ اجتہاد رائے مسلم ہو۔ بگرام اودھ کا مشہور قصبہ ہے اور اُسکی خاک کچھ ایسی مردم خیز واقع ہوئی ہے کہ آجنگ وہاں سے متعدد نامور اُدو ذمی شہرت اصحاب نکل چکے ہیں۔ توطن کے لحاظ سے مولوی سید حسین صاحب کو اُنھیں اسلاف کی جانشینی کا فخر ہو جنکی عظمت کا نقار

آج بھی اُسی زور شور سے بچ رہا ہو۔ لیکن باریک بین نگاہیں مولوی صاحب کی بزرگی و ناموری کا حصہ دار تمام ہندوستان کو سمجھتی ہیں اور واقعت بھی یہی ہے۔

آنقبل مولوی سید حسین بگرامی! خدا جانے اس نام میں کیا جادو ہے اور دوچار الفاظ کے اس مجموعے میں کیا تاثیر ہو؟ قلم اس جادو اور اس تاثیر کا فوٹو کھینچنے سے عاجز ہی لیکن ذوق سلیم ان کی کیفیات کا اندازہ کر سکتا ہے، کہا جاتا ہے کہ لفظوں کے ظاہری معانی کے علاوہ باطنی مطالب بھی ہوتے ہیں۔ اگر یہ سچ ہے تو ہم کہیں گے کہ آنقبل موصوف کے نام ناتجی جو منوی مطلب ذہن نشین ہوتا ہے وہ عبارت ہے سوز و گداز قوم سے، عام ہمدردی سے، بے لوث محبت سے، حقیقی خدمت ملک سے، ایثار نفس سے، علم دوستی سے، صاف گوئی سے، رہنمائی سے، اور ان تمام اوصاف سے جو اس یگانہ روزگار کے حصہ میں آئی ہیں۔ ایک بات اور بھی عجیب ہے کہ اس نام کی تاثیر سمریہ زم کی طرح، محدود یا پابند نہیں ہے بلکہ لامحدود اور غیر پابند ساری نسلوں ہند میں یہ تاثیر پھیلی ہوئی ہے، اور مسلم، ہندو، عیسائی، پارسی ہر ایک کے قلب اُس سے متاثر ہوتے ہیں۔

مولوی صاحب کے حالات ملک میں اس کثرت سے زبان زد ہیں کہ ان کا تفصیلی اعادہ تحصیل حاصل سے زیادہ ہنوگا۔ مختصراً یہ سمجھ لینا چاہیے کہ آپ بگرام کے ایک معزز و موقر خاندان کے رکن رکن اور فرد فرید ہیں۔ آپ کا خاندان عراق عرب سے بگرام آیا تھا۔ عہد مغلیہ میں آپ کے بزرگوں کا رسوخ بہت بڑا ہوا تھا۔ اور جب ہند کی عثمان حکومت برٹش گورنمنٹ کے قبضے میں آئی اُس وقت بھی آپ کے خاندانی عروج و ترقی کی رفتار کیساں طور پر تیز رہی۔ آپ کے خاندان میں علم و فضل کا چرچا جو کچھ آجکل ہے وہی حالت بزرگوں کی بھی تھی اسی وجہ سے آپ کی تعلیم کا انتظام بھی نہایت

مقول رہا۔ گویا آپ کو عربی، فارسی یا انگریزی کی جو تعلیم دلائی گئی وہ بالکل با اصول تھی۔ انگریزی زبان دانی میں آپ کو جوید طولی وقت حاصل ہوا، اسکی بنیاد گویا زمانہ طالب علمی پر چلی تھی۔ مطالعہ علمی کا شوق آپ کی طبیعت ثانیہ بنا ہوا تھا۔ کتابوں کے ساتھ آپ کو عشق تھا حیدر آباد میں بھی باوجود فرائض منصبی کی گرانباری کے آپ کا بہت کچھ وقت لائبریری میں گنتا تھا جسکو ہمیشہ بااوزاد کرتے مجموعہ کتاباں اہل صحیح ہوگا۔ مضمون نویسی اور انشا پردازی کا شغف بھی آپ کو ابتداء سے ہی چنانچہ جب آپ لکھنؤ میں تھے تو ایک انگریزی اخبار نکال رکھا تھا جسکی ترتیب و تالیف آپ ہی کے ذمہ تھی۔ ان تمام باتوں نے آپ کی شہرت کا دائرہ بہت وسیع کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب سلسلہ میں نواب سر سالار جنگ بہ تقریب دورہ شمالی ہند آئے تو آپ کو ان سے تعارف حاصل کرنے کا بہت اچھا ذریعہ پیدا ہو گیا۔ نواب سر سالار جنگ کی مرموشناس نظر آپ کے جو بڑی کو بچان گئی چنانچہ آپ کو لکھنؤ سے حیدر آباد جانا پڑا اور وہاں آپ کو صدارت عظمیٰ کے معتمد خصوصی پراونیٹ سکریٹری (کا منصب قبول ہوا۔ وزیر اعظم دکن کی پرائیویٹ سکریٹری شپ کی ذمہ داریاں کوئی معمولی نہیں ہوتیں لیکن مولوی سید حسین صاحب بگرامی نے جس خوبی اور دانشمندی سے اپنے فرائض انجام دیئے ہیں ان کی یادداشت تک حیدر آباد والوں کے دلوں میں موجود ہے۔ رازداری کی صفت آپ میں نہایت قیمتی صفت ہے اور نواب سر سالار جنگ کا اعتماد آپ حاصل کرنے میں اس سے بیش بہا امداد پہنچی۔ نواب موصوف آپ پر اپنا دلی عندیہ تک ظاہر کرنے میں حیسب میص نہ کرتے تھے۔ حیدر آباد میں اب بھی کچھ لوگ ایسے موجود ہوں گے جو نواب صاحب و رسید صاحب کے بے تکلفانہ اور راستہ باز نہ برتاؤ کی چشم دید شہادت دیکھیں گے۔

۱۸۸۲ء میں حضرت غفران مکان میر محبوب علیخان مرحوم تخت نشین ہوئے اور انتظام مملکت کے لیے اسٹیٹ کونسل مقرر ہوئی، ان کے

فرمانی تھی۔ بیان اُسکا اقتباس درج کیا جاتا ہے کہ ناظرین بھی اُسکو پڑھ کر آپ کی اصابت رائے کا اندازہ کر سکیں۔

سرشتہ تعلیمات سرکار عالی کی بنیاد اُن ہی اُصول پر جاری ہو چکی پابندی قدیم سے چلی آتی ہو۔ غور کیا جائے تو نوعیت سب کی یکساں ہو۔ غریب، امیر، عہدار، ساہوکار، مزارع، اہل حرفہ سبھی کے بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا ہو یا وہ علوم جن سے لکھنے پڑھنے میں مدد ملے اور دفتر یا حجرہ میں بٹھکر دماغ سے کام لینے کی عادت پڑ جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ طریقہ تعلیم کا فرض کرتا ہے کہ امیر و غریب سب کو دُنیا میں بے آزادی یا بے آسائش معیشت گزارنے کیلئے فقط دماغ ہی سے کام لینا پس ہے۔ امداد انشا کا فن، ساری مشکلوں کو حل کر سکتا ہو..... کچھ شک نہیں کہ یہ صفات جبکا ذکر اوپر ہوا بچائے خود کسب قابل ہیں اور نہایت درجہ مفید ہیں..... مگر شاید تمام آبادی ملک کا اگر حساب کیا جائے تو سنو میں پانچ بھی ایسے نہ نکلیں گے جن کو انشا و املا سے کام لینے کی بالعموم ضرورت رہتی ہو پس عامہ غلاموں کا تمام تعلیمی وقت ایسے فنون کی تحصیل میں صرف کرانا اُصول تعلیم کے خلاف ہو۔ عموماً رعایا کو اس قسم کی تعلیم دینا چاہیے جو کب معیشت میں اُنکو مدد پہنچائے اور اُن کے اذہان کو اس قدر صحت مند کرے جس سے وہ اپنے روزمرہ کے معاملات کو جلد سمجھ سکیں..... جو بچے فقط چشم و دماغ سے پڑھنا اور اُمتھ سے لکھنا سیکھتے ہیں اور اُن اعضا سے اور کوئی کام نہیں لیتے اُن سے کیونکر امید کی جاسکتی ہو کہ وہ سن و شد کو پہنچ کر دل درست چلا لیں گے یا کوئی دستکاری کا کام بھی بہتر کر سکیں..... حاصل تقریر یہ ہے کہ مزارعین و اہل حرفہ وغیرہ کی اولاد کو کھنٹ کتابی تعلیم نہ دینا چاہیے بلکہ ایک معتد حصہ اُن کے تعلیمی وقت کا صنعت اور حرفت کے سکھانے میں صرف کرنا چاہیے۔ کتابی تعلیم اُن کو فقط اس قدر دینا چاہیے کہ وہ لکھنے پڑھنے میں دوسرے کے محتاج نہ رہیں اور اپنی صنعت و حرفت میں عقل و فہم سے کام لے سکیں اور اُس میں اختراع و ایجاد کرنے پر

سکرٹری بھی مولوی سید حسین مقرر ہوئے۔ سٹیٹ کونسل کے ختم ہونے پر مولوی صاحب موصوف کو حضور نظام مرحوم کے پرائیویٹ سکرٹری شپ کا قلمدان سپرد ہوا۔ اس خدمت کو اپنے بہت زمانہ تک انجام دیا اور غایت درجہ کی نیکنامی اور راستبازی سے جو لوگ ریاستی کاروبار سے واقف ہیں اور اُسکی پیچیدگیوں کا کچھ تجربہ رکھتے ہیں مولوی سید حسین صاحب کی مشکلات کا ایک حد تک اندازہ لگا سکتے ہیں لیکن مولوی صاحب نے اس خداداد قابلیت و عقلندی سے اپنا کام انجام دیا ہے کہ شاید وہ اب یہ آخر آخرین آپ کے تفویض نظامت و تعلیمات عامہ ممالک متحدہ سرکار عالی کا عہدہ تفویض ہوا تھا اور و خلیفہ یا ب ہونے سے پیشتر تک آپ اسی منصب پر مامور تھے۔ ہم اس جگہ آپ کی تعلیمی خدمات کا تبصرہ کرنے پر آمادہ نہیں۔ نہ قلت گنجائش اسکی اجازت دیگی، لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ آپ نے اگرچہ حیدرآباد یونیورسٹی علیحدہ قائم نہیں کی، صنعتی تعلیم کو بڑے پیمانہ پر جاری نہیں کیا، تعلیم نسوان کو بھی بہت محدود حالت میں رکھا، تاہم حیدرآباد کے حالات و واقعات کا اندازہ کرنے کے بعد اس سیغے میں آپ سے جو کچھ ہو سکا وہ کم نہیں ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مولوی سید حسین صاحب بگرامی کو ہر ایک قسم کی تعلیم رائج کرنے کی فکر دامن گیر رہتی تھی لیکن حکام بالادست کی طرف سے اُنھیں کسی قسم کی امداد نہیں پہنچی۔ آج جو کچھ تعلیم وغیرہ کا چرچا حیدرآباد میں ہو رہا ہے وہ سب مولوی صاحب کی ذاتی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اکثر یہ اعتراض ہوتا ہے کہ آپ کے زمانہ میں صنعتی تعلیم کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ توجہ ضرور ہوئی ہے، ہاں اُسکے نتائج کچھ زیادہ مستقل اور دیر پا نہیں ہو سکے اور اُسکی اصلی وجہ دُوبی تھی جو ہم اوپر لکھ آئے ہیں۔ ہمیں اتفاق سے اُس زبردست یادداشت کی ایک نقل مل گئی ہے جو آپ نے ممالک متحدہ سرکار عالی میں تعلیم صنعت و حرفت کو رائج دینے کے متعلق قلبند

قادر ہوں۔

ان خیالات کے انظار فرمانے کے بعد آپ نے تجویز بنائی کہ صنایع و کمین کہان کہان صنعتی مدارس کھولے جانے چاہیے۔ اس یادداشت سے کم از کم اس قدر پتہ ضرور چلتا ہے کہ آپ بھی اسی صنعتی تعلیم کے موافق تھے جسکی ضرورت عام طور پر ہندوستان میں محسوس ہو رہی ہو۔ اسی طرح یہ اعتراض بھی بسا اوقات وارد کیا جاتا ہے کہ باوجود تعلیم نسوان کے بہترین اور پرجوش حامی ہونیکے آپ کے زمانہ نظامت میں مدارس نسوان نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی۔ لیکن یہ اعتراض بالکل بودا اور نادراست ہے۔ حیدر آباد میں دو ایک زمانہ اسکول بہت خوبی سے کام کر رہے ہیں۔ اس سے زیادہ زمانہ اسکولوں کی ضرورت کیا تھی؟ اسکول تو بہت سے قائم ہو سکتے تھے مگر ٹھننے والیاں کہان سے آئیں۔ ہاں اگر والدین میں لڑکیوں کو تعلیم دلانے کا شوق ہو جائے تو مدارس کی کثرت مفید ہو سکتی ہے۔

مولوی سید حسین صاحب بگرامی کا زمانہ زندگی زیادہ ترجیہ آباد میں گزرا ہے۔ وہاں کے کئی انقلابات اُنکی نظروں کے سامنے ہوئے۔ انھیں ریاستی زندگی کا خاص تجربہ ہے۔ چنانچہ اس وقت تک وہاں کتنی سازشیں ہوئیں، پارٹی فیلنگ کا زور بڑھا، وزارتیں بدلیں، حسد و عناد کی گرم بازاریاں رہیں، لیکن آپ کی کوہ وقاری دیکھنے کے قابل ہے کہ اپنے اپنے اصول سے ذرہ جھڑبش نہیں کی۔ ایک سید راستہ جو شروع میں اختیار کیا اُس پر سے نہیں ہٹے۔ انقلابوں اور سازشوں اور دھڑے بندیوں کے طوفان نے آپ کی طبیعت کوئی اثر نہیں کیا۔ آپ ہر دو زمین کیسان معزز و ممتاز و معتد ہے، اور یہی اعتماد و امتیاز تھا جسکی وجہ سے حضور نظام مرحوم کی آپ خاص نظر عنایت تھی۔ آپ نے کئی مرتبہ فرائض منصبی سے سبکدوش ہونے کے لیے استعفا دیا لیکن مرحوم نے نامنظور فرمایا۔ حضور حال کی

تعلیم و تربیت کا ایک حصہ آپ کے سپرد تھا اور یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ زمانہ حال میں گورنمنٹ نظام نے آپ کی ساہا سال کی تجویز کو سے فائدہ اٹھانے کے لیے آپ کو مشیر وزارت مقرر فرما کر حد درجہ کی بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے۔ گورنمنٹ نظام سے آپ کو جو خطابات حاصل ہیں اُن کی تفصیل یہ ہے۔ نواب علی بارخان، موتن جنگ، عماد الدولہ، عماد الملک بہادر اور گورنمنٹ ہند کی طرف سے جہان ایک مرتبہ آپ وائسرائیل کونسل کے اور بالآخر مجلس وزیر ہند کے رکن مقرر ہوئے، آپ سی۔ ایس۔ آئی کے خطاب سے ممتاز ہیں۔ انگریزی سوسائٹی میں آپ کو جو نمایاں وقعت و امتیاز حاصل ہے اُس کا حال بھی کسی باخبر سے پوشیدہ نہیں۔ آپ ہندوستانیوں اور انگریزوں کے میل جول کے زبردست حامی ہیں۔ علی گڑھ کالج میں ایک دفعہ آپ نے اسی بحث پر نہایت قابل قدر خیالات ظاہر فرمائے تھے۔

ملکی خدمات سے الگ ہو کر دیکھیے تو آئیل نواب عماد الملک مولوی سید حسین بالقابہ کے قومی کارنامے بھی قابل رشک نظر آتے ہیں۔ علی گڑھ کالج کے آپ مربیوں میں ہیں اور حیدر آباد میں علی گڑھ کاڑ کو جو تقویت پہنچی وہ سب آئیل بگرامی کی مساعی کا نتیجہ تھی۔ ٹریشیان کالج کے آپ کچھ عرصے تک پریسیڈنٹ رہ چکے ہیں۔ دو مرتبہ آپ نے کانفرنس کی صدارت فرمائی اور اپنی بیش بہا آراء سے قوم کو مستفید ہونے کا موقع دیا۔ مملکت آصفیہ کی بے نظیر علم دوستی کی مثالیں جو دور آخر سے تعلق رکھتی ہیں زیادہ تر نواب صاحب قبلہ کی بدولت قائم ہوئیں۔ کئی اہل قلم اور مصنف دولت نظام کے وظیفہ خوار ہیں اور ان سبھوں کو آپ ہی کی کوشش سے فراغ بانی نصیب ہوئی ہے۔

نواب عماد الملک بہادر کی علمی کارگزاریوں کا تبصرہ جدا جدا مضمون کا محتاج ہے۔ ہم یہاں چند سطور میں ان کا مختصر ذکر کریں گے۔

کو پہنچائیں۔ اسلامی دنیا کی یہ سخت ترین ضرورت ہو جس کی آپ کے ہاتھوں پورے ہو نیکی اُمید کی جاتی ہے۔

سطور بالا میں آپ کے حالات جو کچھ درج کیے گئے ہیں وہ محض ایک خاکہ ہو ورنہ آپ کے واقعات زندگی اور آپ کی مختلف النوع خدمات کے تذکرہ کیلئے رسالوں کی ضخامت سے کام نہیں نکل سکتا۔ آپ کی ذات ہندوستان کے لیے نعمتات سے ہو اگر ہمارے گوش مشنوا اور چشم مینا ہوں تو آپ سے ہم بہت سے مفید سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ خدائے پاک و برتر آپ کا سایہ ہا پایہ ملک اور قوم کے سر پر عرصہ مدید تک قائم رکھے اور آپ کے فیضان سے خاص و عام کو مستفیض ہونے کا موقع عطا فرمائے۔ آمین!

آپ کی انگریزیت، عربیت اور فارسیت مسلم ہو۔ آپ کی انگریزی زبان کا اقرار یورپین اہل قلم تک کو ہو آپ کے کئی ضامین انگریزی زبان میں چھپکر شائع ہو چکے ہیں۔ اسلامی ڈیپوٹیشن نے جو ایڈریس غلامہ پرنٹو و سیرے بہادر کی خدمت میں پیش کیا تھا اُسے آپ ہی نے قلمبند فرمایا تھا۔ اُسکے متعلق اہل اُلمے صحاب کا خیال ہو کہ شریعی حیثیت سے بھی وہ ایک یادگاری چیز ہو۔ آپ کی ”تاریخ دکن“ جو انگریزی زبان میں مدون ہوئی ہو قابل دید چیز ہو جس میں زبان دانی کے علاوہ تاریخی تحقیقات کی حدیں کھنچی ہوئی پائی جاتی ہیں۔ بہت زمانہ ہوا آپ نے قرآن مجید کا ترجمہ شروع کیا تھا لیکن بعض موانع کے باعث اُسکی تکمیل اُس زمانے میں نہ ہو سکی۔ اب معلوم ہوا کہ آپ کی توجہ اس طرف پھر مبذول ہوئی ہو۔ خدا کرے آپ اس کا رخیہ کو جلد ترا تمام

تنقید کتب

(۱) نظام الملک طوسی

مولوی محمد عبدالرزاق صاحب کا پوری کی علمی شہرت البراکہ اسی محققانہ و مستند تالیف سے وابستہ ہو اور آپ کو پبلک سے روشناس کرتے ہوئے کسی غیر معمولی ذریعہ تعارف کی ضرورت مطلق نہیں۔ یہ امر ہی خواہاں اگرچہ کیلئے خصوصیت مسرت خیز ہو کہ آپ نے ”سلسلہ وزراء اسلام“ کی دوسری کتاب بھی جسکا نام مندرجہ عنوان ہو، اسی خوبی اور زیبائش کے ساتھ تمام کو پہنچائی جو جنھوں نے البراکہ کی ہر لغزیزی اور مقبولیت میں پورا پورا حصہ لیا ہو۔ ”نظام الملک طوسی“ کا غنڈ لکھائی، چھپائی، قطع، جلد مغرض کہ ظاہری شکل و صورت میں بالکل البراکہ کا نمونہ ہو اور خوشی کا مقام ہو کہ محاسن باطنی میں بھی اُس سے کم نہیں۔

”نظام الملک طوسی“ جیسا کہ اُس کے نام سے ظاہر ہو دولت سلجوقی

کے نامی گرامی، وزیر کبیر، ابوعلی حسن بن علی بن اسحاق الخاطب بن خواجہ بزرگ، تاج المحققین، قوام الدین، آبا بک رضی امیر المومنین کی بفضل اور جامع سوانح عمری ہو، جو مولوی محمد عبدالرزاق صاحب کی سالہا سال کی کوشش و سعی سے ہم تک پہنچی ہو اور اُسکے غائر مطالعہ کے بعد ہمیں یہ کہنے میں مطلق تامل نہیں کہ تحقیق و تدقیق اور جانفشانی کے لحاظ سے مولوی صاحب کی یہ دوسری کتاب بہ حیثیت مجموعی، اُردو کے ذخیرہ ادب میں ایک انمول اضافہ ہو۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ سطح طبقہ دزلے اسلام و مشاہیر عالم میں نظام الملک کا نام چوٹی پر نظر آتا ہو اُسی طرح ”نظام الملک طوسی“ شریعی عظمت کے اعتبار سے ایک بہترین کتاب ہے۔

مولوی محمد عبدالرزاق صاحب نے جس تلاش اور جستجو سے پریشان

چین سے بحرم تک اور بحر خضر سے بحر ہند تک سلجوقی پرچم لہتا تھا اور ترکستان، ماوراء النہر، ایران، شام، عراق، لبنان، حجاز ایسے وسیع اور زرخیز ممالک زیر نگین تھے۔ خوش قسمت تھا نظام الملک اُسے ان دونوں نامور حکمرانوں کی وزارت کا فخر حاصل ہوا اور مبارک تھے الپ ارسلان اور ملک شاہ چہین خواجہ بزرگ ایسا وزیر نصیب ہوا۔

”نظام الملک طوسی“ میں ملک شاہ کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے درج ہوا اور اسکی ضرورت بھی تھی ورنہ واقعات و روایات کا تسلسل مشکل سے ذہن نشین ہوتا۔ اسی طریقے سے عمر خیام اور حسن بن صباح بانی مذہب اسماعیلہ کے حالات کتاب کا ضروری جزو ہیں لیکن مناسب ہوتا کہ یہ حالات بطور ضمیمہ شامل کیے جاتے کیونکہ ایسا ہونے سے حسن ترتیب میں کسی قدر خامی ضرور پیدا ہو گئی ہو حسن بن صباح عمر خیام، ملک شاہ اور خود نظام الملک کی تصاویر مولوی محمد عبد الرزاق صاحب نے نہایت جانکاہی سے فراہم کی ہو گی۔ ان سے اصل کتاب کی زینت یقیناً دو بالا ہو گئی ہو۔ اچھا ہوتا اگر وہ مرقع ہاٹ ٹون کر لئے جاتے۔

سیاسی کارناموں کے پہلو پہلو نظام الملک کے علمی کارنامے بھی نہایت وضاحت سے دکھائے گئے ہیں۔ شہرہ آفاق ”یونیورسٹی آف بغداد“ یعنی مدرسہ نظامیہ کے حالات غایت درجہ دلچسپ ہیں۔ نظامیہ بغداد کے علاوہ نیشاپور، صفہان، مرو، خوزستان، موصل، جزیرہ ابن عمر، آمل، بصرہ، ہرات، بلخ، اور طوس کے مدارس کا بھی مختصر ذکر کیا گیا ہو۔ یہ تمام مدارس نظام الملک کے ہائیڈوجوڈ سے سیراب تھے اور نظامیہ بغداد کی شاخ کے طور پر قائم کیے گئے تھے۔ تعجب ہو کہ نظامیہ بغداد کے تاریخی حالات میں کچھ اختلاف پیدا ہو گیا ہو کہ اس بیت العلوم کا وجود جہاں تک

اوراق کا یہ خیرازہ باندھا ہو اُسکا اندازہ اس سے ہو گا کہ اس کتاب کی ترتیب و تکمیل میں آپ کو کم از کم زیادہ سوا سو کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑی ہو۔ ان میں سے بہت سی کتب ایسی ہیں جو ہندوستان میں عنقا کا حکم رکھتی ہیں۔ کوئی شبہ نہیں کہ اگر اتنی محنت و مشقت اور تلاش سے کام نہ لیا جاتا تو ”نظام الملک طوسی“ اس درجہ مکمل نہ ہو سکتی تھی جس صورت میں کہ وہ آج ہم تک پہنچی ہو۔

حبس طرح نظام الملک کا نام کوئی معمولی نام نہیں، اس طرح اُسکے کارنامے بھی معمولی نہیں جس شخص نے دولت سلجوقیہ کی عنان وزارت میں سال تک اپنے ہاتھ میں رکھی ہو، اور جسکی لائف علمی و تمدنی و سیاسی کارناموں کا مجموعہ چکی ہو اُسکا تذکرہ لکھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اسی قسم کی چند و چند مشکلات کا اندازہ کرنے کے بعد ہم مولوی محمد عبد الرزاق صاحب کو اُن کی نمایاں کامیابی پر مبارکباد دیتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

نظام الملک طوسی کے مطالعہ سے جہاں اور بیسیوں پچسپیان پیدا ہو سکتی ہو وہاں ایک یہ بھی ہو کہ دولت سلجوقیہ کی مجمل مگر تسلسل تاریخ پر بھی عبور ہو جاتا ہو، اور ناظر اندازہ کر سکتا ہو کہ جس سلطنت کا نظام الملک وزیر تھا، وہ خود کیا تھی یا اُسکا سیاسی عمل و اقتدار کتنا وسیع تھا۔ ہمیں افسوس ہو کہ قلت گنجائش کے سبب ہم اس جگہ مفصل نہیں لکھ سکتے مختصر طور پر سمجھ لینا چاہیے کہ سلاطین اسلام کی فہرست میں سلاجقہ کا نام زرین حروف میں اس طرح لکھا ہوا ہو کہ آج بھی باوجود امتداد زمانہ اُن کی آب و تاب میں سرمو فرق نہیں آنے پایا۔ لیکن حبس طرح اسلامی سلطنتوں میں سلجوقی حکومت نے خاص نام و نمود حاصل کیا تھا اس طرح خاندان سلاجقہ میں الپ ارسلان اور ملک شاہ کا زامہ سلطنت خصوصیت سے قابل ذکر ہو جبکہ ستر

مالی امداد و تقویت سے تعلق ہو، نظام الملک کے بذل و احسان کا شرمندہ ہو۔ لیکن انصافاً دیکھیے تو اس کے بانی مہمانی حضرت شیخ ابو سعد صوفی نیشاپوری ہیں۔ مولوی محمد عبدالرزاق صاحب فرماتے ہیں: ایسا روشن خیال اور مدبر و ذریعہ کی فلاح و بہبود سے کبھی غافل نہیں رہ سکتا ہو کیونکہ ملک اور قوم میں ترقی، قاریغ البالی اور عزت کا ذریعہ صرف اعلیٰ تعلیم و تربیت ہو اور عام تعلیم بغیر ایک قومی بیت العلوم کے محال ہو۔ اس خیال سے خواجہ نظام الملک نے بڑے پیمانہ پر ایک درس گاہ بنانے کا قصد کیا تھا۔

لیکن اس کے آگے جو کچھ لکھا گیا ہو اس سے ہمارے خیال کی تصدیق ہوتی ہے:-

اور اس ارادہ کی تحریک یوں ہوئی کہ ایک دن شیخ اشیرخ ابو صوفی نیشاپوری خواجہ سے ملنے آئے اور کہا کہ آپ کے نام سے مدینہ اسلام میں ایک مدرسہ تعمیر کرنا چاہتا ہوں جس کے ذریعے سے آپ کا نام قیامت تک زندہ رہیگا جو بنے کہا بہت خوب آپ ضرور بتائیے چنانچہ خواجہ نے فراہمی سامان کے لیے اپنے دکھا کو اسی وقت حکم دیدیا اور شیخ نے وجہ کے کنارے ایک خوبصورت قطعہ اراضی خرید کیا اور بروز منگل مہینہ ذیقعدہ ۷۵۷ مطابق ۴ اکتوبر ۱۳۶۵ء مدرسہ کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور پورے دو سال کی مدت میں باہ و میقدہ ۷۵۹ء (تبریز ۱۳۶۷ء) عمارت مدرسہ مکمل ہو گئی۔ شیخ ابو سعد نے عمارت پر خواجہ نظام الملک کا نام نقش کیا۔

اس سے صاف طور پر ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے بانی مہمانی فی الحقیقت شیخ ابو سعد صوفی تھے۔ ضرورت تھی کہ اس مسئلہ کو مولوی محمد عبدالرزاق صاحب کسی قدر وضاحت سے قلمبند فرماتے۔

ایک نقص ”نظام الملک طوسی“ میں اور بھی ہو جسکی طرف ہم سرت مولف کو متوجہ کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ بعض غیر ضروری

یادداشتیں ضروری باتوں کو خواہ مخواہ طالت و دیکر کتاب کو حجیم بنانے کی کوشش کی گئی ہو۔ فٹ نوٹ تو جس قدر اور جس حد تک لکھے گئے ہیں وہ کار آمد ہیں اور ان کا شمول زہن ضروری تھا لیکن فارسی متر کے بعض انتخابات کا مع ترجمہ درج کرنا تحصیل حاصل سے زیادہ نہیں ہوا۔ اس طرح نظام الملک کے حادثہ وفات پر جن شعرائے فارسی نوحے اور مرثیے لکھے تھے ان کا بجنسہ نقل کر دینا چندان ضروری نہ تھا۔ یہ عجیب بات ہو کہ ناظر کتاب کی قابلیت پر بھروسہ نہ کر کے بغرض تفہیم مطالب فارسی متر کا ترجمہ تو کرنا لایم سمجھا گیا۔ لیکن یہ خیال نہ کیا گیا جو لوگ سلیس متر فارسی نہ سمجھ سکتے ہوں ان کے لیے فارسی نظم کیا دیکھ چسپ ہو سکے گی۔

بہر کیف ان دو ایک معمولی فرد گذشتوں کے علاوہ اور کوئی اہم نقص اس کتاب میں نہیں پایا جاتا اور یہ فرد گذشتین ایسی ہیں جن کا اسناد آئندہ ایڈیشن میں ہو سکتا ہے۔ بحالت موجودہ بھی ہر ایک اہل علم کو قدر وانی کا اظہار کرنا چاہیے۔

(۲) تذکرہ ہزار داستان

المعروف بہ

خم خانہ جاوید

لالہ سریرام صاحب ایم۔ اے۔ بنصفت دہلوی نے چند سال پہلے اپنے تذکرہ شعرا معروف بہ ”خم خانہ جاوید“ کی پہلی جلد شائع کی تھی افسوس ہے کہ طالت مزاج کے باعث اس سلسلے کی دوسری جلد میں جلد نہ چھپ سکے اور نہ اس چارپانچ برس میں لالہ صاحب نے تذکرے کی تکمیل یقیناً کر دی ہوئی۔ جیسا کہ عرض کیا گیا پہلی جلد کچھ عرصہ پیشتر نکل چکی تھی اور اب ہمیں جلد دوم بغرض ریویو موصول ہوئی ہے۔

۱۔ ”نظام الملک طوسی“ کے لئے کا پتہ:- مولوی محمد عبدالرزاق صاحب صنف ابراہیم۔ محلہ بیچ باغ شہر کانپور۔ قیمت - ۵۰

جو وسط سہ ماہی میں شائع ہوئی ہو۔ چونکہ دونوں جلدیں ایک ہی سلک میں منسلک ہیں اس لیے ہم اظہارِ رائے کا دائرہ محض دوسری جلد تک محدود نہ رکھیں گے کیونکہ بہت سی دلچسپ معلومات، جنکا اعادہ اس جگہ کیا جانا ضروری ہوگا، جلد اول سے تعلق رکھتی ہیں۔ جلد اول کی اشاعت کے موقع پر ملک کے تمام نامور اخبارات و رسائل نے ریویو اور تنقید کے ذریعے یہ امر ہلکے ذہن نشین کر دیا تھا کہ لالہ صاحب نے جس تذکرہ کا آغاز کیا ہے اسکی تکمیل میں انھیں سخت جانکاہی و جانفشانی سے کام لینے کے علاوہ مالی اخراجات کا بھی کسی درجہ تحمل ہونا پڑا ہے۔ حقیقت حال بھی یہی ہے کہ حضرت لہو نے اسکی تکمیل و ترتیب میں اپنے جانب سے کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا، اور ساہما سال کی محنت و مشقت کے بعد اسے موجودہ صورت میں لائے ہیں۔ اس قسم کی کتابیں معمولی غور و غوض سے اتمام کو نہیں پہنچتیں بلکہ ان کے لیے خونِ جگر کھانا پڑتا ہے۔ نیند حرام ہو جاتی ہے راحت و آرام کا خیال تک نہیں رہتا، تلاش اور جستجو میں سرگم رہنا پڑتا ہے، کتابوں کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے، اور کوئی شک نہیں کہ لالہ سریرام صاحب نے یہ تمام مصیبتیں برداشت کی ہیں تب دریائے مقصود سے یہ درشا ہوار ہاتھ آیا ہے۔ چونکہ علمی دنیا کا ہمیں کسی حد تک تجربہ ضرور ہوا ہے اس لیے جب ہم نے لالہ صاحب موصوف کے ایک پرائیویٹ خط میں یہ فقرے لکھے دیکھے کہ

بجائے کسی قسم کے مالی فائدے کے میں نے اپنی صحت اس پرے نثار کر دی اور کم از کم بیس ہزار روپیہ اس شوق کی نذر کیا

تو ہمیں کچھ بھی استعجاب نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ ہی لالہ صاحب کی علم دوستی اور مستقل مزاجی کا ضرور معترف ہونا پڑا اور ان کی یہ صفات ایسی ہیں جنکا اقرار تمام علمی حلقوں میں اس سے بہت بیشتر کیا جا چکا ہے۔

لالہ سریرام صاحب کو جیسا کہ دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے، اساتذہ اُردو کے کلام اور حالات کی فراہمی کا شوق اُس وقت سے تھا جبکہ آپ کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ اُسی کے پہلو بہ پہلو یہ تحریک بھی دل میں پیدا ہوئی کہ یہ تمام حالات کجا کر کے ایک جامع تذکرہ کی شکل میں ترتیب دئے جائیں۔ چنانچہ سترہ سال کی محنت و سعی کے بعد آپ نے جلد اول شائع کی اور اُس کے تین سال بعد جلد دوم۔ جلد اول میں صرف الف اور ب کی ردیف اور جلد دوم میں پ سے ح تک کی ردیف ختم ہوئی ہے۔ اس طریقے سے آپ کا ارادہ ہے کہ مکمل تذکرہ پانچ جلدوں میں منقسم ہوگا۔ خدا کرے بقیہ تین جلدیں جلد تراشاعت پذیر ہوں۔ ہم اس جگہ نہایت خلق کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ لالہ صاحب کا مزاج نصیب اعداد کچھ زمانہ سے علیل ہے اور اسی وجہ سے آپ کے علمی مشاغل کا وہ عالم نہیں رہنے پایا۔ یہی خواہاں ادب اُردو کی دعائیں ان کے ساتھ ہونی چاہئیں کہ وہ صحت پا کر اس علمی و قومی خدمت کی تکمیل کر سکیں۔

اس وقت تک اُردو شعرا کے کئی تذکرے لکھے جا چکے ہیں اور بعض انہیں سے تاریخی عظمت رکھتے ہیں۔ لیکن انہیں سے بعض تو ناپید ہیں اور اکثر کی حالت یہ ہے کہ قلت معلومات کی وجہ سے متاثرہ کی تشفی نہیں کر سکتے بعض تذکرہ نگین ہجو و مذمت کا بازار اس قدر گرم کیا گیا ہے کہ جو کچھ خوبیاں بھی انہیں ہیں وہ نظر انداز کر دینے کے قابل ہیں۔ مولوی محمد حسین آزاد کی معرکہ الآر الکتاب آپ حیات اُصولاً نہ صرف ہر پہلو سے خالی از سقم ہے بلکہ وہ مذاق موجودہ کے موافق بھی ہے لیکن اُس میں سوائے خاص الخاص اُستادوں کے اور کسی کیلئے جگہ نہیں نکل سکی۔ ان تمام حالات پر نظر کرنے کے بعد یہ بتاں کہنا پڑتا ہے کہ لالہ سریرام صاحب کا تذکرہ جامعیت کے لحاظ سے واقعی ”ہزار داستان“ ہے۔

شاعر دن کے حالات کی فراہمی کوئی آسان کام نہیں لیکن لالہ سریرام صاحب نے کمال جانفشانی سے اس مشکل کو حل کیا ہے۔ واجد علی شاہ اختر، ارشد گورگانی، ادیب دہلوی، الکریم دہلوی، آزاد اور دہلوی، ان کے مفصل حالات بالعموم ہر ایک کے لیے دستیاب ہونا ممکن نہیں لیکن لالہ صاحب نے جس طریقے سے اسے تفصیلی سوانح بہم پہنچا کر تذکرہ کی زینت بڑھائی، وہ لائق داد و تحسین ہے۔ اکبر مولینا، شہرچی، اقبال، چکبست لکھنوی بجا طور پر دور جدید کے شاعر کہے جاسکتے ہیں۔ ان کے حالات بھی نہایت دلچسپی کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں۔ اچھا ہوتا اگر حضرت اقبال کی مستقل نظموں کا اقتباس بھی درج کیا جاتا۔ مولانا حالی کی غزلوں کے انتخاب بھی گویا ان کی شاعری کا ایک رخ دکھانے کی سعی کی گئی ہے، اور یہ گویا ایک اہم نقص ہے۔

شعراء کے کام کا نمونہ جو درج کیا گیا ہے، اسکو دیکھ کر لالہ صاحب کے نظر انتخاب کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ مقررہ معیار سے وہ بعض اوقات ہٹ گئے ہیں تاہم مجموعی حیثیت سے نکتہ چینی کی گنجائش اُس میں بہت کم ہے۔

ایک بات البتہ تعجب خیز ہے کہ جہاں بہت سے معمولی شعراء کے لیے ”ہزار داستان“ کے صفحات میں جگہ نکالی گئی ہے وہاں دو چار ایسے سنگمورہ بھی گئے ہیں جنکا شمول تذکرہ کی تکمیل کے لیے از بس ضروری تھا مثلاً سید فضل الحسن حسرت مولانی، جو زمانہ جدید کے شاعر نہیں بلکہ نو آدمی ہیں اور جنگی لٹریچر خدمات بھی قدرا فرمائی کی بہر طور مستحق تھیں۔ اس طرح خواجہ احسن اللہ خان ثاقب، یقیناً پاری کا نام بھی اس کتاب سے خارج ہے۔ حسرت مولانی نے اپنے رسالہ ”اردوئی معلیٰ میں“ ”ختم خانہ جاوید جلد اول“ پر ریویو لکھتے ہوئے یہ شبہ ظاہر کیا تھا کہ جلد دوم میں بعض ذاتی اختلافات کی بنا پر ثاقب کا نام

ختم خانہ جاوید میں بڑی خوبی کی بات ایک یہ ہے کہ حتی الوسع اسے ہر شخص کے مذاق کے مطابق بنانے میں کوئی بات اٹھا نہیں رکھی گئی۔ شاعر کے حالات حتی الوسع مفصل لکھے گئے ہیں۔ بعض مقامات پر سب ضرورت روایت و روایت سے انکی جرح و تعدیل بھی کی گئی ہے۔ نامور شعراء کے کلاموں کی تنقید منصفانہ اور مہذبانہ انداز میں دکھائی گئی ہے جن اساتذہ کے متعلق لوگوں میں اختلاف آراء ہیں، وہاں لالہ صاحب نے دونوں قسم کی رائیں درج کرنے کے بعد اپنا ذاتی خیال بھی نہایت صفائی سے بتا دیا ہے۔ شہرت و ناموری، شخصیت و خصوصیت، لحاظ مروت، کوئی بات بھی آپ کو سچ کہنے سے روک نہیں سکی مثلاً مولانا حالی کے متعلق ایک جگہ لکھتے ہیں:-

آپ نے مقدمہ دیوان میں جو شعر و شاعری بحث لکھی ہے اور اساتذہ عرب و یورپ کا موقع موقع سے مقابلہ حال و نیالات اور شعر کے اثر کی کیفیت لکھی ہے وہ دیکھنے سے متعلق ہے۔ کی ہو تو صریح یہ کہ اُمّ الاسلام سنسکرت کے مشاہیر شعراء اور ان کے یادگار کارناموں کا ذکر نہیں کیا جسکا غالباً یہ سبب کہ حضرت کوسنسکرت کی معلومات سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا۔

اقبال کی نسبت لکھتے ہیں:-

آپ کے کلام میں ایک کمی ضرور ہے وہ یہ کہ کہیں کہیں خلاف محاورہ و روزمرہ اہل زبان الفاظ نظم کر جاتے ہیں۔ جلیل کے بارے میں آپ کی رائے ہے:-

اگرچہ ان کے اکثر اشعار رعایت نفل اور محاورہ بندی سے باہر نہیں ہوتے مگر بندش کی چستی اور بیان کی سلاست اس نا طبع رنگ کو نہایت دلچسپ بنا دیتی ہے اور بے اختیار منہ سے تعریف نکلتی ہے۔

یہ آراء ممکن ہے کہ بعض حلقوں میں اطمینان کی نظر سے نہ دیکھائیں لیکن بلاشبہ یہ رائیں نیک نیتی اور انصاف کے ساتھ ظاہر کی گئی ہیں۔

ہو سکتا ہے کہ یہ ریاست سلطنت مغلیہ سے کئی صدی پہلے کی ہو س طرح سیکڑوں سال کے اہم واقعات اور مہتمم باشندان انقلابات کا اس سرزمین سے تعلق قدرتی طور پر ہونا چاہیے اور مولوی سید گلاب میان کی اس تالیف کے مطالعہ سے عجیب و غریب تاریخی حالات کا انکشاف ہوتا ہے۔

تاریخ پالن پور جو فہرست ظاہری کے اعتبار سے ایک بے مثل کتاب ہے، مضامین اور ترتیب مضامین و دونوں اعتبار سے قطعاً بے عیب، تاریخ کا ”میٹرل“ مولوی سید گلاب میان کے استاد اور خالو مولانا مولوی سید رحمت میان صاحب مرحوم کا جمع کیا ہوا تھا۔ سید مخدوم کے حالات جو تاریخ کے شروع میں قلمبند کیے گئے ہیں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ذاتی قابلیت اور پُر اثر شخصیت کے لحاظ سے وہ بے مثل تھے۔ مرحوم کی خواہش تھی کہ پالن پور کی تاریخ مدون کر کے اپنی ایک اور علمی یادگار قائم کریں لیکن قضائے اُنھیں جلت نہ دی اور ابھی وہ کھڑے ہوئے موتی، جنکو اکٹھا کر چکے تھے، لڑی میں پڑے بھی نہ جانے پائے تھے کہ اُن کا انتقال ہو گیا۔ مولوی سید گلاب میان کو خدائے عظیم اجر دے کہ اُنھوں نے منتشر مسودات کی مدد اور اپنی ذاتی جانفشانی سے اس کام کو پورا کیا ورنہ حسرت تکمیل مرحوم کو قبر میں بھی چین سے نہ ہوتی۔ تقسیم مضامین کی تشریح ہم مولوی سید گلاب میان کے الفاظ میں بیان کریں گے۔

تاریخ پالن پور کی تقسیم ایک مقدمہ، دو تین جلدوں میں لکھی ہو، مقدمہ میں مطالب تاریخ کی توقع ہے۔ اور تینوں جلدوں کی تخصیص یہ ہے کہ پہلی جلد میں صرف اُن فرمانروایان خاندان لودھانی کا تذکرہ ہو جنہیں سے اُترنے جاتوں پر اور بعض نے جالور اور پالن پور دونوں پر حکومت کی جو دوسری جلد میں قطعاً اُن رئیسوں کا ذکر ہو جو جالور پر سے قبضہ اٹھ جانے کے بعد

پالن پور ہی پر فرمانروا رہے ہیں اور تیسری جلد ہر اُنس فرمانروائے حال خدائے کرم کے حالات میں ہے۔ اس تیسری جلد کے دو حصے کئے گئے ہیں۔ ایک میں ہر اُنس کی لائف اور نظم و نسق ریاست کی صورت دکھائی ہے اور دوسرے حصہ میں جغرافیہ اور حالات متفرقہ وغیرہ کا بیان ہے۔

عام طور پر یہ گمان ہو سکتا ہے کہ ایک اسلامی ریاست کی تاریخ صرف اہل اسلام کی دلچسپی کا ذریعہ بن سکتی ہے لیکن ہم بلا خوف تردد کہنا چاہتے ہیں کہ تاریخ پالن پور کے قیمتی صفحے جن واقعات و معلومات سے لبریز ہیں اُن کی دلچسپی کسی خاص فرقہ تک محدود نہیں۔ قدیم تاریخ کا جس قدر حصہ ہو اُس کا مطالعہ کسی کیلئے بیکار نہیں ہو گا۔ اسی طرح، معاشرت، تمدن، علوم و فنون، وغیرہ کے مباحث ہر ایک کیلئے بلا تفریق کیساں سودمند ہیں۔ علاوہ اُن حالات کے جن کا تعلق براہ راست ریاست سے ہو سکتا ہے اور بہت سے مضامین بھی اس قسم کے ضرورتاً شریک کتاب کیے گئے ہیں جن پر عبور کرنا خالی از فائدہ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً افغانوں اور پٹھانوں کی نسبی تحقیقات، یا سید محمد جوہوری کے تشریح حالات۔ غالباً مہدی جوہوری کے اتنے تفصیلی واقعات اور کسی اور کتاب میں یک جا نہیں مل سکتے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس بات کا کافی ثبوت ملتا ہے کہ مولف اُن اصول سے اچھی طرح واقف ہیں جو آجکل تاریخ نویسی کی بنیاد سمجھے جاتے ہیں۔ جہاں ملکی واقعات و انقلابات کی تصویر کھینچی گئی ہو وہاں عقاید، رسوم، طرز زندگی وغیرہ پر بھی کافی سے زیادہ روشنی ڈالی ہے۔ جغرافیائی حالات بھی اپنی جگہ کتاب کا ضروری جزو بنے ہوئے ہیں۔ اور یہ تمام خوبیاں بغیر نہایت سخت محنت و جانکاہی کے نہیں پیدا ہو سکتیں۔

واقعات کی صحت کا التزام بھی، یقیناً غیر معمولی کیا گیا ہے۔ مولف صاحب خود تحریر فرماتے ہیں۔

جائے کہیں ذہن میں اچھن نہ پیدا ہوگی۔ پھر کتاب کی زبان ایسی پاکیزہ و شستہ ہو کہ بید و شاید بعض مقامات پر انشا پر داری کا رنگ پیدا ہو گیا ہو مثلاً تیسری جلد کے دیباچہ میں ”عرض حال“ کے عنوان سے رقمطراز ہیں:-

جب میں نے عالم وجود میں قدم رکھا ہوا اور ان کی گود میں پڑے پڑے اپنی ناسمجھ آنکھوں سے دُنیا کے ٹھیسڑ کی سیر کی ہو تو کوئی یہ کہہ سکتا ہو کہ میں کیا ادراک کیا ہوگا؟ کچھ نہیں۔ ان جب ان کی آغوشِ محبت سے نکل کر دُنیا میں دل دُنیا کے ہنڈولے میں خود بخود گردش کرنے لگا تو میری آنکھوں نے گونگے کے خواب کی طرح بہت سے دلچسپ واقعات دیکھے مگر میری ذہنی قوت نے قوتِ مدد کے صحیحہ کے پیدا ہونے تک اسکو بھی حافظہ کی صندوق میں رکھ کر محفوظ کر دیا اور جب سن تیز کے میدان میں اگر علم کی عینک لگائی تو سب تماشے ایک طرف اپنی آپ کو مختلف حقوق میں گھرا پایا۔ پہلا حق تو والدین کا دکھائی دیا جنگی مانتا بھری گود مدتوں میری عمر کا پیانا رہی ہو اور جنہوں نے برسوں اپنے کچے خون کی بتیس دھاریں پلا پلا کر مجھ کو پالا ہو اور دوسرا حق اُس ولی نعمت کا محسوس ہوا جس کا سر پرست ہاتھ میرے اور میرے خاندان کے رزق کا چھپرہ ہے۔۔۔۔۔

اس طرح متعدد مقامات پر سید گلاب میاں صاحب نے اپنی سحر بانی کا ثبوت دیا ہو۔ کتاب کی معمولی حالت باعتبار زبان کے یہ ہو کہ طبیعت کبھی اُس کے پڑھنے سے سیر نہیں ہو سکتی تاریخِ واقعات کے بیان کرنے کیلئے ایک خاص طرزِ تحریر کی ضرورت ہوتی ہو جسکی متانت، صفائی، اور پختگی پڑھنے والے کے قلوب پر نمایاں اثر ڈال سکے۔ ہم حضرت مولف کو نہایت گرمجوشی سے مبارکباد دیتے ہیں کہ اس باب میں بھی اُن کی کوششیں مشکور ہوئی ہیں۔

..... لیکن پھر بھی میں نے اس تاریخ میں جو کچھ لکھا ہو حتیٰ الامکان وثوق کے ساتھ لکھا ہو جب تک کسی چھوٹے سے چھوٹے واقعہ کی نسبت بھی مجھ کو کم از کم دو مختلف روایتوں یا دو مختلف طریقوں سے صحت کا یقین نہیں ہو گیا میں نے اُسکے لکھنے کی جرأت نہیں کی اور جہاں کہیں ذرا سا بھی اختلاف نظر آیا دو وزن مختلف صورتیں بغیر نقل کر کے بعض بعض موقعوں پر اپنی رائے کا بھی اظہار کر دیا ہے۔

جن مشہور و معروف تاریخوں کی امداد سے ”تاریخ پالن پور“ ردو ہوئی ہیں انہیں سے چند یہ ہیں طبقاتِ اکبری، آئینِ اکبری، اکبرنامہ منتخب التواریخ بدایونی، تزکِ جاگیر، تاریخِ ماڈراجستان، کتابِ عہدِ ناجات، لیکن یہ دیکھنا چاہیے کہ قابلِ مولف نے صرف انھیں چند تاریخوں کی ورق گردانی سے کام نہ نکالا ہو بلکہ حقیقت یہ ہو کہ اُنھوں نے متاعِ نیک ہر دکان کہ باشندے اُصول پر عمل کیا ہو اور جہاں سے اور جس طریقے سے جو کچھ ملا ہو اُس سے حسبِ ضرورت استفادہ کیا ہو۔ یہاں تک کہ مقامی گیتوں، مشہور قصوں اور روایتوں اور ہندی اشعار کی مدد سے بھی اکثر واقعات و حالات کا استنباط کیا گیا ہو۔ یہ اعتراض ہو سکتا ہو کہ کیشون کی روایات قابلِ اعتبار نہیں، لیکن اگر مورخ وسیع النظر ہو تو ان کی ہدیان سرایتوں سے بہت کچھ سچی باتیں بھی پیدا ہو سکتی ہیں کیونکہ بھاٹ اور کیشور کے دوہرے اور اشعار کسی خاص اور صحیح واقعہ پر مبنی ضرور ہوتے ہیں اور اسی اعتبار سے انھیں ہندوستان کے قدیم مورخ کہا جاتا ہو۔

تاریخ پالن پور کی دو خصوصیات ایسی ہیں جنکی تعریف خواہ مخواہ کرنی پڑتی ہو۔ ایک حسن ترتیب دوسرے حسن بیان۔ یہ دونوں خوبیان ملکر سونے میں سوہاگے کا کام کر گئی ہیں۔ مضامین کی ترتیب اس اسلوب سے رکھی گئی ہو کہ آپ صفحے کے صفحے پڑھتے

واقعہ نگاری میں بھی جس تک، متانت اور ثقاہت کو دخل دیا گیا ہو وہ قابل تعریف ہو۔ تاریخ کا آخری حصہ فرانزولے حال کے سوانح سے متعلق ہو لیکن مولف نے اس دور کے واقعات بھی کچھ ایسے سلجھے ہوئے الفاظ میں بیان کیے ہیں کہ مبالغہ اور غلو کا شائبہ تک نظر نہیں آتا اور یہ کچھ کم خوبی کی بات نہیں ہو۔

مولوی سید گلاب میان، ملک کے جانب سے مبارکباد پانے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اپنی نادر تالیف کو ہر پہلو سے سنوانے اور درست کرنے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا باطنی خوبیوں کے ماسوا ظاہری محاسن کی کمی نہیں۔ چھپائی لکھائی اور کاغذ وغیرہ کا جو اہتمام کیا گیا ہو وہ بہ نفع آفرین کے لائق ہو۔ فرماؤ ایاں پاپن پڑ کے مرقع، تجارت و پیشہ ور کاروباری لوگوں کے گروپ، مالکن

و محلات کی تصاویر ان سب سے کتاب کی رونق کئی گنا بڑھ گئی ہو، اور انہیں سے بعض اس خیال سے اور بھی قابل قدر ہیں کہ وہ قدیم صناعی کے نمونہ کی حیثیت سے بے کم و کاست ہاؤس ٹون سے چھپو کر شامل کتاب کر دی گئی ہیں۔

آخر کتاب میں بعض شاہراہی قلم کی تقاریظ کا حصہ ہے مثلاً مولانا شہر، مولوی عزیز مرزا مرحوم، صاحبزادہ آفتاب محمد خان نواب حاجی اسماعیل خان، مسٹر شاکر میرٹھی، وغیرہم، اور ان سب میں تبصرہ نگاری کا حق ادا کرتے ہوئے مولف کی محنت جانفشانی کی داد دی گئی ہو۔ یہیں امید ہو کہ عام طور پر اس تاریخ کی قدر دانی ہوگی۔ جو کتب خانہ اس سے خالی رہے گا اسکی قیمتی کامزید ثبوت ہم چھپانکی کوئی ضرورت نہیں۔

سید القلم

العصر کا خیر مقدم

ہیں جوشِ طرب دلی کلیاں خندان پیغام سرور عیش لایا العصر
(۱)
افوج گیا دی
(۲)
اب علم ادب کی رستگاری دیکھو باغِ اُردو کی آبپاری دیکھو
اخلاقی و تاریخی مضامین کے لیے العصر رسالہ ہوا جاری دیکھو

(۱)
گلزار میں اب فصلِ بہار آئی ہو پیغامِ نسیم جانِ فزا آئی ہو
پھر مردہ دلوں میں روحِ تازہ آئی شاکر کا یہ اعجازِ مسیحائی ہو

العصر کے کیوں نہوں ایڈیٹر شاکر ہیں اہل سخن میں سب بہتر شاکر
کیوں نہ ہو قدردانِ زمانہ ان کا ہیں عاقل و نکتہ دانِ سخنور شاکر

العصر ہے گنجِ شائیکانِ اُردو اب ہوگی ترقی زبانِ اُردو
ہے چشمہ فیضِ طبع شاکر جاری ہوگا شادابِ گلستانِ اُردو

تسکین ہو علاج۔ طبعِ برہم کے لیے اور صبح وصال ہے شبِ غم کے لیے
العصر کو ہمدردی جو ہے ہو تو پھر ہم ہیں تیار خیر مقدم کے لیے

اُردو کی ترقی میں جو کچھ ڈھیل ہوئی اخلاق و ادب کی جو نہ تعمیل ہوئی
جو کچھ گزری۔ گذر گئی لیکن اب العصر سے ہر کمی کی تکمیل ہوئی
صبرِ دہلوی

ہے بزمِ سخن کے لیے زیبا العصر ہمیشہ ہے اُردو کا رسالہ العصر

نماز عشق

کیا میں کہوں کوں ہو کچن بیکرا ہوں جاندا وہ اولے جال نگار ہوں
 سارا جہان ہو کوئے حرم میر و واسطے مین زار تجبلی رخسار ہوں
 ہر نقش پانے جھکو دکھائی ہو اہ دست دیر و حرم کے راز کا میں ازدار ہوں
 دل و مقام ہر تو کیسی تلاش دوست مین لامکان کے راز سے بھی ہوا ہوں
 پیش نگاہ یا ر قعود و قیام کیا ہر وقت مین سجود مین بیکرا ہوں
 روتا ہوں دیکھ دیکھ کے اک شے کو ہر جگہ مین خندہ نہان کے لیے شکبار ہوں
 اس بیخودی دل پہ بھی ہتا ہوں شاہ امید دار رحمت پروردگار ہوں
 ہوا نکسا روح تو رکب نماز عشق کیا کہ رہا ہر شے کہ شب زندہ دار ہوں
 پنہان ہو عاشقی مین حیات ابکاراز کیوں مین اسیر گردش لیل و نہار ہوں
 جوشے حمید جلوہ نامہر مکان مین ہو
 وہ بندہ اے اسیر دل ناتوان مین ہو

حمید کوٹلوی

لڑکپن اور بھگپری

آج رنگ خامہ نیرنگ فرادیکھئے سحر پردازی منکر نکتہ پیرادیکھئے
 صورت الفاظ مین معنی کا نقشا دیکھئے خوشنما تصویرِ فطرت کا یہ خاکادیکھئے
 سادہ دل سادہ طبیعت لابی صورت مین

دوہین ابیلی نویلی بھولی بھالی صورت مین
 اک بہت کم عمر اور اک سچ کچن مین سا ایک عنائی صد اک پہ زیبائی فدا
 دونوں پاری پیاری شکلیں ایک اک دوا اک حسین اک حسین اک خوش اد اک خوش لقا
 چشم بوزبان کی بچپن کی ادائیں دیکھئے
 پیار بھی خوش ہو کے لیتا ہو بلا مین دیکھئے

ساوگی اُس پر لڑکپن اور بھگپری رنگ پھر کہاں دین کہاں سین کہاں پھر پینگ
 جسم بچے مین ڈھلے چہرے قیامت نگہ قندہ ہوا سے کہ ہوں سرور و صنوبریت و نگ
 چشم ز گس زلف سنبھل لالہ روح مخفی دین

ایدل تو کیوں فدائے رہ سو ساز ہو؟ کیوں تو رہین لذت درد و گداز ہو؟
 پہلو مین چپکے چپکے تو ہو بیکرا کیوں؟ درد نہان کی ٹھیس سے ہو شکبار کیوں؟
 غم جھکو کیوں پسند ہو کس پر فدا ہو؟ ہر وقت آہ و درد مین کیوں تہلا ہو؟
 دیکھو تو مین بھی صورت حیران کھا ہو؟ کچھ تو فسانہ غم نہان سنا ہو؟
 جیسے تو مر رہا ہو وہ ناز آفرین ہو کون؟ دیتا ہو جیسا چاہا وہ ایسا حسین ہو کون؟
 کیا دیر بہن کے بتوں سے سو اڑو؟ اعلیٰ راز شہود و سرخ مسوا ہو وہ؟
 کسکی ستائشوں مین تو محو خیال ہو؟ کیا آرزو سے ذوق حصول کماں ہو؟
 ہر ذی حیات جس کے لیے درمند ہو؟ کیا تو اسی کے سوز مین مثل پسند ہو؟
 ہاں ہو اسی حسین کی اگر جستجو تھے خون جگر سے چاہیے کہ نا وضو تھے؟

دیر و حرم سے بڑھکے ہو شانِ نیا عشق

حاصل کائنات ہو ذوق نماز عشق

آئی نظر مین حسن کی جیسے ادا مجھے ایک ایک برگ خشک بھی خوشنما مجھے
 ایسا جا ہو رنگ جال نگار کا ہر چیز آ رہی ہے نظر دل ربا مجھے
 لے عشق جب تو نے دکھایا ہو حسن باد ہونا پڑا ہو سائے جہان پر فدا مجھے
 تیری فضا مین تیر رہی ہو کائنات کون دمکان سے آئی ہو تیری جہا مجھے
 سجدے کر لئے تو نے حرم مین ہزار ہا ق تو لے گیا ہو دیر مین بھی بار ہا مجھے
 مٹ مٹ کے مین بنا ہوں یہاں ہزار ہا ہر بار عاشقی نے کیا ہے جلا مجھے
 لکھو دی ہو مین نے عمر غم عشق مین حمید اب آ کے کیا سا سنگی منکر فنا مجھے
 بلبل کو گل نے دی ہیں اگر سینہ سوان حسن ازل نے سوزا بدیدیا مجھے
 موسیٰ نہ کوہ طور کا قصہ سنائیں اب ہر ذرہ وقت دید ہو برق بلا مجھے
 حیرت مین ہوں مین جلوہ دلدار دیکھ کر لے ذوق دیدیا یہ کیا ہو گیا مجھے

بخشا ہو ہوش جلوہ حسن قدیم نے
 دے ڈالی ہو زبان مجھے اپنی کلیم نے

باغبان صبح کی گلکاریوں کے دوچہن

اک طرف گلدان میں سرسبز پھول کی بہا ہلکی ہلکی ٹہنیاں اُس پر شکوفوں کا نکھار
بھینی بھینی تازہ پھولوں کی بو بونے خوشگوار جس پر اک نازک داکو اس قدر آیا ہر پیار
بڑے کلفت شاخ گل کے لیکے بو سے ناز سے

بونے گل پر ہو رہی ہر محو کس انداز سے

گل یہ کہتا ہے کہ صدقے تیرے رنگین کیا خبر مجھ کو کہ ہے رنگ چمن ناپائدار
مُجھ کو اندوہ خزان ہر کچھ نہ پڑے بہار کیا کون تجھ سے جھٹائے انقلاب روزگار
نذر صبر سیکڑن گلہائے رنگین ہو گئے
دست گل لاکھوں قہقہے گلچین ہو گئے

اک طرف شیشہ میں ہر پران سیابی کا گھر تک رہی ہر کُنسی باندھو جسے اک سیر
پتیاں پھرتی ہیں شکل رشتہ تارِ نظر آتی ہیں مڑ کر جدھر وہ بھی جاتی ہیں دھر
کستی ہیں گویا زبان حال سے وہ نیربان
قید ہیں زندہ دکھاتے اپنی ہم اٹھکھیلیاں

اب کہاں؟ وہ موج دریا کی روانی نصیب اب کہاں؟ ہوتا ہوا شقائق پانی نصیب
اب کہاں؟ آزاد یونگی زندگانی نصیب وہ فراغت کب کہاں؟ وہ شادمانی نصیب
ازدوُن میں نور شانوں میں ہمت نہیں
وہ فضا آبِ روان کی دودھ ست نہیں

کیا کہیں! کد شفق آزاد زندان ہم بھی تھے یعنی سیکڑ غم اندوہ و حیران ہم بھی تھے
اُٹھنے بھرے پائیاں عرفان ہم بھی تھے قلم توحید کے اک دُرِ خطان ہم بھی تھے
سادگی کے سالِ زادی کے سن کیا ہو گئے

بنی کی راتیں بھٹکری کے دن کیا ہو گئے شفق عباد پوریا

افسانہ گل

دباں جان جو ہجوم غم زمانہ ہوا میں سیر کے لیے سوئے چمن و انہو
بار بار پتھا حسینان باغ کا جو بن ہر ایک شاخ گلِ تر بنی ہوئی تھی مہن

بناتھا رونق گلشن نکھار پھولوں کا پلٹ کے چوستی تھی منہ بہار پھولوں کا
سمجھ گیا تھا یہ ہر پھول میں یگانہ ہون قبول چشم جان شاہِ زمانہ ہون
مجھ سے رونقِ بزمِ نشاط و عشرت مجھی میں راحت و آرام جان دیت
غرض تجھ پرچہ پُراسد مدام پھولوں کا بھڑکے تھے چمن میں چراغ پھولوں کا
غور و حسن سے آواز سب کہتے تھے وہ جس کو دیکھتے تھے کھل کھلا کے ہنستے تھے

یہ حال دیکھ کے سالت وہاں اُنہ گیا

خطاب کر کے یہ گل کی طرف پکار اُٹھا

بہار حسن و دروزہ پہ پھول جاتا ہے تو اپنی ہستی فانی کو بھول جاتا ہے
شرابِ عشق چھلکتی ہے جام سے تیرے سرور بادہ بھی حاصل ہے نام تیرے
فرخِ حسن حسینان ہر چمن رنگ ترا انوکھی وضع ہو تیری زلالہ دھگ ترا
اُبھرا بھر کے دکھاتا ہے اپنے جو بن کو تڑپ تڑپ کے لٹاتا ہے سائے گلشن کو
ہر گدگداتی صبا بنکے سیکلی تیری پھنساتی ہے اسے خود تجھ کو لگی تیری
پسند کیوں نہیں آتا ہے تجھ کو مجھ غیب کہ ہے اسی میں ہفتہ تمام رازِ شکیب
ہزار جان سے قربان ہے خود فروشی پر سدا تھا ہوا رہتا ہے گرم جوشی پر
آل کار تجھے اکدن کوئی گلچین کر گیا شوق سے اپنے گلے کا ہیرہ بین
لیگا چند گھڑی تجھ کو طعنت و نحوالی رہیگا حسن یہ قائم نہ تیری شادابی
مگر وہ حال زبون تیرا صبر دم ہو گا کہ ہے دیکھنے والوں کو بھی الم ہو گا

اُڑیگا رنگ یہ رنگ رخِ سحر کی طرح رہیگا دہرین تو آہ بے اثر کی طرح
لیگی خاک میں ساری یہ تیری شادی رہیگا حسن نہ وہ بلبلون کی بتابی
تپان رہیگا شرارِ طیبہ کے مانند لیگا خاک میں اشکِ چکیدہ کے مانند
اُٹھینگے انگلیاں تجھ پر کہ شمعِ مردہ ہے کہیں گی شاخیں دکھا کر گلِ فسرہ ہے
اگر تو ماننا ببل کو اپنا شیدائی ہزار جان سے جو تھا ترا شنائی
نہو تا حال یہ اُسکا جو ہو کے تو رہتا نہ تذکرہ سرباز کو بکو جوتا

ڈوبی آبرو اپنی بھی آشنائی بھی وفا بھی عفت و عصمت بھی پارسائی بھی
کہا یہ گل نے سنی ہم نے دستان اپنی دہن میں تیری یہ دانشِ زبان اپنی

پہلے کچھ احکام سلطانی سنائی ہو مجھے قصہ شانِ جہان بانی سناتی ہے مجھے
پھر سناتی ہو محافل کی طرب انگیزان شوخی حسنِ ملاحتِ مذاکی شکر بیزان
کالی کالی دکھائیں ادب بھری بات میں تازے گانادہ رقص کا بھیگی لٹ میں
عہدِ پیشین کے بطنے کچھ سناتی ہو مجھے کچھ ہنسائی ہو مجھے اور کچھ لڑائی ہو مجھے
عاشقوں نے گفتگو سستی جذبات میں ن کی تھی جو آہستہ تنہائی میں بھیگی رات میں
ہم کو بتلاتی ہو آ آ کر صدائے بازگشت در ماضی کا ہے اک دفتر صد بازگشت

ہم سے پوچھ کوئی ایسا جڑ بولوں کا حال انکے ساکن کن تھو اور کیا ہوا اُگلال
نزدہ ز رہ میں یہاں کے نطق کی تفسیر ہو ریزے ریزے میں یہاں کے جو ہر تقریر ہو
سگریزے کام کرتے ہیں بانو کے یہاں ہو رہا ہر طرف ایامِ پیشین کی بیان
ہر قدم پر بانو کے نیچے جاتی ہو زمین دستانِ حالتِ ماضی سناتی ہو زمین

اسجگہ کچھ عیش کچھ عشرت کے سامان فن ہیں اسجگہ پر کچھ مرادیں اور کچھ ارمان فن ہیں
اسجگہ پر ہر مزار شوکت و شانِ غرور اسجگہ مدفون ہیں اسبابِ مکانِ غرور
آرزوئے حدِ شہرت کی بیان پر قبر ہے جس تجوئے لطفِ جنت کی یہاں پر قبر ہے
دلربائی اور دلازاری کی حد ہو اسجگہ عاشقی اور ناز برداری کی حد ہو اسجگہ
نامہ شکیں ز اہد اس جگہ پر ختم ہے حسنِ عالمگیر شاہد اس جگہ پر ختم ہے
تیغ جو ہر دار کی حد اس جگہ پر ہو گئی حسنِ بکردار کی حد اسجگہ پر ہو گئی
اسجگہ ہر یکسی اور نامرادی سو رہی قبر دیوانِ شوخی چشمِ فسون پر واز کی
دب گئے ہیں کچھ جو اہر غیر سفتہ اس جگہ دفن ہیں کچھ خچلے نا شگفتہ اسجگہ
مردین ہیں کچھ خونِ فتنہ سامان کی یہاں چاکِ امان کی یہاں چاکِ گریبان کی یہاں
ساتی تو بہ شکن ہو اسجگہ آرام میں شاہِ نازک بدن ہو اس جگہ آرام میں

ز رہ ز رہ کہ رہا ہو اپنی اپنی داستان

لو سنو افسانہ ہائے ریزہ اسے استخوان

اس طرح کتاب ایک ڈی کا ٹکڑا برلا عالم فانی کا مجھ میں ہر تماشا برلا

بجا ہو ٹھیکے انکار ہو نہیں سکتا مگر خطا کا بھی اقرار ہو نہیں سکتا
خبر نہیں تھے صورت پرست ہو دنیا مدام بادِ غفلت سے مست ہو دنیا
ہماری ہستی موہوم ہے بناتاتی تو دیکھ اُنکو جو رکھتے ہیں جو ہر ذاتی
وفا پرستی کی جو جگہ آب و گل میں ہے اولے فرض کا احساسِ حلو و ملین ہے
مال کا رستہ ہیں عقل رکھتے ہیں جو کارخانہ قدرت میں دخل رکھتے ہیں
ہر جگہ حسنِ یاقوت بھی حسنِ صورت ہے جو رہ چکے ہیں رہیں وفا و الفت بھی
انہیں تو دیکھ کہ مرتے ہیں بیوفا و نیر مٹے ہوئے ہیں تصنع پہ کج اداؤں پر
نہیں ہو نام کو جن میں ذرا وفا داری کہ جو ہو مانی ہوئی خاص شہر و دار
گس گس طرح نیا گل تلاش کرتے ہیں یہ آئے دن نئے گل پیریں پہ پیریں
عبت ہو مجھ پہ پھر الزامِ بیوفائی کا کم الفتیوں کا اور کج اداؤں کا
کہا ہو حضرت اقبال نے غیبِ شباب کہ جنگِ دعوے کا ممکن نہیں کوئی جو
ریاضِ دہر میں ہیں یں تو رنگِ لک پھول

وفا کی جن میں ہو بودہ کلی نہیں مٹی ! شباب

دیران قصر شاہی

فطر تا ہو مجھ کو شوق دیدار کہن قدر تا ہو مجھ کو ذوقِ علم سر کہن
یادگارِ شوکتِ ماضی جانِ پاتا ہو نہیں جسطرح بتا ہو اُسکو دیکھنے جاتا ہو نہیں
خواہ مسجد خواہ مندر خواہ ہوشاہی مکان نقشِ کمنہ میں ہیں اُن کے طعنے زبان
مجھ کو اجڑی بستیوں سے خاص دلچسپی ہے اور باشندوں سے اُنکے خاص ہمدی سہی
غور کرنا ٹوٹی دیواروں پہ بھاتا ہو مجھے ایسی اجڑی بستیوں میں لطفِ آہو مجھے
میں سمجھتا ہوں کہ ایک فناء کتا ہو کوئی بھول کر بھی گرا نہیں دیرانِ کتا ہو کوئی
جب کسی ایسی جگہ پر میرا ہوتا ہو گذر ہوتی ہو طاری عجب یک بجو دی سی قلب
جب کوئی شاہی عمارت دیکھنے جاتا ہو نہیں ایک عجب عالم میں اپنے آپ کو پاتا ہو نہیں

اُجڑے محلوں سے جاتی ہو صدائے بازگشت طرف افسانہ سناتی ہو صدائے بازگشت

سات آبی ہن نظر بان کھنے

روان

قطعہ

ہر لگا رکھا بحث محرم ہم نے بھی کوہِ گد
 زمین آیا ہو کہ ترک عشق غریبان کچھ
 تاب گئے یہت پرستی و کاجا یہ کافر یا
 مستکف ہو بیٹھے اور ذکر یزدان کچھ
 دخل ہو ضام غارت گر کا امین کسلا
 گھر خدا کا ہو چل کیوں لکڑیاں کچھ
 مصحف خسار میں تشبیہ ہو کمزوری
 ہنسے مطلب پیدا صحت یا بان کچھ
 منتقم صبح جوانی ہو پے فکر معاد
 کیوں سعادت کی سحر کو شام چل کچھ
 اسے کیا حاصل کہ پیمان حقیقی چھوڑ کر
 سست پیانوں سے کئے عذیبان کچھ
 دروغ گفتہ نہ پیدا کیجئے زمین تو کیوں
 منت عیسیٰ پے تدبیر و دربان کچھ
 لوٹے کانٹوں پہ کیوں ہر شب کسی بچہ میں
 سے توتے کیوں خیال نوکِ ترنگان کچھ
 بیٹھے کیوں ہو کے پاد حلقہ زنجیر زلف
 اپنے گھر کو کس لیے ماند زندان کچھ
 کھینچ اچھا کے گیسو میں دل بتاب کو
 خود پریشان ہو چئے اُن کو پریشان کچھ
 کیسی حشت چھوڑ کر گھر بار اپنا کسٹے
 سے صحرایہ قطعے بیا بان کچھ
 اکیں گہری جلاؤ الدین بگھر کے چراغ
 دھانے دلس کیوں ہر شب چراغان کچھ
 شمع رویوں سے لگایا کیجئے ہرگز نہ لو
 کس لیے پھر شکوہ لے سوز نہان کچھ
 دیکھ کیوں جا کے گج بلغم میں لڑو قطار
 گل کو خندان کیجئے ٹیل کو گریان کچھ
 فصل گل میں ہو کہ کیوں منت کن خشت
 محو دے امان کیجئے پرنے گریان کچھ
 شاعری کس نام پر اک دنغ ہو عشق مجاز
 فائدہ کیا ہو کہ وصفِ لاہور بان کچھ
 کس نے کہلائے محرم؟ میں ناماد
 خود ہی اپنے آپ کو کیوں مرجھان کچھ
 جن سے سب جواب خط نہ ہواں کیلئے
 کس نے ہر روز فکر تازہ ہواں کچھ
 کیجئے موزون اشعار طرب انگیز کیوں
 کیوں غزل میں پیری سو گواران کچھ

یہ تو سب کچھ کیجئے پر آگیا وہ شوخ پھر

نزد دل گزرائے؟ یا پیشکش جان کیجئے

محرم

میں وہ پنجہ ہوں کہ حسین اگر تیغ آبدار
 شیر افکن مروید نو کو کوئی تھی غما
 چار سو عالم میں شہوت خانچہ عکاسی
 شان شوکت کامری اوچلہ چشم کامری
 کتنے گھرا تیر کیے تھے میں نے اپنے ہاتھ سے
 کتنے تن پے سر کیے تھو میں نے اپنے ہاتھ سے
 میرے تیش کی دیکھتے ہر کو تابدگی
 میری خنجر کی چمکے برق کو نرسندگی
 زندگی میں ل کی کافی نہ بیاحت مجھ
 قبر کی تعمیر بعد مرگ سونے کے لیے
 بعد مرگ میں ہی آرام کی تدبیر تھی
 بس یہی گویا بقائے نام کی تدبیر تھی
 آدمی کو کام ہو اولاد سے دو چارشت
 ہاں بقاء نام ہو اولاد سے دو چارشت
 آگے ہیں فاصلے پہ طبع ماضی سے ہم
 جانتے یہ بھی نہیں تھے کون جدِ مہم
 ہونگے ہم گناہم آمدن اپنی ہی اولاد میں
 رفتہ رفتہ ہو کر شامل بے نشان افراد میں
 دور اندیشی سے کیوں قبر نہ اپنی پسند
 امتدادِ وقت سے پہنچے نہ ماکوئی گزند
 عین اب کچھ بھی نہیں اس قبر کی تانی نشا
 ورنہ ہوتا تم کو اس کی پائدار یکا لکان
 قبر نہ اپنی تھی جو اپنی حفاظت کے لیے
 اب محافظ کا کوئی ذرہ نہیں محفوظ

سرگزشت عالم فانی سانے کے لیے

ہم ابھی باقی ہیں ٹھوکر کی کھانے کے لیے

دوسرا ریزہ یہ کتابچہ نہ پوچھو میرا حال
 ظلم سے میری تھی اک خلقت کی خلعت پائال
 کیا ہونمیں؟ اک حاضرِ شہم سنون پڑا ہوں
 میں سراپا عشق ہوں اور میں پائال ہوں
 میں نے صد ہا سرکشوں کا حال تبرک کیا
 بس جدھر دکھایا دھر عالم کو مضطر کیا
 وہ جہاں آشوب سرکش اور وہ شکارزار
 تھا م لیتے تھے کلچ جب مرا پڑا تھا دار
 کتنی خلقت مبتلائے بدحواسی مر گئی
 کتنی خلقت میری کہ چتون کی پی پی گئی
 میں نے کتنے دل جلاؤ کا ساز و سامان لیا
 دین کتنوں کا لیا کتنوں کا ایمان لیا
 پی کے میری اک نظر سے شربتِ آبِ حیات
 نیجان کتنے ہوئے شاد و سیرِ حیات

داستانِ وقتِ رفتہ، آہ لیکن کب تک

یہ بیانِ وقتِ رفتہ، آہ لیکن کب تک

میں غرض یہ بتیاں تاریخِ صفحاتِ قدیم

انکو پرانہ نہ سمجھو ہیں بیانِ دھنِ مقیم

کوئی کیفِ عبرت آموزی کا متوالا تو ہو



شمس العلماء مولانا الطاف حسین صاحب "حالی"

العصر

کرہ ہوائی کے متعلق دلچسپ معلومات

(Crust) مانع اور سیال مادہ کے انجماد سے پیدا ہو گئی ہو سکی
سطح کے بعض حصص تو خشک ہیں لیکن اکثر حصوں کے اوپر پانی
کے بخارات نے ٹھنڈے ہو جانے کی وجہ سے سمندر کی شکل اختیار
کر لی ہے۔ سطح زمین کے اوپر کئی میلون کی اونچائی تک ہوا کا ایک
وسیع اور عمیق سمندر ہے اور اس سے اُدھر خضائے بیسطین "ایم" کا
بحر بیکراں ہے۔

اس بحث کے متعلق ہم ایک جگہ گاہ مضمون میں تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے
دنیا میں بہترین گھڑی موہر وقت کے اندازہ کے لیے زمین کی گردش میل نما بھی
جاتی ہے لیکن فی زمانہ سائنس کی حیرت انگیز ترقی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ زمین کی گردش
گردش کا وقت بڑھ رہا ہے گویا ایک شبانہ روز کا حصہ موجودہ زمانے میں آج سے
چند ہزار صدیاں پہلے سے چند ایک دقیقہ کی مقدار سے لمبا ہے۔ الفاظ دیگر ہمارے
دن رات لمبے ہو رہے ہیں لیکن سال اسی تناوب سے چھوٹا ہو رہا ہے کہ آبی
ہائڈروسفر Hydrosphere کہہ ہوائی = Atmosphere

تہیہ

عالم ارضیات اور ہیئت و اوزن کا متفق علیہ قیاس ہے کہ زمین
جس پر ہم بستے ہیں خلا میں معلق ایک کرہ ہے جو وقت معینہ پر ایک
اپنے محور پر گھومتی اور آفتاب کے تجاذب سے سال میں ایک دفعہ
آفتاب کے گرد چکر لگاتی ہے۔ اسکا اندرونی حصہ مرکز کے قریب
اغلباً مانع اور سیال ہے لیکن سطح پر اور سطح سے بہت دور اندر
کی طرف پتھروں اور چٹانوں کی ایک موٹی ٹھوس تہ (کرسٹ) =
لے فٹ نوٹ ہے جی آجیٹ (Geologist) یعنی عالمان علم طبقات الارض۔
ہم نے ہی آجی (Geology) کا ترجمہ ارادۃ ارضیات کیا ہے اگر برسی
زبان میں تمام علوم کے نام ایک ہی طرز پر وضع کئے گئے ہیں مثلاً ذرا آجی نفی
آجی سوشی آجی وغیرہ تمام جدید علوم اسی طرز پر پکارے جاتے ہیں۔ قدیم
علوم مثلاً فزکس یا بائیوئی وغیرہ مستثنیات ہیں۔ کیا ہی اچھا ہوا اگر وہ دین بھی
اسو ان علوم کے جن کے نام پہلے سے وضع ہو چکے ہیں یا اب مشکل سے وضع ہو گئے

۱۔ کرہ ہوائی کرہ زمین کا ایک جزو لا ینفک ہے

زمین اپنی سالانہ گردش میں ۸۰ میل فی ثانیہ یا تقریباً ۲۹ ہزار میل فی گھنٹہ کی حیرت انگیز رفتار سے حرکت کرتی ہے۔ لیکن کرہ ہوائی بعینہ اسی طرح زمین کے ساتھ متصل رہتا ہے۔ ہم سطح زمین پر رہتے ہیں۔ اسی طرح کرہ ہوائی کرہ زمین کے ساتھ زمین کی یومیہ گردش میں بھی متصل رہتا ہے۔ زمین کا محیط تقریباً ۲۵ ہزار میل ہے۔ لہذا خط استوا کے قریب کرہ ہوائی کے وہ حصے جو سطح زمین سے قریب ہیں ساڑھے دس سو میل فی گھنٹہ یا ۸۰ میل فی منٹ کی رفتار سے گھومتے ہیں اور وہ حصے جو عرض بلد ۳۰ کے قریب ہیں ۹۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے گھومتے ہیں اور وہ حصے جو عرض بلد ۶۰ کے قریب ہیں سو پانچ سو میل فی گھنٹہ یا ۹۰ میل فی منٹ کی

(تبیہ صفحہ گذشتہ) تبدیل کیے جاسکتے ہیں تمام نئے نام "ارضیات" کے وزن یعنی "آیات" کی آواز پر ختم ہوں مثلاً علم ادب کو ادبیات، علوم طبعی کو طبیعیات، کائنات کے علم کو معدنیات، علم کیا کو کیمیات، علم نباتات کو نباتیات وغیرہ نام دیئے جائیں ہمارے زبان میں علمی ترقی کے لوازمات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اصطلاحات علمی مناسب طریقہ پر وضع کی جائیں۔ میرا مدعا ہرگز یہ نہیں ہے کہ موٹے موٹے عربی کے الفاظ اردو لغت میں شامل کیے جائیں، میں صرف بہترین یگانگت کا حامی ہوں انگریزی زبان میں علمی اصطلاحات میں کیسی عمدہ اور قابل تعریف کجبتی ہے۔

کیمیات یعنی Chemistry کے متعلق علمی کتب کا اردو میں ترجمہ کرنا تقریباً محال ہے، تاوقتیکہ جیسی کیسان اصطلاحات (Nomenclature) انگریزی زبان میں کیمیائی مرکبات کے لیے وضع ہیں اردو میں بھی وضع نہ کی جائیں۔ ایک اور گزارش جو میں العصر کی علمی تحریک سے فائدہ اٹھا کر علم دوست اصحاب کی خدمت میں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ تمام علمی آلات Scientific Instruments کا نام اصول متشعرہ صدر کے مطابق اردو لغت میں کیسان وضع کرنا چاہیے۔ مثلاً آلات بالعموم دو قسم کے ہوتے ہیں۔

رفتار سے گھومتے ہیں۔ بعض حضرات غلطی سے یہ خیال کرتے ہیں کہ کرہ ہوائی زمین کی روزانہ گردش میں شامل نہیں ہوتا بلکہ زمین اس کے نیچے اس طرح پھسلتی رہی جس طرح ایک متحرک جسم دوسرے ساکن جسم کے نیچے حرکت کرتا ہے۔ وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ کشش زمین جسکی بدولت باقی تمام مادی اجسام زمین کے ساتھ حرکت کرتے ہیں جو اپر بھی بحیثیت ایک مادی جسم ہونے کے اسی طرح عمل کرتی ہے اور زمین کے ساتھ کرہ ہوائی اسی طرح گردش کرتا ہے جس طرح ایک متحرک صندوق کے ساتھ اسکے اندر کی چیزیں حرکت کرتی ہیں۔ ایسی مثالوں میں ایک بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ الفاظ کے مفہوم کو غلط طور پر محدود کر دیا جاتا ہے۔ اس بحث میں سطح زمین کے اوپر کرہ ہوائی اور دیگر مادی اجسام کی وہی حالت ہے جو ہماری مثال میں صندوق کے اندر کی چیزوں کی ہے۔ ایک وہ جن کے نام کا آخری حصہ اسکوپ (scope) ہوتا ہے دوسرے وہ جن کے نام کا آخری حصہ میٹر (meter) ہوتا ہے۔ میٹر کے آلات وہ ہوتے ہیں جن کی مدد سے مختلف چیزوں کا صحیح طور پر اندازہ کیا جاتا ہے۔ برعکس اس کے اسکوپ والے آلات صرف چیزوں کے باہمی تعلقات عام طور پر دکھانے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ میرے نزدیک اگر ان آلات کا ترجمہ "پیما" کی مدد سے کیا جائے تو نہایت موزون ہوگا مثلاً ایکٹر میٹر Electro-meter "برق پیما" ایکٹر اسکوپ Electro-scope "برق نا" وغیرہ ایک تیسری قسم کے آلات جو حال ہی میں مروج ہونے لگے ہیں جو درجہ و بغیر کسی بیرونی مدد کے اپنے شاہد لکھتے جاتے ہیں۔ ایسے آلات حوالہ دینے کے لیے نہایت مفید اور کارآمد ہیں۔ انکی صفت سیلف ریکارڈنگ ہے جسکا صحیح ترجمہ "خود نویس" ہو سکتا ہے۔ ایسے آلات بالعموم گراف graph — پر ختم ہوتے ہیں۔ مین تجویز پیش کرتا ہوں کہ انھیں "نوسین" کہا جائے۔ مثلاً تھرمو گراف Thermograph جو محکمہ آب و ہوا میں استعمال ہوتے ہیں "حرارت نویس" کہے جائیں۔ فقط۔

مین ۱۰۴۰ میل فی گھنٹہ ہوگی۔ بالفاظ دیگر ان کا اعتراض یہ تھا کہ زمین تو ۱۰۴۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آگے بڑھ چکی لیکن ہوا جو زمین کی حرکت میں کوئی حصہ نہیں لے رہی زمین کی اشیاء کے اوپر اسی رفتار کے ساتھ رگڑ کھاتی رہیگی۔ زمانہ حال میں تجاذب مادی کے مسئلہ کو سمجھ لینے کے بعد اس قسم کے جملہ اعتراضات خود بخود دفع ہو جاتے ہیں۔

۲۔ ہوا میں مدوجزر ہوائی جہاز رانی کا مسئلہ

زیادہ تر چاند کی کشش سے اور ایک تھوڑی حد تک سورج کی کشش سے سمندر میں دودفعہ مدوجزر ہوتا ہے۔ پانی کا جو حصہ چاند کے مقابل آتا ہے وہ چاند کی طرف کھینچ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندرگاہ میں ہر ۲۴ گھنٹہ میں سمندر کا پانی دودفعہ اونچا چڑھتا ہے اور دودفعہ معمول سے کم نیچے ہو جاتا ہے۔ جب سورج اور چاند کی کشش ایک ہی سمت میں اثر کرتی ہو تو بڑے جوار بھائے پیدا ہوتے ہیں اور جب ان کی کشش مخالف سمتوں میں اثر کرتی ہو تو معمول سے چھوٹے مدوجزر ہوتے ہیں۔ سطح زمین کے نزدیک ایک بہت موٹی ٹھوس تہ ہونے کا ایک بدیہی ثبوت یہ ہے کہ سمندر میں مدوجزر ہوتا ہے۔ اگر یہ تہ کم گہری ہو تو چونکہ پانی کے ساتھ نیچے سے سمندر کی تہ بھی اوپر کی طرف کھینچی آئے مدوجزر ایسے نمایاں نہ ہوں۔ قیاس کیا جاسکتا ہے کہ چاند اور سورج کی کشش سے کرہ ہوائی میں بھی سمندر کی طرح مدوجزر ہوتا ہوگا۔ بہت سے سائنس دان علمی طریقے پر ہوائی مدوجزر کی تحقیقات میں مصروف ہیں کیونکہ ہوائی مدوجزر نہ صرف علمی حیثیت سے دریافت طلب ہے بلکہ جبکہ ہوائی جہاز دن بدن زیادہ استعمال کیے جا رہے ہیں اسکی ضرورت اور زیادہ ہو گئی ہے کہ کرہ ہوائی میں مدوجزر کے یہ معنی ہیں کہ ہوائی جہاز رانوں کو ملاحی طرح ہوائی مدوجزر کے اوقات کا خیال رکھنا لازم ہوگا۔ ان چونکہ ہوائی سمندر یا سولے

جس طرح متحرک ہونے کے لیے صندوق اور اس کے اندر کی چیزیں ایک جسم کا حکم رکھتی ہیں اس طرح تجاذب مادی کی بدولت زمین کرہ ہوائی اور تمام مادی اجسام جو زمین کی کشش کے احاطہ اثر میں داخل ہیں زمین کی روزانہ اور سالانہ گردشوں میں ایک جسم رکھتے ہیں یہاں تک کہ ہمارا چاند جو زمین سے تقریباً ۲۴ لاکھ میل کے فاصلے پر ہے اسی طرح زمین کی مختلف حرکتوں میں حصہ لیتا ہے جو سطح ہم اور تم جو کہ سطح پر رہتے ہیں یا قصہ کہانیوں کا سمندر جو زمین کی اندرونی چٹانوں کے پتھروں کے اندر جاگزیں ہے۔ اگر بغرض محال ایک لمحہ کے لیے یہ مان لیا جائے کہ کرہ ہوائی زمین سے کم از کم اسکی روزانہ حرکت کے لحاظ سے علیحدہ ہے تو ایک عبارہ باز یا ہوا میں اڑنے والے جانور اگر صبح کو ہندستان کی زمین سے ہوا میں اڑنا شروع کرے تو تقریباً بارہ گھنٹہ کے بعد شام کے وقت وسطی امریکہ یعنی میکسیکو وغیرہ کی زمین پر اتر سکتا ہے !!!

متقدمین زمین کی روزانہ گردش کے قائل نہیں تھے۔ منجملہ دیگر غلط اعتراضات کے جو وہ روزانہ گردش کے خلاف پیش کرتے تھے ایک اعتراض اسی نوع کا تھا جس کے متعلق ہم ابھی بحث کر چکے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ اگر زمین ذرات میں ایک دفعہ گھومتی ہے تو جیسا اوپر ذکر کیا گیا ہے خط استوا اور اسکے قرب وجوار کے ممالک میں ہمیشہ اتنے زور کی آندھی چلنی چاہیے کہ درخت جڑ سے اٹھ جائیں اور مکانات مسمار ہو جائیں اس لیے کہ وہاں ہوا کی رفتار زمین کے مقابلے

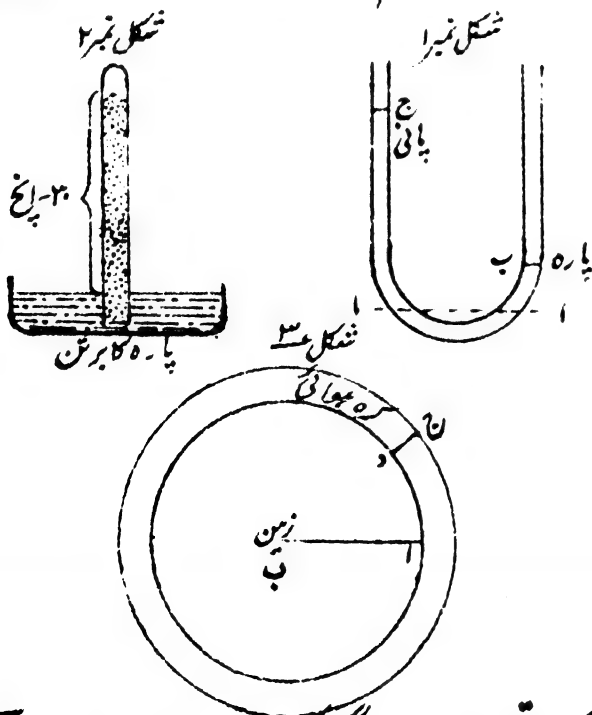
۱۔ تجاذب مادی سے مراد نیوٹن کا وہ عالمگیر قانون یعنی Law of Universal Gravitation ہے جس کے مطابق عالم

میں مادہ کا ہر ایک ذرہ باقی تمام مادی ذرات کو اپنے مرکز کی طرف کھینچتا ہے

باقی تین چوتھائی حصہ پانی کے سمندر دن سے گھرا ہوا ہو گیا سمندر کی وسعت سطح زمین کے مجموعی رقبہ کی تقریباً تین چوتھائی کے برابر ہو لیکن کرہ ہوائی کے متعلق یہ امر دلچسپی اور افادہ سے خالی نہیں کہ سطح زمین کا ایک چہرہ بھر حصہ تو ایک طرف ایک ذرہ بھی ایسا نہیں جسے کرہ ہوائی احاطہ نہ کیے ہوئے ہو اور جس کے ارد گرد ہوا کے سمندر کی لہریں ہر وقت جاری و ساری نہ ہوں۔ بالفاظ دیگر رقبہ کے لحاظ سے کرہ ہوائی سطح زمین کی وسعت کے بالکل برابر ہو اور ایسا ہونا عین ضروری ہو اسلئے کہ پانی کے بغیر انسان کچھ دن تک زندہ رہ سکتا ہو لیکن اگر ہوا ایک لمحہ نہ ملے تو جان بلب ہو جاتا ہو۔ زیست کے لیے ہوا سب سے پہلی ضرورت ہو ان اگر ہماری خلقت موجودہ ہے بالکل مختلف ہوتی تو غالباً صانع قدرت ہمیں اس قدر ہوا کا محتاج نہ بنا

۴۔ کرہ ہوائی کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے دس گنا کم ہو

یہ اندازہ آسانی کے ساتھ یوں لگایا جاسکتا ہو۔ اگر انگریزی حرف یوں کی شکل کی ایک شیشے کی ٹی لیجائے اور اس میں پانی یا پارہ یا اور کوئی ایک مائع جسم ڈال دیا جائے تو دونوں بازو زمین مائع کی



سطح ایک جتنی بلندی پر ہوگی لیکن ایک بازو میں پارہ اور دوسرے

صرف چند ایک رکا وٹوں کے جو بند پارہ دنی و بہ سے اس کی انگیر کیسانیت میں واقع ہوئی ہیں مدو جزر کے لیے وسط سمندر کا جہاں پانی کی سطح کا نشیب و فراز بندرگاہوں سے کہیں کم ہوتا ہو حکم کرتا ہو اور دوسرے ہوا پانی سے کئی سو گنا ہلکی ہو کرہ ہوائی میں مزید کی وہ شدت نہیں ہوتی جوتنگ بندرگاہوں میں ہوتی ہو یہی وجہ ہو کہ آج تک اس صیفہ علم کی طرف کچھ زیادہ توجہ نہیں لکئی اور مقیاس لہوا میں پارے کے اوپر نیچے ہونیسے ہوائی مدو جزر کا پتہ نہیں لگ سکتا جب تک زیادہ نازک طریقہ اختیار نہ کیے جائیں گے یہ مسائل ایک بڑی حد تک علمی حیثیت سے راز سر بستہ رہیں گے۔

۳۔ ہوا کے اعلیٰ طبقات کی پچھلانات

کرہ ہوائی کے متعلق جدید ترین معلومات اس کے طبقات اعلیٰ کے حالات کی مفصل دریافت ہو عبارتہ کے ذریعے سے آدمی زیادہ سے زیادہ پانچ میل کی بلندی تک جاسکتا ہو۔ دنیامین سب سے اونچا پہاڑ بھی تقریباً پانچ میل بلند ہو لیکن ان پانچ میلوں کی بلندی کا حال بھی ان طریقوں سے وسیع طور پر فی الحال معلوم نہیں ہو ان حال ہی میں ایک نیا طریقہ ایجاد ہوا جو جس سے ۱۰ میل کی بلندی تک کے حالات معلوم کیے گئے ہیں۔ اس سے پیشتر کہ ہم ان دلچسپ معلومات کا مفصل ذکر کریں ہم موازنہ کی خاطر کرہ آبی اور کرہ ہوائی کا مختصر مقابلہ کرتے ہیں۔

جس طرح مچھلیاں اور دوسرے آبی جانور پانی کے سمندر میں رہتے ہیں اسی طرح انسان اور خشکی پر رہنے والے حیوانات ہوا کے ایک سمندر میں رہتے ہیں جو پانی کے سمندر سے کیا لحاظ وسعت اور کیا لحاظ گہرائی کے ہر طرح سے بڑا ہو۔ سطح زمین کا صرف ایک چوتھائی حصہ خشک ہو جو عرف عام میں ربع مسکون کے غلط نام سے مشہور ہو۔

مین پانی ڈالا جائے تو پانی کی سطح ج کی بندی خط مستقیم ۱-۱۰۰ سے اوپر پارہ کی سطح ب کی بندی خط ۱-۱۰۰ سے اوپر کی نسبت تقریباً ۳۰ گنا زیادہ ہوگی اسلئے کہ پارہ پانی سے ۳۰ گنا زیادہ بھاری ہو۔ دوسری شکل مین ایک شیشہ کی نلی پارہ سے بھر کر پارہ کے برتن مین الٹی کھڑی کی گئی ہو نلی مین پارہ برتن کے پارہ کی سطح سے ۳۰ انچ اونچا کھڑا ہوتا ہو۔ یو شکل کی نلی والے تجربوں سے فائدہ حاصل کر کے آپ کہہ سکتے ہیں کہ بیان بھی ایک ٹیگل کی نلی ہو جسکا ایک بازو دکھائی نہیں دے رہا اس لیے کہ اس مین ہوا بھری ہو اور دوسرے بازو مین پارہ بھرا ہو گویا ۳۰ انچ لمبی پارہ کی نلی ہوا کی ایک غیر مٹی لمبی نلی کے وزن کی وجہ سے پارہ کی بیرونی سطح سے (جس پر ہوا کے وزن کا دباؤ اثر کر رہا ہو) اوپر کھڑی ہو بعینہ اسی طرح سطح شکل ازل مین پانی کی ایک ۳۰ گنا لمبی نلی پارہ کی ایک چھوٹی نلی کو سہارا دینے ہوئے ہو۔ ان تجارب کی بنا پر ہم فوراً کرہ ہوائی کی بندی کا اندازہ لگا سکتے ہیں بشرطیکہ کرہ ہوائی نیچے سے اوپر تک ایک جتنا کثیف ہو۔ اس شرط کو صحیح مان کر کیسان کثافت کی ہوا کے کرہ کی بندی چونکہ پارہ ہوتے دس ہزار گنا بھاری ہو ۳۰۰۰۰ + ۳۰۰۰۰ یعنی تقریباً پانچ میل نکلتی ہو لیکن چونکہ ہوا جون جون ہم اوپر چڑھتے ہیں لطیف ہوتی جاتی ہو کرہ ہوائی کی اصلی بندی کا اندازہ تمام ان باتوں کا لحاظ کر کے تقریباً پینتالیس میل لگایا گیا ہو۔ اس علم کے ساتھ ہم کرہ ہوائی کے وزن کا تناسب زمین کے وزن کے ساتھ تیسری شکل لی مدد سے معلوم کر سکتے ہیں۔ زمین کی کثافت اضافی پانی کے مقابلے مین ۵ ہو بالفاظ دیگر اگر زمین کا حجم رکھنے والے پانی کے نیچے کو اکٹھے کئے جائیں تو ان کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے کچھ کم ہوگا اب اگر آپ ایک کعب فٹ پانی کا وزن جانتے ہیں زمین کا وزن ان اعداد سے آسانی سے مل سکتا ہو۔ زمین کا حجم

$\frac{4}{3} \times \frac{22}{7} \times (۴۰۰۰)^۳$ کعب میل ہو۔ کرہ ہوائی کا وزن دریافت کرنے کے لیے ہم مقیاس ہوا کی نلی (شکل دوئم) کو پھر استعمال کریں گے۔ ہوا کرہ ہوائی کی بندی بالکل صحیح طور پر معلوم نہیں ہو لیکن یہ معلوم ہو کہ تمام کرہ ہوائی کا بوجھ پارہ کی ۳۰ انچ گہری تہ کے بوجھ کے برابر ہو۔ شکل ۳ مین آپ یوں سمجھیں کہ بجائے زمین کے گرد ۴۵ میل گہری ہوا کی ایک تہ ہونے کے پارہ کی ایک ۳۰ انچ گہری تہ ہو جس کا حجم تقریباً $\frac{4}{3} \times \frac{22}{7} \times (۴۰۰۰)^۳$ کعب میل ہو۔ پارہ پانی سے ۳۰ گنا زیادہ بھاری ہو اور زمین پانی سے ۵ گنا بھاری ہو اس لیے کرہ ہوائی کے وزن کو زمین کے وزن سے وہی نسبت ہو جو ۳۰ + ۲۲ × (۴۰۰۰) + ۲۲ + ۲ کو ۲۲ + ۲ (۴۰۰۰) + ۲ سے ہو یا ایک کو دس لاکھ سے۔ المختصر کرہ ہوائی کا مجموعی وزن زمین کے وزن سے دس لاکھ گنا کم ہو۔

۵۔ ہوا کا دباؤ

بہت سے حضرات متعجب ہوں گے کہ اگر فی الواقع ہوا کا اتنا بوجھ ہو اور ہم ہوا کے بوجھ کے نیچے ہیں تو پھر کیوں ہم اس دباؤ کو محسوس نہیں کرتے۔ بات اصل مین یہ ہو کہ ہوا کا دباؤ ہمارے اندر باہر ہمارے بدن مین مساوات وغیرہ کی جیسے دونوں طرف برابر ہو اور اس لیے اس کا مجموعی اثر ہمارے بدن کے اوپر صفر محض یعنی کالعدم ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو چونکہ فی مربع انچ ہوا کا دباؤ تقریباً ۱۰ سیر ہوا درجہ مین ہمارے جسم کی بیرونی سطح کا رقبہ ۶۵ ہزار مربع انچ ہوتا ہو ہمارے جسم پر کچھ کم سوا چالیس ہزار سیر یا دس ہزار پانچ سو من کے دباؤ سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ لیکن تعجب ہوتا ہو کہ کس عمدگی کے ساتھ ہم ہوا کے حیرت انگیز دباؤ سے بالکل بے خبر ہیں اور اسے کبھی محسوس تک نہیں کرتے۔ (پانی چونکہ ہوا سے تقریباً ساڑھے آٹھ سو گنا بھاری ہو اگر ہم پانی کی سطح سے ۳۲ فٹ نیچے جائیں تو ہمارے جسم پر اتنا ہی دباؤ

پڑتا ہے جتنا کہ کرہ ہوائی کے بوجھ سے پڑ سکتا ہے۔ اب آپ خیال فرمائیے کہ اُن آبی جانوروں کی ہڈیاں اور تمام جوارح کس قدر مضبوط ہوتے ہونگے جو سطح سمندر سے ہزاروں فٹ نیچے نشوونما پاتے ہیں!! اگر ایک شیے کے برتن میں مخرج الہوا کی مدد سے ہوا کا اکثر حصہ خارج کر دیا جائے اور شیشہ کافی مضبوط نہ ہو تو ہوا کے دباؤ کا اثر برتن کے ٹوٹ جانے سے آسانی کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ اگر ہمارے جسم بھی شیشہ کی طرح غیر سدا بہ ہوتے اور ان کے آ رہا ہوا نہ گذر سکتی تو نہایت سختی کے ساتھ جکھو ہوا کے دباؤ کا یقینی احساس ہوتا۔ لیکن چونکہ ہوا ہمارے جسم کے اندر باہر آسانی سے گذرتی ہے اس لیے نتیجہ ہمارے حق میں حد درجہ مفید ہے۔

۱-۶ اسٹریٹوسفیر یا کرہ زمہری

کرہ ہوائی کے متعلق ایک دلچسپ امر جو متعدد اور مختلف تجارت اور مشاہدات کی بنا پر معلوم ہوا ہے یہ ہے کہ تقریباً چھ میل کی بلندی تک ہوا کا درجہ حرارت تین سو فٹ کی بلندی کے لیے ایک درجہ فارن ہیت کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ لیکن چھ میل کی بلندی سے اوپر ۱۵ درجہ حرارت کی پیمائش کے لیے یورپ میں اور دوسرے ممالک میں جان یورپ کے علوم مروج ہیں برف اور بھاپ کی درجہ حرارت کے درمیانی وقفہ مختلف پیمانوں کے مطابق تقسیم کیا جاتا ہے۔ فارن ہیت کا پیمانہ ان میں سے ایک ہے۔ اسکے مطابق جتنے ہوئے پانی یا برف کا درجہ حرارت ۳۲ کہلاتا ہے اور کھولتے ہوئے پانی کی بھاپ کا درجہ حرارت ۲۱۲۔ ہٹ سے کم درجہ حرارت کی پیمائش اسی حساب کے مطابق ہوتی ہے مثلاً ایک جسم کا درجہ حرارت جو برف سے اتنا ہی زیادہ ٹھنڈا ہو جتنا کہ بھاپ بمقابلہ برف گرم ہو فارن ہیت کے پیمانے کے مطابق ۲۲-۱۰۰ یعنی منفی ۱۰۰ (منفی ستر و نصف کے نیچے ہے) ہو گا سنٹی گریڈ پیمانے پر برف اور بھاپ کی درجہ حرارت کا وقفہ سو درجہ یعنی ۱۰۰ درجہ اور یومر میں اسی حصہ پر برف کا درجہ حرارت ایک مین صفر سنٹی گریڈ اور دوسری مین صفر کہلاتا ہے بھاپ کا درجہ ایک مین سنٹی گریڈ اور دوسری مین ۱۰۰ کہلاتا ہے

درجہ حرارت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی یہاں تک کہ ۸ میل کی بلندی تک ایک ہی درجہ حرارت ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے کرہ ہوائی دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے ایک تو وہ حصہ جو سطح سے لگا ہوا تقریباً چھ میل کی بلندی تک اور پڑ جاتا ہے اور جس میں ہوا کا درجہ حرارت بلندی کے ساتھ کم ہو جاتا ہے اور فی میل ۱۸ درجہ فارن ہیت کم ہوتے ہیں انتہائی حد پر صفر سے تقریباً پچاس درجہ فارن ہیت نیچے یعنی منفی ۵۰ فارن ہیت ہو جاتا ہے۔ اس حصہ کو کرہ حرارت (ٹراپو سفیر Troposphere) کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ دوسرے حصہ کو اسٹریٹوسفیر (Stratosphere) کہتے ہیں ہم اسکو کسی خاص صحیح نام سے اردو میں تعبیر نہیں کر سکتے سہولت کے لیے میں نے جلدی سے اسکے لیے کرہ زمہری استعمال کر لیا ہے۔ ہوا کے اس اعلیٰ طبقہ کا عجیب خاصہ یہ ہے کہ اس میں درجہ حرارت میلون تک یکساں رہتا ہے۔ شروع میں خیال کیا گیا تھا کہ اس طبقہ کا درجہ حرارت بدلتا نہیں ہوا اور اسے طبقہ مساوی حرارت کہتے تھے لیکن بعد کے تجارب ثابت کر دیا ہے کہ سطح زمین پر مختلف مقامات کے اوپر یہ طبقہ مختلف مختلف بلندیوں پر شروع ہوتا ہے بلکہ اسکا اصلی درجہ حرارت بھی مختلف ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ایک ہی مقام کے اصلی درجہ حرارت میں تبدیلی واقع ہوتی رہتی ہے لیکن ان تمام اختلافات کے باوجود ایک امر جسکی وجہ سے یہ اعلیٰ طبقہ طبقہ اسفل سے ممتاز ہے یہ ہے کہ جہاں سے شروع ہوتا ہے اس کے پرے اوپر کی طرف پھر کوئی تبدیلی درجہ حرارت میں واقع نہیں ہوتی۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ ہوا کے اس اعلیٰ طبقہ اسٹریٹوسفیر کا مطالعہ کن ذرائع سے کیا گیا ہے۔ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ ہارٹون کی مدد سے یا انسانی غباروں کی مدد سے ہم زیادہ سے زیادہ بصدد مشکل ۵ میل سے کم تک کی بلندی پہنچ سکتے ہیں۔ ہوا کے اعلیٰ طبقے

کا مطالعہ زمانہ حال سے شروع ہوتا ہے۔ مسیح عیسوی میں ایک منظر علم دوست یورپ کا بنیا گلیشر (Gleisher) اس امر کے درپے ہوا اور ایک ہبادانہ کوشش کے بعد ۲۹ ہزار فٹ کی انتہائی بلندی تک ہوا کی سیر کر آیا۔ بیسوی صدی کے شروع تک اس کے بعد پھر کوئی کوشش ہوا کہ مطالعہ کی زمین کی گئی لیکن گذشتہ دس بارہ سالوں میں اپنے آپ کام کرنے والے آلات کی تکمیل کی وجہ سے یہ کام از سر نو نہایت زور و نوا کے ساتھ شروع ہو۔

سب سے زیادہ مفید چیز اس ضمن میں آزمائشی عبارہ (سوئنگ بلون یعنی Sounding Balloon) ہے جو کہ نہایت عمدہ تیلے ربر کا بنا ہوا ہوتا ہے اور ہائیڈروجن گیس سے بھرا جاتا ہے۔ صعود سے پہلے اس کا قطر تقریباً ایک گز ہوتا ہے۔ چون جوں عبارہ اوپر چڑھتا ہے ہوا کے بیرونی دباؤ کے کم ہونے سے عبارہ کے اندر کی ہائیڈروجن گیس پھیلتی جاتی ہے حتیٰ کہ ایک خاص حد تک پھیلنے کے بعد عبارہ پھٹ جاتا ہے اور نیچے گر پڑتا ہے۔ عبارہ کے اندر عام طور پر کم از کم دو آلات ہوتے ہیں یعنی ایک درجہ حرارت نوٹس جو خود بخود درجہ حرارت کی پیمائش کرتا ہے اور ایک کاغذ کے لمبے ٹکڑے پر ہر لمحہ ایک یادداشت لکھتا جاتا ہے اسے انگریزی اصطلاح میں تھرموگراف (Thermograph) کہتے ہیں، دوسرا ہوا کے دباؤ کی پیمائش کے لیے ہوتا ہے اور پہلے کی طرح یہ بھی اپنا کام خود بخود کرتا ہے اور ایک کاغذ کے لمبے ٹکڑے پر یادداشت لکھتا ہے اسے نقل نوٹس (Barograph) کہتے ہیں ان دونوں آلات کے مختصر مجموعہ کا نام میٹیروگراف (Metereograph) ہے۔ کمال یہ ہے کہ میٹیروگراف کا مجموعی وزن ایک چٹان تک کم ہوتا ہے اور اسی لیے پن کیوجہ سے عبارہ مع آلات دس بارہ پندرہ بلکہ بعض اوقات ۱۸ میل کی بلندی تک اوپر چڑھ جاتا ہے۔ عبارہ کے اندر آلات کے ساتھ ایک انعامی اشتہار ہوتا جس میں اپنے والے کے لیے عبارہ اور

آلات کو حفاظت سے بند کر کے مالک کے پاس واپس بھیجنے کے لیے مفصل ہدایات درج ہوتی ہیں۔ اس ترکیب سے بہتے عبارے اپنے فرض کی تکمیل کے بعد اپنے مالک کے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ نہ صرف خشکی پر بلکہ سمندر میں بھی عبارہ کے ضائع ہونے کا کم امکان ہے کیونکہ یورپ جہاں یہ سب علمی چرچے ہیں ان کی ہوا میں بھی علم کی لہریں سرایت کر گئی ہیں اور ہر پیر و جوان علمی شغل کی اعانت میں سرگرم ہے۔

اسٹریٹوسفیر یعنی ہمارے کرہ زمہر کے متعلق ایک دلچسپ اور دلچسپ طلب مرید ہے جو کہ سطح زمین کے اوپر مختلف مقامات پر کرہ حرارت (ٹراپوسفیر Troposphere) اور کرہ زمہر میں حد فاصل کی بلندی کیا ہے اور وہاں درجہ حرارت کیا ہے بلکہ جو دو فاصل ایک دوسرے سے بدیہی طور پر ممتاز ہوتی ہیں گو بعض حالات میں یہ بھی پایا گیا ہے کہ درجہ حرارت میلون تک بہت آہستہ آہستہ کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ انگلستان کے اوپر کرہ زمہر کی بلندی تقریباً ۵۰ میل کی بلندی پر شروع ہوتی ہے اور اس کا درجہ حرارت تقریباً منفی ۲۵ فارن ہیت ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں پر مشاہدات کا موازنہ کر کے معلوم ہوتا ہے کہ کرہ زمہر کی بلندی خط استوا کے اوپر سب جگہوں سے زیادہ قطبین کے اوپر سب جگہوں سے کم ہے۔ جتنی زیادہ بلندی ہوتی ہے درجہ حرارت اتنا ہی کم ہوتا ہے۔ لہذا اگر کرہ حرارت کسی مقام کے اوپر زیادہ بلندی ختم ہوتا ہے تو وہاں کرہ زمہر کا درجہ حرارت بہت کم ہوتا ہے۔ ان امور کے انطباق سے یہ حیرت افزا نتیجہ نکلتا ہے کہ سب سے زیادہ سردی ہوا کے اعلیٰ طبقات میں خط کے استوا کے اوپر ہے نہ کہ قطبین کے اوپر۔ وسط افریقہ میں ایک صعود معلوم ہوا کہ کرہ زمہر کا درجہ حرارت جھیل کٹوریا نینسرا کے اوپر منفی ۱۱۹ درجہ فارنہیت یعنی پانی کے درجہ حرارت انجمادی سے ڈیڑھ سو درجہ نیچے مصنوعی طریقے سے اس سے کم درجہ کی سردی حاصل کرنا ممکن ہے لیکن غالباً قدرت میں یہ سب سے کم درجہ کی سردی ہوگی۔

لارڈ کیلون

سر ولیم ٹامسن، جو اپنی عمر کے اخیر حصہ میں لارڈ کیلون کے نام سے مشہور ہوئے، انیسویں اور بیسویں صدی کے نہایت مشہور و معروف عالم طبیعیات و ریاضیات تھے۔ اپنی کوششوں سے انھوں نے قابل قدر اضافہ علمی اکتشافات میں کیا ہے وہ کسی اور عالم کو نصیب نہیں ہوا۔ برقیات کے متعلق انھوں نے کئی بیش قیمت امور معلوم کیے اور اس کے متعلق بہت سی مفید اختراعات بھی کیں جن کی وجہ سے انکا نام سائنس کی دنیا میں ہمیشہ چمکتا رہیگا۔ علماء و محققین کے دنیا آپ کا قول ناظر سمجھا جاتا ہے۔ کئی عمدہ کتابیں بھی انھوں نے تصنیف فرمائی ہیں جو یونیورسٹیوں کے سائنسی نصاب میں داخل ہیں۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ لڑکپن میں جو اثر نیچے پر پڑتا ہے وہ عمر بھر قائم رہتا ہے۔ لارڈ کیلون ہر فن مولا اور گرامی قدر عالم تھے۔ اسنے طبعا دل میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے اثرات اور صحبتیں تھیں جن سے لارڈ موصوف کے دل و دماغ پر اسقدر مستقل اور انقلاب خیز اثر پیدا ہوا۔

لارڈ کیلون کے والد پروفیسر ٹامسن آئر لینڈ کے بننے والے تھے انھوں نے گلاسگو یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ اسنے قدیم (لاطینی و یونانی) ریاضیات اور نیچرل فلاسفی (علم طبعی) میں انعامات حاصل کیے۔ ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد الہیات اور طبیعیات کے لیکچرر و نمین بھی شریک ہوتے رہے۔ ۱۸۳۷ء میں وہ بلفاسٹ اور آئر لینڈ کے شاہی دارالعلوم میں اور چند سال بعد گلاسگو یونیورسٹی میں ریاضیات کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ ۱۸۴۱ء میں انھوں نے "علم الحساب" پر ایک کتاب تصنیف کی تھی جو نہایت مستند اور ایک علمی پایہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب اسقدر مقبول ہوئی کہ ساٹھ سال کے عرصے میں شرمزہ طبع ہوئی۔ یہ کتاب پروفیسر جیمس ٹامسن کی وسیع ریاضی دانی اور عالمانہ

طریقہ تعلیم کا زندہ ثبوت ہے جب وہ بلفاسٹ میں پروفیسر تھے تو علم ہندسہ، جغرافیہ، فلکیات اور کیل کلس (Calculus) یعنی اعلیٰ ریاضی پر بھی کتابیں تصنیف کی تھیں۔ آپکا بڑا بیٹا بھی علمی مسائل پر بحث کرنے لگا، اور اس نے بھی ریاضیات میں خاص دستگاہ بہم پہنچائی۔

اس سے صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ سر ولیم ٹامسن کی زندگی کا ابتدائی حصہ کس قسم کے خیالات اور اسباب میں صرف ہوا کہ انکی طبیعت پر ایسی تاثیر ہوئی کہ شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں دقیق جگہ کا استحقاق حاصل کیا۔

سر ولیم ٹامسن ۲۷- جون ۱۸۲۴ء کو شہر بلفاسٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ اپنے والد کے دوسرے بیٹے تھے جب ان کے والد گلاسگو یونیورسٹی میں پروفیسر مقرر ہوئے، اسوقت ان کی عمر آٹھ سال کی تھی۔ دو سال بعد سارا خاندان ایک حیرت انگیز ہو گیا۔ وہ ان کے فطری مناظر بہت دلفریب اور دلکش تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچوں کے دل پر کوہستانی مناظر کا بہت گہرا اثر ہوا۔ انھیں قدرتی مناظر کے باعث ان کا اشتیاق تجسس بہت چست ہو گیا۔ ہزار ہا قسم کے نئے پودے اور جاندار ایسے تھے جنہیں بچے بڑے شوق سے دیکھتے اور ان کے متعلق مختلف سوال کرتے تھے۔ پروفیسر جیمس ٹامسن کو ناگون علمی مذاق اور قافیہ علمی و دانش کے آدمی تھے، اسلیئے وہ ارضی تحقیقات میں مصروف ہو گئے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ولیم ٹامسن نے طبیعیات اور ارضیات کو کیوں اپنے خاص علوم تسلیم کر دیا، اور انھیں کی تحقیقات اور ترقی میں عمر بسر کر دی۔

دس برس کی عمر میں ولیم ٹامسن نے گلاسگو یونیورسٹی سے

امٹرنس پاس کیا۔ دونوں بھائی ایک ہی جماعت میں تھے، مگر ولیم ہمیشہ اول رہتا تھا۔ اس زمانے میں چھوٹے بھائی نے اپنی تیز فہمی اور غیر معمولی ذہانت اور وسعتِ علم کے باعث اپنے ہم سبقوں کے درمیان خاص نام پیدا کر لیا تھا۔ اُس زمانے میں امتحان کے اچھے نتائج پر بہت کم انعام ملتا تھا۔ مگر جماعت کے دوسرے لڑکوں نے ولیم کو کثرتِ رائے سے انعام کا حقدار قرار دے رکھا تھا۔ جو لڑکے ریاضیات اور علمِ طبیعی میں ڈگری حاصل کرنے کے خواہشمند تھے، اُن کے نصائح میں ہندسہ میں اپوٹومس اور لاگرانج کی معرکہ آرا تصانیف، علمِ طبیعی میں نیوٹن کے ”اصولِ اولیہ“ اور لاپ لیس کی ”ترکیبِ ام فلکی“ کتب شامل تھیں۔

۱۸۳۹ء میں ولیم نے ایک خاص مضمون ”کرہ ارض کی حالت زمانہ آئندہ میں کیا ہوگی؟“ کے عنوان پر لکھ کر یونیورسٹی سے انعام حاصل کیا۔ ایک پندرہ سال کے لڑکے کے لیے یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ ولیم نے السنہ قدیم اور منطق میں بھی انعامات حاصل کیے اور بڑے بڑے ذہین لڑکوں کو مات دی۔

۱۸۴۰ء میں ولیم اپنے والد اور بھائی بہنوں کے ساتھ جرمنی گیا۔ وہاں پہلی مرتبہ اُس نے جرمن عالم فزیر کی شہرہ آفاق کتاب ”انتشارِ حرارت“ پڑھی۔ اس کے مطالعہ سے اُس کے دل پر بہت گہرا اثر ہوا، اور وہ استخراجِ نتائج اور ریاضی طریقہ استدلال کی خوبی کا قائل ہو گیا، اور تمام عمر اسی عالم کے اصول و طریقہ سے ہدایت پذیر ہوا۔ وہاں سے آکر گلاسگو گیا، اور ایک مضمون فزیر کے خیالات کی تائید میں لکھا اور جن لوگوں نے اُس کے نظریہ پر حملہ کیا تھا اُنکی بھی ساتھ ساتھ تردید کی۔ دوسرا مضمون ولیم نے خلا میں گرم جسم کے سرد ہونے کے مسئلہ پر لکھا، اُس کے تھوڑے عرصے کے بعد اُس نے ایک نادر مضمون ”حرارت اور برق کے بعض مسائل کی مساوات“

پر لکھا، جس کے باعث علمی حلقوں میں ولیم کا نام نہایت عزت سے لیا جانے لگا۔ پروفیسر جسٹس ٹامسن نے خیال کیا کہ کچھ عرصے بعد گلاسگو یونیورسٹی میں نیچرل فلاسفی کی پروفیسری خالی ہوگی، اور نیز وہاں ایک اور شخص کا لڑکا کیمبرج سے ریاضیات کا اعلیٰ امتحان پاس کر کے آیا تھا لہذا انھوں نے ولیم کو اس پرائی تعلیم گاہ میں ریاضی کی اعلیٰ سند کے لیے بھیجا۔ ۱۸۴۱ء میں ولیم کیمبرج کو گیا۔ اس وقت اس کے محلوں ریاضی اور طبیعی اسقدر اعلیٰ اور وسیع تھے کہ وہ دیگر استادوں کی تصانیف پر نہایت بے تکلفی کے ساتھ تنقید کر سکتا تھا۔ وہاں جا کر اُس نے بہت نیکنامی اور ہر دلعزیزی حاصل کر لی جب ریاضی کے امتحان کا وقت قریب آیا تو اُسے سجد تشویش ہوئی کہ اگر درجہ اول میں پاس نہ ہوا تو باپ کو بہت رنج ہوگا نیز امتحان ہوا، اور جب نتیجہ شائع ہوا تو ولیم دوسرے نمبر پر آیا اس سے اُس کے باپ کو بہت صدمہ ہوا، اسکے بعد اُس کا انعامی امتحان ہوا۔ اس میں ایک سوال حرکتِ قیق کششِ اجسام اور پٹریج کی طبعی تمثیل پر بھی تھا۔ ولیم ٹامسن اس امتحان میں اول نکلا اور انعام کا مستحق ہوا۔ چونکہ یہ انعام ہر طالبِ علم حاصل نہیں کر سکتا تھا، اس لیے اسکو باعثِ امتیاز و فخر سمجھا جاتا تھا۔

۱۸۴۵ء کے شروع میں ولیم ٹامسن نے مشہور زمانہ محقق برقیات مائکل فیڈی سے ملاقات کی اُس نے انھیں کیمج کا ایک ٹکڑا تحفہ دیا تھا جسے زندگی بھر ولیم ایک قیمتی چیز سمجھتا رہا۔ موسمِ گرما میں وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ پیرس گیا اور وہاں مشہور فرینچ محقق طبعیات رگنٹال کی زیر نگرانی اُس کے کیمیا خانہ میں طبعیات کا مطالعہ کیا اور اس نامی استاد کے طریقہ تحقیقات کو خوب دیکھا بھالا۔ یورپ میں یہ قاعدہ ہو کہ آسودہ حال لوگ اپنے لڑکوں کی تکمیلِ تعلیم کے لیے ڈگری کا امتحان ختم کرتے ہی انھیں مالکِ غیر کی سیاحت کے لیے بھیج دیتے ہیں، جن سے اُنکا شاہد

کر رہے تھے۔

۱۸۹۹ء میں آپ نے بوجہ کمین سالی اس آسامی سے قطع تعلق کر لیا۔

آپ نے ریاضیات اور عملی طبیعیات کے تمام شعبوں میں تحقیقات کی

اور کئی باتیں ایسی معلوم کیں جن سے علماءِ نادان واقف تھے۔ علمِ حرارت

میں ایک نیا نظریہ قائم کیا اور اسے توسیع دی۔ یہ نظریہ اصولِ تھرمو

ڈائنامیکل (Thermodynamical) کا حامی ہے۔ اس سے

یہ مراد ہے کہ حرارت قوت میں منتقل ہو سکتی ہے۔ اس کے متعلق آپ نے ایک

ایسا طریقہ وضع کیا ہے جس سے درجہ حرارت و برودت ایسی صحیح

معلوم ہو سکتا ہے کہ اس میں کسی غلطی کا امکان نہیں ہو سکتا۔ طبیعیات

میں آپ نے ایک نیا اصول "انتشار قوت" یعنی Dissipation

of Energy قائم کیا تھا۔ یہ اصول سائنس میں

بہت وسیع اہمیت رکھتا ہے اور اس کا اطلاق بھی نہایت شاندار

اور فلسفیانہ بن گیا ہے۔ اس کا ذکر ہم لارڈ کیلون ہی کے الفاظ میں

کرتے ہیں۔

عالمِ موجودات میں یہ ایک عالمگیر میلان ہے کہ قوت جیٹکنگہ خارج ہو کر

پھیلتی رہتی ہے۔ یہ قوت جتنی خارج ہوتی ہے بے جان مائیاں کے فطری عمل

سے بحال نہیں ہوتی، اور نہ ذرّوں کے اجتماع سے اس کی کمی پوری ہوتی ہے۔

خواہ وہ باقی زندگی کے عمل سے ہوں یا جاندار کی قوتِ ارادہ کے تابع

ہوں۔ ایک زمانہ تھا جب کہ ارض جانداروں کی ہستی کے ناقابل

تھا۔ اور کچھ عرصہ بعد وہ پھر ان کے رہنے سہنے کے قابل نہ رہیگا۔ ان

البتہ اگر موجودہ فطری قوانین کے عمل میں کچھ تغیر واقع ہو جائے تو دوسری

بات ہے۔

یہ خیال آپ نے اپنے ایک مضمون میں ظاہر کیا تھا جس کا عنوان "نشأ

قوت کا عالمگیر میلان" تھا۔ اس خیال کو اس طرح سے واضح کیا جاتا ہے کہ

آفتاب سے دس لاکھ اکیاون حرارت خارج ہوتی ہے اور اس میں سے

اور تجربہ وسیع ہوتا ہے۔ اسی مقصد سے ولیم ٹامسن کو فرانس وغیرہ بچا

گیا تھا کہ اس کی تعلیم درجہ کمال تک پہنچ جائے۔ چنانچہ رگنال کاکیلیا خانہ

اور اسکے طریقہ تحقیق کے مشاہدے سے بہت فائدہ حاصل ہوا۔

۱۸۹۷ء میں گلاسگو یونیورسٹی کے پروفیسر علمِ طبیعی کا انتقال ہوا

اور اتفاقاً اس سے ولیم ٹامسن اس کا جانشین منتخب ہوا۔ یہ انتخاب

صرف اس کے لیے بلکہ اس کے رشتہ داروں اور دوستوں کے لیے بھی ایچہ

خوشی کا موجب ہوا۔ ۱۸۹۹ء میں گلاسگو میں ہیضہ نمودار ہوا۔

جب میں اس کا باپ ہمیں ٹامسن مر گیا اور اس کی جگہ پر کر نیکے لیے بیکن

برن نامی اس کا ایک دوست ریاضی کا پروفیسر منتخب ہوا اس کا ٹیڈ

میں یہ عام دستور ہے کہ یونیورسٹی کے پروفیسر اور ڈاکٹر وغیرہ انتخاب

سے مقرر ہوتے ہیں۔ انگلستان کی یونیورسٹیوں میں یہ دستور نہیں ہے۔

ولیم ٹامسن نصف صدی تک یونیورسٹی نہ کو رہیں علمِ طبیعی کے

پروفیسر رہے اور وہ بین علمی دنیا کی کائنات میں اپنی انشراحات سے

بیش قرار خاذا کیا۔

۳۔ نومبر ۱۸۹۷ء کو پروفیسر ٹامسن نے "نیچرل فاسفی پر پاپائیز

دیا۔ اسے آپ نے بہت ہوشیاری سے مرتب کیا تھا۔ اگرچہ سالم لیکچر لکھا ہوا

تھا مگر جماعت کے سامنے جاتے ہی وہ گھبرائے گئے اور جلدی جلدی

لیکچر پڑھ ڈالا۔ رفتہ رفتہ بولنے کی عادت ہوئی گئی اور چھجک بھی

جاتی رہی اور تب اپنے مطلب کو رکھ کون کے ذہن نشین کرنے میں

کامیاب ہوتے رہے جب صبح کو جماعت میں جاتے تو سب سے

پہلے دعا مانگتے، اور پھر اپنا لیکچر شروع کرتے۔ پہلے اصول بیان کرتے

پھر آلاتِ طبیعی کے ذریعے سے تجربے دکھاتے۔ بعض دفعہ دورانِ لیکچر میں

کوئی نیا مسئلہ دریافت کر لیتے جس کے انکشاف میں وہ کئی دن

سے مصروف تھے کبھی لیکچر دیتے وقت جھٹک کر کہیں سے کہیں چلے

جاتے اور اس مسئلہ کا تذکرہ پھر دیتے جس پر وہ کچھ دیر پہلے غور و فکر

صرف ۲۲۰ اکیان سیاروں میں آتی ہے، باقی خلا میں پھیل کر ضائع ہو جاتی ہے اور حرارت قوت قرار دی جاتی ہے کسی زمانے میں آفتاب اس قوت سے محروم ہو جائے گا۔

لارڈ کیلون نے طبیعیات کی تحقیقات میں ریاضی طریقہ استدلال اور اصول سے کام لیکر جدت طبع کا ثبوت دیا۔ ایتھر کی ماہیت اور اکن اجسام سے متعلق مسائل بھی اسی سے حل کئے اور ذروں کی صفات کی توجیہ کرتے ہوئے ان سے گردانی حرکت بھی اسی قاعدے سے منسوب کی ہے۔ مگر اپنے برقی اور مقناطیس کے متعلق سب سے زیادہ کام کیا ہے۔ بحری تار برقی اور برقی کو قوت میں لکھ کر قرار دیکر صنعت و تجارت پر بڑا احسان کیا ہے۔ انگلستان اور امریکہ کے درمیان بحری تار برقی کا سلسلہ قائم کرنے میں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی وہ آپ ہی کی مساعی حسہ اور برقی دریافتوں کی وجہ سے ہوئی ہے۔ ۱۸۵۸ء اور ۱۸۵۹ء کے درمیان بحر اطلانتک اور دیگر سمندروں کے دار پار جو بحری سلسلہ تار برقی قائم ہوا ہے وہ آپ ہی کے برقی اصولوں کی عملی صورت ہے۔ برقی کے متعلق آپ نے کئی نازک اور باریک آلات وضع کیے جن سے انجنیئر و کو بہت فائدہ پہنچا۔

لارڈ کیلون کو فن جازرانی کا بھی شوق تھا۔ اسکے متعلق آپ نے ایک قطب نما جازرانی کی ہدایت کے لیے بنایا، اور سمندر کی گہرائی معلوم کرنے کی بھی ایک کل تیار کی قطب نما کی تصحیح اور مد و جزر کی تحقیقات کے لیے کئی خاص طریق وضع کیے۔ علاوہ ازیں کئی مضامین مختلف طبعی و ریاضی و برقی علوم کے متعلق شائع کیے۔ ان مضامین کا شمار ساڑھے چھ سو سے زائد ہے، جو کئی مسلسل جلدوں میں طبع ہوئے ہیں۔

لارڈ کیلون نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی شادی ۱۸۵۲ء میں ایک نامی عالم کروم کی لڑکی سے ہوئی تھی۔ اسکا انتقال ۱۸۵۸ء

میں ہو گیا۔ دوسری شادی میں بلانڈلی (متوطن ڈیرا واقع بحر اوقیانوس) کے ساتھ ۱۸۵۸ء میں ہوئی۔ ۱۸۵۸ء میں آپ برف پر لڑکتے ہوئے گر پڑے تھے جس سے ران کی ہڈی کا بالائی سرا ٹوٹ گیا۔ اسکی وجہ سے آپ عمر بھر لنگڑے رہے۔ کئی ماہ تک ٹانگ باندھ کر پڑے رہے مگر اس زمانے میں کاغذ اور پنسل آپ کے غلگسار اور ہمدرد تھے۔ ۱۸۶۶ء میں بحری تار برقی کا سلسلہ قائم کرنے میں جو نمایاں خدمات انجام دی تھیں ان کے اور نیز دیگر قابل قدر اکتشافات کے صلے میں آپ کو نائٹ کا خطاب مرحمت ہوا۔ پھر ۱۸۹۲ء میں ملکہ وکٹوریہ نے آپ کو لارڈ کے خطاب ممتاز فرمایا۔ اُس وقت آپ رائل سوسائٹی کے پریسیڈنٹ تھے۔ پھر ملک معظم شہنشاہ ایڈورڈ ہفتم نے آپ کو آرڈر آف میرٹ میں شامل فرمایا۔

اپنے وسیع طبیعی علوم اور سائنسی اکتشافات کی بدولت آپ تمام مہذب دنیا میں مشہور ہو گئے۔ تمام یونیورسٹیوں اور سائنس کی کونینوں نے آپ کو اعزازی ڈگریاں عطا کیں۔ فرانس اور جرمنی نے خاص طور پر اپنی قدر دانی کا اظہار کیا۔ آپ بہت قوی ہیگل تھے اور کام سے کبھی نہیں تھکتے تھے۔ آخر عمر میں در و شقیقہ کا دورہ لاحق ہو گیا تھا جس سے آپ کو بوجہ تکلیف ہوتی تھی مگر دورہ ختم ہو جانے پر آپ پھر اپنے کام مصروف ہو جاتے تھے۔

۱۸۹۸ء شروع موسم سرما میں لیڈی کیلون بیمار ہو گئیں۔ ۲۲ نومبر کو لارڈ مدوح کو بھی سردی لگ گئی۔ ادھر بیوی کی علالت کی تشویش تھی، ادھر اپنی طبیعت ناساز، اس سے جسم بہت مضر اثر ہوا، اور آپ صاحب فراسٹ ہو گئے۔ تاہم اپنے کام میں لگے رہے۔ ایک دو ہفتہ اسی طرح مر کھپ کے گذارے مگر روز بروز طبیعت تندرست ہوتی چلی گئی جسمانی قوت رفتہ رفتہ سلب ہو گئی۔ آخر کار ۱۸ دسمبر ۱۸۹۸ء کو اس جہان فانی سے رحلت فرمائے۔

اس وقت آپ کی عمر تراستی سال کی تھی۔ ۲۳۔ دسمبر کو آپ کی لاش نہایت بزرگ و احتشام کے ساتھ ویسٹ منسٹر ایبی میں دفن کی گئی۔ نماز جنازہ سادگی آمیز نشان کے ساتھ ہوئی، جس میں سب بڑے بڑے آدمی شریک تھے۔

لارڈ ممدوح کے شاگردوں میں بہت سے نام آدر لوگ ہیں جو وقت شاندار مراتب پر ممتاز ہیں۔ پروفیسر صاحبان جیک، ارنٹن، پیری، نڈیل، گرے، گبس، اور کارلس لا آپ ہی کے شاگرد ہیں۔ سر ولیم رامزے مشہور عالم کیمسٹری اور کثرت بری کے موجودہ آپرچ بشپ صاحب بھی آپ کے نامی گرامی شاگرد ہیں۔ جاپان میں بھی کئی نامی مدبر اور عالم آپ کے شاگرد و نہیں سے ہیں اپنے شاگردوں کے آپ بہت خیر خواہ تھے اور ہر طرح انکی مدد کیا کرتے تھے۔

۱۹۱۱ء میں لارڈ کیلون کی ”جوبلی“ ہوئی تھی جس میں تمام مذہب

ممالک کی یونیورسٹیوں اور انجمنوں کے وکیل شریک ہوئے اور لارڈ ممدوح سے اظہار عقیدت کیا۔ اس موقع پر اپنے جوابی تقریر کرتے ہوئے سرائیک نیوٹن کے ہمزبان ہو کر فرمایا۔

”بچپن (۵۵) سال کی تحقیقات کے بعد میرا خیال ہے کہ برقیات کے بارے میں میرا علم طالب علمی کے زمانے سے کچھ ہی بہتر ہے۔“

جس سے غالباً آپ کی یہ مراد ہوگی کہ برقیات کا میدان نہایت وسیع ہے۔ لارڈ کیلون بیسویں صدی کے ایرک نیوٹن تھے۔ ان دونوں عالموں میں بہت کچھ مشابہت پائی جاتی ہے۔ سرائیک نیوٹن کے اصول اولیہ اب تک مستند سمجھے جاتے ہیں، اس لیے اپنے تحقیقات طبعیات اور برقیات میں ان کی اور اسکی بنا پر اصول قائم کیے وہ عرصہ دراز تک مسلمہ و مقبول رہیں گے۔

جے۔ آر۔ رائے

انسانی دماغ کی ماہیت

دنیا میں سب عجیب، بلکہ سب قیمتی، مادہ وہ ہے جس سے دماغ تیار ہوتا ہے۔ اگر ہم اس مادہ کو بخوبی سمجھ سکتے اور اس کے اجزاء کی پہچان ہمیں حاصل ہو سکتی تو انسان کی ہستی کے متعلق ہمیں بہت سے راز معلوم ہو جاتے۔“

(سوزیس کرکٹن براؤن)

دیکھو تو دماغی مادہ قریب قریب ہر حالت میں کیسا ہی پایا جاتا ہے۔ ایک امتحانی نلی میں کسی بیوقوف اور دوسری میں کسی فیلسوف کے دماغی ٹکڑے کو رکھ کر ان کا تجربہ اور ان تجربات کا مقابلہ کر دو تو دونوں میں ذرہ برابر فرق نہ معلوم کر سکو گے۔ باوجود اس کے یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ دونوں صورتوں میں کیمیائی اختلافات ضرور موجود ہوتے ہیں۔ تصور اگر تو صرف ہماری نظریہ سمجھ کا ہے۔

وہ سفید مادہ جسکو عرف عام میں دماغ کے نام سے پکارا جاتا ہے، سخت کے لحاظ سے مختلف حیوانات ہی میں مختلف نہیں ہوتا بلکہ ایک ہی انسانی دماغ کے مختلف حصوں میں ایک دوسرے سے اختلاف کتنا ہے جن عناصر سے وہ مرکب ہے انکی تعداد، صورت، انتظام اور تعلق کے اعتبار سے دو انسانی دماغوں کا مادہ کبھی کیسا نہیں ہوتا۔ نہ آج تک کبھی کیسا نہ دیکھا گیا، اور نہ آئندہ دیکھا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اسکا تعلق ہی انفرادی شخصیت ہے۔ لیکن کیمیائی ترکیب کی رو سے

دماغ کی خاص خاص مرضانہ حالتوں میں عصبی ریشون اور اس رقیق مادہ کے اندر جو دماغ اور ریڑھ سے تعلق رکھنے والی ہڈی اور گنبد کو چکنا کیے رکھتا ہے کیمیائی تبدیلیاں دیکھی گئی ہیں اور یہ قرن قیاس ہو کہ دماغی مرکبات اور اجزاء میں فرق واقع ہونے سے انسان کے مزاج اور اس کے عادات میں بھی فرق آجاتا ہے۔

وہ تمام عجیب و غریب باتیں اور حیرت خیز عقلی و نقلی دلائل جو انسان کو سوچتے ہیں حقیقت اس دماغی مادہ کی مضبوطی اور عمدگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر حالت میں دماغ کی مناسب غذائیت کو نہایت اہم معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ اگر تم دماغ سے کام لینا چاہتے ہو تو ضروری ہو کہ اسے مناسب غذا بہم پہنچاؤ۔

لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کونسی غذا ہے جو دماغی تقویت کے لیے بہترین سمجھی جاسکتی ہو۔ یہ ایک نہایت دلچسپ سوال ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ ان سطور میں اس پر کب قدر تفصیل کے ساتھ بحث کی جائے۔

حکما متفق ہیں کہ جسم کے باقی حصوں کی طرح دماغ کو بھی باقاعدہ غذا ملتی رہنی چاہیے جس حالت میں انسان کے خون کا دوران باقاعدگی سے ہوتا ہے تو جسم دماغ کے روبرو متعدد غذا یہ پیش کرتا ہے۔ انہیں سے جو چیزیں اس کے مطلب کی ہوتی ہیں دماغ انہیں منتخب کر لیتا ہے۔ لیکن جہت سے خون اور اس کا دوران ہمیشہ باقاعدہ نہیں ہوتا۔ بعض اوقات خون کمزور ہوتا ہے۔ اس صورت میں دماغ کو اسکی پوری غذا حاصل نہیں ہوتی اور اسکی طاقت کم ہونے لگتی ہے بعض اوقات خون غلیظ ہو جاتا ہے اس وقت دماغ کو ضرورت سے زیادہ چیزیں ملتی ہیں اور وہ بھی اسکے لیے خرابی کا باعث ثابت ہوتی ہیں۔ ان دونوں حالتوں کے علاوہ بعض صورتوں میں خون کے ساتھ خراب اجزاء دماغ تک پہنچ جاتے ہیں جن سے اسکے اندر زہر لایا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔

سچ پوچھو تو کوئی چیز خصوصیت کے ساتھ ایسی نہیں جسے دماغی غذا قرار دیا جاسکے۔ لیکن خوراک کے بعض اجزاء اس قسم کے ہیں جو دماغ کی غذائیت کے لیے ضروری تصور کیے جاتے ہیں۔ اور ان میں سے جس کو سب سے بڑا رتبہ دیا گیا ہے وہ فاسفورس ہے۔ کبزر کا قول ہے کہ "فاسفورس کے بغیر انسان میں سوچنے کی طاقت نہیں آسکتی"۔ لیکن یہ بیان ایک قسم کے مبالغہ پر مبنی ہے جسکی بنا اس اصول کو قرار دیا جاسکتا ہے کہ ایک خاص فاسفورس دار چربی دماغی اجزاء کی ساخت میں موجود پائی جاتی ہے۔ مبالغہ اس لیے ہے کہ اگر ہم کہیں "گندھک یا لوہے کے بغیر انسان میں سوچنے کی طاقت نہیں ہوتی" تو وہ بھی کچھ کم درست نہیں ہے۔

جب (۱۹۲۹ء) فاسفورس دریافت ہوا ہے اسے دماغی تکمیل کے لیے جزو لازم سمجھا جاتا رہا ہے۔ گو یہ خیال سائنٹفک تحقیقات پر مبنی نہیں جتنا بعض لوگوں کا خیال ہے۔ باوجود اس کے جدید تجربہ اور دریافتوں نے اس امر کی تصدیق کی ہے کہ اس سے دماغی عمل میں آتی ہے جن حالتوں میں دماغی ترقی زیادہ تیز دیکھی گئی اسکی وجہ فاسفورس کا مقدار کثیر میں موجود ہونا ہی پایا گیا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جس وقت دماغ اور ہڈیاں بالیدگی کے عمل میں ہوں تو انہیں فاسفورس کی کافی مقدار کار ہوتی ہے۔

ان باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بچوں اور کمزور دماغ والوں کو فاسفورس کا معقول جزو بذریعہ خوراک بہم پہنچایا جائے اور ہر خد کہ غذائیں فاسفورس کی مقدار کم ہو جائیسے کوئی بدیہی مرضانہ علامات نمودار نہیں ہوتیں تاہم ہمارا اس نتیجے پہنچنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ جس طرح غذا میں چنے کا جزو کم ہو جیسے جسم کی ہڈیاں نرم ہو جاتی ہیں اس طرح فاسفورس کی مقدار کم ہو تو دماغ کو مست کرتا اور اسکی بالیدگی میں مانع آتا ہے۔

لیکن باوجود اسکے کہ فاسفورس دماغی ترقی اور برقراری صحت کے لیے اس قدر ضروری سمجھا جاتا ہے اس کا استعمال فاسفیٹ کی قسم کے مرکب کی صورت میں چند ان ضروری نہیں کیونکہ ضرورت کے اعتبار سے اسکی کافی مقدار معمولی ملے جلے کھانے میں پائی جاتی ہے۔ فی الحقیقت یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ آخذ ذکر صورت میں استعمال کیسا ہوا فاسفورس اول الذکر صورت کی نسبت زیادہ مفید ثابت ہوتا ہے اس لیے مناسب ہے کہ جسم کو جس قسم کا فاسفورس مہیا کیا جائے وہ انٹلی یا مٹی ملے ہوئے فاسفیٹ کی صورت میں نہ ہو بلکہ معمولی کھانوں ہی کی صورت میں دیا جائے۔

مختلف کھانوں میں فاسفورس کی مقدار کا تناسب مختلف ہوتا ہے اور اس لیے ضروری ہے کہ نوجوانوں کے لیے جو کھانے منتخب کیے جائیں وہ ایسے ہوں کہ ان میں فاسفورس کی مقدار نسبتاً زیادہ ہو۔

اگر سہری خورونکے عقیدے کے مطابق چند بچوں کی پرورش صرف بقولات کیچا بے تو کچھ عرصہ گزرنے پر ان کا دماغ یقیناً کمزور پائا جائیگا۔ اگر کسی بچے کو محض گاجرین اور شلغم کھلا کر بالغ کیا جائے جن میں علی الترتیب ۱۰۰۳۶ اور ۱۰۵۸ فیصدی فاسفورک ایسڈ ہوتا ہے تو اول تو انکا بالغ ہونا ہی مشکل ہے اور اگر ہوں بھی تو دماغ اعتبار سے اس بچے کے مقابلے میں بہت کمزور ہوں گے جس کی پرورش انڈون اور بھیر کے گوشت پر لگائی ہو جن میں علی الترتیب ۱۰۳۴ اور ۱۰۴۲ فیصدی فاسفورک ایسڈ پائا جاتا ہے۔

تمام معمولی کھانوں میں پنیر کے اندر فاسفورس کی مقدار بیسٹیاؤ پائی گئی ہے۔ اسکے اندر فاسفورس پنٹ اکسائیڈ (فاسفورس ایک حصہ اور گسیجن ۵ حصہ) کی مقدار ۱۱ فیصدی پائی جاتی ہے۔ بحالیکہ معمولی سبزیوں میں صرف ۱۸۰ ہوتی ہے چونکہ پنیر میں

فاسفورس کے علاوہ وہ تمام اجزاء جو اعصاب و عضلات کو تیار کرنے میں مدد دیتے ہیں، بہت بڑی مقدار میں موجود ہوتے ہیں یہاں تک کہ ایک پونڈ بہترین پنیر میں اس قدر وہنیت اور مادہ کیسین پائا جاتا ہے جتنا کہ ایک گیلن دودھ میں ہوتا ہے اس لیے نوجوانوں کے لیے یہ بہترین غذا خیال کی جاتی ہے۔ اس میں اگر کوئی نقص ہے تو صرف یہ ہے کہ کمزور معدے سے ہضم نہیں کر سکتے اور ظاہر ہے کہ نوجوان معدے بالغ معدوں کے مقابلے میں کمزور ہوتے ہیں۔

بعض لوگ پنیر سے طبعاً متنفر ہوتے ہیں لیکن اکثر اسے اس لیے استعمال نہیں کرتے کہ وہ دیر میں ہضم ہوتا ہے اور اس دیر میں ہضم ہونے کی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ اسے بخوبی چبا کر نہیں کھاتے، یا پیٹ بھر کر کھاتا کھانے کے بعد اسے زیادہ مقدار میں کھالیتے ہیں، یا قوت کھاتے ہیں جبکہ وہ خشک اور سخت ہو گیا ہو۔ اگر نیز عہدہ قسم کا ہو اور عہدہ طور پر کھایا جائے تو یہ ایسی چیز ہے کہ بھوک لگاتی غذا ایت ہم پہنچاتی ۱۰۰۰ طبیعت کو فرحت دیتی ہے۔ گوشت کے مقابلے میں یہ نہ صرف ارزان غذا ہے بلکہ فائدہ میں بھی بہتر ہے اور جو لوگ گوشت نہیں کھاتے ان کے لیے نعمت غیر مترقبہ سمجھی جاسکتی ہے۔

ان صفات کو مد نظر رکھتے ہوئے اور نیز اس خیال سے بھی کہ اس میں گوشت اور دماغی مادہ پیدا کرنے والے اجزاء موجود ہوتے ہیں اور یہ مادہ ٹاکسین جو تفرس پیدا کرتا ہے بڑی ہوتا ہے اس کی کچا کھائی ہو کہ زمانہ آئندہ میں بچوں اور کمزور دماغ والوں کی غذا میں بھر کا جزو کافی رکھا جائے گا۔

فاسفورس کے دماغی غذا تسلیم کیے جانے کے سلسلہ میں بہت سے لوگ جنہیں دماغی محنت کا کام پڑتا ہے اس خیال سے پھلے کا استعمال کثرت کر رہے ہیں کہ اس میں اسکا جزو غالب ہوتا ہے

دل کے کمزور صورت میں مینڈک کے ایسے نظر آتے تھے ابھیڑوں کے غدود سے ایک قسم کا مرکب تیار کر کے پہنچایا گیا تو نہ صرف ان کا قد بڑھ گیا ہاتھ کے زیادہ ہو گیا بلکہ شکل و صورت بھی عمدہ نکل آئی جسکی وجہ محض یہ تھی کہ جو مادہ خود ان کے اندر موجود نہ تھا وہ دوسری جگہ سے حاصل کر کے ان کے اندر پہنچا دیا گیا۔ ایسے لوگوں کی مثالیں موجود ہیں جو پہلے بالکل فاجر لعل تھے لیکن اس عمل سے ذہن اور سمجھدار ہو گئے۔

ان تجربات میں کامیابی حاصل ہونے کی وجہ سے سب سے پہلے حیوانی غدود و اجسام پر بھی عمل کیا گیا تاکہ غذائیت کی کمی اور دماغی کمزوری کے مختلف مدارج معلوم کیے جاسکیں لیکن باوجود عرصہ دراز کی محنتوں کے اس بارے میں کوئی نمایاں کامیابی حاصل نہیں ہو سکی۔ اس قسم کے جوہر کا اثر بدن پر کچھ بڑا مضر ہو گیا دماغی امراض میں اس سے اطمینان بخش فائدہ حاصل نہیں ہو سکا۔ اس صورت میں ممکن ہو کہ لوگ حیوانات کے مغز کو ایک لذیذ اور زود مضام غذا سمجھ کر استعمال کرتے ہیں لیکن یہ ناممکن ہو کہ اس سے انسانی دماغ کو زہار یا مضبوط بنائیں کوئی خاص مدد مل سکے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے دماغ کے لیے کوئی خاص غذا تجویز نہیں کی جاسکتی۔ زندگی کی تمام منازل میں کفایت شعاری اور فضول خرچی دونوں کے انتہائی پہلوؤں کو چھوڑ کر اگر مناسب اور عمدہ کھانا کھایا جائے تو دماغ خود بخود ان میں سے اپنے مطلب کی غذا چن لیتا ہو۔

بچپن میں جبکہ بچہ شیر خوار ہوتا ہو ان کا دودھ ہی اسکے لیے بہترین دماغی غذا ہو۔ ان کے دودھ میں جو تاثیر ہو وہ ان کے انا کے دودھ میں ہو سکتی ہو نہ گائے یا بکری کے اور نہ اسکے

لیکن تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ یہ خیال ایک بڑی حد تک غلط ہے اور اس کا رواج ڈومانی ایک مشہور کمیادان کے ایک سرسری بیان پر مبنی ہے۔ جو لوگ مچھلی کے گوشت سے فاسفورس حاصل کرنا چاہتے ہیں انھیں اس تلاش میں یقیناً مایوسی حاصل ہوگی۔ باوجود اس کے ان لوگوں کے لیے جنھیں بیٹھک کا اور دماغی کام کرنا پڑتا ہے مچھلی ایک عمدہ غذا ہے۔ کم از کم اس قسم کی مچھلیاں جو زیادہ موٹی نہیں ہوتیں اور جنکے اندر اجڑے پروٹین کا تناسب کم ہوتا ہو۔ ان نوجوانوں کے لیے جن کا نظام عصبی شگفتا پذیر ہو اور بہت جلد اس میں فتور واقع ہو سکتا ہو گوشت کے بجائے مچھلی بہتر غذا تسلیم کی جاتی ہے۔

ایک زمانہ میں لوگوں نے اسی فاسفورس کی تلاش میں اس خیال سے کہ کیسان چیرن ایک دوسرے کو غذائیت ہم پہنچا سکتی ہیں حیوانات کا مغز بطور خوراک استعمال کرنا شروع کر دیا تھا لیکن جدید تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ گو اس قسم کی خوراک کا خواہ کوئی اور فائدہ ہو لیکن اس سے انسانی دماغ پر کچھ مفید اثر نہیں ہو سکتا۔

بعض حیوانات کے غدود یا ان غدود کے اندر سے حاصل کیے ہوئے لعاب کے استعمال سے چند صورتوں میں جو تعجب خیز اثرات دیکھنے میں آئے ہیں انکی وجہ سے لوگوں کے دل میں امید پیدا ہو گئی ہے کہ اگر جانور کا مغز یا ان کے مغز کا جوہر حاصل کر کے اسے بطور خوراک استعمال کیا جائے تو اس سے خون کو اس قسم کی قابل تحلیل غذا حاصل ہو سکتی ہے جو دماغ کو تقویت دیتی ہے جو لوگ سائنس کے مختلف شعبہ غنیمت دیکھتی ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہ ہوگی کہ تجربات سے معلوم ہو چکا ہے کہ دماغی کمزوری کے ایسے مریضوں کے اندر جن کی حالت حد درجہ افسوسناک تھی یعنی جو قد کے ہونے

مقابلہ میں کوئی پیٹنٹ فوڈ یا بوتل میں دودھ پانے کا طریقہ مفید قرار دیا جاسکتا ہے۔ بہت سی ننھی جانیں محض اسی لیے ضائع ہو جاتی ہیں کہ انھیں وہ غذائیں دی جاتی ہیں جسکی وہ قدرتی طور پر حقدار ہیں اور اس طرح پر شیر خواری کے ایام میں نامناسب غذائیں دے دے کر انکے دماغ کی بالیدگی میں رکاوٹ پیدا کی جاتی ہے۔

ایام شیر خواری کے بعد زندگی کے تمام مدارج میں غذا کو عام اصول کے مطابق باقاعدہ بنایا جاسکتا ہے۔ اس بات کی ضرورت بالکل نہیں کہ دماغ کی تقویت کے لیے کوئی خاص غذا استعمال کی جائے۔ اس میں شک نہیں کہ ہر عمر میں خوراک کی بہت سی غلطیوں سے بچنا اور اس میں خاص تر اہم کرنا ضروری ہے لیکن ان سب کی تفصیل اس جگہ ناممکن ہے۔

ضروری ہے کہ زندگی کے ہر حصہ میں انسان کو مادہ پروٹینڈ کافی مقدار میں ملتا رہے کیونکہ یہی وہ چیز ہے جو جسمانی ریشون کو تیار کرتی ہے اور اسی کا دماغ سازی پر مفید اثر پڑتا ہے۔ چونکہ انسان کی عمر زیادہ ہوتی جائے اسے لازم ہے کہ حیوانی غذا کا استعمال بھی بڑھائے کیونکہ مادہ پروٹینڈ قابل انضمام صورت اور کثیر مقدار میں اسی چیز کے اندر موجود پائالیا ہے۔

انسان کی زندگی میں ایک خاص وقت ایسا ہوتا ہے جب دماغ کی مناسب غذائیت کا خاص طور پر خیال رکھنا ضروری ہے، یعنی اس وقت جبکہ وہ بچپن سے نکل کر جوانی میں قدم رکھنے لگا ہو۔ اس تبدیلی کے ساتھ ہی خوراک کی خواہش میں بھی ایک نمایاں تبدیلی واقع ہوا کرتی ہے۔

جس وقت عقل ڈاڑھ نکلتی ہے تو اس وقت کھانوں کی رغبت میں بھی فرق واقع ہوتا ہے۔ اس کے زمانے میں پھلون اور مٹھائی کو زیادہ پسند نہیں کرتے بلکہ حیوانی غذا اور اسی قسم کی دوسری

لذیخ چیزوں کے خواہشمند پائے جاتے ہیں۔ بخلاف اس کے لڑکیاں مٹھائی کی زیادہ خواہشمند ہو جاتی ہیں۔ بعض صورتوں میں اس تبدیلی کے ایام میں وہ مٹی کھریا مٹی، یا کچے چاول کھانے لگ جاتی ہیں۔ ان چیزوں کا استعمال سخت مضر ہے اور اس قسم کی عادات کو فی الفور ترک کر دینا لازم ہے ورنہ خدائے تبدیل کے ایام میں اور اس کے بعد ایک عرصہ تک اس بات کا احتمال ہوتا ہے کہ انسان خراب یا کم غذا کھانے لگے اور اسے قلت خون کا مرض لاحق ہو جائے، اس لیے ضروری ہے کہ سہن بلوغ کی نسبت ان دنوں میں غذا نہ صرف زیادہ بلکہ مقوی ہو جائے اگر ایسا نہ کیا گیا تو عصبی کمزوری اور بچپنی پیدا ہو جائے گی۔ جس کے بعد ممکن ہے کہ مسکرات کے استعمال کی خواہش پیدا ہو جائے۔ حقیقت یہی وہ زمانہ ہے جبکہ شراب پینے کی تباہ کن عادت اختیار کر لی جاتی ہے۔ پس لازم ہے کہ غذا کی طرف پوری توجہ دیکر الکحل کو سکی تمام صورتوں میں دور رکھا جائے۔ یہ چیز ککشن براؤن کا خیال ہے کہ بعض لوگ جو مذہبی خیال سے یا کسی اور وجہ سے خاص خاص کھانوں یا مخصوص گوشت کا استعمال ترک کر دیتے ہیں یہ بہت بُرا ہے جو ان تک ہو سکے لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔“

ایک چیز البتہ ایسی ہے جو دماغ کے لیے خاص طور پر مفید سمجھی جاسکتی ہے اور جس کا بچپن اور اس کے بعد شباب سے پیشتر کے زمانے میں استعمال واجب ہے وہ چیز جو یاجی کاٹا (Oat-Meal) ہے۔ حقیقت یہ تمام کھانوں میں سب سے زیادہ غذائیت بخش چیز ہے اور اس میں چربی فاسفورس اور دیگر مقویات کے اجزا باافراط پائے جاتے ہیں۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ سفید گھیون ہم ہندوستانیوں

کی عام غذا ہے اور اس میں قابل تحلیل پروٹین کی بہت سی مقدار پائی جاتی ہے اس کے مین غذائیت اور چربی پیدا کرنے والے مادے بہت پائے جاتے ہیں، چاول سبب زیادہ نشاستہ رکھنے کے بعض اقوام مثلاً کشمیریوں یا بنگالیوں میں زیادہ استعمال ہوتے ہیں اور جو مین معدنی مادے زیادہ پائے جاتے ہیں، تاہم ان سب باتوں کو زیر نظر رکھتے ہوئے یہی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جی مین جو صفا موجود ہیں وہ انہیں سے کسی چیز مین بھی نہیں پائی جاتیں۔ اگر تم کسی شخص سے اسکا ذکر کرو تو وہ یہی کہے گا کہ جی تو گھوڑوں کی خوراک ہے۔ یورپ مین بھی سولے باشندگان اسکا لینڈ کے بہت کم اقوام اسے استعمال کرتی ہیں۔ حال مین ایک فرانسیسی نے لکھا تھا کہ جی کی روٹی موٹی اور کھڑوری ہوتی ہے اور اسے صرف غریب ملکوں میں کھایا جاتا ہے۔ لیکن کچھ عرصے سے اسکا رواج انگلستان مین زیادہ ہونے لگا ہے۔ بد قسمتی سے وہاں بھی مزدور پیشہ جماعتیں اسے اب کم استعمال کرتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس طبقہ کے لوگ اب ویسی مضبوط کاٹھی اور جسمانی تحریک نہیں رکھتے جیسی ان کے پیشروں مین پائی جاتی تھی۔

جب جدید تہذیب نے ترقی حاصل کرنی شروع کی ہے لوگ ان سادہ کھانوں کو چھوڑ کر چا، بسکٹ، وغیرہ استعمال کرنے لگ گئے ہیں۔ ایک مشہور اہل الرائے کا قول ہے کہ ”جی کا آٹا دودھ مین ملا کر استعمال کیا جائے تو لاکھ چائین اور قہوے اس پر قربان کر دیے جاسکتے ہیں کیونکہ یہ مرد و عورت، بچہ، سب کے لیے بہترین غذا ہے۔“

حال کی بعض علمی تحقیقات سے اس بات مین مزید روشنی حاصل ہوئی ہے کہ جی کے آٹے کا اثر جسم پر کیا پڑتا ہے۔ تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ ۸ ہفتہ تک جن چوہوں کی پرورش جی کے آٹے اور پانی کی گئی انہیں وہ غدود جسے اصطلاح مین (Thyroid Gland) کہتے ہیں ان چون کے غدود کی نسبت جن کو دودھ اور روٹی کھلائی گئی تھی دو گنے تھے۔ جیسا کہ قبل ازیں بیان کیا جا چکا ہے اس غدود کا عا جب سم کے ہر حصہ مین غذائیت کا اثر پیدا کرتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ شمالی انگلستان کے باشندے بچپن مین جی کے استعمال کے باعث مضبوط اور تندرست ہوتے ہیں۔ بظاہر ہی معلوم ہوتا ہے کہ جی کا آٹا اس غدود پر اثر ڈال کر داغ سازی کے عمل مین بہت مدد دیتا ہے۔ یہ پتہ چلا

شمس العلماء خواجہ حالی

ان صاحب کمالوں کے علوئے مرتبت مین کس کو شک ہو سکتا ہے۔ خصوصاً غالب کے، جنہوں نے اس اندھی تقلید کے نقصانات کا اندازہ کر کے آخر اپنے لیے ایک دوسرا راستہ تلاش کر لیا۔ لیکن اسے ان بزرگوں کا طبعی رحمان کیے یا بعض خارجی و اضطراری اسباب کا نتیجہ کہ اپنے گلدستے کو اپنے باغ کے پھولوں سے زیب دینے کی جگہ انھیں اصفہان و شیراز کے باغبانوں کا منت پذیر ہونا پڑا

اردو شاعری کا جنم بھوم ہندوستان ہی لیکن اسکی نشو و نما فارسی شاعری کے زیر اثر ہوئی ہے۔ قاعدہ ہے کہ ابتدائی تاثرات کا رنگ انسانی طبائع پر آخر عمر تک گہرا رہتا ہے۔ اسی اصول سے جب اردو شاعری کے مختلف پہلوؤں پر نگاہ کرتے ہیں تو ہمیں اس بات سے کہ سنسکرت اور بھاشا کا اسپر تو تک نہیں پڑا تعجب نہیں ہو میر و سودا سے لیکر غالب و موتی تک ایک لکیر کے فقیر بنے رہے ہیں۔

اور اس ایک فوگداشت سے اردو شاعری میں بعض ایسے عیوب پیدا ہو گئے جو اب تک اس کے صاف و شفاف دامن کو داغدار بنائے ہوئے ہیں۔

عرب سے قطع نظر خود غم کی شاعری نے اب تک کئی پلٹے کھلے آلیکن اردو شعراء نے جو راگ روزا دل سنا تھا اسی پر آخر تک سر دھتے رہے۔ ہم اساتذہ اردو کی دماغ سوزیوں کے دلی اعتراف کا اثبوت کئی دفعہ زبان قلم سے بھی دیکھے ہیں اور اس میں کلام نہیں، بانہیں کے کارنامے آج بھی اردو لٹریچر کی لاج قائم رکھے ہیں لیکن اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں ہو سکتی کہ اگر انھوں نے "صلیت" بجے ذرا بھی کام لیا ہوتا تو اردو شاعری میں تاثیر کلام کے اعتبار سے تفصیح کوئی کمی نہ رہتی۔ ہمارے بعض شعراء نے جن میں میر و درد، غالب و آغ، مجروح وغیرہ خصوصیت سے ذکر کے قابل ہیں اپنے کلام میں کائنات پر اپنی کوشش بہ کامیابی کی ہو اور اکثر نے جذبات انسانی کو اور واردات عشق کی صحیح اور سچی تصویر اتارنے میں کمال کر دکھایا کی ہو جس کا اقرار آجکل بھی کیا جاتا ہے جبکہ ایک گروہ بدقسمتی سے ملک بڑھلن ایسا پیدا ہو گیا ہے جسے ایشیائی شاعری کی ہجو گوئی کا بار پانے میں نہ لے رکھا ہے۔ ان استادوں کا کلام جو مبالغہ و تصنع سے بری ہے پچھل محسوسات قلب کے لحاظ سے ہر طرح قابل قدر ہے اور چونکہ کی یہ باتیں فطری وسیع النظری اور نازک خیالی کا نتیجہ ہوتی ہیں اس لیے اسو نہیں وہ بے مزگی اور سیٹھا پن نہیں ہے جو عموماً چبائے ہوئے لہجے تبدیل ہو تا ہے۔ لیکن افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ دلپذیر عملی نظیریں واقعتاً شاذ و نایاب جاتی ہیں۔ الغرض سنسکرت اور بھاشا بلکہ عربی کے ساتھ بھی اعتناء نہ کرے جو نقصانات اب تک عائد ہوئے اور ہوتا رہیں ان کی تلافی اور بھی مشکل ہوتی اگر یہی سنوک مغربی خیالات کوڑے ساتھ بھی کیا جاتا جن سے مستفید ہونے کے لیے ہم حکومت

برطانیہ عظمیٰ کا منت پذیر ہونا چاہیے طرز معاشرت اور عادات و خصائل کی طرح حکمران جماعت کے علم ادب کا اثر مفتوح قوم پر پڑنا مضابطہ قدرت کی سب سے پہلی دفعہ کے عین مطابق ہے۔ اسلامی ادبیات کا اثر ہندوؤں پر جیسا کچھ پڑا اس کا ثبوت کاسیتھون اور کشمیری پنڈتوں میں مل سکتا ہے۔ نسیم اور سرشار اور سرور ایسے جادو نگار اگر اس دنیا میں نہیں ہیں تو چکبست اور ابرو وغیرہ بجائے خود ہندو شاہین ہیں۔ برٹش گورنمنٹ کے ظل عاطفت میں ہندوستانیوں کو مغربی طرز تعلیم پانے کا موقع ملا اور اس سے جہان اور بہت سے مادی و اقتصادی فوائد حاصل ہوئے وہاں علمی منافع بھی نظر انداز نہیں کیے جاسکتے۔ لٹریچر کی طرف ہمیں ان دنوں جو تھوڑا بہت اعتناء پیدا ہو گیا ہے وہ سب اس یورپی تشویق کا نتیجہ ہے جو نہ نئی صورتوں میں لئے دن جلوہ گر ہوتی رہتی ہے۔

مکن نہ تھا کہ مغرب اور مشرق باہم ملین اور ایک دوسرے کے معائب و محاسن سے متاثر نہ ہوں۔ مشرق کے متعلق مغرب نے جو رائے قائم کی ہے ہمیں اس سے بیان کوئی بحث نہیں لیکن ہمارے لیے بہت سی باتوں میں مغرب نے آئینہ کا کام دیا ہے اور اسی آئینہ میں جس پر جدید اصول تنقید کی جلا لگی تھی ہمیں اپنے علم ادب کے خطہ خال نظر آئے ہیں اور ہمیں ایک حد تک معلوم ہو گیا ہے کہ اسکی حالت کیا تھی؟ اب کیا ہے؟ اور آئینہ کیا ہونی چاہیے؟

فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کی شاعری مختلف طبقوں میں منقسم کی جاسکتی ہے۔ مثلاً
عشق شاعری
رزمیہ شاعری
اخلاقی و مذہبی شاعری
نیچرل شاعری

قومی شاعری۔

عشق و محبت کے عنوان سے جس قدر سالہ ہمارے اسلاف نے مہیا کیا ہے اس سے ایک نہیں بکلمہ بیسیوں اور سیکڑوں مندر پیکر حسن کی پرستش کیلئے تیار ہو سکتے ہیں۔ رزمیہ شاعری کی کمی نہیں دیر کے مرثیے نے پوری کر دی ہے۔ اخلاقی اور مذہبی صنف سخن کی ترتیب جداگانہ طور پر ہمارے بیان نہیں ہو لیکن اساتذہ اُردو کی غزلیات اکثر دہشتہ اخلاق و آداب کے مضامین سے ملبو پائی جاتی ہیں۔ نیچرل شاعری اُردو میں مفقود تھی لیکن مولانا آزاد نے ایک ایسی شاہراہ کی داغ بیل ڈال دی ہے جس پر چلنے کے بعد ”برگ درختان سبز“ کا ذوق آفرین منظر خود بخود آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

نیچرل شاعری کی طرح قومی شاعری کا نام لیا بھی شعراء اُردو میں کوئی نہ تھا لیکن انگریزی مثل ہے کہ ضرورت ایجاد کی مان ہے اور حقیقت شناس نظروں سے پوشیدہ نہیں کہ حسب طرح یہ مثل قدیم زمانے میں اُن تاج کے اعتبار سے جو علمی اور تمدنی دُنیا میں طور میں آچکے ہیں صحیح ثابت ہوئی ہے اس طرح آج بھی وہ صحیح ہے۔ مغربی تعلیم کے اثر سے ہندوستان میں بھی خیالات و جذبات کا جو انقلاب لازمی طور پر پیدا ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ ایک طرف اگر ہر بڑے پسنسر اور کہسے کے فلسفہ نے ارسطو و بوعلی سینا کی شہرت پر اپنا حق چاہا تو دوسری طرف گو لد اسمتھ، ٹینسن، اور بریٹن کا رنگ تخیل ریورس کی مصوری پر غالب آنے لگا۔ صحیفہ فطرت کے حقیقی مجسمین کی اُردو میں کمی تھی لیکن شمس العلماء، مولانا آزاد مرحوم کا ”مجموعہ نظم“ اس بات کا ثبوت ہے کہ اُردو میں بھی ”معرفت کردگار“ کے ایک ایک ورق میں دفتر کی دست پید ا کی جاسکتی ہے۔ ہمارے ادبیات کی خوش قسمتی ہے کہ آج کل علمی رسائل میں بعض اوقات نیچرل

نظمیں اس پاپ کی شائع ہوتی رہتی ہیں جو اپنے صحیح معنوں میں اُردو شاعری کا بہترین حصہ سمجھی جانے کی مستحق ہوتی ہیں۔

رگبی قومی شاعری؟ اس کا وجود متقدمین کے کلام میں نہیں ہے اور متاخرین میں بھی حالی سے پہلے کسی نے اس پر توجہ نہ کی تھی۔ قائد ہے کہ ضرورت سے اسباب خود بخود بنتے ہوئے ہیں۔ مسلمانوں کی حالت جیسی کچھ زبان تھی اُسکی صحیح اور سچی تصویر بیان دکھانا تحصیل حاصل ہے۔ مختصراً سمجھ لینا چاہیے کہ حکومت کے ساتھ دولت و عزت اور اخلاق و آداب بھی اُن سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ حبالۂ لاعلمی، خود غرضی، اُدوہ تامل عیوب جو کسی تنزل پذیر قوم کے جزو لاینفک خیال کیے جاتے ہیں مسلمانوں میں موجود تھے۔ ضرورت تھی ایک ایسے شخص کی جو انھیں ذلت و ادوار کے اس قعر سے نکلے اس اہم منشاء کی تکمیل کے لیے سرسید مغفور کی ذات مقدس ہو چکی تھی۔ مرحوم نے اپنی بیش قیمت عمر خلافت زدہ مسلمانوں کی فلاح و بہبودی کی کوششوں میں صرف کر دی اور آج اس مردہ قوم میں جو کچھ زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں وہ انھیں کی مسیحائی کا صدقہ ہے۔

سرسید نے اپنے مبارک مقصد کی تکمیل کیلئے اپنے گرد و پیش ہر قابل آدمی جمع کر لیے تھے۔ مولانا حالی بھی اُسی قومی نورتن کے روشن اور درخشاں ہواہر ہیں۔ شک نہیں کہ سرسید کو ایک ایسے شخص کی ضرورت بھی تھی جو اپنی سحر آفرینیوں سے اعجاز کا کام لیکر جمود کو حرکت میں لاوے اور جو اپنی ولولہ انگیز صدائے دل و زمین جو ش پیدا کرے۔ تاثیر کلام نے دُنیا میں اکثر بڑے بڑے کام کیے ہیں اور اسکے متعلق متعدد تاریخی روایات شہور ہیں۔ حالی کی معجز بیانی نے اگرچہ سولن کی طرح یونان و الونکو سٹیکس کا قبضہ نہیں دلا دیا اور نہ لارڈ بائرن کی طرح دول یورپی یونان کی امداد پر آمادہ کر کے اُسکی بغاوت کی شاخ میں حکومت خود اختیاری کا پھل لگایا لیکن اتنا سب کو معلوم

ہو کہ جس زمانے میں سرسید کشتی اسلام کو جہالت و فلاکت کے بھنور میں چکر کھاتے دیکھ کر اُسکے محفوظ رکھنے کی مساعی میں مصروف تھے اور بہت کم لوگ اُنکی پروا کرتے تھے اُسی وقت حالی کی ایک جگہ دوز چنچ نے مسلمانوں میں وہ ٹپل ڈال دی کہ سوتے بیدار ہو گئے، مٹیٹھے اٹھ کھڑے ہوئے اور جو لوگ کھڑے تھے وہ دوڑنے لگے۔

مسدس جزوۃ اسلام یا مسدس حالی دُنیا کے اُن علمی ادبی کارناموں میں شمار کیا جاتا ہے جن کا پائدار اثر کسی قوم کے اخلاق معاشرت، اور تمدن پر پڑ سکتا ہے۔ حالی نے جسوقت اسلام کی گذشتہ شان و شوکت کی تصویر دکھا کر موجودہ اذبار و ذلت کا موقع مؤثر الفاظ میں پیش کر کے مسلمانوں سے صاف صاف کہہ دیا کہ جس کی یہ حالت ہو۔ مصرع

وہ قوم آج ڈوبی گئی نہ دُوبی

یہ ایک بجلی تھی جو آنکھوں کے سامنے دوڑ گئی، رعد کی گڑگڑ تھی جسے دلوں کو ہلادیا۔ وہ دماغ جو اپنے متعلق کبھی سوچنے کے عادی نہ تھے روشن ہو گئے۔ پہلو میں درپیدا ہوا اور در بھی قوم کا۔ نگاہیں منزل مقصود کی تلاش میں ادھر ادھر دوڑنے لگیں اور ان تمام تحریکوں سے کم از کم اسقدر فائدہ ضرور مرتب ہو گیا کہ مسلمانوں کو اپنی پست حالت کا اندازہ ہو گیا اور انھیں اپنا ایک نصب العین مقرر کر کے اُسکی جدوجہد میں مصروف ہونا پڑا۔

قلم کی ایک خاص نظم کی بابت کہا جاتا ہے کہ اگر وہ اسکے سوا اور ایک سطر بھی نہ لکھتا تاہم یہ نظم اُسکے کمال فن کی کفالت کرتی۔ مسدس حالی کا بھی یہی حال ہے۔ حالی کی علمی شہرت اسی کے بدولت ہوئی اور انھیں قومی رہنمائی کی سند اسی نے دلوادی ہو بہت لوگ جو حالی کو غلطی سے شاعر نہیں سمجھتے وہ بھی مسدس کی خوبیوں کے معترف ہیں اور اُسکے مطالعہ سے اثر انداز ہوتے ہیں۔

خیال کرنے کی بات ہو کہ تیرہ سو سال کے اسلامی واقعات کا نظم میں قلمبند کرنا کہ زبان کی لطافت، واقعات کی صحت، طرز بیان کی خوبی اور سب سے زیادہ یہ کہ کلام کی تاثیر کا کوئی پہلو نظر انداز ہونے پائے کوئی آسان بات نہ تھی لیکن مولینا حالی نے ان تمام مرحلوں کو جس خوش اسلوبی سے طے کیا ہے وہ انھیں کا حق تھا اور اسکا انصاف کچھ وہی کر سکتے ہیں جنہیں مبدی فیاض سے مذاق سلیم و وجدان صحیح کا دافی حصہ ملا ہے۔ یہاں اُن لوگوں سے سوال نہیں جو فطرتاً نکتہ چین اور عیب جو واقع ہوئے ہیں یا جنہیں یہ بات خواہ مخواہ قہر معلوم ہوتی ہو کہ دہلی دیکھتے آگے بانی پت کا نام بھی لیا جائے۔

مسدس حالی سہل ممتنع کا بہترین نمونہ ہے اور تسلسل مضمون کا اسقدر لحاظ کیا گیا ہے کہ اگر کہیں درمیان سے دو ایک بند چھوڑ پڑھا جائے تو مطالب کی وہ وضاحت نہیں باقی رہتی۔ تاثیر سخن اور سوز و گداز کے ماسوا مسدس حالی کی ایک بلا تیار خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُسکا مطالعہ لڑکوں، جوانوں اور بوڑھوں کیلئے یکساں معنی خیز و موثر اور فرحت بخش ہے۔ یہ صفت اردو کی شاید کسی اور کتاب میں نہ ہوگی۔ فارسی میں ”گلستان“ البتہ یہی وصف رکھتی ہے۔

مسدس حالی کوئی طرز کی شاعری کا سنگ بنیاد خیال کیا جاتا ہے اور یہ خیال صلیبت پر ہے۔ حالی کی تقلید شعراء اردو کو اس وجہ سے ناگزیر تھی کہ خیالات کا جو انقلاب علمی نقطہ خیال سے پیدا ہوا تھا وہ بہر حال پرانی اور بے کیف شاعری کے حق میں ضرور سم قاتل تھا جن لوگوں نے دور بین نظر سے کام لیا اس رمز کو پیشتر سے سمجھ لیا انھوں نے حالی کے اتباع پر اپنے طرز سخن میں تبدیلی کر دی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو بھی زمانہ ایک نہ ایک دن

انہیں ایسا کرنے پر مجبور کرتا۔
 مولنا حالی کی اُس شہرت کا کفیل جو انہیں آج ملک سرائے
 ناز اور قوم کا چشم و چراغ بنائے ہوئے ہو اُن کا جدید رنگ کا
 کلام ہو لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ رنگ اختیار کرنے سے
 پہلے وہ شاعری کے کوچہ سے نابند تھے۔ اُن کے ابتدائی حالات
 سے ناظرین واقف ہونگے لیکن ہم سیاق عبارت کیلئے یہاں اُن
 مد نظر کھڑے اُن کے سوانح قلمبند کرتے ہیں اس سے یہ بھی معلوم
 ہوگا کہ انہوں نے کن کن تجربوں کے بعد موجودہ طرز سخن کی
 پابندی اختیار کی ہو۔
 مولنا حالی پانی پت کے ایک معزز خاندان کے سپوت ہیں۔
 پانی پت میں ایک محلہ انصاریوں کا ہے۔ یہ خواجہ ملک علی صاحب
 کی اولاد ہیں جو ہرات سے ہندوستان آئے۔ بزرگ آدمی تھے۔
 بادشاہ نے سر آنکھوں پر لیا۔ پانی پت اور اُس کا ملحقہ علاقہ انہیں
 بطور مد و معاش دیا گیا۔ آپ کو اُس پر کنہ کا منصب قضاوت بھی
 حاصل تھا۔ نرخ بازار کا تعین، نماز عیدین کی امامت، بزرگوں کے
 مزارات کی تولیت، بھی ان کے تفویض تھی۔ مولنا حالی نسل انصاری
 اور بطناً سید ہیں۔ آپ کے والد بچپن ہی میں اختلال دماغ کے
 عارضہ میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ۵ سال کی عمر میں سایہ مادری بھی سر
 اٹھ گیا۔ ایسی حالت میں باقاعدہ تعلیم و تربیت کا ہونا بظاہر غیر ممکن تھا۔
 لیکن حالی کو تحصیل علم کا فطرتی شوق تھا اور اپنی ذاتی کوشش
 سے انہوں نے وہ کچھ کر دکھایا جو دوسروں کیلئے باوجود قہم کی
 سہولت و آسانی کے محال سمجھا جاتا ہو۔
 میر مہنون دہلوی کے بھتیجے اور داماد سید جعفر علی فارسی کے ماہر
 کامل تھے۔ مولنا حالی نے فارسی انہیں سے پڑھی۔ عربی کی تعلیم
 مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری سے پائی۔ ۷ سال کی عمر میں

آپ کی شادی ہو گئی تھی۔ اس وقت تک آپ کی تعلیم درجہ تکمیل کو پہنچی
 تھی اور اس معاشرتی پابندی کے بعد ناممکن تھا کہ وہ اس کا سلسلہ
 بدستور جاری رکھتے لیکن جن لوگوں کی قسمت میں ناموری لکھی ہوتی ہو
 اُن کی واسطے حصول مقصد کا راستہ خود بخود صاف ہو جاتا ہے۔
 ان کے ولین تحصیل علمی کا شوق باقی تھا۔ اور حسن اتفاق سے
 سسرال بھی خوشحال ملا کہ گھر بار کی فکر دن کا ناقابل برداشت با
 ان پر نہ پڑ سکا۔ طلب صادق تھی۔ اگر کوئی رُکاوٹ بھی ہوتی تو اُن کا
 خیال نہوتا۔ بسم اللہ لکھے آپ دہلی چل کھڑے ہوئے۔ اس زمانے
 میں دہلی کی حالت گئی گزری نہ تھی۔ اہل کمال کا مجمع تھا طالبانِ
 کمال کیلئے دلی چھوڑا اور کوئی جگہ مشکل مل سکتی تھی حالی دلی پہنچے اور
 اوروں سے ہمک و ہم رہے اور علوم منطق و فلسفہ اور صرف و نحو وغیرہ
 کی تحصیل انتہائی درجہ تک بہ اطمینان تمام کی۔ دلی سے پانی پت
 واپس آنے کے بعد بھی آپ کا علمی مطالعہ برابر جاری رہا۔ ۱۲۵۷ھ میں
 ضلع حصار کی محکمہ کلکٹری میں ایک مختصر سی جگہ پر مامور ہوئے
 لیکن ۱۲۵۸ھ کے پر آشوب زمانہ اندر کی پریشانیوں میں یہ جگہ بھی چھوڑنا
 پڑی۔ لیکن امن و سکون ہو جانے کے بعد انہیں گورنمنٹ پنجاب کے
 دارالکتب (بک ڈپو) میں ایک جگہ مل گئی۔ یہاں آپ کے ذمہ یہ
 خدمت سپرد تھی کہ کتابوں کی عبارت زمانہ حال کے مذاق کے مطابق
 درست کیا کرتے تھے اور حشو و زائد سے پاک کر کے اُسے جدید نمونے
 پر لاتے تھے۔ اس خدمت پر آپ جب تک مامور رہے آپ کا قیام
 لاہور میں رہا۔ اس وقت لاہور آجکل کا لاہور نہ تھا۔ جس شخص نے
 دہلی کے ارباب کمال کی دیکھ چھپتوں کے لطف اٹھائے ہوں
 اُسکی دلہنگی کا سامان لاہور میں کیا ہوتا۔ پھر وطن اور اہل وطن
 کی مفارقت اُس پر مستزاد تھی اور سب پر طرہ یہ ہوا کہ اُسی زمانے میں
 وہاں چچیک درمہضہ کی دست برد نے شہر کو وحشت ناک بنا دیا تھا۔

بے دیار و بے وطن آدمی کیلئے اس مصیبت میں اسکے علاوہ اور کیا ہو سکتا تھا کہ اپنی بیتی اپنے آپ سے کہہ کر دلوں کو دھار سے اُنکی بعض قدیم غزلوں میں جہان لاہور کی پریشان کن زندگی کی حیرناک تصویر کھینچی ہو وہاں بزرگانِ دہلی کی یاد بھی آگئی ہو اور سچکھ یہیں بہت دردناک ہو گیا ہو۔ مثلاً ایک غزل میں فرماتے ہیں ۵

دلالتی ہے صبا کس کو چمن یاد نہ میں بلبل نہ گھر میرا چمن ہے
کردن تجھ سے بیان کچھ دروغِ بہت مگر جو شش سخن نہیں رہن ہے
سے لاہور میں اگر سو جانے یہی دُنیا یہی دارالمن ہے
ہاں بیگانگی ہے اس قدر عام کہ بلبل ناشناساے چمن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہل لاہور تصور میں مرے اک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامہ بزم خموشی میں مری ذوق سخن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس باغ کا پھول جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تم کو ہوں کس مصر کی بو؟ جہاں غربت و وطن پر خند زن ہے
نہ لینے دیگا جنت میں بھی آرام یہی گر جند بہ ہر وطن ہے

یہ اشعار بھی اُسی زمانے کے تصنیف ہیں ۵

شہر و دیار سے باغ و صحرا سے بوئین آتی آشنائی کی
بختِ ہمدانستانی شیدا تو نے آخر کو نارسائی کی
صحبتِ گاہ کا ہی رشتگی تو نے بھی ہمسے بیوفائی کی
لیکن اُنھیں لاہور میں بہت زیادہ عرصہ تک قیام نہیں
کرنا پڑا۔ چار برس کے بعد یہ "انگلکو عربک سکول" دہلی کی مدرسہ پر
مقرر ہو کر وہاں سے واپس آئے۔ دہلی واپس آکر حالی کو وہی
لطفِ بلا جو شاعر و فن کے الفاظ میں بلبل کو رہائی کے بعد چمن کی
سیر سے حاصل ہوتا ہے یا غریب لوطن مسافر کو غربت کی کلفت و
مصیبت جھیلنے کے بعد وطن پہنچ کر عزیز واقارب یا احباب کی
ملاقات سے۔

ابھی مولانا حالی عربک سکول میں مدرس ہی تھے کہ اتفاق سے
نواب آسمان جاہ مرحوم جو کسی زمانے میں دولتِ آصفیہ کے مدارِ المہام
اور اسلامی معارف پروری کے روایات کے حامل تھے، کالج دیکھنے
کیلئے علیگڑھ آئے۔ مولانا حالی بھی موجود تھے اُن کو بھی باریابی کا
موقع دیا گیا اور آپ کے لیے ۵۰ روپیہ ماہوار کا علمی وظیفہ مقرر ہو گیا۔
سنتِ بلا میں جب مولانا حالی علیگڑھ ڈیپوٹیشن کے ساتھ جس کوٹہ
سرسید کی سرگردگی کا فخر حاصل تھا حیدر آباد گئے تو آپ کا وظیفہ
بھی حصہ سے پورے سوڑو پے کر دیے گئے۔

ان واقعات سے معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ کی زندگی کا بہترین حصہ
دہلی میں بسر ہوا ہے اور اگر تیسرے غالب اپنے مطول قیام دہلی کے
لحاظ سے دہلوی اور ناسخ و آتش اسی اعتبار سے لکھنوی کہلائے
جائیکے مستحق ہیں تو مولانا حالی نے کیا قصور کیا ہے کہ اُنھیں
دہلوی کہنا تو ایک طرف رہا اُنکی زبان آج تک ہدفِ ملامت
کا نشانہ بنائی جاتی ہے۔ یہ ایک اصولی بحث ہے۔ اسکا تصفیہ ہر
علم اللسان کر سکتے ہیں لیکن اسکے باوصف ہمارے خیال میں
دہلوی یا لکھنوی کا اضافی لقب مولانا حالی کی دستارِ فضیلت کا
طرہ نہیں بن سکتا بلکہ اُن کا کمال اُن کی عظمت کی دلیل ہے۔

زمانہ قیام دہلی میں مولانا حالی کو اُن ذی کمال اربابِ فن
کی صحبت میں شریک ہونے کا موقع ملا ہے جو اپنے وقت کے فردِ فیر
ایشیائی شاعری کی زندگی اُس زمانے میں اُن کے دم سے وابستہ تھے
وہ شاعر تھے اور شاعرِ گری بھی، یہ بات ناممکن تھی کہ اُن کے ذوقِ شعر
گوئی کو دیکھ کر مولانا حالی کو شوق نہ پیدا ہوا ہو۔ فطرت سے اُنھیں وہ
صفات عطا ہوئی تھیں جو شاعر کو شاعر بناتی ہیں۔ اُن سے کام
لینے کے لیے ایک معمولی سی تحریک کی ضرورت تھی۔ غالب ساہم
شناس شاعر مولانا حالی کی نسبت کہتا تھا کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو

ظلم کرو گے۔ بالآخر انھیں بھی ان بزرگوں کا ہمنوا ہونا پڑا اور آج ان کا پیرانا کلام دیکھ کر ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ ابتدائیں ان کا رنگ طبیعت کیا تھا۔

غالب کا نام اردو شعرا کی فہرست میں فلسفی شاعر کے لقب سے لکھا جاتا ہے۔ حالی کو بھی زانو سے تلمذ انھیں کے آگے نہ کرنا پڑا کسی مجبوری سے نہیں بلکہ اس سبب سے کہ جس راستے پر چلنے کو یہ کمر بستہ تھے اُسکی رہنمائی غالب سے بہتر کوئی نہ کر سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ابتداء نواب شیفتہ سے اصلاح لی۔ نواب موصوف کے ساتھ انھیں ایک عرصہ تک یکجائی حاصل تھی ممکن ہے کہ شاگرد بھی ہو گئے ہوں البتہ اس میں کلام نہیں کہ نواب شیفتہ جو خود بھی مشاق شاعر تھے، انکی صحبت بھی مولنا حالی کی تشویق و تحریص کا باعث ہوئی۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ پہلے موتی کے شاگرد تھے پھر غالب سے اصلاح لینے لگے۔ جہانگیر آباد سے جو انکی ریاست تھی غزنین بغرض صلاح غالب کے پاس آتی تھیں۔ حالی بھی جب تک جہانگیر آباد میں رہے ان کا کلام بھی غالب کے پاس نظر ثانی کی غرض سے آیا کرتا تھا۔ یہ کہنا تحصیل حاصل ہے کہ مولنا حالی کا ابتدائی کلام زلف و رخ، اساق و ساعد کے تذکرہ سے مالا مال رہا ہو گا۔ ابتداء میں یہ امر ناممکن العمل تھا کہ وہ اس طرز سخن کے عیوب سے جنھیں انکے اور تمام ساتھی محاسن سمجھتے ہوں واقف ہو جائے انھوں نے اس وقت تک جو کچھ پڑھا تھا یہی پڑھا تھا اور جو کچھ دیکھا تھا یہی دیکھا تھا۔ دنیا میں کوئی اصلاحی کام بغیر کسی ذاتی مشاہدہ و تجربہ کے آج تک نہیں ہوا اور حقیقت حال بھی یہی ہے کہ جب تک انسان

لے یہ صفت قیاس ہی قیاس ہو ورنہ دیوان حالی کی قدیم غزلیات سے بھی اسکا ثبوت نہیں ملتا۔ راقم الحوادث کا خیال ہے کہ مولنا کی صرف وہی قدیم غزلیات دیوان لگی ہیں جو ایک حد تک مذاق جدید موافق سمجھی جاسکتی ہیں اور جن میں چونکہ کلمہ کا مطلع نہ آیا

کو بطور خود کسی چیز کے حسن و قبح نہ معلوم ہوں وہ اُس کے متعلق ابھی یا بڑی رائے کی سطح قائم کر سکتا ہے۔

گورنمنٹ پنجاب کے بک ڈپو کی ملازمت سے پیشتر قیاساً مولنا حالی کے خیالات وہی تھے جو طرز قدیم کے تعلیم یافتہ آدمی کے ہو سکتے ہیں لیکن بک ڈپو کا تعلق اس قسم کا تھا کہ جو کوئی کتاب کسی زبان سے ترجمہ یا تالیف ہو کر شائع کیجاتی وہ پہلے انکی نظر سے گذرتی۔ اس قسم کی کتابوں میں تراجم کا حصہ زیادہ تھا۔ ان کے مطالعہ سے مولنا حالی کو مغربی لٹریچر پر عبور کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا اور جب مغرب کے طرز ادا اور اسلوب بیان سے حسین و لفرسی کے ساتھ اصلیت کا بھی پہلو عموماً موجود ہوتا ہے مانوس ہو گئے تو انکی آنکھیں کھلیں اور انھوں نے دیکھا کہ انکی شاعری کا درجہ کیا ہے۔ اصلی پھولوں کے آگے مصنوعی پھول کبھی پسند نہیں ہوتے۔ انھوں نے معلوم کر لیا کہ ہماری شاعری بالکل لپست حالت میں ہے اور جس چیز سے یورپ والے اخلاق و معاشرت کی اصلاح کا کام لیتے ہیں ہمارے یہاں وہ حد درجہ مخرب اخلاق بن گئی ہے اور اُس سے اصلاح و ترقی میں امداد حاصل کرنے کی توقع اُس وقت تک بالکل فضول ہے جب تک اُس میں اُسکے حقیقی اوصاف نہ پیدا کیے جائیں خیالات یہ انھیں تھی جس میں مولنا حالی شروع شروع میں یقیناً گرفتار تھے ہونکے لیکن فراست و ذکاوت کی امداد سے بالآخر انھوں نے نتیجہ نکال لیا کہ اردو شاعری نہایت ذلیل ہو رہی ہے اور فائدے کی جگہ اس سے ملک و قوم کو نہایت سخت مضرت پہنچ رہی ہے۔ اور جب روضہ سخن کے چہرے کے بد نما خال و خط جنھیں تصنع اور استعاروں کے پو ڈرنے چھپا رکھا تھا اس طرح ظاہر ہو گئے تو جس راستے پر پہلے قدم پرچے تھے اُسے ایک قلم ترک کر دینے کی ٹھان لی۔ خیالات میں انقلاب آیا اور خود انھیں کے لفظوں میں

تو دستکاروں کا غیض و غضب انتہائی درجے پر پہنچا ہوا تھا۔ پوڈ
ہیم نے جو انگلستان کا ایک وسیع النظر مورخ تھا جب اپنے ریلے
شائع کیے تو پادریوین اسکی مخالفت کا ایک طوفان عظیم برپا ہو گیا
تھا۔ مختصر یہ کہ اصلاح کا کام کچھ عرصہ تک اعتراضات کا ہدف بنا رہتا
حالی کیونکر مستثنیٰ رہتے؟ مخالفت کی ترکش میں کوئی تیر نہ تھا جو اپنر
نہ چھوڑا گیا ہو لیکن انکی سلامت روی اور مستقل مزاجی نے سپر
کا کام دیا اور جو کچھ گولڈ اسمتھ نے اپنی نظم کو خطاب کر کے کہا تھا کہ
جہاں کہیں تجھے نکلتے جینی ہو تو وقت کا مقابلہ کیجیو اور بادِ مخالف کے

جھگڑوں پر غالب آئیو اور اپنے دردناک نالوں سے سچ کی برد کیجیو
وہ مولنا حالی نے اپنے قول و فعل سے ثابت کر دکھایا۔ ایک دفعہ
جو شاعرے سے یہ لکھراٹھے کہ ۵

بلبل کی چین میں ہمزبانی چھوٹی بزم شعراء میں شعر خوانی چھوٹی
جب سے دل زندہ تو نے ہکا چھوٹا بنے بھی تری رام کہانی چھوٹی
تو پھر نہ بیٹھے۔ بزم نشینوں کا اصرار اچھلی انسیت، دوستوں کی
مروت، ان تمام نے دامن پڑا اگر حالی نے یہ لکھ کر بھیجا چھڑایا ۵
اب اُلفت نہ چاہت نہ جوانی نہ تنگ سر ہو سوتے ہی عشق سے دل خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھتے غزل میں آخر نہ رہی چیز وہ مضمون سمجھا نیوالی
جو تجویز ہونسا رہتی ہو اسکی کامیابی کے اسباب بھی خود بخود
پیدا ہو جاتے ہیں۔ حالی کو چار طرف سے معترضین اور مخالفین دشمنی
کی نظروں سے گھور رہے تھے لیکن سرسید اور انکا گروہ ہمدردانہ
محبت کے ساتھ انھیں دیکھتا تھا اور پھر جیسے جیسے تعلیم پھیلی گئی
لوگوں کے خیالات میں صلاحت آتی گئی ویسے ویسے مخالفت کی
جگہ انس کو ملتی گئی۔

کرنل آراؤڈ ڈاکٹر تعلیمات کا نام نامی ایک عرصے تک رڈ
کے یورپین محسنین کے زمرہ میں لیا جاتا تھا۔ کرنل صاحب نے اپنی

”جس شاعری پر ناز تھا اُس سے شرم آنے لگی“
مولنا حالی اپنے طرز کے موجد اور نیچرل اور قومی شاعری کے مجدد
ہیں۔ اس اعتبار سے اُن کا مرتبہ شعراء اُردو میں وہی ہو چو گزری
میں گولڈ اسمتھ کا ہو جس نے اپنے بیان کی شاعری کو ہنر لہ ایک چین
کے تھی فضول گوئی اور مبالغہ پسندی کی جھاڑیوں سے نشانہ کیا ہو
مولنا حالی اور گولڈ اسمتھ میں ایک طرح کی یون بھی مماثلت ہو کر دونوں
کو ابتدا میں خاص و عام کی مخالفت کا مقابلہ کرنا پڑا۔ گولڈ اسمتھ
یہ الفاظ اس کا ثبوت ہیں۔

اے میری پیاری نظم! تو اُن موقعوں سے پہلے بھاگنے والی نظم ہو جہاں
نفسانی خواہشوں کی طغیانی ہوتی ہو۔ تو اس بے قدری کے زمانے میں
بجائے اس کے کہ دونوں کو اپنی طرف مائل اور پاک شہرت حاصل
کرے ہر جگہ ملامت کیجاتی ہو۔ تیری بدولت عام طلبوں میں مجھے شرمندہ
ہونا پڑتا ہو لیکن جب تنہا ہوتا ہوں تو تجھے فرخ کرنا ہوں۔

مولنا حالی بھی ایک عرصہ تک ”لامت“ اور ”شرمندگی“ کا
نشانہ بن چکے ہیں۔ ایک بات اور بھی ان کے خلاف مخالفت کا جوش
بڑانے کی باعث ہوئی اُسے نفس شاعری سے حقیقت میں کوئی
تعلق نہیں مولنا حالی سرسید کی تعلیمی ہم میں ہمیشہ دست راست
کی حیثیت سے شریک تھے۔ اُس زمانے میں عامہ مسلمین سرسید
نہایت بدظن تھے اور اُن کے رفقاء کو بھی کافر و بدعتی سمجھتے تھے۔
ممکن ہو کہ اگر سرسید کا ساتھ دینے کا ”الزام“ اُن کے سر نہوتاگی
جدید طرز شاعری کی شاید اس درجے پر نہ ہوتی۔ بہر کیف اعتراضات
اور اختلافات عامہ جسطرح مصلحان قوم کے لیے ناگزیر چیزیں ہیں
اُسی طرح علوم و فنون کے نقطہ خیال سے بھی۔ ہمارے کنسر وٹیو علماء
آج بھی فلسفہ جدید کے نام سے براہِ فروختہ ہو جاتے ہیں۔ انگلینڈ میں
جارج سوم کے وقت میں جب دُخانی انجن وغیرہ ایجاد ہو رہے تھے

ذات سے مشرقی علوم و فنون کو جو تقویت پہنچائی ہو وہ باخبر صحاب سے مخفی نہیں۔ آپ نے ایک مجلس مشاعرہ بھی قائم کی تھی اور اُس میں جدت کا یہ پہلو رکھا تھا کہ بجائے مصرع طرح کے کسی خاص عنوان پر شعراء کو طبع آزمائی کا موقع دیا جاتا تھا۔ مولانا آزاد نے بھی سب سے پہلے اسی گلشن میں جدت طرازی کے نئے نئے سنائے تھے اور حالی کی نظموں پر کھارت، نشاط، امید، مناظرہ، رحم و انصاف، جبین وغیرہ اسی مشاعرے میں پڑھی گئی تھیں۔ گو یا فکر کے سانچے میں جذبات کی تصویریں جو آئندہ ڈھلکر نکلنے والی تھیں ان کا یہ ابتدائی نمونہ تھا۔

لیکن مولانا حالی کے علمی کارناموں میں جن کا تعلق ان کی عمر کے اولین حصہ سے ہو دو ایک کتابیں اور بھی قابل ذکر ہیں مثلاً "تریاق مسموم جو ان کے ایک ہموطن مسلمان کی ایک کتاب کے جواب میں ہو جس نے مسیحی ہونیکے بعد اسلام پر اپنے خیال کے مطابق چند اعتراضات قلمبند کر کے کتابی صورت میں شائع کیے تھے۔ اس طرح آپ نے ایک کتاب تعلیم نسوان کے متعلق لکھی تھی جو آج شاید کیا ہی ہو لیکن ہمارے خیال میں اس کی دوبارہ اشاعت خالی از فہم نہ ہوگی اور اس زمانے میں جبکہ نصاب تعلیم مستورات کی تکمیل میں دو تین واقع ہو رہی ہیں مولانا حالی ایسے مبصر کی تصنیف کی موجودگی بہت کارآمد ہو سکتی ہو۔ اس کتاب کے صلی میں تعلیمی دربار دہلی کے موقع پر آپ کو گورنمنٹ کے جانب سے چار سو روپیہ کا اعزازی انعام بھی عطا ہوا جو لارڈ مارٹھروڈ کے ہاتھوں آپ کو ملا تھا۔ یہ کتاب غالباً پنجاب کے مدارس میں کچھ عرصہ تک چل کر سبھی رو چکی ہو۔ ان دونوں کتابوں کے علاوہ اپنے طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ اصل کتاب فرانسیسی زبان میں تھی۔ مصر کے ایک عالم نے اس کا عربی ترجمہ کیا اور مولانا حالی

نے اسے اردو کا لباس پہنایا۔ یہ علمی خدمات ہر طرح مستحق شکر یہ تھیں اور ساتھ ہی ان سے حالی کی یاقت و علمیت کا سکہ بھی ٹھٹھکتا تھا لیکن آپ کی مابعد کی تصنیفات اور شاعری نے آپ کی منزلت کو جس رتبہ پر پہنچا دیا ہو وہ اول الذکر کے ذریعے سے ناممکن تھا مولانا کی مستقل تصانیف کی فہرست یہ ہو سکتی ہے۔

حیات سعدی

مسدس حالی

دیوان حالی

شکوہ ہند

یادگار غالب

حیات جاوید

ان کے علاوہ آپ کی پیشا نظموں مستقل قدر و قیمت کی چیز ہیں

اور بہت سے علمی مضامین شرح تہذیب الاخلاق اور دوسرے ملکی رسائل میں وقتاً فوقتاً شائع ہو چکے ہیں بجائے خود ایک ضخیم کتاب میں حیات سعدی، یادگار غالب، اور حیات جاوید میں اول الذکر شائع کی ثانی الذکر مرزا اسد اللہ خان غالب کی دور آخری کتاب سربلجام کی شرح اور مبسوط لائف ہو۔ یہ کتابیں آج کل ہندوستان کے تعلیمی طبقے میں عام طور پر سدا اول ہیں غالب کے کلام اور تصانیف کی تنقید یادگار غالب میں جس پر ایسے مین لکائی ہو وہ حالی ہی کا حق تھا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہو کہ حقیقت میں غالب کے واقعی طور پر پہچاننے والوں میں ان کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔

"حیات سعدی" غالباً اپنی قسم کی پہلی کتاب ہو اور اس کے محاسن و فضائل کے متعلق اس قدر کہنا کافی ہو گا کہ "سعدی شیرازی" کو ہندوستان جدید سے روشناس کرانے کی خدمت "سعدی پانی پتی" سے بہتر کوئی نہ انجام دے سکتا تھا۔

سرسید کی لائف اُس مقدس بزرگ اور قومی خادم کی تمام عمر کی جانکاہی اور جانفشانیوں کی مطول داستان ہو۔ جو لوگ سرسید کے متعلق ذرا اسی بات بھی دریافت کرنے کے خواہشمند ہوں انھیں اس کتاب کا مطالعہ از بس ضروری ہو۔

یہ تینوں کتابیں مفصل ریویو کی محتاج ہیں۔ محض دو ایک سطر سے انکی ظاہری و باطنی خوبیوں کا انکشاف ناممکن ہو۔ اس مضمون میں چونکہ ہمیں اپنی رائے زنی کو انکی شاعری تک محدود کرنا ہوا اس لیے ہمیں افسوس ہو کہ انکی نثر تصانیف کی بابت تفصیل سے نہیں لکھ سکتے۔

اب ہم مولانا حالی کی شاعری پر نگاہ تنقید ڈالتے ہیں۔ سب سے پہلے ہم اُن کے دیوان کو لیتے ہیں اُسکے بعد انکی متفرق نظموں کو دیکھیں گے۔ مسدس حالی کی نسبت ہمیں جو کچھ کہنا تھا وہ یہ ہیں گزر چکا ہو۔

مسدس میں مولانا حالی کا دیوان شائع ہوا۔ دلی دکنی کا کلیات جب پہلے پہل دلی میں آیا تھا تو اسوقت وہاں کی علمی مجالس میں جو کیفیت پیدا ہوئی تھی وہی ہندوستان کے ٹریریا حلقوں میں دیوان حالی کی اشاعت سے دیکھنے میں آئی۔ اپنے اپنے وقت میں دونوں نئی چیزیں تھیں اور دیکھنے والوں کے لیے حیرت و استعجاب بڑھاتی تھیں لیکن ان دونوں کے ابتدائی تاثرات میں فرق ہو۔ دلی کے کلام کی تقلید کا شوق بہت جلد تمام ہندوستان میں پھیل گیا اور آج بھی اُسکی لکیر کے فقیر بیان کو نے کو نے میں موجو ہیں لیکن حالی کے کلام کو یہ عزت نہیں ملی۔ انکی روش سے اہل ملک پہلے سے کچھ واقف تھے لیکن دیوان حالی کی اشاعت تک وہ قابل مصنف کی ہمہ گیر طبیعت کے رنگ سے واقف تھے۔ عام مذاق کو دیکھتے ہوئے پُر جوش خیر مقدم کی توقع حضرت حالی کو خود بھی

نہ تھی اور ایسا ہی ہوا کہ اُنکے مجموعہ افکار نے قدامت پسندوں کو بجائے خوش کرنے کے مول کر دیا۔ اعتراضات کی بھرمار اور مخالفت کے طوار سے اُنھوں نے حالی کا ناطقہ بند کرنا چاہا لیکن مستقبل شناس آنکھیں اب سے کئی صدیوں آگے تک کے واقعات نگاہ میں رکھتی ہیں۔ حالی یہ بھی جانتے تھے کہ اس قسم کی مخالفت بھی لازمی چیز ہو اگر اسکا مقابلہ ثابت قدمی سے کر لیا تو میدان مارا ہوا ہو۔ یہی بات آخر کو سچ ثابت ہوئی۔ وہی طبائع جن کے لیے کلام حالی زہرہ سے زیادہ تلخ تھا اُس میں اب شہد و شکر کی حلاوت پاتی ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ابھی باشندگان ہند کی ایک کثیر تعداد ایسی ہو جو اُنھیں قدما کی عظمت کا مستحق نہیں جانتی تاہم اُن کے کلام کے سودمند نتائج کا ہر شخص کو اقرار ہوا و حالی کی سب سے بڑی جیت یہی ہو۔

دیوان حالی میں سب سے پہلے اور مقدمہ اور دیباچہ کے بعد قطعات کو گلہ دی گئی ہو جو اخلاقی نکات پر مبنی ہیں۔ پھر غزلیات کی باری آتی ہے۔ اُسکے بعد رباعیات ہیں۔ آخر میں قصائد ترکیب بند مدحیہ قطعے، متفرقات، اور تاریخیں ہیں۔ دیوان کا مقدمہ بجائے خود فن شاعری پر ایک مبسوط اور معرکہ الآرا کتاب ہے۔ اس میں شعر کی طرح و ذم، تاثیر سخن، مختلف ممالک کی شاعری کے مدارج، اسلام اور شاعری، شاعری کے عروج و زوال، شاعری اور سلطنت کے تعلقات عہد وسطیٰ اور زمانہ اخیر کی شاعری کا فرق، سوسائٹی پر شاعری کا اثر، غرض اس قسم کے اکثر نہایت نازک اور دلچسپ مسائل پر بہت خوبی سے معنی خیز رائے زنی کی ہے۔ اردو شاعری کے عیوب و زور و روشن کی طرح ظاہر کیے ہیں لیکن اساتذہ متقین کا ذکر نہایت متانت اور تہذیب کیا گیا ہے۔ خواہ مخواہ کسی کو اعتراضات کا نشانہ نہیں بنایا۔ آخر میں اردو فن شعر کی صلاح

کے باب میں جو قابل قدر خیالات ظاہر کیے گئے ہیں وہ حصہ بھی خواہ ان ادب اُردو کے خاص غور و خاص کا محتاج ہو جو شعراءِ قدیم شاہراہ سے ہٹ کر حالی کے قدم بقدم چلے ہیں اُن سے قطع نظر اگر پرانی شاعری کے دلدادہ اور حالی کے نام پر خار کھانے والے حضرات اُسے ٹھنڈے دل سے دیکھیں تو ممکن نہیں کہ اُنھیں حالی کی رائے سے اتفاق نہ کرنا پڑے۔

یہ ممکن ہو کہ حالی کے مخالفین اُنکی شاعری کو کسی پایہ کا سمجھیں اور یہ بھی ہو سکتا ہو کہ حالی کی شاعری کسی پایہ کی نہ بھی ہوتا ہم مقدمہ دیوان حالی اپنے ذی منزلت مصنف کی اصابتِ رائے کی کافی دلیل ہو۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ حالی کو فن شاعری کے اصول و فروع اور اسکی تاریخ پر کتنا قابو حاصل ہو جس مسئلہ قلم اُٹھایا ہو اُسکے ہر پہلو پر نظر ڈالی ہو اور اپنے خیالات کی تائید عقلی دلائل کے ساتھ مشرق و مغرب کے اُن اہل الرائے اشخاص کی آراء سے کی ہو جو ہر طرح مستند اور قابل قبول سمجھے جاسکتی ہیں اخلاقی قطعات، گلستان کے باب ہستم کے مضامین کا گویا جواب ہیں جو سبق آموز باتیں اُنھیں سوچھی ہیں اُنھیں نظم کا لباس پہنا کر قوم کے سامنے پیش کر دیا ہو۔ چند عنوان مختلف قطعوں کے درج کیے جاتے ہیں۔ ناظرین اُن سے نفس مطلب کا قیاس کر سکتے ہیں ”چھوٹوں کا بڑا بن جانا“ ”شعر کی طرف خطاب“ بے تمیزی اپنے زمانہ“ ”آزادی کی قدر“ ”خط اہل اللہ“ ”نیشن کی تعریف“ ”استفادہ“ ”اسراف“ اور علیٰ ہذا القیاس۔

ان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہو کہ نصیحت کی تلخی کو قصے اور کالم کی چاشنی و دیر خوشگوار بنایا ہو۔ پند و موعظت کا بہترین طریقہ یہی ہو کہ اُسے گفتہ آید در حدیث دیگران کے مصداق اس طرح ادا کیا جائے کہ سامع کو اسکی تمیز نہ ہو کہ خطاب اُسکی طرف ہو۔ دوسری

خوبی ان قطعات میں یہ ہو کہ جن مضامین پر طبع آزمائی کی گئی ہو وہ زمانہ جدید کی ضروریات کے مطابق ہیں۔ دولخ و جنت اور خوشنوتر کی موٹگافیوں سے سروکار نہیں رکھا بلکہ جو بات کہی ہو وہ چچی تلی اور آج کل کے رنگ میں۔ اس فرق کو بوضاحت ذہن نشین کرنے کیلئے ہم اُن کا ایک منتخب قطعہ درج کرتے ہیں۔ اس سے ناظرین کو ہمارے منشا کے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ فرماتے ہیں ۵

حالی سے کہا ہے کہ ہر اسکا سبب کیا جب کرتے ہو تم کرتے ہو سرف کی موت
لیکن بخلان آپکے سب اگلے سخنور جب کرتے تھے کرتے تھے بخیلوں کو ملامت
حالی نے کہا ہے کہ نہ پوچھو سبب اسکا یاروں کیلئے یہ بیان موجبِ رقت
کرتے تھے بخیلوں کو ملامت سلف اُس وقت جب قوم میں افراط و تفریط تھی
اور اب کہ نہ دولت ہو نہ ثروت نہ قبال گھر گھر پر چھایا ہوا افلاس و فاکت
ترغیب سخاوت کی ہر اب قوم کی ایسی پرواز کی ہو چوڑیوں کو جیسی ہوت
بعض قطعے اختصارِ مضمون و کثرتِ معنی کے اعتبار سے مثیل ہیں
”خط اہل اللہ“ کے عنوان سے ایک جگہ فرماتے ہیں ۵

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب ری جو تھا سو شہم پریم۔ اپنا تھا پیرایا
”نہائے ٹھکے سب جو تھے مردِ صادق“ یہ کیکے شیخ کا دل میا خستہ بھرا یا
ہم نے کہا تم میری باقی رہی نہ پیری“ یہ کیکے ہم بھی رہے اور کبھی لایا
”شعر کو خطاب کر کے آپ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہو اُسکے صحیح ہونے
میں کسکو شک ہوگا۔ کہتے ہیں ۵

اے شعر و لہریب نہ ہو تو تو غم نہیں پر تجھ پہ جیت ہے جو نہ ہو لگداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
اہل نظر کی آنکھ میں رہتا ہو گرجیز جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھنا باز تو
چپ چاپ اپنے سچ سے کیے جاؤ نہیں گھر اونچا ابھی نہ کر علم مستی باز تو
پہلے دو شعر اس امر کی تشریح ہیں کہ شعر فی الحقیقت کسکو کہتے ہیں
آخری دو نون اشعار کی لئے گولہ سمیٹہ کی تان کا مزادیتی ہو جو کتا

ہو کہ تو وقت کا مقابلہ کیجیو اور باد مخالف کے جھگڑو نہ پر غالب ہو
 ترک سوال کی نصیحت کس جدت کے ساتھ نئے پیرائے میں
 کی ہو۔ معنوی طور پر گویا یہ بھی جتا دیا ہو کہ مہذب اور ترقی یافتہ
 اقوام گداری کو سخت عیب خیال کرتی ہیں۔ دیکھیے ۵
 عادت تھی ایک فقیر کی کرتا تھا ببال اگر بیکے سوانہ کسی سے تھا انگنا
 مدت تک سکی جب بھی دیکھی گئی روش پوچھا کیسے اُس سے کہ ہکا بھکا کیا
 بولا کہ عادت اس لیے کی ہو یہ اختیار چھٹ جائے تاکہ مجھ سے یہ کا سوال کا
 پہلے تو بھاگوں نوسے مٹی تھی روز بھیک آتا تھا انگنے میں بہت بھیک کے مزا
 پر جب ہو سوال کا اس قوم پر مدار منت عجز سے کبھی ملتا نہیں نکا
 امیہ کہ انگنے کی چھوٹ جائے لت گر چند روز اور رہا اس سابقہ
 ظاہر ہو کہ پند نصیحت میں زبان اور لطف بیان کا چٹخا بہت
 مشکل سے پیدا ہوتا جو خصوصاً جب شاعر کو خود یہ باتیں ناپسند ہوں
 جو لوگ اس قسم کے قطعات میں واسوخت امانت یا مثنوی میر حسن کا
 مزا ڈھونڈتے ہوں وہ غلطی پر ہیں مجلس وعظ ہم سن احباب
 کی صحبت کی طرح کبھی کیفیت انگیز نہیں ہو سکتی۔ البتہ کہیں کہیں
 کلام کی روانی اور محاورات کے استعمال سے دلچسپی پیدا ہو گئی
 ہو۔ مثلاً ۵

تم لے خود پر تو طبیعت کے بندو ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
 نہیں کام کا تلکو اندازہ ہرگز جدھر ڈھل گئے ہو ہے بس اُھر کے
 جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت تو چیخ اٹھے دودن میں ہائے گھر کے
 چڑھا بھوت عشق جوانی کا سر پر تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
 جو کھانا تو بچہ جو پینا تو آت گت عرض یہ کہ سرکار میں بیٹ بھر کے
 زبان اور طرز بیان کی کمی قطعات میں رہ گئی ہو اور یہ کمی بعض
 اوقات ناگزیر ہوتی ہو اسکی تلافی غزلیات میں بہت کچھ ہو گئی ہو۔
 غزلیات حالی دو حصوں میں باعتبار اوقات فکر تقسیم ہو سکتی ہیں

یعنی قدیم و جدید۔ دونوں قسم کی غزلوں کا مقابلہ کر نیسے رنگ طبیعت
 کے تدریجی تغیرات کی تیز آسانی ہو جاتی ہو۔ قدیم غزلوں کے دیکھنے
 سے پتہ چلتا ہو کہ ابتداء میں بھی آپ کا مذاق بہت سنجیدہ اور متین
 تھا۔ یہ ہو سکتا ہو کہ اس مجموعہ میں آپ کی وہ غزلیں عمدہ شامل
 کی گئی ہوں جنہیں مستی سرسہ اور کنگھی چوٹی کے مضامین لکھے گئے
 ہوں۔ کیونکہ ہمارا خیال ہو کہ اسکی بابت ہم اور بھی کہیں کنایت
 لکھ چکے ہیں کہ پہلے پہل انسان کو اسی قسم کے خیالات نظم کرنے پڑتے
 ہیں تاہم اگر ان قدیم غزلوں کو جنکی صراحت موجود ہو بالکل ابتدائی
 نہ سمجھا جائے تو بھی ان سے یہ قیاس ہو سکتا ہو کہ رنگ جدید اختیار
 کر نیسے پیشتر انکی شاعری کا کیا عالم تھا۔ ہائے خیال میں اصولاً یہ سخت
 غلطی ہوگی اگر ہم کلام حالی میں تیز جرات اور دلغ کی خصوصیات
 تلاش کریں جب حالی نے اپنا مشرب ہی جدار کھا تو انہیں پرانی
 باتوں کا ہونا ایسا ہی ناممکن ہو جس طرح افلاطون کا شیکسپیر بن جانا۔
 دیکھنا صرف یہ ہو کہ شاعری کا جو مفہوم حالی قرار دیا ہو اُس لحاظ
 سے اُن کے کلام کی کیا حالت ہو اور جب ہم اس معیار پر اُسکو
 دیکھتے ہیں تو وہ کہرا اُترتا ہو۔ انکی پرانی غزلیں بھی انکی اعتدال
 پسندی اور سلامت روی کا ثبوت ہیں۔ دیکھیے یہ مطلع کس قدر

بلوغ ہے ۵

ہو جستجو کہ خوب ہے غزب تر کمان اب ٹھیرتی ہو دیکھیے جا کر نظر کمان
 اسی کے ساتھ یہ شعر غالب کے طرز بیان کی یاد دلاتا ہو ۵
 یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر تھا اُسکو ہم سے ربط اگر اس قدر کمان
 مند رجہ ذیل مطلع باعتبار اختصار و طرز ادا کے کتنا اچھا ہو ۵
 رنج اور رنج بھی تنہائی کا وقت پہنچا مری رسوائی کا

ایک غزل کے یہ چند اشعار قابل ملاحظہ ہیں ۵

پیش از تو ہو عشق کی کا نشان تھا تھا حسن میزبان کوئی میمان تھا

ملنے ہی اُنکے بھول گئے کلفتیں تمام
کچھ میری بخودی سے تھا ازبان نہیں
رات اُسکوبات بات پہ تلو تلوئیے جواب
اور دیکھئے فرماتے ہیں ۵

آپ وہ اگلا سالقات نہیں جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
رج کیا کیا ہیں ایک جان کے ساتھ زندگی موت ہے حیات نہیں
دور دورہ ہے مظهر خورشید جاگ اے آنکھ دن ہر ات نہیں
زندگی کو کس خوبی سے موت ثابت کیا ہو۔ اور آخری شعر معرفت
شناسی کا گویا آئینہ ہو۔ اس طرح ایک یہ شعر کس قدر مضمون خیز ہو ۵
کوئی محرم نہیں ملتا جان میں مجھے کہنا ہی کچھ اپنی زبان میں
یہ مختصر انتخاب اُنکی قدیم غزلیات کا ہو۔ جدید طرز پر جو کچھ کہا ہو وہ
دُنیا ہی آوری مضمون آفرینی کے ساتھ سوز و گداز اور درد کا پہلو
ہاتھ سے جانے نہیں پایا۔ ان غزلوں میں ایک بڑی خوبی یہ ہو کہ اکثر
مسلل اور قطعہ بند ہیں، شروع سے آخر تک ایک ہی مضمون کے
اشعار لکھے گئے ہیں، اور سلسلہ خیالات کے اس طرح قائم رہنے سے عجیب
لطف پیدا ہو جاتا ہو، شادمانی الوداع، جوانی الوداع، اس زمین
میں کہتے ہیں اور کس حسرت سے کہتے ہیں ۵

اے بہار زندگانی الوداع اے شباب اے شادمانی الوداع
اے بیاض صبح پیری السلام اے شبِ حدیجوانی الوداع
روزگار ضعف و سستی الصلا وقت سعی و جانفشانی الوداع
فرست عشق و جوانی الفراق درد عیش و کامرانی الوداع
تجکسو سمجھے تھے نعیم جاودان اے نعیم جاودانی الوداع
آگاہی کنارے پر جہاز

الوداع اے زندگانی الوداع

ہم اوپر ایک جگہ کہ چکے ہیں کہ حالی کے کلام کو خود اُن کے

مقرر کردہ معیار پر جانچنا چاہیے۔ اس لیے ہمیں بیان یہ دیکھنا ہو کہ مولانا
نے غزل گوئی کے کیا اصول رکھے ہیں اور پھر یہ کہ خود اُنھوں نے اُنکی
پابندی کہاں تک کی ہو عشقیہ مضامین کے متعلق آپکی رائے ہو کہ
وہ ایسے جامع الفاظ میں ادا کیے جائیں جو دوستی اور محبت کی تمام انواع
واقسام اور تمام جسمانی اور روحانی تعلقات پر عادی ہوں۔

نفس مضمون کے متعلق آپ کا خیال ہو کہ اس کا دائرہ وسیع کرنا
چاہیے، یعنی محض عشق و محبت کی باتوں پر محدود کرنا چاہیے بلکہ
جس بات کا سچا عیش اور دلولہ اُٹھے خواہ اُس کا منشا خوشی ہو یا غم
یا حسرت یا ندامت یا شکر یا شکایت یا حُب وطن یا قوی
ہمدردی یا کوئی جذبہ جذبات انسانی میں سے اُسکو
بھی غزل میں بیان کر سکتے ہیں۔

لیکن حقیقت یہ ہو کہ مولانا کا یہ مشورہ بہت بعد از وقت ہو۔ ہمیں
نے خود غزلیات کا انحصار عشقیہ باتوں پر نہیں رکھا۔ ہاں اُن کے
ہیاں حُب وطن، ایتنا نفس، قومی ہمدردی، اور اسی قبیل کے
مضامین پر بہت کم توجہ کی گئی ہو اور شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ اُن کے
زمانے میں اسکی ضرورت نہ تھی۔ ہاں آج کل اس قسم کے جوش و خروش
خیالات کے ذریعے سے قوم کے جمود کو توڑنا فرض تھا اور اس میں
کلام نہیں کہ اس مقصد کی تکمیل مولانا حالی کے دم سے ہوئی مختصر
یہ کہ مولانا کی غزلیات اُن مضامین پر زہین جنگی تاثیر کسی مردہ قوم
میں زندگی کی حرکت پیدا کر سکتی ہو۔ فرماتے ہیں ۵

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہا یا یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا
اے بانگِ طبل شاہی دن ہو گیا جب آخر خوابِ گران سے تو نے ناخ ہن جگایا
تقلید قوم ہی پر گر ہو مار تحسین تو ہنے دوستو کی تحسین ہاتھ اٹھایا

باپ کا جو چہی پسر وارث ہو ہنر کا بھی اُسکے گرد ارث

صلح ہے اک مہلت سامان جنگ کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تشنگ
عہد گیتی پر نہ بھولین کامران آخر اسکی آشتی لائیگی رنگ
علم کیا، اخلاق کیا، ہتھیار کیا، سب بشر کے مار کھنے کو ہیں ٹھنگ
کام کا شاید زمانہ ہو چکا دلیں اب ٹھتی نہیں کوئی اُٹنگ
کا ہشون سے پرورش پاتی ہر روح اب لگا کھایا پیاسا کے انگ
حد کے یہ چند شعر معانی کے اعتبار سے کس قدر دلچسپ اور مضمون خیز

ہن ۵

کابل ہو جوازل سے وہ ہو کمال تیرا باقی ہو جواب تک وہ ہو جلال تیرا
کادش میں ہو اتنی نگد امین ہو طبعی جو حل ہوا نہو گادہ ہو سوال تیرا
دل ہو کہ جان تجھ کو نہ کر عزیز کیئے دل ہو سو چیز تیری جان ہو سوال تیرا

لیکن نیچے کے یہ دو شعر اور ہی کیفیت سے پُر ہیں ۵

نہجی رکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے

ہے سدا نامراد جو یاں اُنھیں بھی اُسید وارد کیا

خبر نہیں یہ کہ کیا ہو کیا ہو کون ہو اور تو کہاں ہے

پہ لپنے میں اور تجھ میں ہمنے علاقہ اک اُستوار دیکھا

نعت کا یہ شعر کتنا بلیغ ہو۔ اس سے زیادہ صحیح تعریف ناممکن تھی ۵

قال ترا اور حال نشہ وحدت میں اوڑھنا تیرا خدا اور کچھو نا خدا

مسئلہ عشق کی نزاکت و دقائق سے مولانا حالی بے خبر نہ تھے لیکن

بعض متقدمین کی بدولت عشق بھی لڑکون کا کھیل بن گیا اور

رفتہ رفتہ عوام الناس اس پاک جذبہ کو بھی شاہد بازی کا مراد و

سمجھنے لگے حالی کو معلوم تھا کہ اس حالت میں جبکہ اُسکے حقیقی

معانی سے بے خبری کا یہ عالم ہو عشق و محبت کی تعلیم قوم کیلئے غیر مفید

ہوگی۔ یہی سبب ہے کہ اُنھوں نے اکثر اسکا ذکر ایسے الفاظ میں کیا ہو

جس سے تشویش کی جگہ تحریف کا پہلو نکلتا ہو۔ کہتے ہیں ۵

عشق تو نے اکثر قوم کو کھا کے چھوڑا جس گھر سے سر اٹھایا اُسکو بٹھا کے چھوڑا

گھر ہنر و کار کا ناخلف نے لیا تیرا ہر کون لے ہنر و ارث
ہو اگر ذوق کسب سے آگاہ کرین میراث سے حذر و ارث
قوم بے پرہیز دین بکیس ہے گئے اسلام کے کدھر و ارث
جو جذبات قومی امراض کے حق میں اکیسر سمجھے جاتے ہیں اُنکے
اُکسانے میں مولانا حالی نے کمال دکھایا ہو۔ جو لوگ اپنی پست حالت
دیکھ کر ہمت ہار بیٹھے تھے اُنھیں سطح ڈھارس دیتے ہیں ۵

ہو کہین اقبال کی نوبت کہین ہمار کی سب کو کرنی ہوئی پوری پنی اپنی باریاں
زیست بے حق کو کھو جائے بسر کرنی محال اتنی بھی لے عاقوا چھی نہیں بشاریاں

تلخی دوران کے ہیں سب شکوہ سنج یہ بھی ہو یا رو! کوئی رنج و نین رنج
رنج و شادی بان کے ہیں سب ثبات اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج

پہنچ اے خضر کہ موقع ہے مدد گاری کا ڈلگاتی ہو بہت دیر سے مسجد بار میں ناؤ
لے شرافت تجھ کو کتنا ہو اگر رفت تو تک آجکل کیجیے کیا ہو یہی بازار میں بھاؤ
قافلے ساتھ کو چاہیے حرم کے لگ بھگ وقت اب ہاتھ سے جاتا ہو چلتے ہو تو آؤ
قوم کے ظاہر و باطن کی تصویر جو مندرجہ تحت شعرون میں الفاظ کے

ذریعے کھینچی ہو کتنی صحیح اور سچی ہو ۵

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم پر ہر کھنہ میں داغ اک عیب پاتے ہیں ہم

دلیں در عشق نے دیکھ کر کھا ہونگ پر اسے آلودہ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم

ٹھہرتے جاتے ہیں جتنے چشم عالم میں بھلے حال نفس و کما اتنا ہی بڑا پاتے ہیں ہم

گو بھلائی کر کے ہم جسٹو خوش ہوتا ہو جی ہنشین اُس میں گرد و دریا پاتے ہیں ہم

ہر ردائے نیک نامی دوش پر اپنے کر داغ رُسوائی کے پھر زیر و پاتے ہیں ہم

نور کے ہمنے لگے دیکھے ہیں لے حالی مگر

رنگ کچھ تیری الاپ نہیں نیا پاتے ہیں ہم

ان اشعار کی کیفیت اور خیالات کی حقیقت قابلِ داد ہو ۵

اوقات نہایت موثر طریقے پر دکھایا ہو۔ اسلامی عروج و زوال کا مرقع
ایسا نہیں کہ کوئی دیکھ کر اپنے دل کو قابو میں رکھ سکے ۵

پھر زخم پھوٹ نکلا حالی نہ چھوڑا تھا فضل خزان کا قصہ ذکر گل سخن میں
وہ قوم جو جہان میں کل صدائیں تھی تہنہ سنا بھی؟ سپر کیا گزری سخن میں
وہون گئے کہ موتی مشہور عدج کے ہو کال موتیوں کا آب سر صبر میں
قبر ویش پر ہو بس غراب قرن کا زندہ ادیس کی باقی نہیں قرن میں
خرد و بزرگ ساری میں بدحوہں گویا لٹنے کی قافلے کی پہنچی خبر وطن میں
حالی بس اب نہیں بن سننے کی باقی مانا کہ ہو بہت کچھ دعت ترے سخن میں
نو کہ بانچے تیری سینوں کو چھید ڈالا،

ترکش میں ہو یہ پیکان لہر زبانی ہن میں

رباعیات حالی بھی دیگر اصناف سخن کی طرح مفید خیالات کی طبع
ہیں۔ کہیں وحدت کا ترانہ ہو کہیں صلح کُل کی لے اور کہیں انقلاب
عالم پر فلسفیانہ جذبات کا اظہار۔ یہ دور با عیان جن میں وجود و وحدت
باری تعالیٰ کی پُر اثر اور سچی دلائل سے کام لیا گیا ہو بہت مشہور ہیں ۵
کا شاہی ہر اک جگر میں اٹکا تیرا حلقہ ہو ہر اک گوش میں اٹکا تیرا
مانا نہیں جسے تجکو جانا ہو ضرور بھٹکے ہوئے و لمین بھی ہو کھٹکا تیرا

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا آتش پہ معان نے راگ کا یا تیرا
دہری نے کیا دہرے تعبیر تجھے انکار کسی سے بن نہ آیا تیرا
قوموں کے باہمی اتفاق اور میل جول کی خوبی یوں ظاہر کی ہے
ہندو سے لڑیں گبر سے سیر کرین شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کرین
جو کہتے ہیں یہ کہ ہو جہنم دُنیا وہ آئین اور اس ہشت کی سیر کرین
دُنیا کے فانی ہونے سے کسکو انکار ہوگا لیکن یہی خیال اس اوقات
بڑے کاموں کی تکمیل میں ہارج ہوتا ہو۔ اس نکتہ کو مولانا حالی
یوں ادا فرماتے ہیں ۵

ابرار تجھے ترسان احرار تجھے لرزان جو زبہ تیری آیا اسکو گرا کے چھوڑا
راؤ کے راج چھینے شاہو کے تاج چھینے گردن کشو کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا
آگے چل کر تو صاف صاف کہہ دیا ہو ۵

جیتے جی موت کے تم مُنہ میں نہ جانا ہرگز دوستوں نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
عشق بھی تاک میں بیٹھا ہو نظر بازی دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑنا ہرگز
چاہت اک طلعت کردہ ہو رقع میں نہان کسی دلالہ کے دھوکے میں نہانا ہرگز
ہاتھ ملنے نہون پیری میں اگر حسرت تو جوانی میں نہ یہ روگ لگانا ہرگز
یہ چاروں شعر مولانا حالی کی ایک مشہور غزل سے لیے گئے ہیں
یہ غزل سر تا پا مرصع ہو اور تسلسل کلام میں جان دہلی کا ذکر آگیا ہے
وہاں حسرت دیاس کا عجیب عالم پیدا ہوتا ہو ۵

تذکرہ دہلی مرحوم کالے دست نہ چھوڑ نہ سنا جاہنگاہم سے یہ فسانا ہرگز
ڈھونڈتا ہوں دل شوریدہ بننے مطرب درواگیر غزل کوئی نہ گانا ہرگز
صحبتیں اگلی مصور میں باؤٹلی کوئی دیکھ پ مرقع نہ دکھانا ہرگز
لیکے داغ آئینہ گاسینے پہ بہت لے سیاح دیکھ اس شہر کے کھنڈر نہیں جانا ہرگز
چپے چپے ہیں یاں گوہر کیتا ہر خاک دفن ہوگا کہیں اتنا خزانہ ہرگز
کبھی لے علم و ہنر گھر تھا تھارادلی ہلکو بھینے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز
کروا مر کے یگانوں نے یگانہ ہلکو ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں گانا ہرگز
داغ و مروج کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز
رات آخر ہوئی ادب بزم ہوئی زیر و زبر اب نہ دیکھو گے کبھی لطف شاہ ہرگز

بزم ماتم تو نہیں بزم سخن ہو حالی

یاں مناسب نہیں بڑو کے رُلانا ہرگز

حالی کی نظروں سے دہلی کا سامان جو گزرا تھا اسکے درہم برہم ہونے
جوالم آگین جذبات پیدا ہو سکتے ہیں انھیں حالی سے زیادہ کون
محسوس کر سکتا تھا۔ حق یہ ہو کہ حالی نے یہ داستان چھوڑ کر اپنے ساتھ
سامعین کو بھی خوب رُلایا ہو اس طرح قومی انقلاب کا فوٹو بھی بعض

دُنیا سے دنی کو نقش فانی سمجھو۔ رودادِ جان کو اک کہانی سمجھو
 پر جب کرو آواز کوئی کام بڑا ہر سانس کو عمر جاودانی سمجھو
 غریبات اور زبایات کے بعد قصائد ہیں۔ متقدمین نے قصائد نگاری
 کے جو اصول موضوعہ مقرر کیے ہیں انکے اعتبار سے خصوصیت کے ساتھ
 یہ صنفِ حاکمی کے مذاق سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی۔ لیکن انکی
 جدید مدحیہ نظمیں اور قصائدِ اسباب کا ثبوت ہیں کہ اس خازنِ مین
 بھی اُنھوں نے اپنا علیحدہ راستہ نکال لیا ہے۔ حال میں آپ کی
 ایک تازہ نظم "منور نظام میر عثمان علیخان فرما زو اب دکن کی تخت نشینی
 لے موقع پر شائع ہوئی تھی اُسکے چند اشعار مندرجہ ذیل سے اُن کا رنگ
 طبیعت ظاہر ہو گا۔ سعدی کی طرح حالی کا بھی کہنا یہی ہے کہ ۵

چہ حاجت کہ نہ کرسی آسمان نہی زیر پائے قزل ارسلان
 گم پائے عزت برا فلاک نہ بگورے اخلاص بر خاک نہ

مبالغہ اور تصنع کی گلا کاریوں سے کلام میں گلزار کی سی دل فریبی
 پیدا کر نیکی جگہ اپنے مدح کو اُسکی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنا پہلا فرض
 سمجھا ہے۔ فرماتے ہیں ۵

فلک مرتبت میر عثمان علیخان مبارک تھیں مسند شہیاری

مبارک ہو تمکو وہ دشوار منزل جہان چتے چتے پہ ہونہ داری

مبارک بزرگون کی میراث تمکو جنھوں نے کہ تھیلی ہیں گڑیاں سای

اب انکی جگہ آپ کو ہے اٹھانا خدا کی امانت کا یہ بوجھ بھاری

جو بے بس ہیں دنیا ہو اُنکو سہارا جو بے یار ہیں اُنکی کرنی ہو یاری

نکتے جو ہیں اُن کو کامی بنانا بڑا نادل اُنکا جو ہیں کاروباری

جگانا اُنھیں نیند کے جو ہیں تاتے پڑانا اُنھیں علم سے جو ہیں تاری

قصائد کے بعد مدحیہ قطعات ترکیب بند اور تاریخی قطعے ہیں اور شاعر
 کی طبعی مناسبت کے لحاظ سے بہت اچھے ہیں لیکن ہمارے خیال
 میں انکی عظمت و منزلت یہ چیزیں نہیں بلکہ انکی وہ نظمیں ہیں جنکے

عملی نتائج سے مسلمان آج متمتع ہو رہے ہیں۔ انکی تعداد ایک دو نہیں
 بلکہ بیسوں ہو، اور انہیں سے بعض اپنی شہرت کے لحاظ سے مسدس
 کے بعد ہی جگہ پانے کا استحقاق رکھتی ہیں۔ مثلاً قصیدہ الغیاثہ اور
 شکوہ ہند۔ اول الذکر جس موثر پیرایہ میں لکھا گیا ہے اُسکا اندازہ
 چوٹ کھائے ہوئے دل خوب کر سکتے ہیں۔ اسے شروع سے آخر
 تک دیکھئے اور عالم سکوت میں اسکی معنی آفرینیوں اور طرز بیان کی
 خوبیوں کا موازنہ کیجئے۔ اللہ اللہ کس جوشِ محویت میں کہتے ہیں ۵
 لے خاصہ خاصانِ سلطنتِ عالمہ اُست پہ تری آئے عجبت پڑا ہو
 یہی حال شکوہ ہند کا ہے۔ ایک ایک لفظ تیر و نشان کا کام کرتا ہے۔
 مولانا حالی کے مبصر اور عالی دماغ شاعر ہونکی سب سے بڑی دلیل یہ ہے
 کہ اُن کا کام محل اور موقع کے مناسب ہوتا ہے اسلئے سامع کے دل و
 دماغ پر اُسکا اثر ضرور پڑتا ہے۔ یہ صفت اکثر جدید رنگ کے شاعروں
 میں مفقود ہے اور اسی وجہ سے مخالفین نئی شاعری کو غلطی سے بالعموم
 بے اثر اور روکھی پھسکی کہنے لگتے ہیں۔

حالی کے پہلو میں ایک ستم رسیدہ دل ہے اس لئے اُن کی زبان
 سے جو بات نکلتی ہے وہ عموماً سوز و گداز کی مجموعی کیفیات سے مملو
 ہوتی ہے۔ مرزا غالب، سرسید اور حکیم محمود خان کے مرثیے اسکی کافی
 شہادت ہیں۔ غالب کا مرثیہ مجروح نے بھی لکھا ہے لیکن حالی کو نہیں
 پہنچے حکیم محمود خان کے نوحہ کی تہدید میں دہلی کی بربادی اور تباہی کا
 حال کتنا عبرت خیز ہے۔

مولانا حالی کے فیضانِ قلم سے ذکر و نامہ دونوں کو فائدہ پہنچا ہے اور
 بعض خاص نظمیں تو خالص طبقہ نسوان سے متعلق لکھی ہیں مینا جاوید
 اس قبیل کی پہلی نظم ہے اور "چپ کی داد" غالباً سب سے آخری۔ مجھے
 وہ دن نہیں بھولتا جب میں نے "چپ کی داد" خود مصنف کی زبان
 سے سنی تھی حضور نظام میر محبوب علی خان خلد مقام کی جوبلی چل سالہ

کا جشن حیدر آباد میں عام طور پر منایا گیا تھا۔ مولنا حالی جو اس وقت
ابدیت کے قدیم متوسلین میں سے ہیں ہمارا آجہا ملا لہام کی دعوت پر
وہاں تشریف لائے تھے۔ تنگ منس ڈیٹنگ فورم کے اہتمام سے
بھی ایک جلسہ قرار پایا تھا۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم، مولوی علیخان
مولوی عبدالحق وغیرہم شریک تھے۔ ہمارا جشن پر شاد بہادر وزیر عظم
دولت صفیہ صد نشین تھے۔ مولنا حالی بھی حیدر آباد میں تھے اسلئے
آپ سے بھی تشریف آوری کی درخواست کی گئی تھی۔ تازہ نظم لکھنے کا
موقع نہیں تھا۔ آپ نے جلسہ میں چپ کی واڈ سنائی تھی جلسے کی سہر
عام ہو چکی تھی۔ وقت مقررہ پر نواب میر فیاض علیخان کی پُرفضا کوٹھی
حاضریں سے پر تھی۔ اس ذوق و شوق کے باوجود اکثر اجابجا خیال
تھا کہ عالم نسوان کے متعلق مولنا حالی اُن خیالات پر کیا اضافہ کر سکیں گے
جو دس پندرہ سال کی طول طویل مدت میں مولوی محب حسین ظم
نثر کے ذریعے سے ملک کے سامنے وہاں پیش کر چکے تھے لیکن جبوقت
مولنا نے اپنی متین اور موثر آواز میں پہلا ہی شعر بڑھا کہ
اے ماؤ ہنوبنیو تو مو کی عزت سے ہو شہر کی بستی ہوتھیں نیکی نہی سے ہو
تو حاضرین کی چیر زنے زمین کو آسمان پر اٹھالیا اور اُس کے بعد تو
خود فتگی کا سا عالم تھا۔ ہمارا جہ صدر نشین نے اپنی تقریر صدارت
میں اس نظم پر دلی پسندیدگی کا اظہار کر کے یہ تمنا کی تھی کہ اسے کم
از کم مملکت نظام کے مدارس نسوان کے نصاب میں داخل کیا جائے۔
اس میں کلام نہیں کہ مولنا حالی کا کلام اگر انتخابی شکل میں کوں
کی کتابوں میں داخل کیا جائے تو بہت فائدہ مند ہوگا۔ پنجاب کی
کتابوں میں پہلے ہی ایسا کیا جاتا ہے لیکن ضرورت ہو کہ حصہ ملک
کی اُردو کتابیں جوڑ کون یا لڑکیوں کے لیے تالیف کی جائیں اُن میں
کلام حالی کو نمایاں جگہ دیجائے۔

مولنا حالی اور اُن کے کلام کے متعلق تفصیلی بحث کی گنجائش

یہاں اس سے زیادہ نہیں کل سکتی ورنہ ابھی دو ایک پہلوؤں پر
اور روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ تاہم اُمید ہو کہ ان سطور سے
ناظرین کو انکی شاعری کے متعلق ہمارے ذاتی خیالات کا اندازہ ہو سکا
اور وہ خود بھی آخری فیصلے پر آسانی سے پہنچ سکیں گے۔

حالی کا دم ہندوستان میں غنیمت ہو۔ اُنکی قومی خدمات اگر یہ
زیادہ تر مسلمانوں تک محدود ہیں لیکن اُنکی شاعری ہندو مسلمان
پارسی عیسائی، بھون کیلئے کیسان نتیجہ خیز ہو۔ اس کے علاوہ ہندوستان
کی مختلف اقوام کے درمیان میل جول اور محبت آمیز روابط قائم کرنے
کے وہ ہمیشہ حامی رہے ہیں۔ یہ راز اصحاب ہندو سے بھی چھپا ہوا
نہیں ہو اور یہی وجہ ہو کہ اُن کے کلام کے قدر دان مسلمانوں سے
قطع نظر اور لوگ بھی کثرت سے ہیں اور خیالات و جذبات میں جیسے
جیسے صلاح ہوتی جا ئیگی اُسی طرح کلام حالی کی ہر دلعزیزی کا حلقہ وسیع
ہوتا جائیگا۔

کم از کم تعلیم یافتہ مسلمانوں میں انھیں "قومی شاعر" کا پوزیشن ضرور
حاصل ہو اور اُنکی حیثیت اسلامی جماعتوں میں عام طور پر بال
اختلاف عقائد تسلیم کی جاتی ہو۔ اب اُن کے مخالفوں کا بھی وہ زور
نہیں رہا اور اُن کی شہرت ہندوستان سے گذر کر یورپ تک جا پہنچی
ہو۔ انگلینڈ میں اُنکی رابعیات کا ترجمہ انگریزی میں چند سال پیشتر
ہو چکا ہو۔ گویا وہاں والوں پر ثابت ہو گیا ہو کہ ہندوستانی دماغ بھی
انسانی زندگی کی رمز شناسی اور نیچر کی زبردست طاقت سے ہتھاؤ
حاصل کرنے کا کم و بیش مکمل رکھتے ہیں۔

حالی کا سب سے بڑا وصف بقول ایک نکتہ رس نقاد کے یہ ہے
کہ اُن کا کام اور کلام ایک ہو، حقیقت میں قول فعل کی جو پسند
مطابقت مولنا حالی کی ذات بابرکات میں ہو وہ کسی دین نہوگی
آجکل ہندوستان میں ایسے ہی شاعر و نثر نویس ضرورت ہو جن میں حیرت و

سمجھتے بلکہ برخلاف اسکے ہمارا عقیدہ ہے کہ ان کی شاعری بہت کم
مفید نتائج کا سبب ہے جس سے مسلمان بالخصوص متمتع ہوئے ہیں۔
خود ان کا یہ شعر ان کے حسب حال ہے
گو کہ حالی اگلے استادوں کے آگے پیچھے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو پرچم
سید محمد فاروق

یا امیر و داغ کی عظمت سے انکار نہیں بلکہ بہت سی باتیں ہم انھیں
حالی سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن زمانہ جدید کی تمدنی و معاشرتی اور ادبی
ضروریات کا جنگی کمپل پر ابقاء قومی کا انحصار ہو تقاضا ہے کہ حالی ایسے
شاعر پیدا ہوں۔ ہم مخالفین کی تشفی کیلئے ان تمام عیوب و نقائص
کو تسلیم کرتے ہیں جو وہ حالی کی "شاعرانہ" سخن سنجی میں بتاتے ہیں مگر
اس کے باوجود بھی ہم ان کی شاعری کو فضول اور یادہ گوئی نہیں

اساتذہ اُردو کی فارسی شاعری

کی کچھ بہت زیادہ بلا واسطہ ممنون نہیں ہے، اور اگر چند عربی مذاق
بزرگوں سے اُردو نے ذرائع اُٹھایا ہے تو وہ شمار کے قابل نہیں۔
یہ عجیب بات ہے کہ فارسی شاعری کی ابتدا خود عربی منتہی الام
ہو لیکن خود فارسی شاعری پر بحیثیت شاعری عربی کا کوئی خاص
اثر نہیں ہے۔ عرب کی شاعری کی بنا اسادگی جو ش اور تقاضا فطر
پر ہے لیکن فارسی شاعری کو اس حصہ سے کوئی بہرہ نہیں ملا۔ بات
یہ ہے کہ تمدن کی اعلیٰ ترقی معاشرت کی انتہائے معراج اور پھر آزادی
و آزاد روی کا فقدان فارسی شاعری کی جان ہے۔ ایسی حالت میں
وہی ہو جو ہونا چاہیے تھا۔ چنانچہ خود عرب شاعری نے بھی دوسری
صدی میں ہی رنگ اختیار کر لیا، اور اُردو کے ساتھ آمد کا
بتادلہ ہو گیا۔ شہادت کیلئے آج بھی گھر گھر دیوان مستثنیٰ موجود ہے۔
عرب کی اصلی شاعری سے یہ اور ان کے معاصر کتنے اور ہیں، ایک ہی
نگاہ میں معلوم ہو سکتا ہے۔

اُردو شاعر کو کمپل شاعری کے لیے ضرورت تھی کہ وہ ہندی
اور فارسی دونوں سے علی وجہ الکمال واقف ہو تاکہ یونکہ دنیا میں
صرف اُردو زبان ہی ایک ایسی زبان ہے جسکو شاعری کا استحقاق

زبان اُردو کی ترکیب استعجابی پر جسے غور کیا ہو وہ جانتا ہے کہ زبان
جو اسوقت انڈیا کی لنگو افرینکا ہے کن کن عنصر وں سے مرکب ہوئی
ہو اور ایشیا و یورپ بلکہ افریقہ تک کی زبانیں کس طرح اس میں کم و بیش
داخل ہیں۔ ہماری زبان کے اصل الاجزاء کی طرف غور کیجئے تو معلوم
ہوگا کہ ہندی سرزمین میں فارسی تخم بویا گیا، اسکا ثمرہ ہے "اُردو" اور بس
تنگی، مرہٹی، گورکھی، بنگالی وغیرہ یہ پراکتین سب ایک ہی پھیلی کے چٹے
ٹپے ہیں میں نے جو ہندی کا لفظ استعمال کیا ہے اس سے مراد اسوقت
کی ہندوستانی بولی ہے جو اس قطعہ ملک میں مستعمل تھی جان اُردو
نے جنم لیا ہے۔ خواہ وہ برج بھاشا ہو اور خواہ سندھی اور مرہٹی۔

فارسی میں عربی سیلاب کچھ سطح اُمنڈ کر آیا کہ فارسی حروف تک
جل گئے۔ اسی لیے فردوسی کی زرین یادگار شاہنامہ سمجھا جاتا ہے
جس میں پرانے نام عربی الفاظ لائے گئے ہیں۔ اب تو یہ شوق زمانہ نے
سرور دیا ہے لیکن ہمارے چین کی بات ہے کہ اچھے فارسی دان اچھی
فارسی اُسکو کہتے تھے جس میں عربیت کا حصہ کم اور بہت کم ہوا اور ہر
جیسی کا ہش و کاوش کرتے تھے یہ انھیں کی وضع پرستی تک محدود
تھی۔ اس مختصر سی تہید سے غرض صرف اتنی ہے کہ اُردو زبان عربی

من بہت الام والاب حاصل ہے۔ پُر لطف اتفاق ہے کہ عربی جو خود شاعری کی جان ہو وہ فارسی سے آنکری۔ موجودہ فارسی جو بحیثیت زبان عربی کی سخت دست نگر ہو وہ خود شاعری کیلئے ایسی موزون ثابت ہوئی کہ باوجود کس پرسی کے اب بھی اُس کے قدردانوں نے نیا خالی نہیں ہے۔ فارسی ایسی زبان سے آنکری جو گویا شاعری ہی کیلئے خلق ہوئی تھی۔ اور "اُردو" اس کے بیچ کا نام ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے علوم و فنون کا مطالعہ اور تحصیل نہایت علمی شغف کے ساتھ کی اور اس کا انکار کرنا انتہائی کوتاہ نظری ہو لیکن اس کو مان لینا چاہیے کہ اُردو اساتذہ نے ہندی زبانوں کی طرف بہت ہی کم توجہ کی۔ اگر کسی نے مقامی خصوصیات کا بیان کیا ہو اور چون و چوڑ کو چھوڑ کر گنگا و جمنہ اور لیلی و مجنون کے بدلے ہیرا پنجا کا ذکر کیا ہو تو یہ علی سبیل الحجت تھے اور اس کا دائرہ صرف جدت و ندرت اور تفنن طبع تک محدود رہ گیا۔

تکمیل شاعری کیلئے جنہے تحصیل فارسی اور ہندی کی ضرورت کا اظہار کیا ہے۔ ہر کو اس حصہ سے مسرت ہے کہ ہمارے اساتذہ اراکین شاعری کے پاس فارسی علمی ذخیرہ ایسا تھا کہ اگر وہ اُردو چھوڑ کر صرف فارسی کی طرف توجہ کرتے تو اس میدان میں بھی علم اُستادی بند کر سکتے تھے لیکن افسوس ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کو ہندی شاعری کی طرف توجہ نہ تھی جس کا نتیجہ اکثری صورت میں آپ بے اثری پاتے ہیں۔

آج ہم اُردو کے چند مشہور اساتذہ کے فارسی اشعار پیش کرتے ہیں جس سے یہ معلوم ہو سکے گا کہ انکی فارسی قابلیت کس درجے کی تھی۔

۱۔ عجیب ترین واقعہ ہے کہ حسان الہندیہ غلام علی راؤ نے ہندی شاعری و زبان متل و دہانے سے بہت کچھ اپنے عربی اشعار میں لیا ہے۔ اور اس طرح حضرت امیر خسرو نے اپنے کلام کو ان جواہروں سے رونق دی ہے۔ ملاحظہ ہو سید المرزا و شاعر امیر خسرو

ہم نے اس فہرست ہے خان آرزو امیرزا مظہر مولانا آرزو ہزار غائب جیسے بزرگواروں کا نام خارج کر دیا ہے کیونکہ حقیقت یہ حضرات فارسی کے شاعر تھے ان کا ذکر "فارسی اساتذہ کے اُردو اشعار کے ذیل میں آنے کے قابل ہے۔

تیسرا حضرت میر تقی میر جن کے بہتر تشر مشہور ہیں اور جن کے لیے غالب و ناسخ کا متفق علیہ قول موجود ہے۔

غالب اپنا یہ عقیدہ ہو بقول ناسخ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں تماش کے بعد میر صاحب کے دو ہی شعر۔ واضح رہنا چاہیے کہ میر صاحب نے خان آرزو جیسے علم الثبوت استاد فارسی کے زیر تربت پرورش پائی تھی۔ نواب صدیق حسن خان مرحوم نے لکھا ہے کہ میر صاحب نے ایک فارسی دیوان بھی حسین دو ہزار اشعار تھے اپنی یادگار چھوڑا ہے۔

گفتہ آن آتش سوزان سر طوطی دل اشارت بگر کرد کہ اینجا افتاد گراہین رنگین خرامی گزری از طریق سرور اشوق تماشایت بفتار آورد دردا حضرت خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ کا نام نامی اُردو شاعری میں میرے نزدیک ایک اور وجہ سے مصحح ثبت ست برجیدہ عالم دوام او ہے کہ انھوں نے ہی صوفیانہ خیالات کو سب سے پہلے اُردو نظم میں ادیا۔ خود اہل درد تھے اور خاندان سوز و درد کے جانشین اسلئے اس وقت کے اہل تصوف کی طرح فارسی کی شان بھی آپنے برقرار رکھی۔ بہت سے فارسی رسالوں کے ساتھ ساتھ ایک فارسی دیوان بھی موجود ہے۔ فارسی مذاق دن بدن انحطاط پر ہے اسلئے انتخاب بھی ہم مختصر کرتے ہیں۔

سواۃ خبرے ز آمد او من بہد خبر نامدارا

۱۔ شمع انجمن کو ۴۱۔ ۲۔ آب حیات آواز۔

۳۔ شمع انجمن از نواب صدیق حسن خان مرحوم۔

ہر سکوئی قوم کی باری باید گریست . ابر تاد اندک این مقداری باید گریست
 ناسازی مزاج کبس ساختن ندو . چنہ بجویش این ہماچار ساختیم
 خود را میان محکمہ جبر و اختیار . مجبور بودہ ایم کہ محنت را ساختیم
 گویند رحمت ست طلب کار بخششی . خود را باین امید گنگار ساختیم
 بیک متافیل از شفقہ خاطر ام کن . مرزہ ہم زن داین بزم جلد را ہم کن
 سودا اُردو کے انوری و سوزنی میرزا رفیع السودا در اصل کالی نسل
 تھے۔ انھوں نے بھی فارسی میں ایک دیوان یادگار چھوڑا لیکن ان کے
 قصائد ہی ان کی فارسی قابلیت کے لیے اچھے سارے نمونے ہیں علاوہ ازیں
 عبرت الغافلین ایک ایسی یادگار ہے جو مرزا کی استادانہ قابلیت کا سکہ
 بٹھا رہی ہے۔ یہ نکتہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ مرزا پہلے فارسی ہی کہتے
 تھے۔ خان آرزو کی تحریر کے رخیہ کوئی شروع کی ۵

بتنام از کہ زین دودن خون بہاے دل . دل جرم چشم گوید و چشم گندہ دل
 سازم بچنین مرگ عوض عمر ابدرا . سراچہ دم نزع بزانوسے تو بینم
 مصحفی شیخ غلام ہمدانی جنھوں نے آٹھ اُردو دیوان یادگار چھوڑے
 ہیں۔ اپنے فارسی تذکرہ میں سودا کے متعلق لکھتے ہیں ”آخر از خیا
 شعر فارسی ہم پیدا کرو کر از فہم و عقلش این امر بعید بود کہ در عرض
 غزلہاے فارسی خود نیز کہ در لکھنو گشتہ بقید رویت ترتیب دادہ داخل
 دیوان رخیہ نمودہ“ مگر آپ کو تعجب کرنا چاہیے کہ مصحفی خود بھی صاحب
 دیوان فارسی ہیں۔ سودا کے لیے جسکو غلطی سے تعبیر کرتے ہیں اسی غلطی
 میں خود بھی پھنسے ہیں مگر میرے خیال میں یہ کوئی غلطی نہیں ہے کہ
 ایک شخص دودا ورتین تین زبانوں میں شعر لکھے ان اتنی بات
 ماننی چاہیے کہ ایک زبان کی مشق اور مرزا ولت دوسری زبان
 کے اعلیٰ درجہ کمال پر پہنچنے میں سنگ راہ ہوتی ہے۔ تین شعر و شیکش
 ناظرین ہیں ۵

۱۔ آب حیات حالات سودا۔ ۲۔ آب حیات۔ ۳۔ شمع انجمن۔

جانم بے وقت شمار نفس ست این . بنشین نفسے چون نفس از پس ست این
 بر یکسی کشتہ تیغ نظر ہنگن . در خاک کنون طعمہ مورد گس ست این
 چون نقش مرا از سر کوشش گذر افتاد . انگشت بندان شد و گفتا کس ست این
 انشا ہر فن مولا میرانشاء اللہ خان انشا جگے مولہ ہونے کا بنگالہ کی سر
 زمین کو طر ہے یہ وہ جو ہر قابل تھا جسکو شاعری نے برباد کر دیا طبعہ شاعر
 میں اس دل و دماغ اور ہمہ گیر طبیعت کا مخلوق کم ہوا ہے۔ آرزو نے
 ان کے فارسی دیوان پر جو لے لکھی ہے ہم اسکو نقل کر دیتے ہیں ”باتوں
 ہی باتوں کا مرا ہے جس غزل کو دیکھو گو یاد و ایرانی ہیں کہ کھرے باتیں
 کرے ہیں اور فقط سخن اپن مضمون کو دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ یہ سب
 کچھ ہو کر لٹھ زبان اور خوبی بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی اور
 اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اگر چند ساعت کیلئے اپنے رفیق طبعی یعنی
 مستحضر سے جدا ہوتے اور ذرا زبان کو قابو میں رکھتے تو خدا جانے
 اپنے زمانے کے خاقانی اور انوری ہوتے یا سعدی اور خسرو“
 مختصر اچند شعر انتخاب کیے دیتے ہیں۔ دیوان ہر جگہ ملتا ہے ۵

ہا رہن تو بنگ پریدہ مے اند . گل شگفتہ بجیب دریدہ مے اند
 تو دلدے تو شیخ را بجو اہی گفت . شامل تو ہیچ آسریہ مے اند
 نگاہت رنگ مستی بردیجانہ می یزد . باز از سر صبا از لب پیمانہ می یزد
 مومن حکیم مومن خان جو دنیا کی دنیاے شاعری میں ایک خاص
 طرز کے بانی شمار ہوتے ہیں ان کی فارسی قابلیت کے لیے خود ان کا
 اُردو کلیات کافی ہے جو حسین جستا اور خوش اسلوب سی ترکیبیں اور
 قصائد میں توالی اضافت اور خوش آند فارسی تلمیح کی کوئی کمی
 نہیں ہے چند فارسی شعر کا انتخاب حاضر ہے ۵

دل گرفتہ دزد لدا رنٹام دادند . انچہ بُردند ز من بہتر از اتم دادند
 لے مرگ ترا جان شدہ شتاق ترا شب . سوے تو خود آید تو نہ آئی اگر شب

بکھر دستان کلیسا تراچہ کار مومن بدین بہاد شستن برکت
 فریب لطف نہانی خوردہ کسب من زبزم راند و شستم بستان گستاخ
 مردم ز شکاش آسان کردم رحم بر بارے جانان کردم
 امیر امین نے صرف تطویل مضمون کے خیال سے قدیم اساتذہ میں
 سے کئی نامور بزرگوں کو چھوڑ دیا ہے۔ دور ششم کے اساتذہ بھی اس
 لطف سے خالی نہ تھے مفتی امیر احمد مینائی عربی کے بہت اچھے فاضل تھے
 اور شاعری کی برکت سے مولوی سے منشی امیر احمد بنگے تھے۔ دور ششم
 میں ہمارے خیال میں ان جیسا جامع کمالات شاعری کوئی نہیں ہوا
 ہے۔ فارسی کلام بھی متانت سخن سے برتر ہے۔

خجرے نازینا بد جگرے بہتر ازین لے بتوبان تو ظالم نظرے بہتر ازین
 سرپائے تو خنم میکے بہتر ازین روم از غیش بناد سبے بہتر ازین
 می بر دول باد لے کہ نہ اند کہ ہر غمہ اش بادندارد ہنرے بہتر ازین
 بوسد اوی لب غیش میکہ ازنا لے شکر لب باد لے دگرے بہتر ازین
 یار سرست و ہوا سودی ناب بوش ساقیا بازینابی سحرے بہتر ازین
 نگھے کردی دول بروی و جانم بایت جان من گرد تو گردم نظرے بہتر ازین
 بخودی برد بستر نزل مقصود ہر نیست مدراء جنون را ہرے بہتر ازین
 داغ ابلبل ہندوستان جنھون نے جرأت کے طرز کو درجہ کمال
 تک پہنچایا انکے متعلق یہ بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انھون نے
 کبھی اپنی زندگی میں فارسی شعر بھی کہا ہو حضرت نساخ نے سخن شعر
 میں جو دیار رک کئے ہیں اسوقت حضرت داغ کی ابتداء تھی لیکن
 انتقال سے پہلے نساخ نے ایک تذکرہ اپنے فارسی گو معاصرین کا لکھا
 ہے افسوس ہے کہ یہ پورا چھپنے بھی نہ پایا کہ آپ نے انتقال فرمایا۔
 اسمین حضرت داغ کے متعلق لکھتے ہیں "از مشاہیر شعرے نعتیہ
 گوے دہلی دارشد تلامذہ شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی ست فکر را
 ۱۔ نگارستان سخن ۲۔ تذکرہ شعرے فارسی نساخ۔

دلیخ شوخ دارد و اقبال شعر نفرو نیکو میگاوید۔ استاد مسلم الثبوت ست۔
 فکر شعر فارسی نمی کند پاس خاطر را تم الحروف شعرے چند برے
 درج این تذکرہ گفتہ ہم بیان اس مقبول عالم شاعر کی پوری
 غزل نقل کر دیتے ہیں۔

عجب انداز وقت مرگ من آن شکستہ دار تبسم زیر لب دارد و تاسف و رنگہ دارد
 ز شوخی کے بود تمکین مزاج لا ابالی را خیال عاشق شیدا نذر دکاہ و گمہ دارد
 ندر سروسہی بینی نہ در تاج فلک یابی اولے خاص کان رعنا جان کچ کلاہ دارد
 بدین بارگران انسان نبرل کے رطربہ کرانا کاتین بردوش و بر سر صد گندہ دارد
 بگنج باد آور و رونی آرد و استغنا گدے کوچہ جانان دماغ پادشہ دارد
 کلام داغ چون خاندن صد بختا از بختل خدے پاک از عین الکمال اورانگہ دارد
 اس دور کے شاعر دن میں حکیم امیر منیر تسلیم، مجروح، ظہیر مسلم، قیوٹ
 استاد گئے گئے ہیں۔ العصر کے صفحات میں اگر گنجائش ہوتی تو سمجھوں
 کے فارسی انتخاب ہم دیکھتے تھے۔ آخر میں صرف ایک بزرگوار کے
 ذکر کے بعد اس مختصر مضمون کو ختم کیے دیتے ہیں۔

حالی | مولانا خدو عربی کے فاضل اور مرزا غالب کے شاگرد رشید
 ہیں آزرہ، حسرتی، مومن خان، جیسے اساتذہ کرام کے صحبت یافتہ
 ان کی فارسی کیسی ہوگی، کیا پوچھنا ہے۔ اس قابلیت کو دیکھتے ہوئے
 بے ضرورت اور خواہ مخواہ انگریزی الفاظ کا استعمال مولانا حالی کے
 دامن شہرت پر بے نادمہ ہے۔ اور ساتھ ہی ایسی ٹھیک بولی جو
 متانت اور ثقافت زبان سے بہت بعید ہے بہر حال ہم ایک غزل
 انتخاباً درج کرتے ہیں۔

شوقی بدوست راہ تاداشتہ چشہ درے ہزار دو او داشتہ چشہ
 عمرے ست دل بہ بند پیام دل نیت چشمے بہ رگزار صبا داشتہ چشہ
 دوست جام بادہ دور ہوائے دست وقتے چراہل دل بصفادام چشہ
 ۱۔ تذکرہ فارسی نساخ۔

دوستو اب تک ماتم تھا کہ اُردو شاعری مان کی طرف
سے بے نصیب ہے لیکن اب زمانہ آگیا ہو کہ باپ کی طرف سے
بھی بیچاری محروم ہو جائے اور نوحہ منیمی ہر قدردان اُردو
کی زبان سے نکلے۔

حبیب الرحمن

سودریان غیش نردی مرا زجلے پنهان باو معالہ ہاشتم چہ شد
یادم کنون نمازہ کہ بیان چہ بودہ است در سینہ خار خار و فدا شتم چہ شد
کارم ز سعی خضر بجائے نمی رسد در ظرف غیش آب بقا د شتم چہ شد
جائی خوش آنکہ بود مرا نگہ بردن
ز فتنے بدل ز جور و جفا د شتم چہ شد

نواب فریدون جنگ بہادر

وابستگان دولت ہفتیہ کی فرست سطح مطول و مفصل ہو
سطح اُسمین ایسے نام بہت کم پائے جاتے ہیں۔ جبکہ تعلقات دیرینہ
یا موروثی ہوں۔ حیدر آباد کی ”سول لسٹ“ پر ایک نظر ڈالنے سے
ہم پتہ چلتا ہو کہ دو چار ہی نام اس قماش کے مل سکتے ہیں اور ان میں
مسٹر فریدونجی جمشید جی غالباً سب میں ممتاز اور نمایاں ہیں جنہیں
خصوصاً نظام کی غائبیہ برداری کا فخر حاصل کیے ہوئے دس میں نہیں
بلکہ چالیس سال سے بھی زیادہ مدت گزر چکی ہو۔

حیدر آباد کی تمام خوبیوں کا اعتراف کرنے کے ساتھ ہی یہ
تسلیم کرنا پڑتا ہو کہ وہ ان کے آئے دن کے انقلابات و تغیرات قابل
اور ہوشیار سے ہوشیار شخص کو بھی دس پانچ برس سے زیادہ ٹھہرنے کا
موقع نہیں دیتے۔ اس صورت میں مسٹر فریدونجی کا ذمہ دارانہ خدمات
کے ساتھ اتنا طویل زمانہ بغیر کسی تفریح کے گزار دینا جہاں خود
مسٹر موصوف کی بے عرضانہ روش پر دلالت کرتا ہو وہاں فرماؤ
دکن کی صفات قدر شناسی و رعایا پروری بھی اُس سے آشکار
ہوتی ہیں۔

مسٹر فریدونجی پارسا نثر ادہن لیکن حیدر آباد میں کوئی طبقہ
یا کوئی گروہ ایسا نہیں جو آپ کا نام عظمت و عزت کے ساتھ لینے کا

عادی ہو۔ اور اس کا راز یہی ہو کہ آپ نے ہمیشہ بے لاگ و غیر غفلانہ
طور پر اپنی خدمات انجام دی ہیں حیدر آباد میں ملکی و غیر ملکی کا
قصہ نہایت شد و مدت چل رہا ہو لیکن چونکہ ایک طرف آپ کو
ملکی ہونے کا حق بھی حاصل ہو اور دوسری طرف آپ کی رفتار
و گفتار ہمیشہ انصافانہ رہی ہو اس وجہ سے کسی پارٹی کو بھی آپ سے
منغض ہونے کا موقع نہیں ملا۔ مسٹر فریدونجی کے والد ڈاکٹر جمشید جی
جن کی اولاد اکبر ہونے کا آپ کو فخر ہو ریاست دکن کے سلسلہ ملازمت
میں منسلک تھے۔ مسٹر فریدونجی صوبہ اورنگ آباد میں باہر ستمبر
۱۸۴۹ء پیدا ہوئے اور اس لیے قانوناً وہ ”ملکی“ تھے۔ ملازمت دکن
کی شروعات اُس وقت سے ہوئی کہ آپ کی عمر، اسلئے کی سطح
متجاوز نہ تھی اور اُس وقت سے اب تک مختلف عہدوں کی نازک
ذمہ داریاں اس خوش اسلوبی سے انجام دی ہیں کہ مخالف
تک بھی آپ کی ثنا و صفت میں رطب اللسان ہیں۔

سر سالار جنگ اول کا زمانہ اصلاح دکن کی تاریخ کا پہلا باب
تھا۔ ابواب آمدنی کو مستقل و باقاعدہ کرنے کیلئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ
الگ ذاری کا طریقہ برٹش انڈیا کے نمونہ پر جاری کیا جائے اور اسی
میں ممبئی کے نمونہ پر بندوبست اراضی کا کام شروع کر دیا گیا۔

مسٹر فریدونجی کے ذمہ ضلع اورنگ آباد، بیٹرا اور پھنسی کی پائش اور "سرے" کی خدمت سپرد ہوئی جسکی مجموعی مقدار پندرہ ہزار مربع میل تھی۔ چونکہ مسٹر موصوف مین کام کرنے کا سلیقہ خدا داد موجود تھا آپ نے اپنے فرائض کچھ ایسی خوبی اور عمدگی سے ادا کیے کہ "بیمارک ہند" ایسے دور اندیش اور نقاد مدبر سے خراج تحسین وصول کیا یعنی سر سالار جنگ اعظم نے بطور خوشنودی ایک طلائی گھڑی معہ زنجیر بجلد سے حسن خدمات محنت فرمائی اور "سر" کے اختتام پر آپ ضلع اورنگ آباد میں اول تعلقدار (ڈپٹی کمشنر) مقرر کر دیئے گئے۔ گویا اعزاز و مناصب کی جو شاندار عمارت آگے چلکر کھڑی ہونے والی تھی، اسکی بنیاد نیک ہاتھوں سے اور نیک ساعت میں اسطرح ڈالی گئی۔

۱۸۸۳ء میں جنرل کلاسفڈ کے خانہ نشین ہونے پر مسٹر فریدونجی اہلی جگہ "سرے سٹیشن کمشنر" مقرر کیے گئے۔ اسمین شک نہیں کہ یہ بہت بڑا اعزاز تھا جو انھیں نہایت قریب تر زمانہ میں حاصل ہوا، لیکن سچ یہ ہو کہ یہ خدمات مسٹر فریدونجی کی ہمہ گیر طبیعت کچھ زیادہ موافقت نہ رکھتی تھیں اور اس بات کی ضرورت تھی کہ کسی اور شعبہ میں انکی ذکاوت و فراست سے فائدہ اٹھایا جائے۔ اس ضرورت کو سب سے پہلے جس نے محسوس کیا وہ نواب لائق علیخان سر سالار جنگ ثانی تھے۔ جب بعد وفات سر سالار اعظم قلمدان وزارت عظمیٰ ان کے سپرد ہوا تو مسٹر فریدونجی کو انھوں نے اپنے معتمد خصوصی (پرائیوٹ سکرٹری) کے منصب پر فائز کیا اور ساہما سال کے تجربہ اور عمل کے بعد آج کہا جاسکتا ہو کہ نواب سر سالار جنگ ثانی کا انتخاب اسقدر کامیاب ثابت ہوا کہ بایں وہ شاید اسوقت سے لیکر آج تک مسٹر فریدونجی وزیر اعظم دکن پرائیوٹ سکرٹری ہیں وزارتین تبدیل ہوئیں، انقلاب آئے تغیرات ہوئے، لیکن مسٹر

موصوف نے اپنے عہد کے فرائض جس خوبصورتی سے پورے کیے، اسکو پیش نظر رکھکر ہر ایک نے انکی کارروائی اور تجربہ کاری سے نفع اٹھانا پسند کیا۔ نواب لائق علیخان مرحوم کے بعد اور عہد جدید سے پہلے سر آسمان جاہ مرحوم، سر وقار الامر مرحوم اور پھر ہمارا جہ سرکشن پرشاد کی وزارت کے دور آئے، اور اسمین شبہ نہیں کہ ہر دو مین بہت سی اہم تبدیلیاں ہوتی رہیں لیکن مسٹر فریدونجی جون کے تون اپنی جگہ پر قائم ہے اور نہایت مسرت کی بات یہ ہو کہ انکی ہر دفعہ زبانی میں کبھی اور کسی زمانے میں بھی سر موفرق نہیں آنے پایا۔ اسی ایک بات سے مسٹر موصوف کی دانشمندی اور زمانہ شناسی کا اندازہ کافی طور پر ہو سکتا ہے۔

ان فرائض کے علاوہ، جو آپ کے عہدہ معتمد خصوصی سے وابستہ ہیں، آپ کو باوجود عہدیم الفرستی و کثرت کار کے، کبھی کبھی اور کام بھی محض اسوجہ سے سپرد کیے گئے ہیں کہ ان کا انفصال آپ کے ہاتھوں بہت اچھی طرح ہونے کی امید تھی۔ مثلاً سر آسمان جاہ مرحوم کے عہد وزارت میں، جسوقت معدنیات دکن کا مشہور مقدمہ چل رہا تھا اور جسکے دریافت حال کے لیے ولایت میں پارلیمنٹ کے جانب سے کارروائی ہونے والی تھی مسٹر فریدونجی اس لیے منتخب کیے گئے تھے کہ نواب محسن الملک مرحوم کے ساتھ حیثیت قائم مقام دولت نظام ولایت جا کر اس کارروائی میں شریک بنیں۔ اس طرح بزمانہ ہمارا جہ سرکشن پرشاد جب مسٹر کیسین واکر، معین المہام فنانس رخصت پر جا رہے تھے تو مسٹر فریدونجی کے ذمہ صیغہ معدنیات ٹریلو کی نگرانی سپرد کی گئی تھی۔ اسطرح بحیثیت پرائیوٹ سکرٹری وزیر اعظم حیدر آباد آپ کو ہمیشہ اپنے وقت کا بہت بڑا حصہ ان سرکاری ہمانوں کی خدمت اور خبر گیری میں گزارنا پڑتا ہے جو مختلف بلاد و ممالک سے آئے دن وہاں آتے رہتے ہیں اور جن میں زیادہ تر تعداد یورپین

سیاحوں کی ہوتی ہے۔ لیکن اس قدر مصروفیت کے باوجود آپ کا کام دائمی طور پر وقت پر ہوتا ہے اور توجہ کے ساتھ یہی وجہ ہے کہ آپ کے خلاف کسی کو بھی نکتہ چینی کا موقع نہیں ملا۔

خصوصاً نظام مرحوم نے آپ کی بے لاگ روش کو ہمیشہ بہ نظر استعسا دیکھا ہے اور آپ کے اعزاز و اکرام میں کبھی رتی برابر کمی نہیں کی۔ بلکہ جب موقع آیا ہے تو اُس میں زیادتی ہوتی گئی ہے چنانچہ ہمارا راجہ کشن پڑ کے زمانے میں پرائیوٹ سکرٹری کی خدمات کے ماسوا گورنمنٹ نظام کے پرنسپل سکرٹری کا منصب بھی مسٹر فریدونجی کے حصہ میں آیا۔ اس عہد کے فرائض جیسقدر نازک اور ذمہ داری سے پُر ہیں ظاہر ہے لیکن مسٹر موصوف نے کمال عقل و فہم سے کام لیکر اب تک اپنی سکر کو الگ فوسٹ رکھا ہے اور گورنمنٹ ہند کو الگ جیسور نظام سے نواب فریدون جنگ بہادر کا خطاب بھی عنایت ہوا ہے لیکن آپ کا نام (فریدونجی) دکن میں کچھ ایسا ہرولغزیز اور مشہور ہو گیا ہے کہ خطاب کا استعمال تحریرات کے سوا معمولاً بہت کم ہوتا ہے۔

گورنمنٹ آف انڈیا نے مسٹر فریدونجی کی خدمات کا اعتراف کئی موقعوں پر اور مختلف صورتوں میں فرمایا ہے۔ ۱۹۰۳ء میں آپ کو سی آئی۔ اے کا خطاب دیا گیا اور خود دوسرے ہند کے ہاتھوں دہلی دہلی کے موقع پر آپ کو یہ اعزاز ملا۔ سر ڈیوڈلے جنکا زمانہ چہیت رزیدنٹ حیدر آباد کئی معنوں میں یادگاری سمجھا جاتا ہے اپنی ایک اسپچ میں جو حیدر آباد سے رخصت ہوتے وقت کی گئی تھی مسٹر فریدونجی کی خدمات شایستہ کا اقرار کرتے ہوئے انکی بہت کچھ بیج سرائی کی تھی۔ لارڈ کرزن نے بھی کسی خاص موقع پر تعریفی الفاظ میں آپ کا ذکر فرمایا تھا۔ ابھی حال میں دربار دہلی ۱۹۱۶ء کے موقع پر مسٹر موصوف سی۔ اے۔ آئی کے خطاب سے مخاطب کئے گئے اور یہ تمام باتیں اسکی شاہد ہیں کہ پرائیوٹ سکرٹری اور پرنسپل

سکرٹری کے فرائض کی انجام دہی اور گورنمنٹ ہند اور ریاست دکن کے سیاسی دوستانہ تعلقات کے قائم رکھنے اور اُنھیں زیادہ تر اُسٹوار کرنے میں مسٹر فریدونجی نے پوری پوری کامیابی حاصل کی ہے۔ ۱۹۰۹ء میں مسٹر فریدونجی نے چاہا تھا کہ فیشن بیکر اور خدمات کی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر اپنی پیرانہ سالی کا زمانہ بہ آرام بسر کریں لیکن خصوصاً نظام مرحوم نے جنھیں مردم شناسی کا کمال حاصل تھا آپ کے تجربہ و عملیات سے ریاست کو محروم رکھنا گوارا نہ کیا بلکہ یہ انتظام فرمادیا گیا کہ مسٹر موصوف کو ایک قابل مددگار دیدیا جائے تاکہ روزمرہ کے معمولی کاموں کا بار مسٹر فریدونجی پر نہ پڑے اور یہ رعایت بھی ساتھ ہی منظور فرمائی گئی کہ موسم گرما کے دو مہینے جبکہ خاص حیدر آباد کا قیام تکلیف دہ ہوتا ہے وہ باہر جا کر بسر کریں تاکہ انکی صحت جسمانی اچھی رہے۔ اسی ایک واقعہ سے اسکا اظہار ہو سکتا ہے کہ مسٹر فریدونجی کے حال پر آقائے نامدار کی کیسی کچھ توجہ تھی۔ اور یہ سب کچھ صلہ تھا خود آپ کی محنت و مشقت اور جانکاہی کا ہمیں اسد کرنا چاہیے کہ دور جدید میں بھی اُن کے اعزاز کی افزونی کا سلسلہ برابر قائم رہیگا جسکے آثار ظاہر ہو رہے ہیں۔ مسٹر فریدونجی کے ذمے جو گرانبار خدمات آپری ہیں انکی موجودگی میں یہ توقع کرنا فضول ہے کہ وہ اپنے وقت کا کچھ حصہ علمی مشاغل میں باطمینان گزار سکتے مہم اُنہیں وہ بالکل کنارہ کش بھی نہیں رہے۔ آپ کا نام اگرچہ مستقل مولف یا مصنف کی حیثیت سے نہ سہی، تاہم ایک قابل مضمون نگار کے طور پر ضرور دیا جاسکتا ہے۔ آپ کے اکثر مضامین جو علمی و عملی خوبیوں سے نلکوتھے انگریزی زبان کے مشہور و معروف موقت الشیوع پر چون میں نکھر کر مقبول ہو چکے ہیں۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ برٹن اینڈ آئرلینڈ اور کابڈن کلب کے آپ لائف ممبر ہیں اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ اعزاز صرف اُنھیں ہوگوں کو ملتا ہے جو کمال علمی

شفقت بدرجہ کمال پہنچا ہوا ہوتا ہے۔
 شکار کا شوق بھی آپ کو بہت ہو۔ جو یورپین حکام حیدر آباد میں
 سیر و شکار آتے ہیں ان کی پارٹی کے ہمراہ مسٹر فرید ونجی ضرور
 ہوتے ہیں۔ اور سیف آباد میں آپ کی کوٹھی میں شیر و غیرہ کی
 کھالیں اور سربانے سڑاٹ موجود ہیں۔
 مسٹر فرید ونجی کے اکلوتے صاحبزادے مسٹر ستم جی فرید ونجی

برار میں ڈپٹی کمشنر ہیں اور آپ کے دونوں حقیقی چھوٹے بھائی مسٹر
 برزوجی جمشید جی اور مسٹر سہراب جی جمشید جی ریاست دکن میں معزز
 عہدوں پر مامور ہیں۔ اول الذکر کو اول تعلقداری کا منصب حاصل ہے
 اور مسٹر سہراب جی ناظم محکمہ جنگلات (کنسروٹیر آف فارسٹ) ہیں۔
 ہماری دلی تمنا ہے کہ مسٹر فرید ونجی ناموری اور عزت میں روز افزوں
 ترقی کریں اور نیکنامی کے ساتھ ان کے کارناموں کا اختتام ہو۔

تنقید کتب

سوانح عمری پیغمبر اسلامؐ مذہبی نقطہ خیال سے قطع نظر حضرت محمد مصلم
 دُنیا میں افضل ترین ہادی و صلح کا مرتبہ رکھتے ہیں۔ لیکن مسلمانانِ
 کیلئے یہ بات ضرور غیرت دلانے والی تھی کہ جس نبیؐ کے وہ نام لیا
 ہیں، اس کی کوئی مفصل و دلائل سوانح عمری اُردو زبان میں موجود نہیں
 یہ ضرور ہے کہ حضرت محمد صاحبِ واقعات زندگی اور تلقینات و ارشادات
 کا تذکرہ عربی زبان میں بصورتِ مکمل موجود ہے اور اس امر خاص
 میں ابوعلیٰ ترمذی، ابوالفدا، واقفی، کی مساعی جمیلہ زیادہ تر مشکوٰۃ
 ہوئی ہیں۔ اس طرح انگریزی زبان میں کئی مستقل کتابیں اسلام او
 ہادی اسلام کے متعلق لکھی جا چکی ہیں لیکن ہندوستان میں عربی
 زبان کا رواج کچھ ایسا کم ہو گیا ہے کہ بحالتِ موجودہ عربی تواریخ و
 کتب سیر سے (الامامۃ اللہ) استفادہ حاصل کرنا ناممکن نظر آتا ہے
 ایسے ہی انگریزی میں گبن، کارلائل، جان ڈیون پورٹ، سرولیم میو
 کی تحریریں یا تو مختصر ہیں یا مفصل ہونے کی صورت میں بھی نہیں
 بعض ایسی لغزشیں محسوس ہوتی ہیں کہ حقیقت مند دلون کو
 ان کے مطالعہ سے کوئی انبساط نہیں حاصل ہو سکتا۔ صورتِ
 حال جب یہ ہو تو یہ ضرورت مسلم ہوئی کہ اُردو میں آنحضرت کی

مستقل سوانح عمری جدید طرز پر تیار کی جائے۔ شکر ہے کہ مولانا شبلی
 نعمانی نے اس کا عظیم کی تکمیل پر کمر باندھ ہی ہے۔ خدا ان کی ہمت میں
 برکت اور عزم میں استقلال دے کہ ان کے اس تازہ ترین ماعنی
 کارنامے سے ملک کو مستفید ہونے کا جلد تر موقع ملے لیکن جب تک
 مولانا شبلی کی "سیرت نبوی" کا سراور آنکھوں سے خیر مقدم کرنا
 وقت نہ آجائے، ہم "سوانح عمری پیغمبر عالم" کو غنیمت سمجھتے اور اسے
 جوشِ مسرت کے ساتھ خوش آمدید کہتے ہیں۔ یہ سوانح عمری کارکنانِ
 ہلالِ ٹرینڈنگ کمپنی نے ترتیب دیکر شائع کی ہے اور کئی دفعہ کے
 متواتر مسلسل مطالعہ کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ اسکی تالیف میں محنت
 و دروسری سے ضرور کام لیا گیا ہے اور کتاب میں دلچسپی اور دلچسپی
 کے سامان بہم پہنچانے کی کسی امکانی سعی سے دریغ نہیں کیا گیا۔
 سب سے پہلے ایک مختصر تمہید کے بعد "آنحضرت کے سوانح نگار"
 کے عنوان سے ایک جداگانہ باب ہے جس میں اس بحث پر خصوصیت
 سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ کن کن مشاہیر اہل قلم نے آپ کے سوانح نگار
 بننے کی عزت حاصل کی ہے۔ عربی، فارسی اور انگریزی وغیرہ زبانوں
 کی سوانح عمریوں کا تذکرہ کر کے ان کی تنقید کی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے

کہ کس مورخ میں کیا خوبی یا کوئی کمزوری ہو اور ہمیں کام نہیں کہ جو کچھ بھی اور جس قدر بھی رائے زنی کی گئی ہو وہ نیک نیتی پر مبنی ہے۔

اہل عرب کے قدیم رسم و رواج اور عادات و اخلاق کا تذکرہ نہایت مبسوط ہے۔ اس کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہو سکتا ہے کہ حضرت کا ایک ایسے بڑے ہوئے ملک میں ایک نئے مذہب کی تقیین کرنا اور پھر اُس میں کامیاب ہونا بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ زمانہ جاہلیت کے مراسم کے علاوہ مذاہب عرب کے دلچسپ حالات بھی درج ہیں جن کا مطالعہ وسعت معلومات کیلئے از بس مفید ہوگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات زندگی بلا کم و کاست سطح قلب بند کیے گئے ہیں کہ کوئی پہلو نظر انداز نہیں ہونے پایا، مثلاً حسب نسب، خاندان، ولادت، طفولیت، رضاعت، بعثت، غزوات، انہیں سے ہر ایک عنوان کے تحت میں مفصل بحث کی گئی ہے اور محقول منقول دلائل سے حسب ضرورت کام لیا گیا ہے، اخلاق محمدی کی جو تصویر اس کتاب کے صفحات میں دکھائی گئی ہے وہ نہایت دلکش ہے۔ اعلیٰ کلمۃ الحق میں آپ کو ہزاروں قابلِ برداشت تکالیف و مصائب کا سامنا کرنا پڑا لیکن کبھی اپنے اسکی پروا نہیں کی اور اپنے فرض کا ہمیشہ خیال رکھا یہی ایثار ہی استقلال، یہی عزم وہ قوتیں تھیں جنکے ہاتھوں اسلامی مشن تکمیل کو پہنچا ہے۔

تبلیغ اسلام میں جو دشواریاں راہ میں حائل ہوئیں وہ ایسی نہ تھیں کہ معمولی آدمی کے ہوش و حواس بجا رہنے دیتیں لیکن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے عزم و قوت ارادی کے جانفزا کرشمے دیکھئے کہ آپ ان کا کچھ بھی خیال نہیں فرماتے اور برابر اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ آخر یہی ہوتا ہے کہ دشمنی اور مخالفت کے پہاڑ علو ہمتی اور

مستقل مزاجی کے زور سے پانی کی طرح کٹ جاتے ہیں اور آپ کے سامنے دشمن اور مخالفت سب کے سب سر جھکا دیتے ہیں۔ کئی مقامات پر بعض معرکہ آرا مباحث آگئے ہیں مثلاً واقعہ شق صدر واقعہ معراج مبارک، یہ وہ اختلافی مسئلے ہیں جنکے متعلق علمائے اسلام صدیوں کی کوششوں کے بعد بھی ایک مرکز پر نہیں آ سکے۔ اس کتاب میں ان مسائل کے متعلق اچھا کیا گیا ہے کہ ہر قسم کے مضامین اور آراء کا حوالہ بالتصریح دیدیا گیا ہے مثلاً یہ کہ قرآن شریف میں اسکا ذکر کس طرح پر ہے؟ احادیث سے اسکے متعلق کیا معلوم ہوتا ہے؟ سرسید مرحوم خطبات احمدیہ میں اس باب میں کیا فرماتے ہیں؟ یا کسی اور اہل الرائے کیا خیال ہے؟ اس سے ناظرین کو بجائے خود رائے قائم کرنے کا موقع مل جائیگا۔ آخر کتاب میں چند ضمیمے شامل کیے گئے ہیں جن میں بعض مطالب کی خاص طور پر وضاحت ہوتی ہے۔ ضمیمہ سوم خصوصیت سے دلچسپ ہے اور اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ہر جگہ اور ہر قوم میں خواہ خارجی اسباب موافق ہوں یا ناموافق، ایک مخصوص طبقہ حق پسندوں کا بھی ہوتا ہے جسکا کام صرف یہی ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ کہیں سچ کہیں اور طرفداری یا ناجائز تعصب ہٹھکھڑائی کے شکار نہ ہوں۔

اس ضمیمہ میں وہ تمام آراء جمع کی گئی ہیں جو غیر مسلم اہل الرائے نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بیان کی یا لکھی ہیں۔ خیال طوالت ہم صرف پادری بوسو تھ اسمتھ کا اقتباس درج کرتے ہیں جس سے صاف فہمی اور راستبازی کی ایک قابل تعریف شان ظاہر ہوتی ہے۔

ملک کے بادشاہ اور نبی ہونے کی حیثیت سے وہ ایک ہی وقت میں تیز اور پوپ کا مرتبہ رکھتے تھے۔ وہ پوپ تھے لیکن پوپ کی سی

دیکھو بازی سے معرا تھے۔ وہ سیر رہتے لیکن سیزر کی سی کارروائیوں سے
بیزا تھے۔ باقاعدہ فوج کے بغیر حفاظت کے سپاہی نہ ہونے کے باوجود،
محل کے بغیر معمرہ خراج کے ہوتے ہوئے اگر کوئی آدمی یہ کہنے کا
حق رکھتا ہو کہ اُس نے خدای طاقت سے حکومت کی تو وہ محمد ہی تھے
کیونکہ اُن کو یہ طاقت و حکومت سب مینا تھی لیکن ہتھیار نہ تھے۔
اسی طرح گلبن کار لائل راؤ دہل ڈاکٹر لئیر ڈیون پورٹ کے خیالات
قابل دید ہیں۔

لالہ لاجپت رائے کو بھی اسی سلسلہ میں جگہ مل گئی ہے جو جنکایہ
فقہ بہت پر معنی ہے۔

مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی تامل نہیں کہ میرے دل میں پیغمبرِ اسلام کیلئے
نہایت عزت ہو۔ میری رائے میں ہادیان دین و رہبران بنی نوع انسان
میں اُن کا درجہ بہت اعلیٰ ہے۔

ہمارا راجہ کشن پرشاد بہادر شاد (حیدر آباد دکن) کے یہ اشار بھی
نمایان طور پر لکھے گئے ہیں۔

مدینہ کو چلو دربار دیکھو رسول اللہ کی سکر دیکھو
نروکین گئے مجھ دربان کہ ہوتی عن سلام احمدیغت اردیکھو
خدا کو جانتا ہوں دل سے وہ کہ وحدت سے نہیں انکار دیکھو
فدا ہوں نام احمد مصطفیٰ پر وہ بیشک ہیں سرسردار دیکھو

تاریخ کعبہ کا ضخیمہ بھی سود مندی سے خالی نہیں غرض کہ یہ
کتاب دلچسپ و مفید ہے اور ملک کی عام قدر دانی کی مستحق ہے۔
قیمت فی جلد بیس روپے موصوف سے پیسہ اخبار شریٹ لاہور کے
پتہ سے طلب کرنا چاہیے۔

مباحثہ گلزارِ نسیم | گلزارِ نسیم اردو زبان کی ایک مشہور و معروف
مثنوی ہے جو اپنی شریری اور شعری خوبیوں کے لحاظ سے آج بھی
باوجود اُن تغیرات کے جو مغربی لٹریچر کے اثر سے ہمارے مذاق علمی

میں لازمی طور پر پیدا ہونے چاہیے تھے ملک میں اس طرح ہر واعر
جو سطح کے قدیم سوسائٹی میں تھی۔ امتداد زمانہ سے اُس میں یہ خرابی
ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ اُس کا کوئی صحیح نسخہ دستیاب ہونا مشکل ہو گیا
تھا۔ عام کتب فروشوں کے پاس جو ایڈیشن ملتے تھے ان میں اس قدر اختلاف
تھا کہ کسی ایک کو دوسرے کے مقابلے میں مستند تصور کرنا محال تھا
اور انہیں اغلاط کی بدولت آج تک اس مثنوی پر بہت سے جا بے جا
اعتراضات کی بجھا رہی رہی ہیں۔ مسٹر چکبست لکھنوی نے یہ بہت
اچھا کیا کہ گلزارِ نسیم کا صحیح نسخہ ہم پہنچا کر معہ ایک تنقیدی مقدمہ کے
چھپوا دیا۔ اس کا شائع ہونے کو کئی سال ہو گئے۔ اخبارات و رسائل نے
اس پر حوصلہ افزا ریو کیے۔ لیکن قاعدہ ہو کہ مذاق کے اختلاف کی وجہ سے
رائیں بھی مختلف ہو جاتی ہیں۔ مولانا عبدالحکیم شرر نے اپنے رسالہ
”دلگداز“ میں اس مثنوی کے نئے ایڈیشن پر اظہار رائے کرتے ہوئے
جہاں اُس کے محاسن پر روشنی ڈالی وہاں معایب کو بھی نظر انداز نہیں
کیا۔ مولانا شرر کی نکتہ چینی کا جواب مسٹر چکبست نے ”اودھ پنچ“ میں چھپوا
اور جواب الجواب لکھنے میں شرر کے قلم سے ”پنچ“ کی شان میں بعض ایسے
الفاظ بھی نکل گئے جو مناسبت اور تہذیب کے درجہ سے گریے ہوئے تھے۔ یہ
ہو سکتا ہے کہ مولانا شرر نے ”اودھ پنچ“ کے ظریفانہ انداز کے مضامین
کو دیکھ کر جنہیں جولانی فکر مضمون نگار کو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے
اُسے ”شہدے“ کا لقب دیدیا ہو لیکن اگر وہ ایسا نہ کرتے اور یہ سمجھ لیتے
کہ ”پنچانہ“ انداز کا اقتضای ہی تو خوب ہوتا۔ بہر حال معرکہ ”چکبست“
شرر کی شان نزول یہ ہے۔ پہلے تو یہ بحث صرف اُس طبقے تک محدود
تھی جو ”دلگداز“ اور ”اودھ پنچ“ کا قدر شناس کہا جاسکتا ہے لیکن رفتہ
رفتہ اسکی دلچسپی کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا اور اکثر اہم مسائل پر کئی
نقادان فن کو قلم فرسائی کی ضرورت پڑی ”مباحثہ گلزارِ نسیم“ میں وہ
تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں جو اس بحث سے متعلق ہیں عام ہر

اسی قسم کے اور بہت سے اقتباس پیش کیے جاسکتے ہیں جن سے آپ ستر حکمت کے حامی ثابت ہوتے ہیں۔ اور اگرچہ میرزا صاحب کے ان خیالات سے بہت بڑی حد تک ہم بھی موافقت رکھتے ہیں تاہم اگر وہ اپنا عندیہ ظاہر نہ کرتے تو زیادہ مناسب تھا۔

اس کتاب میں کم نہ زیادہ پورے ۱۵ مضامین درج ہیں۔ میرزا صاحب نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ کوئی مضمون جو اس مباحثہ سے تھوڑا بہت بھی علاقہ رکھتا ہو اس مجموعہ میں شامل ہوئے رہ نہ جائے۔ لیکن یاد پڑتا ہے کہ مولوی سید غوث علی حیدر آبادی کا ایک مضمون اُسی زمانے میں مخزن میں نکلا تھا جو اگرچہ فی نفسہ اس مباحثہ سے بے تعلق تھا لیکن اگر وہ بھی لے لیا جاتا تو مولانا شرر کے اس اعتراض کا ایک اور پہلو بھی روشن ہو سکتا تھا کہ رد گلزار نسیم، دیا شنکر نسیم کی تصنیف نہیں ہے، گلزار نسیم نسیم کی تصنیف ہو یا نہیں، ہمیں اس سے واسطہ نہیں لیکن چونکہ سید غوث علی کے مضمون سے اس قدر ضرورت پڑتا ہے کہ نسیم کے اس چراغ میں تیل تہی ایک دوسرے چراغ سے مستعار لیگئی ہو، اس خیال سے اُس کے لیے اس مجموعہ میں گنجائش نکالنا انصافاً ناجائز تھا۔ سید غوث علی کا مضمون کیا تھا؟ ایک قلمی مثنوی کے جس کا ایک غیر مطبوعہ نسخہ غالباً حیدر آباد کے کتب خانہ صفیہ میں اب تک محفوظ ہے، متعدد مقامات کے اقتباسات تھے جو گلزار نسیم کے اقتباسات کے بالمقابل چھپوائے گئے تھے۔ اُس کے مطالعہ سے یا تو ناممکن قوار شعر کا جو سرقہ کی حد تک پہنچ گیا ہو، تائل ہونا پڑتا ہے یا کسی ایک کو دوسرے کا خوشہ چین ماننا پڑتا ہے۔

مضامین مندرجہ ”مباحثہ“ میں چند مضامین ایسے بھی ہیں جن کے مطالعہ سے بہت سے علمی و ادبی نکتے ذہن نشین ہو سکتے ہیں خصوصاً بحث کی ڈاک کا سلسلہ جس کے تحت میں آتش کے

کہ وہ شرر کی تائید اور حکمت کی مخالفت میں لکھے گئے ہوں یا اس کے برعکس۔ اور خواہ وہ دنگل آرمین شائع ہوئے ہوں یا کسی اور جہاں یا سائے میں۔ خلاصہ الحکماء میرزا محمد شفیع شیرازی ثم الکنوی نے اس مجموعہ کو ترتیب دیکر گویا اس معرکہ الاراء علمی مباحثہ کی یادگار قائم کی ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ ”مباحثہ گلزار نسیم“ کے صفحات کو خیالات کی گونا گونی، جذبات کی بوقلمونی، اور آراء کی نیزنگی نے ایک نہایت پر لطف چیز بنا دیا ہے۔ شروع میں ایک دیباچہ بھی ہے۔ لیکن میرزا صاحب نے ایک اصولی لغزش ہو گئی ہے۔ یعنی آپ لکھتے تو ہیں کہ۔

اس علمی جنگ میں جناب شرر اور جناب حکمت کے درمیان معرکہ پیش تھا۔ اب رہا یہ امر کہ ان دونوں پہلوانان سخن میں سے کس کو فتح ہوئی اور کس کو شکست ہوئی اس کا فیصلہ کرنا ہمارا کام نہیں۔ اس کا فیصلہ جناب محمد علی صاحب شوق، منشی سجاد حسین صاحب، حافظ جلیل حسن صاحب جیل و جناب حسرت موہانی و جناب طیش بگرامی وغیرہ نے کر دیا ہے۔

تاہم آپ کے انداز تحریر اور طرز بیان سے یہ ہویدا ہوتا ہے کہ آپ ستر حکمت کے طرفدار ہیں۔ فی الحقیقت یہ کوئی قابل گرفت فعل نہیں لیکن جب آپ نے تمام مباحث کو ناظرین کے پیش نظر رکھ کر فیصلہ اُنھیں پر چھوڑ دیا تو شرر کے متعلق یہ لکھنا عجب تھا کہ آپ کے مضامین سے اکثر مقام پر بے جا غیض و غضب کا اظہار ہوتا ہے، ہکو مولانا شرر ایسے بزرگ کے قلم سے ایسے الفاظ نکلتے دیکھ کر سخت تعجب ہو۔

یا یہ الفاظ:-

برعکس اس کے انصاف ہمیں یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ جناب حکمت کے قلم سے جو مضامین جناب شرر کے اعتراضات کے جواب میں شائع ہوئے ہیں ان میں پوری شان تنقید قائم ہے۔

خطوط موسومہ شریکے کئے ہیں جو سب کے سب 'اودھ پنچ' میں چبے تھے۔ مولانا شوق قدوائی کا مضمون بھی یقیناً قول فصل کا درجہ رکھتا ہے۔ لیکن بعض مبتذل مضامین اس میں ایسے بھی پائے جاتے ہیں جو اگر بہ حالت موجودہ نہوتے تو بہتر تھا۔ مثلاً "ہوا خواہ نسیم کی ہرز سرائی خیالات کی بختگی، تنقید کی قابلیت، توازن کی لیاقت کا تو گویا اس میں ایک سرے سے فاتحہ پڑا گیا ہے ان مثنوی سحر البیان کے عیوب گنولنے میں البتہ شاطرانہ کمال سے کام لیا گیا ہے حالانکہ جو اعتراضات بزعم خود کیے گئے ہیں وہ نہایت عامیانہ اور خود حضرت معترض کی ناواقفیت اور کم علمی کے شاہد ہیں۔

بعض مضامین اور کارٹون اودھ پنچ کے ایسے بھی لئے گئے ہیں جن میں ظریفانہ رنگ پوری شان کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ جہاں تک تفریح طبع کو تعلق ہو یہ دونوں خاص دلچسپی کی چیز ہیں۔ اور انکو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ مثنوی سجاد حسین نے اپنی بے مثل قابلیت کی بدولت "اودھ پنچ" کو جس رتبہ تک پہنچایا تھا وہ انھیں کا کام تھا۔

مباحثہ گلزار نسیم میں 'مسٹر چکبست والا ایڈیشن' مع مقدمہ کے شامل ہے جو اس کتاب کے خریداروں کو مثنوی کے جداگانہ نسخہ کی ضرورت سے مستغنی کر دیتا ہے۔ افسوس ہے کہ کتابت کی غلطیاں "مباحثہ" میں اس کثرت سے موجود ہیں کہ ہمیں حضرت مولف کی توجہ اس طرف خصوصیت سے مبذول کرنا پڑی ہے ضرورت تھی کہ پروف کی صحت کا خیال رکھا جاتا۔ معمولی لاپرواہی بھی کتاب کی اصل خوبیوں کو خاک میں ملا دیتی ہے۔ کتاب کے ملنے کا پتہ مطبع مثنوی نو کشور لکھنؤ قیمت ۷۵ جو تقریباً پانچ سو صفحہ کی کتاب کیلئے کچھ زیادہ نہیں۔

دیوان خیال جانان | علاقہ کاٹھیاواڑ میں ریاست منگروں ایک مشہور جگہ ہے۔ یہاں کے فرمانروا نے سابق شیخ محمد حسین بیاضا

نہایت علم دوست اور مذاق رئیس گذرے ہیں جنگی علم دوستی اور معارف پروری کی بدولت کسی زمانے میں منگروں راہپور کا نمونہ بنا ہوا تھا۔ میان صاحب بہادر کو شعر و سخن سے نہایت درجہ دلچسپی تھی اور آپ کا دربار کمال دہن سے ہر وقت معمور رہتا تھا۔ ایک وقت تھا کہ داغ جلیل تسلیم شمشاد اور احسان ایسے نغمہ کو شعرا کو رئیس کی علمی قدر شناسی نے وہاں بھیج دیا تھا۔ قاعدہ ہے کہ حاکم وقت کا رجحان طبیعت جسطرف ہوتا ہے اسی جانب عوام الناس کی طبائع بھی جھک پڑتی ہیں۔ انہیں مولوی محمد عمر صاحب جنون شاگرد جلال مرحوم کو خاص امتیاز حاصل ہے۔ خیال جانان جس کا دوسرا نام "ریاض فکر" بھی ہے حضرت جنون کے کلام کا مجموعہ ہے جو ہمارے بیان بغرض اظہار اے موصول ہوا ہے۔ اسکو دیکھ کر انصافاً یہ کہنا پڑتا ہے کہ حضرت جنون ایک اچھے شاعر ہیں اور اگر مثنوی سخن کا سلسلہ قائم رہا تو ان کے کلام کی بختگی اور نفاست روز افزون رہیگی۔

اس دیوان میں ایک جدت خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ یعنی حضرت جنون نے اکثر ایسے مضامین قطعی طور پر ترک کر دیے ہیں جو ایشیائی شاعری کا مدت مدید سے جزو لاینفک بنے ہوئے چلے آئے ہیں لیکن کثرت استعمال سے مبتذل ہو گئے ہیں مثلاً کوہ طور اور موشی، بلی مجنون، مصر اور بازار سکندر و آئینہ، اس طرح بعض متروک الفاظ کے متعلق یہ التزام کیا گیا ہے کہ قصائد وغیرہ میں بھی آنے نہ پائیں جیسے پڑتک، ولے، اچھا ہوتا اگر جناب جنون چند اور مبتذل اور مخرب اخلاق مضامین کا استعمال بھی جائز رکھتے مثلاً شب وصل، تیغ قاتل، بوس و کنار۔

زبان کے اعتبار سے حضرت جنون کا کلام اگرچہ اسوجہ سے مستحق ستائش ہے کہ آپ کا وطن کاٹھیاواڑ ہے جہاں کی زبان ابھی

اس قدر ترقی یافتہ نہیں ہو کہ اُسین صلاح کی گنجائش نہ سمجھی جائے
تاہم آپ نے زبان کی صفائی، بندش کی درستی اور محاورات کے صحیح
استعمال کا بہت خوبی خیال رکھا ہے، خیالِ خال ایسی مثالیں نظر آتی ہیں
جہاں کسی محاورے یا لفظ کا استعمال صحت کے ساتھ نہیں کیا گیا
مثال کیلئے یہ شعر ملاحظہ ہو۔

مینوش اٹھیں اپنے قدح کی سنابین خیر
آہا ہوا برادر وہ کہیں سے اٹھا ہوا

”قدح کی خیر سنابین“ محاورہ ضرور ہے لیکن اس موقع پر اس کا
استعمال غلط ہوا ہے۔
یا یہ شعر۔

تو بھی آیا نہ اسے خیال صنم رات بھر ہم تجھے پکارتے ہیں
اسین پکار ہیں ”آجکل کے رواج کے اعتبار سے غیر ضمیمہ ہے۔
اس طرح اس شعر میں۔

شوخی ہو جائینگے کہ دیتے ہیں اُنکے تیر
اول شب جو وہ شرتا ہے میں شرتا ہے دو

”کہ دیتے ہیں“ کے عوض ”کہے دیتے ہیں“ ہونا چاہیے۔

ان معمولی فرد گزشتوں کے علاوہ حضرت جنون کا کلام داد کا
مستحق ہے بعض غزلیں خاص طور پر دھپ پانی گئی ہیں اکثر شاعرا
تاثیر اور بیاضنگی کی گونا گوں خوبیوں سے مالا مال ہیں۔ مثلاً

اگرچہ صہل سے ہو یا س لیکن آس ہے اتنی کہ میرا نام شامل ہو ترے امیداروں میں
وہی کچھ معتبر اب آپ کے نزدیک ٹھہر رہا ہے گنا گرتے تھے جنکو آپ بھی اعتبار نہیں
نہ سمجھا وقت پرین اے ابھی کیا سمجھا وہ کچھ کہ تھے چہی چون شادوین

وہ پچھین مراحل یوں ملقت ہوئی مگر اُن کو دھوکا ہوا ہے کسی کا

وے قسمت جب پوچھا تو رعب حسن کہ دیا میں نے کہ میرا مدعا کچھ بھی نہیں
غیر سے وہ تذکرہ میرا ہی کرتے تھے مگر میں نے جب پوچھا تو بھولا کر کہا کچھ نہیں
غزلیات کے ماسوا، قصیدے، سہرے، قطعے اور خمسے بھی ہیں اور
سب اپنی اپنی جگہ اچھے ہیں۔ شروع دیوان میں ایک دیا چہ شامل
ہو حسین مصنف کے سوانحی حالات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہو لیکن
ایک بحث کے درمیان مندرجہ ذیل شعر کو غلطی سے غالب کی
تصنیف خیال کر لیا گیا ہے۔

ڈیڑھ جزیر بھی تو ہے مطلع و مطلع غائب
غالب آسان نہیں صاحب دیوان ہونا

کتاب ملنے کا پتہ: منشی عبدالرحمن محمد محسن صاحب خوشتر

درسہ اسلامیہ منگروں (کاٹھیاوار) قیمت غالباً ۱۰
ہارنجوش | یہ نام ہے ایک مختصر دیوان کا جو جناب حفیظ جو پوری
نے حکیم برہم صاحب کے مطبع میں گورکھپور سے شائع کیا ہے۔ عالیجناب
ابو ہیشور پر شاہ صاحب رئیس عظم مظفر پور اسکے مصنف ہیں۔ ابوصفا
جو شغف تخلص کرتے ہیں اور غالباً حضرت حفیظ سے تلمذ ہے۔ کتاب عمدہ
کاغذ پر صفائی کے ساتھ طبع ہوئی ہے۔ کتاب کی لوح رنگین و مطلقاً
حسن ظاہری کے ساتھ ایک عیب نہایت نمایان طور پر محسوس ہوتا
ہے کہ کتابت کی غلطیاں بہت سی پائی جاتی ہیں۔ اگر پردف کی صحت
کا کسی قدر التزام کیا جاتا تو آخر میں صحت نامہ کے شمول کی ضرورت
نہ ہوتی۔

فص شاعری کے متعلق ہماری رائے میں جو ش صاحب اچھا
کہتے ہیں اور عاشقانہ مضامین بہت خوبی سے نظم کرتے ہیں۔ اکثر
غزلیات اسیر، داع، مضطر وغیرہ کے ہر طرح کی گئی ہیں اور فی الجملہ
پسندیدہ ہیں کاش کچھ زیادہ متانت اور جدت کا خیال رکھا جاتا،
جس سے کلام کی عظمت دو بالا ہو جاتی۔ بہت عامیانا مضامین کے

اشعار جنکو سنتے سنتے طبیعت سیر بلکہ بیزار ہو گئی ہو اگر مطلقاً نظر نہ کر دیتے جاتے تو دیوان کی دھچی میں فرق نہ آ سکتا تھا۔ مثلاً
دل حسینوں سے لگانا چاہیے زندگی کا لطف اٹھانا چاہیے
دیکھیے آج آتے ہیں وہ یا نہیں جذب دل کو آزمانا چاہیے
آج در در سر نہ آنے کا ہے عذر روز اک حیلہ ہانا چاہیے
ہاں کہیں کہیں بھریا قافیہ ورد لیف کی وجہ سے انھیں معمولی
مضامین میں بھی لطافت آگئی ہے جیسے ۵

نہیںد فرقت میں جب اچھتی ہو تارے گنتے ہی رات کتنی ہے
نہ لگی آنکھ جب سے آنکھ لگی عمر بیتابیوں میں کتنی ہے
کھل گیا منہ سورتے ہی کا کل دن کے بڑھتے ہی رات کتنی ہے

دہکتے ہیں ہمیں لیلیٰ بنا کر تم بوجھو جنوں کا جوش و خروش تماشہ بھی دیکھنیے
خاتمہ دیوان پر متفرق اشعار سے پہلے دو ایک مختصر قومی نظمین
بھی شامل ہیں مندرجہ ذیل اشعار سے اس صنف میں رنگ
طبیعت آشکار ہوگا ۵

واہ کیا خوب ہے ہندو کالج سب کو محبوب ہے ہندو کالج

یوسفستان ہے ہندو کالج چشم یعقوب ہے ہندو کالج

قوم کی شان ہے ہندو کالج

ہند کی جان ہے ہندو کالج

سلطان یہ ہے ہندو کالج آب حیوان ہے یہ ہندو کالج

آئے دن قوم کی سرسبزی کے ابر نیان ہے یہ ہندو کالج

قوم کی شان ہے ہندو کالج

ہند کی جان ہے ہندو کالج

انہیں سے ہر تیسرا مصرعہ باقی تینوں مصرعوں سے باعتبار قافیہ
ورد لیف مختلف ہو اگرچہ یہ جدت پسند یہ نہیں کہی جاسکتی لیکن

یہی التزام آخر تک قائم رہتا تو اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ مگر
پانچویں بند میں بانو صاحب فرماتے ہیں۔ ۵

راجہ صاحب کی توجہ ہو اگر جائیں گے قوم کے سب کام سنو

طلبا کہتے رہیں آٹھ پہر زندہ مہراج کو رکھے ایشور

قوم کی شان ہے ہندو کالج

ہند کی جان ہے ہندو کالج

عجب ہو کہ پبلشر صاحب نے جو خود ایک ذکی احس او نازک خیال

شاعر ہیں اس معجون مرکب نظم کے لیے اس مجموعہ میں کیوں جگہ

نکال لی۔ قومی شاعری کی طرف رجحان پیدا ہونا ملک کے حق میں ایک

نیک فال ہو لیکن اصول شاعری سے انحراف کر کے قومی شاعری کی

مشی پید کر نیکی بھی ضرورت نہیں حضرت جوش کو اس صنف خاص میں

کافی واقفیت ہم پہنچانے کے بعد طبع آزمائی کرنا چاہیے تھی جن صاحب کو اس

دیوان کے مطالعہ کا شوق ہو وہ حضرت مصطفیٰ "ستد عا کرین قیمت کچھ

نہیں لکھی اور غالباً مصنف کی دریا دلی سے اسکی قیمت کچھ رکھی بھی نہیں گئی

زوال بغداد یہ نام ایک جدید الاشاعت تاریخی ناول کا ہے، جو لٹریا

محمد عبد الحلیم صاحب شرر لکھنوی کے رشحات قلم کا تازہ ترین نمونہ ہے

مولانا کی بے مثل قوتِ فسانہ نگاری تعریف و توصیف سے اسطرح مستغنی

ہو جسطرح آفتاب عالم تاب چراغ کی روشنی سے۔ یہ غنیمت ہو کہ کن

کے تعلقات منقطع ہو جانے کے بعد آپ کو شریذی خدمات کے لیے بہت

کچھ وقت ملتا ہو اور ملک کو آپ کا دل سے ممنون ہونا چاہیے کہ

آپکی ساری کوششیں علم ادب اُردو کے سنوارنے اور درست کرنے

میں ہمیشہ وقف رہتی ہیں۔

"زوال بغداد" میں جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہو اس زمانے

کے واقعات دکھائے گئے ہیں جبکہ خلافت عباسیہ کا چراغ، شمع

سحری کی صورت، ٹٹمار ہاتھ اور سطوت ہارونی محض ایک فسانہ

بن چکی تھی۔ تخت سلطنت پر مستصم باللہ جنتیت خلیفۃ المسلمین و امیر المؤمنین ممکن تھا لیکن اسکا رعب، اسکی عظمت اور اس کے اثر کا دائرہ بالکل محدود تھا۔ مولوی محمد عبدالحلیم صاحب شرر نے اسوقت کی خرابیوں اور بدانتظامیوں پر کافی روشنی ڈالی ہے اور نہایت خوبی سے تاریخی واقعات کو قصہ کے پیرائے میں بیان کرنے کی کامیاب کوششیں کی ہیں۔ سب سے زیادہ دردناک وہ سین ہیں جو ان قومی فرقہ بندی اور جہالت آمیز تقصبات ہاتھوں ستی اور شیعہ باری باری سے ایک دوسرے کا گلا کاٹتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ ناول کا پلاٹ فردوس برین سے بہت ملتا ہوا ہے اور ہم عصر علیگڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ کا یہ ریمارک صحیح ہے کہ

”زوال بغداد کے واسطے مصنف کو کسی خاص دماغ سوزی کی ضرورت نہیں پڑی صرف فردوس برین کی زمین پر زوال بغداد کی بنیاد اٹھا دی گئی ہے۔“

اس کے باوجود بھی ”زوال بغداد“ کی خوبیوں سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ عیاروں کے گروہ کی سچی کیفیت کا انکشاف عمدگی سے کیا گیا ہے۔ ناول کے آخر حصہ میں اس گروہ کے اسرار سرسبز طرح کھو گئے ہیں کہ کوئی بات جو قصہ کے درمیان میں ایک طلسم سے کم نہیں معلوم ہوتی، حیرت انگیز مافوق العادات نہیں رہ جاتی۔ ”عیاروں“ کا مقصد بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ مختلف فرقوں کی کسی حیلہ و فریب سے آتش عناد و منافرت مشتعل کرتے رہیں چنانچہ انھیں کی البہ فریب نہیں اگر شیعہ اور ستی ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں مڑھپ جاتے ہیں، محلے کے محلے تلوار کی بھینٹ چڑھتے ہیں، بوڑھوں، بچوں کا خون پانی کی طرح بہتا ہے عصمت آب پر وہ نشین خواتین علانیہ بے آبرو کیجاتی ہیں۔ یہ سب کچھ کون کرتا ہے؟ مسلمان۔ اور کسپر ہوتا ہے؟ مسلمانوں پر رفتہ رفتہ اس

جدال و قتال کا سلسلہ یوں ختم ہوتا ہے کہ ابن علقمی جو مستصم باللہ کا وزیر اور مذہباً شیعہ ہے خلیفہ کو سمجھا بھجا کر فرج میں افراتفری کر دیتا ہے اور تاتاریوں کو مدعو کرتا ہے کہ خلافت بغداد کو حلوے بے دود کی طرح ہضم کر جائیں۔ ہلاکو خان آتا ہے اور نتیجہ وہی ہوتا ہوتا ہے جسکی یاد اب بھی بدن کے روگٹھے کھڑے کرنے کو کافی ہے۔ قتل فروشی کی جو نفرت خیز تصویر وزیر سلطنت (ابن علقمی) کی شخصیت میں دکھائی گئی ہے اس کے نظارہ سے دلمین بے اختیار حقارت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ تقصبات اسکی آنکھوں پر پڑی باندھ دی ہوتی اور ناجائز جوش مذہبی نے اسے اگر بصارت سے نہیں تو بصیرت سے ضرور محروم کر رکھا تھا۔ کاش اسے اپنے آقا کے نمک کا کچھ بھی پاس ہوتا اور جہالت اور تعصب نے اسے اندھانہ کر دیا ہوتا تو باوجود خلیفہ مستصم کی کمزور حکومت کے، خلافت بغداد کا خاتمہ اس قدر عجلت سے اور اس عبرت انگیز طریقہ پر بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ناصح شیراز کو مواعظ حسنہ و نصائح دلپذیر کے عوض اسکی مرثیہ خوانی کا فرض ادا کرنا پڑتا ہے کہ ۵

آسمانِ راقی بود گر خونِ بابر دوزخین بر زوال ملک مستصم امیر المؤمنین
لے محمد گر قیامت نی آری زرخاک سر راوردین قیامت دین خلق بین
نازنینان حرم راقون خلق نازنین ز آستانِ گذشتہ ماراقون دل آستین
خلافت عباسیہ کا خاتمہ اچھا ہوا بڑا، ہو گیا۔ لیکن جسطرح اس کے ذکر سے کوئی تاریخ عالم خالی نہیں رہ سکتی اسی طرح خلافت کے حسرت خیز انجام کے تذکرہ کے ساتھ ابن علقمی کا نام ضرور لیا جانا چاہیے گا اور قوم فروشی و نمک حرامی کے جرم میں خلق خدا کی طرف سے اُسپر لعنت کی بوجھار ہوتی رہیگی۔

”زوال بغداد“ کے دیکھنے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ باہمی عداوت مذہبی عناد جاہلانہ تعصب اور ان کے ہاتھوں بالکل خفیف سی

میں تھوڑی بہت رقم ضرور بھیجتے رہتے تھے۔ قیامت اُنکی گھٹی
میں پُری گئی۔ اوالغزنی بھی اسکے ساتھ اُن کی عادات کا ایک
قابل تعریف جزو تھی۔ انھوں نے کبھی کسی کے آگے ہاتھ نہیں بھیلایا
ان بعض نیکدل بندے جو سوانی جی کی خدمت کو اپنا شرف جانتے
تھے وہ جو کچھ ذکر کرتے تھے اس سے انکار بھی نہ تھا۔

طالب علمی اسکول لائف ملازمت پروفیسری اور اسی کے
ساتھ اور بہت سے خانگی حالات کا صحیح صحیح تذکرہ "خطوط رام"
کے صفحات میں موجود ہیں۔ سے زیادہ صحت کے ساتھ کہیں

اور ملنا نامکن ہے۔ یہ کتاب بیحد کجسپ ہے اور وہ لا بُرری بہت
قسمت ہوگی جہاں اسکا ایک نسخہ نہ ہو۔ ہم نے چاہا تھا کہ اسکے
چند خطوط من وعن نقل کرتے اور بعض قابل ذکر خصوصیات
دکھاتے لیکن یہ خیال طوالت نظر انداز کرتے ہیں۔ ہاں اسکے
نواہشمند ہیں کہ علم دوست اصحاب اس کتاب کی خریداری
ضرور کریں قیمت قسم اعلیٰ مجلد ۱۲ و قسم دوم غیر مجلد ۸ روپے کتاب
کی خوبیوں کے مقابلے میں بیچ ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:۔ لالہ امیر خیز
پریم دھام بڑا دریہ۔ دہلی۔
"سیل القلم"

کلام شاد

(از ہمارا جہاد راجہ سرکشن پر شاد صاحب شاد بالقابم)

درد و فرقت سے نہو دل کی تسلی نہ سہی
نالہ غم میں بھی لذت مجھے اب ملتی ہے
عکس اور شخص کی نسبت تو مجھے حاصل ہے
نہیں دیتے جو تسلی تو اگاؤ خنجر
قابل جلوہ گہ یار تو دل ہولے قیس
ساتھ پارس کے جو لوہا رہے سونا ہو جائے
تم بھی بانگے ہو ادا بھی ہو تھاری بانگی
کوزہ و جام بنائیں کی تو تھی خاک مری
معرفت علم لدنی ہو کہوں کیا تجھ سے
گر نہیں لیتے خبر تم مرے دل کی نہ سہی
نہ سہی لب پہ مرے نغمہ شادی نہ سہی
میری صورت تری تصویر سے اچھی نہ سہی
یہ بھی منظور نہو تم کو تو یہ بھی نہ سہی
گر نہیں اس میں ابھی جلوہ لیلیٰ نہ سہی
تم میں جو کچھ ہے نہیں مجھ میں تو خوبی نہ سہی
تم اگر بات نہیں کرتے ہو سیدھی نہ سہی
اسکے بھی کام کی گریہ نہیں مٹی نہ سہی
واعظا اگر تو سمجھتا نہیں معنی نہ سہی

اس میں بھی شک ہے تھیں کیا کہ نہیں خیر
خیر کافر ہی سہی شاد و صوفی نہ سہی

شکر یہ

کیونکر ادا ہو شکر اے پروردگار تیرا مجھ پر نیا اک احسان ہے خطہ و تیرا
بندوں پہ کس قدر ہے اثر بیا تیرا مایوس کب ہوا ہے امیدوار تیرا
وہ ہے بڑے خلقت تیری ہی ماہ شفقت
یکسان ہے سب کے جانب تیری نگاہ شفقت

اے پاک ساز سارے عیون سے پاک تو ہے سب میں ہے اور پھر بھی لا شرک تو ہے
تقویتِ جہان ہے یہ بیم و باک تو ہے تسکینِ فرائے قلب اندوہناک تو ہے
تعلیمِ کم و قابلِ ہر ایک نام تیرا
ارض و سما سے بالاتر ہے مقام تیرا

ہر برگ و بار سے تو پیدا ہو بوی صورتِ مخلوق کی زبان پر تو گفتگو کی صورت
کل کائنات میں جو حسن و نمود کی صورت ہر دامن جلوہ آ رہا ہے آرد کی صورت
قطرہ میں آب ہو کر تو ہی جھلک رہا ہے
ذره میں مہر بن کر تو ہی چمک رہا ہے

ہر پردہ جہان میں مستور از تیرا خاموشی و سکون میں بجا ہو ساز تیرا
تارِ نشیب میں ہے نورِ فراز تیرا مخصوص ہر سان میں ہے اتیا ساز تیرا
معتشوق میں عیان ہے رنگِ جالِ بنکر
عاشق کے دل میں پناہ نقشِ خالِ بنکر

تیرے ہی فیض سے ہے قائم ہمارا ہستی منظر میں تیرے سارے نقش و نگار ہستی
موقوف ہے تجھی پر دار و مدار ہستی اور تیرے ہی سہارے چلتا ہے ہر ہستی
معبود اک حقیقی شاہ و گدا کا تو ہے
روزِ ازل سے مالکِ رض و سما کا تو ہے

اے خالقِ دو گیتی، راجتِ عالم! اے مخزنِ کرم! اے حاجتِ عالم!
اے جانِ نوازِ مطلق! اے آئینہ عالم! اے ابتدائے عالم! اے انتہائے عالم!
تجھسا شفیق صادق کوئی نہیں کسی جا

تجھسا رفیقِ واثق کوئی نہیں کسی جا
ہر خطہ دل سے تیری آواز آرہی ہے احکامِ پاک تیرے ہموں سارہی ہے
نیرنگیِ جہان کا پردہ اٹھا رہی ہے راہِ نجات یعنی سب کو دکھا رہی ہے
کہتی ہے کان سے سُت تو میرا کیاں ہر دم
کہتی ہے من سے رکھ تو میرا ہی پیمان ہر دم

افضل ترین تیرا ہے پایہ ہدایت اور حد سے بھی فزون ہے سترِ ہدایت
توفیقِ پاک دے ہاں لے مایہ ہدایت سارے جہان پر اپنا رکھ سایہ ہدایت
ہر ایک رزے بجا سے ہوں الگ ہم
دُنیا میں رہے کچھ بھی دُنیا سے ہوں الگ ہم

ہاں ایسی کروا زش قیلم و چھوین لطف و سکونِ حاصل فکرِ دم سے چھوین
ہو کثرتِ محاسن عیبِ دم سے چھوین یعنی کہ نفسِ بے جور و ستم سے چھوین
دل سے نہ اپنے تجھ کو صلا بھی بھلا میں
تیری عنایتوں کا ہر خطہ راگ گائیں

اقبال و راسخ

ہر ذرہ سے عیان ہے یارب اظہور تیرا دل میں چمک رہا ہے مومن کے نور تیرا
ارض و سما میں جلوہ تیرا سارا ہے روشن ہے تمام سپر و ذیک دور تیرا
یاب تری عطائیں دُنیا میں گہت ہیں انعام اور ہوگا روزِ نشور تیرا
ہر نام پاک تیرا دل کے لیے تسلی ہر قابِ مضطرب کو کافی سرور تیرا
انسان ہے گو کہ شرف لیکن تجھ سے غافل لیتے ہیں نام سارے دشمنِ طہور تیرا
پشتہ سے کم حقیقتِ عالم کو جانتا ہے حاصل ہوا ہے جسکو قرب و حضور تیرا
یارِ بچھے بچائے خطرے مرے مٹا دے

بندہ تو ہوں میں آخر بتِ غفور تیرا
رورو کے التجا کر اللہ سے عاکرا بیڑا ہے پار پھر تو بندے اضرد تیرا
یہ کار گاہِ ہستی اک شانِ ایزدی ہے تجھ کو نظر نہ آئے تو ہے قصور تیرا

کلام اکبر

کہا میں نے خدا سے اُس کیوں نہیں وہ بڑ کر بول اُٹھو آپ مرتے کیوں نہیں
جب حالت ہو طاعن کی تو کیوں کہتے ہوں اگر اُٹھتے کیوں نہیں غم اُٹھ بھر کیوں نہیں

دیا نہیں تکبر اچھی نہیں تعلق اک دم میں مٹ دجائے سارا غرور
لوٹ گناہ چھوٹے تو کس طرح سے چھوٹے دل ہی نہیں ٹھکانے لے پے شور تیرا
غفلت میں عمر اپنی لے اٹھ گئے کھوئی

ساری تری خطا تھی سارا قصور تیرا
اشک بند شہری

آزار گئے جو ہے نام و نمود میں کیا ہرج زندگی ہوا اگر حال نشہ میں
دورخ کے داخلے میں نہیں اُن کو نذر کچھ فوٹو کوئی لگا دے جو انکا بہشت میں

کسو سادہ ساقی جو کچھ بھرا جی میں تو نے اڑائیں اکثر باتیں مہنسی میں
لیکن مری مصیبت نہ دہلی جی تباہی غمخوارین خدا را اس درویشی میں
لا بھر کے ایک ساغر ساقی نے کہن کا اک تازہ غم ہو چھکوا اس رنج بیدی میں

نیچے چھو بیٹھے یہ کیوں ہو ایسا کیوں نہیں شیخ ایہ پوچھو تمہارے پاس کیا کیوں نہیں

مغربی ساڈے لالہ تون پرز کے ساتھ ساری بھی انکی ہو گئی غائب کر کے ساتھ
ہستی ہی تیری کیا ہو کہ ہوا نکاح ہم سفر موجد نکالے جاب انہ سے تو اُٹھ کر کے ساتھ

اہل وطن نے مکرر بار دکر دیا ہے جس گھر کی تھی ضرورت ہم باندگی تین
بھولے ہیں دوست با ہم افٹ ملے رہنا کیوں با گریہ ہیں ہم غفلت مہر میں
جینے کی واسطے اب ہر قوم مر رہی ہے یہ دت نہ تھکتے ہیں ہر جا پہ زندگی میں

شیخ صاحب سے رنج مجھے تو ہے مفید شغل کچھ آپ بھی فرمائیں جو انکار نہ ہو
مے بھی ہوں میں مجھ پر بھی مسرت شیخ بھی خوش رہیں شیطان بھی نرا نہ ہو
پھیر سکتی نہیں تقویٰ سے مجھے کوئی صدا شرط یہ ہو کہ وہ بازیب کی جھنگار نہ ہو

کیوں ضد ہو رہیں کو شیخ حرم نشین کیا شیخ کا بڑا ہر مند رکی آرتی میں
تیرے ہی گیارہ نکاح کی اجڑھیا میں پر م آتما کی مایا رکھی ہو سکے جی میں
ہر گھٹ میں ام جی ہیں اور نام داؤ کیوں مرے ہوا حق کہ جگہ نہ گری میں
ساری جہان کی تو میں کچھ کا اگر نہ تھی تم پھنس رہے ہیں یا رو کس دن واری میں
توحید کی تشقہ پندت کی جو جبین پر طرہ حق کی وحدت دستا مولوی میں
یا رعدا و تین ہیں بیوسب ہماری پہان نجات سکی ہو صلح و اشتی میں
آپس کی الفتو نہیں گریاں ہو ہمارا سب کچھ ملے گا ہکودانش کی گہی میں
ہو کہ قدر مصیبت بدلا ہو کیا زمانہ جان حمید نالان ہو سخت بے بسی میں

جذبات شوق

یہ حسن عارضی یہ دور روزہ ہا کیا اس حلیتی بھرتی چھانوں کا یار عتبار کیا
دل بکھر رہا ہو سانس الٹتی ہو بار بار ہونا ہو آج لے مرے پروردگار کیا
دیتا ہو لطف آنے نہ آنے کا سچ بھی مجھ کو گراں ہو کشمکش انتظار کیا
بھولا ہوا سا خود ہی ہے جو شباب پر یاد اور کو کرے وہ فراموشگار کیا

دھنک لیکہ یاران شرب مدام کردند
چون نوبت باشد آتش بجام کردند

صاحب اک بے گم ہو کام اک بندہ اشد کا جا کے سمجھا دے یہ سودا ہو خدا کی اہ کا
جس دم سے زہ کس کا ذکر ہو ہو نظر سیکھتے ہیں ضبط سے ہم روک لٹاؤ کا

حمید کوٹلوی

سمجھانے بات فہم میں ہو یہ قصور کیا اب بار بار پوچھ رہا ہوں حضور کیا

دشوار ہو گیا ہو مجھ کو خود اپنا بسنا ہے کیا وسیع عالم میری ربوبی کا
وہ ہوش میں ہمارے آئی اگر کسی دن
ہم دیکھتے تماشاً شوق اپنی بخودی کا

اے جنوں ایوں تو نہ پھوٹو نگا اگر پھوٹا
ایسے ایسے بجا دوں گا تو کفر چھوڑو نگا
ڈھونڈو ہی لوں گا چھپے لاکڑہ ہر گونہ میں
نہ کوئی گل نہ کسی گل کا شجر چھوڑو نگا

جبر شہ نہین ارباب وفا کا اور نہ تو مفید کشش دل کے اثر میں تبا
غیر سے راز چھپانا تھا تو میری جانب کچھ تمنا فل ترے اندازِ نظر میں تبا

دیارِ عشق

تشبیبِ قصیدہ

چلا ہوں دشتِ محبت کی سمت میں ناشاد قدم قدم پہ صد امگ نومبار کیا
یہ جانتا ہوں بلا خیز دشتِ الفت ہو رکھا ہو اتو قدم شینے ہر چہ بادا باد
وہ ہولناک یہ وادی ہولے معاذ اللہ سنائی کچھ نہیں دیتا جہان بجز فریاد
عجیب رنگ ہو اس ہولناک شکل کا کہیں ہو دام کہیں ہو نفس کہیں ہو
چلا ہی جاتا ہوں کچھ انتہا نہیں ملتی ہر اک قدم کی مسافتِ طولِ ازمنہ
ہر اک قدم پہ سے بریز میرا پیانا کہ آہو کی تپک ٹھٹھکی ہو حد سے زیاد
خدا ہی مجھ کو نظر آ گیا وہ عالم ہو نہ آدمی ہو بیان کوئی اور نہ آدم زاد
کہیں ملا جو کوئی زندہ دل شکستہ مزاج ہزار حیف کہ قسمتِ وہ بھی تھا جاؤ
نظر بھی آئی تو کچھ جا بجا جلی جلی غا گراٹھا کہ ہو دیکھا تو تھا دل ناشاد
کہیں پڑے ہوئے ڈھانچہ مستم سید کہنا ہے دفترِ شریکِ عالم اجساد

کہیں پڑھیں کچھ استخوان بوسیدہ کہیں پتھر ویرانہ عدم آباد
دیارِ حسن میں جتنے کدو دوسے تھے بنے ہیں عنصرِ خاک آب و ہوا تانِ برباد
وہ اپنے شوق جو چلنے میں ایک اندھی تھے اسی کی خاک خاک کر رہا جواب برباد
دہنِ عشق نے ذی آج انکے ہر سکت جو پھونکتے تھے کبھی صورِ نالہ و فریاد
نجانے کون ہیں یہ کیسے ہو گئے انکے خیال وہ چند کا سہ سہ دیکھ کر یہ آیا یاد
جلنے آپ ہیں کچھ خون تازہ کے دریا جہازِ جسمین روان ہیں سو عدم آباد
شناور اسکے بہت ہاتھ پاؤں ملتے ہیں مگر ابھر نہیں سکتے کسی طرح ناشاد
بشکل چاک گریبان کھلا ہوا اک زندہ جہان چلے ہیں گرفتار ہو کے چند آزاد
صدایہ ہو کہ قدم تک کسی لفت آئی ہے تا بختِ اسیروں کی مدت تبا
غرض کہ منزلیں ایسی ہزار ہا کہیں و فور غم سے پریشان ہوا دل ناشاد
وہ دل جو پیرِ طریقت بنا تھا ساتھ مر وہ دل کہ جس سے ملتا تھا فاضلہ لہو
لرز رہا ہے کچھ سطح و کھل کر یہ حال نہ زردِ نالہ و زاری نہ طاقتِ فریاد
یہی صد اداں ناما بختِ خیال کی ہو کہ میں تو چلے دن اور سہا کروں میں باد
سنی جو حضرت دل نے عزیز کی تقریر جو تیلے لہجہ میں غم سے یہ کیا ارشاد
دشت کیا یہ نازل ہیں کیا یہ دیر یا کیا قسم ہو جزا بخت کی سب ہیں بے بنیاد
یہ سچان فقط تھا تری طبیعت کا ابھی جو چاہوں تو دم بھر میں بٹ برباد
تمام عمر وہاں میں نے خاک چھانی ہو جہانکے دڑے سے کمتر ہے عالمِ آباد
سجھکے کچھ تو ہوا ہوں اسیرِ دام بلا و گرنہ چاہوں تو ہو جائے موم ابھی لاد
بنا ہوں ہاتھ سے خود اپنے پکس مجبور غرض ہو اس سے فقط آزمائش بید
نگاہِ قوتِ اعجازِ عشق پیدا کر دکھاؤں کیا نہ تھے تاثیرِ نالہ و فریاد
تجھے خبر ہی نہیں ان اہل لفت کی کہ زندہ رہتے ہیں کیونکر خاتمِ برباد
تمام عمر جو دیا ہو خون کے آنسو ہو کر بلاے محبت میں کچھ دہی ناشاد

گلے میں جسکے ہو طوق اور پانوں میں زنجیر

دیارِ عشق میں ہو ذی بندہ آزاد

عزیزِ لکھنوی

شادیوہ

سمندر اور دل

اے حسرت خدارا جگو نہ آب ساؤ سترے اُنکو دلمین مرے نہ آؤ
بہر خدانہ چھیر دیوہ ہون رقم کھلو بس بس سنگار کی آب ترغیب دلاؤ
اُترا ہوا سا چہرہ کیا آرسی میں دیکھوں

مغموم شکل اپنی میں کس خوشی میں دیکھوں
رنگین کوئی کپڑا بھاتا نہیں دلو پان اور سی کا چہرہ بھاتا نہیں دلو
آہ کوئی گستا بھاتا نہیں دلو آئینہ کا تماشا بھاتا نہیں ہے دلو

پھولوں میں پانہ خوشبو آتی نہیں ہو جگو
برگِ حنا کی رنگت بھاتی نہیں ہو جگو

دلمین جو درد فرقت لگا ہوا ہوا ڈاری رہتے ہیں چشم تر سے ہر وقت اشک باری
سو زخمِ جدائی سے اُن سے بیکاری کروٹ بیل بیل کے کشتی اور تاری
صبح ہو کے مضطرب دلو مسرتی ہوں

ہر دم تڑپ تڑپ کے قسمت کو کستی ہوں

بھولپون میں چلتی ہے شرم جگو ساتھ اُنکے گیت گاتے آتی ہو شرم جگو
ہنسکر کھینچتے آتی ہے شرم جگو اب دلو گدگداتے آتی ہو شرم جگو
کاشا ذالم میں اک گوشہ گیر ہون

کنجِ قفس میں گویا مرغِ اسیر ہون

کسکو سناؤں اپنی حسرت بھری کانی سناؤں کون میری مجھے مری بانی
یہ دگرہ جو حسین الدن جو جان جانی برباد ہو رہی ہو اٹھتی ہوئی جوانی

جینے سے تنگ جی سے بیزار ہو گئی ہوں

جسدن سے وہ مرے ہیں بیاہ ہو گئی ہوں رعدِ جوی

اے سمندر تیری وسعت دیکھ کر آرزو میں میری کسی شادی
جس طرح موجیں ہیں تجھ میں جلوگر یونین سیر دلمین یہ آباد ہیں

تو اگر ہو بحرِ ناپید اکسار اور لہروں کی نہیں کچھ انتہا
یونین ارمان ہیں مرے بھی بیکار اور وسعت دلی تجھ سے بھی سوا

جس طرح تجھ میں سلاطم ہے بپا اور مد و جزر کا ہے زور شور
یونین طوفان کھتا ہو جذبات کا میرا دل جس کا نہیں کچھ اوجھڑ

جس طرح تیرے میں لئے بیٹھا ہے تو بیش قیمت در کنون سیکڑوں
میرے دل میں بھی اگر ہو جستجو ایسے ہی نکلیں گے مضمون سیکڑوں

جس طرح تجھ کو سکون حاصل نہیں ایک طالت پر نہیں رہنے کی تاب
چین سے اک لمحہ ہٹا دل نہیں یہ بھی ہو یونین رہیں اضطراب

سطحِ برتری روان چن جس طرح یہ دخانی کشتیان اور یہ جہاز
آتے جاتے دلمین بھی ہیں سطح حسرت و اُمید کے راز و نیاز

ہیں ہزاروں ہستیوں کے تجھ میں غرق جس سے تو گنجِ شہیدان نکلیا
پھر بھی کچھ ہوتا نہیں اس سے فرق ہے مٹاؤں کا مدفن دل مرا

اے سمندر امین تو سمجھا ہوں یہی تو خدا دل سے کوئی ہستی نہیں
تجھ میں اور دلمین ذرا بھی واقعی امتیازِ رفعت و پستی نہیں
اخذ تھانومی

اس ملکِ رنگین تصویر کے متعلق جو نظم آئی تھی وہ سوچا چھپنے سے رو گئی۔

ماہِ آئندہ کا انتظار کریں

تضمین قطعہ صغیر لکرامی

مرانا مہ لیکر تو جاسوئے شاہ بیان کر پراسرار جہن مقاصد
 ٹھہرنا نہ رستے میں تو آن واحد بے شوق سے بھیجتا ہوں مقاصد
 رہیگی نظر راہ پر دیکھ لینا
 سفر کوے قاتل کا تھکوا مبارک بنا خاک کو دہان کی تیغ تارک
 سفر خطر ہونین میں کچھ تنگ تو خیر سے پھر کے آئے گا جب تک
 نہ ٹھہرے گا دل نہ جگر دیکھ لینا
 ادھر آکر اک بات بتاؤں تھکوا رہے دھیان اُس پر کھلاؤں تھکوا
 مریجہ شکر کا دکھلاؤں تھکوا تیرے کوئے قاتل کا بتاؤں تھکوا
 جو کتا ہوں سب ہونڈ کرو دیکھ لینا

تو پہنچ گیا جب تا سر کوے دہر نظر آئے گا تھکوا اک قصار حمر
 دہان پر بیاہو گا سامان محشر کوئی ہو گا دھونی رائے وہاں پر
 کسی کو کھڑے نگے سر دیکھ لینا

کوئی گریہ خون پیے ہو گا اپنا کوئی نیم جان دل دیے ہو گا اپنا
 گوئی جامہ عریان سے ہو گا اپنا کوئی چاک دامن کیے ہو گا اپنا
 کہیں پر کھڑے نجیہ گرد دیکھ لینا

کوئی بے خبر مست جام محبت کوئی مائل شکوہ یاس و حسرت
 کیسی زبان چکایات و فرقت کوئی شام غم میں گرفتار کلفت
 کسی لب پر آہ سحر دیکھ لینا

دیئے ہو گئے جان مرزا لے کیسے بڑے ہو گئے دہان جان کلا کیسے
 زلاؤں گے خون تھکوا چھلے کیسے ہلا دیگے دل تیرا نا لے کیسے
 کسی کی فغان بے اثر دیکھ لینا

جو منزل تھی ہوگی آخر سفر کی خطرناک ہو راہ دہان گذرگی
 کہیں کھوپڑی ہوگی قلمد سر کی کہیں ڈیان طاڑ نامہ بر کی

کسی جا کتوبر کے پر دیکھ لینا
 نہ زکنا دہان تھکوا کوئی جو رک نہ زنا خردار اگر کوئی پکڑے
 قدم کو پڑھائے چلا جائے آگے یہ سامان گلی میں دھوکے پڑے
 پھری سب ان کی نظر دیکھ لینا
 نظر آئیگا اک سماں طرف دیگر جسے دیکھ کر تیرا دل ہوا مضطر
 نشان ٹھیکٹ دیکھ لینا ملا کر بعد ایک حسرت بھری صبر
 لکھی نظم یہ لوح پر دیکھ لینا
 ”ادھر دیکھ کیوں مج زینت غافل پیرا مان یہ مرقہ ہر عبرت کی منزل“
 پڑا اس میں سوتا ہو کر تیرا سہل تجھے اپنی آنکھوں کی سو گند قاتل“
 ”مری قبر روز اک نظر دیکھ لینا“
 سیدت حسرت حسین بی ادب ل

اپنے عکس سے دودو باتیں

ایک لڑکے نے کسیدن اہ میں آئینہ پا کر کہا قسمت مری
 پھر وہ بولا عکس اپنا دیکھ کر واہ واہ کیا خوب صورت مری
 کیوں ہیں ناخوش دیکھنے لے کر اُنکے دل میں کون نہیں افسوس مری
 میں حسینوں ہوں کس غنی میں کم چاہیے دنیا کرے عزت مری
 لے مے شکل ملے میرے شبیہ تو ہی کر شدہ کچھ محنت مری
 عکس نے شکر دیا فوراً جواب عفو گستاخی کرین حضرت مری
 فذہ ناچیز ہوں میں کیا کہوں بستہ اس باب میں ہمت مری
 آپ کا وصف اور مجھے جو سکے کیا مجال نطق کیا طاقت مری
 مجھے اور سرکار کا ارشاد ہو تھی کہاں ایسی بھلا قسمت مری
 ہو مگر اک عرض گرسن میں جنو روبرو کننے کی ہے خصلت مری
 آپ کا ہر رنگ میں ہمزگ ہوں آپ کی تصویر ہے صودت مری
 آپ میں جاندار یہ محکم خدا اور میں بیجان قسمت مری

نشی عبد الرحمن محمد صاحب شتر سنگرولی

حیات چند روزہ سطح سے ہو بسر کرو عدم کا ہر سفر و پیش سامان سفر کرو
دکھا دو چاہنے والو کو تم انداز محبوبی سما جاؤ نظریں سبکی لمبیں بک گھر کرو
اسل اندازیا سے لو چوری کھل گئی دلی کہا تھا کس تم سے چھپ کر بچی نظر کرو
متنازاہد و احوال کی کرنا بعد مرنے کے پرستش ان بتان ماہوش کی عمل کرو
یہ خالی جام ساقی میکشہ کیا کام لینگا اگر لیتے ہو ساغر بادہ رنگین سے بھر کرو
جو محفل ہو مہقتل ہو جو بیدار ہو میں بولان جو خیرات تھیں اپنے کبھی تم بن سونو کرو
شب عدہ جو آنے ہو نہ پھیرو ذکر دشمن کا نہ بخش کی کرد تم بات اہل حل کر کرو
نہایت سرفرازی اسکو عشاق میں حاصل پست آجان ہر جہیز تم خوشتر کا کرو

سید محمد امین صاحب تاحمدانی گیاروی

کیا دھوان ہمارا گھٹا اٹھی ہر چٹانے سے ساقیا ہنور کا مینہ برسے گا پانی سے
کھل گیا رنگ ہر اک گل کا ہار آنے سے حسن دنا ہوا صورت ککھر جانے سے
حلق پر تیغ دودم کھلے بھی پھیری گئی کیا ملا تھکا دستہ گلاب مر وڑ پانے سے
وصل میں دیکے نہ ارمان نکلنے پانے جان پر بنگی غلام اترے شرنالے سے
یہ ہر حال میں تقدیر پر شا کر انسان سب بنے کام گر جاتے ہیں گھبرانے سے
قتل کے بعد ہی حسرت و افسوس عشت جی نہ اٹھو نگاہ میں ظالم اتیرے پٹانے سے
واہ سے ضبط دم قتل ترے عاشق کا دم نہ مارا تہر خنجر ترے فرمانے سے
مر گیا میں تو وہ شانے کو ہلا کر بولے جاگ ادیند کے ماتے امرے خنجرانے سے
بہر میں شعر و سخن کی ہر بحث فکر سا خون پینے سے فرستہ دم کھلے سے

ابوالافکار میر عاجز مہسوالی

دیکھ کر جلوہ ترا مخلوق شیدائی ہوئی محو حیرت کس قدر چشم تماشاںی ہوئی
جلوہ و شہ کی کثرت میں خود آرائی ہوئی فتنے دتے سے نمایاں شان کی تائی ہوئی
رہے روشن ہر تر چشم و چراغ شمع طود چشم موسیٰ کی طرح خلقت تماشاںی ہوئی
پامال غمزدہ دل جان فتنہ ناز خرام اک قیامت حارہ ہی ہو حال اٹھائی ہوئی
اپکے جاتے ہی عاجز نے کیا روا شروع یک قلم دل سے جدا صبر کیلانی ہوئی

آپ میں جو صفت ہیں مجھ میں کہاں لغو سمجھیں آپ کو محبت مری
ہو نظریں میری کیساں ہر بشر بس اسی جو ہر سے ہر عزت مری
ہو اگر انسان میں بھی یہ صفت پھر نہ منہ نکلتی رہے حیرت مری
خود نمائی مجھ سے لیتے ہیں حسین جھوٹ سے بھی سیکھیں نفرت مری
دل میں رکھنا ہمنشینوں سے غبا دیکھ سکتی ہو کہاں غیرت مری
آپ عاقل ہیں تو میں مجھے سبق رستی سیکھیں جو ہے فطرت مری
ہو دو بلا آپ کا حسن و جمال

کاش اس صوت پہ ہو سرت مری
جمیدیر مٹھی

تازہ نزلین

مجدد الوقت بلا ناسیہ احمد حسن صاحب شتر سنگرولی

جلوہ افکن ہر موقع حسن عالمگیر کا آئینہ حیرت سے منہ نکلتے لگا تصویر کا
کھینچ لیا ان کو جذبہ آہ پر تا شیر کا کام دے گا میرا ہر تار نفس زنجیر کا
خضر کے چھینٹو نہیں وہ آئینے جو کفر میں ہم کو چھینتا چاہیے آب دم شیر کا
جب تے جلوے سے حیرت کا موقع بن گیا میری صورت دیکھ کر رنگ اڑ گیا تصویر کا
رکھ کے فرق کبر پر اسکو جواب سا نہ بھول تاج شاہی مہر ہے بازیچہ تقدیر کا
ہر مہرہ ناک تو اس کے واسطے پر ہو نگاہ ترک کرے ترک تو ترکش میں کھنڈیر کا
کیا ملائیگا تو مجھ وحشی سے آنکھ لے چارہ گر دیکھ چشم شیر ہے حلقہ مری زنجیر کا
چارہ گر خود قید نے بختا مجھے پائے گریز خانہ زنجیر میں نالہ ہون میں زنجیر کا
بے ثباتی کی ہوا میں اڑ رہا ہوں ات دن یا خدارنگ پر یہ ہوں میں کس تصویر کا
سینہ گر کھائل نہو ناموس غم کا داغ ہو دل اگر زخمی نہو تو زخم ہو تقدیر کا
لذت بست نرا کتک ہوئے دونوں شہید چل رہا ہو میرے دم کے ساتھ دم شیر کا
وسعت و حشر کے آگے تنگ یا اسقدر دام صحرا بن گیا حلقہ مری زنجیر کا

بول جائیں دم میں جہنم کتک سخن کے عیب ہیں
شعر نے پھیرا ہے منہ ہر شیر آہو گیر کا

میر مہدی مجروح



العصر

حرکت کا پہلا قانون

زمین کی محوری حرکت بند ہو گئی ہے! کل صبح آفتاب عالم تاب افق مشرق سے طلوع نہیں ہوگا بلکہ صبح کی نورانی سفیدی کبھی آشکارا نہیں ہوگی!! جہاں دن ہے وہاں دن رہیگا اور جہاں رات ہے وہاں رات کی ابدی تاریکی صفحہ زمین کو انسان کی آخری نسلوں کا ایک عالمگیر قبرستان بنا دیگی!!!

انسانی طبائع کا صحیح مطالعہ کرنا مقصود ہو تو کسی طریقہ سے اس سنسنی خیز خبر کو عارضی شہرت دیدہ بچے پھر دیکھیے جمالت کی نیند کے متوالوں کی آنکھیں کس طرح کھلتی ہیں۔ مارکونی گرام اور تار برقیوں کس عجلت اور شوق کے ساتھ پڑھی اور سنی جاتی ہیں۔ کیسی مستعدی کے ساتھ اجرام فلکی کا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور خواہش ظاہر کی جاتی ہے کہ اگر ایک فہم پھر زمین کی فائدہ اور مسلسل حرکت شروع ہو جائے تو اسکا وسیع مطالعہ کریں گے۔ لیکن جب ایک

لہ مارکونی گرام (Marconigram) جو پیغام برقی رو کی مدد سے تاروں کے بغیر تہرے توجہ اور برقی لہروں کے ذریعہ سے ایک مقام سے دوسرے

گراں بہا نعمت ہمیں عطا کی گئی ہے اور ہم ہر لمحہ اس نعمت کے جاں بخش فوائد سے مستمع ہو رہے ہیں ہماری غفلت شعاری اور کوتاہ اندیشی ہمیں اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم ان آسان لیکن مہتمم بالشان مسائل پر کما حقہ غور کریں اور زمین کی محوری حرکت کے علل اور نتائج پر عبور حاصل کرنے کے بعد اس کے مسلسل اور باقاعدہ قیام کے متعلق جہاں تک انسانی سمجھ اور علم کام آسکتا ہو غایت درجہ کے یقین ہو جائیں۔

امروا قعہ یہ ہے کہ نہ صرف انسانوں کے میل ملاپ میں بلکہ مظاہر قدرت کے متعلق بھی حضرت انسان کا یہی معمول ہے کہ بے تکلفی اور روزمرہ کی ملاقات کا نتیجہ اگر نفرت نہیں تولد پر وائی ضرور ہوتا ہے۔ اس اصول کی تشریح مذکورہ بالا عیسیر الحصول اور مرگ فرا مثال سے اگر کافی طور پر نہ ہوتی ہو تو مقام پر وصول کیے جاتے ہیں ان کو بغیر تار کی برقی پیغام رسانی کے ایک ملاوٹی تبدیلی مارکونی (Marconi) کے نام پر مارکونی گرام کہتے ہیں۔

اپنی زندگی کے جس شعبہ پر چاہے نظر ڈال کر اپنی تسلی کر لو جب یورپ میں بغیر تار کے برقی پیغام رسانی کا سلسلہ شروع ہوا تو ہر شخص اس کے سمجھنے کے لیے حد سے زیادہ خواہشمند نظر آتا تھا اور علمی ترقی کے میدان میں پیچھے رہ جانے والے کے سرتاج نیم روشی نیم مہذب ملک ہندوستان میں تو آج تک یہی حالت ہے کہ وہ لوگ بھی جو علمی نقطہ خیال کے مردوں کا حکم رکھتے ہیں اور علمی دنیا سے مایوس و ناخیر ہیں، بلاتار برقی، کے نئے نام سے چونک اٹھتے ہیں۔ علمی زندگی کی ایک عارضی لہر ان کے مردہ دلوں کو جلادیتی ہے اور اس عجوبہ دریافت کے سمجھنے کے متمنی نظر آتے ہیں حالانکہ یہی وہ لوگ ہیں جن کو معمولی تار برقی پیغام رسانی کے متعلق ذرہ برابر درک نہیں ہے اور نہ ہی اس کے سمجھنے کی خواہش

ہے۔ فرق دونوں حالتوں میں صرف یہ ہے کہ ”معمولی تار برقی“ ایک روزمرہ کی چیز ہے جب سے ہنسنے ہوش سنبھالا ہے معمولی تار برقی کا نام سننے آئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اگر نفرت نہیں تو لاپرواہی اس کے متعلق ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ برعکس اس کے ”بلاتار برقی“ ایک نوکھی چیز ہے اگر اس کے متعلق تھوڑی بہت گفت و شنید کرتے ہیں تو ہماری فطری جدت پسندی کی تسکین ہو جاتی ہے۔ وگرنہ علمی نقطہ خیال سے معمولی تار برقی اس امر کی زیادہ مستحق ہے کہ اسے بلاتار برقی سے پہلے سمجھا جائے میں خیال کرتا ہوں کہ اگر دنیا میں قدیم سے یہی رواج ہوتا کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ کھوکھلی نلیوں کے ذریعہ سے باتیں کرتے یعنی آواز کی موجوں کو کھلی ہوا میں گزارنے کی بجائے نلیوں میں سے گزارتے تو شاید نلیوں کی مدد سے باتیں کرنا ایک ویسی ہی معمولی بات سمجھی جاتی جیسی کہ تار کے ذریعہ سے برقی رو کا گزارنا سمجھا جاتا ہے۔ اور نلیوں کی وساطت کے بغیر براہ راست کھلی ہوا کے ذریعہ سے باتیں کرنا ویسا ہی عجیب و غریب ہوتا جیسا بغیر تار کے برقی پیغام رسانی کا سلسلہ فی زمانہ سمجھا جاتا ہے حالانکہ بغیر نلی کے باتیں کرنا جیسا کہ ہم ہمیشہ بغیر سوچے سمجھے کرتے ہیں ویسا ہی ہے جیسا کہ بغیر تار کے برقی رو کا ایک مقام سے دوسرے مقام تک بھیجنا۔ ایسا ہی چیزوں کے بوجھ کا مسئلہ اور ان کا زمین کی طرف گرنا

ایسا عام مشاہدہ ہے کہ محض عومیت کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں اس کی اہمیت باقی نہیں رہی۔ جہاں معمولی سے معمولی سمجھ کا آدمی یہ سوال کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے کہ یہ امر کیوں ہوا؟ اور وہ امر کیوں ہوا؟ اس کے دل میں اس خیال کا خیال بھی نہیں آتا کہ زمین چیزوں کو کیوں کھینچتی ہے؟

مندرجہ بالا اصول کسی مفصل تصدیق کا محتاج نہیں ہے اور نہ کے ثبوت کا ہم پہنچانا ہمارے مبحث میں داخل ہے۔ ہمارا منشا موجودہ سلسلہ مضامین کے لکھنے سے برادران وطن میں ایک علمی تحریک پیدا کرنا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم نے ایسے مضامین انتخاب کیے ہیں جن ناظرین میں اپنے مشاہدات اور عام علمی استعداد بڑھانے کی خواہش پیدا ہو۔ مضمون زیر بحث یعنی حرکت کے پہلے قانون کے ضمن میں زمین کی روزانہ اور سالانہ گردش کے متعلق چند نہایت ضروری سوالات ہیں کہ زمین کیوں اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی ہے؟ ہم کس طرح اس بات کا یقین کرتے ہیں کہ یہ ہمیشہ اسی رفتار کے ساتھ اپنے محور اور سورج کے گرد گھومتی رہیگی؟ ہمارے پاس اس یقین کے لیے نظری اور علمی ثبوت کیا ہیں؟ ان سوالات کا مفصل تسلی بخش جواب اپنی جگہ پر اس مضمون کے دوران میں آجائے گا۔

نظام بطلمیوس کے مطابق زمین ساکن مقصور کی جاتی تھی اور اسے عالم کا مرکز مانا جاتا تھا۔ گردش لیل و نهار یعنی طلوع و غروب آفتاب کے متعلق متقدمین کے عجیب عجیب خیالات تھے۔ قاعدہ کی بات ہے کہ انسان اپنے گرد و پیش کے واقعات کی توجیہ کے لیے ضرور کوئی نہ کوئی وجہ بنا لیتا ہے جس سے ایک حد تک اس کے دل کی تسلی ہو جاتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے دریافت کردہ ہباب صحیح نکلیں یا غلط۔ لیکن یہ ضرور ہوتا ہے کہ لے بطلمیوس (Ptolemy) زمانہ قدیم میں ایک قابل ہندس ہو گا اور جس نے پہلی مدی عیسوی میں فروغ پایا تھا۔

ان اسباب کی حقانیت کا اعتبار اس زمانہ کی معلومات کے مطابق ہوتا ہے۔ آج جن باتوں پر مدرسہ کے طلباء کو ہنسی آتی ہے وہی باتیں اپنے اپنے وقت میں لا انتہا دماغ سوزی کا نتیجہ ہونے کی وجہ سے مقبول خاص عام تھیں۔ ہم لکھ رہے تھے کہ طلوع و غروب آفتاب کے متعلق متقدمین کے عجیب غریب خیالات تھے۔ شروع شروع میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سورج ایک دیوتا کا منظر ہے جو اپنے رتھ میں بیٹھ کر ہر روز مشرق سے مغرب کی طرف سیر کرتا ہے۔ یاد رہے کہ یونان میں ہندوستان کی طرح ہر قدرتی طاقت کا کم از کم ایک دیوتا ضرور ہوتا تھا۔ لہذا سب سے پہلے انھوں نے سورج کے دیوتا کی سواری سے سورج کے طلوع اور غروب ہونے کو تعبیر کیا۔ ازاں بعد متقدمین نے یہ خیال رائج ہوا کہ سورج دیوتا نہیں ہو سکتا اس لیے کہ کبھی کبھی (گرہن کے موقع پر) اس کی روشنی میں نقص واقع ہوتا تھا لہذا انھوں نے سوچا کہ ورنہ ہر روز جلتی ہوئی آگ کا ایک بہت بڑا گولہ بنا کر مشرق کی سمت سے نہایت زور کے ساتھ اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ چونکہ گرمیوں میں سردیوں کی نسبت سورج آسمان پر زیادہ مسافت طے کرتا نظر آتا ہے اس لیے انھوں نے خیال کیا کہ ورنہ سورج کو مختلف موسموں میں کم و بیش زور کے ساتھ اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ شام کے وقت ان کا خیال تھا کہ سورج بحرِ طلمات میں گر کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ ساری رات و لگن ایک نیا سورج بنانے میں مصروف رہتا ہے اور علی الصبح اُسے ختم کر کے پھر اوپر کی طرف پھینک دیتا ہے۔ اس کی توجیہ کے خلاف خود ہی اُن کے دل میں دو اعتراضات گذرے۔ ایک تو یہ کہ ہر روز ایک نئے سورج کا بنانا و لگن کے لیے بھی باوجود اس کی دیو تائی طاقتوں کے زحمت سے خالی نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ جہاں سورج بحرِ طلمات میں گرتا ہوگا وہاں اس کے گرنے اور سرد ہونے سے بہت شور ہوتا ہوگا اور پانی میں ایک طوفان اٹھتا ہوگا اس لیے انھوں نے ایک اور وجہ سوچی جو ان دونوں نقائص سے

برا تھی۔ اس نئی تجویز کے مطابق و لگن علی الصبح سورج کے پھینکنے کے بعد ایک سنہری کشتی میں بیٹھ کر مغرب کی جانب جلدی جلدی پہنچ جاتا ہے اور شام کے وقت سورج کو سمندر میں گرنے سے بچا لیتا ہے۔ اس تجویز کے مطابق نہ تو ہر روز ایک سورج کا نقصان ہوتا ہے اور نہ سمندریں طوفان ہی برپا ہوتا ہے۔ ساری رات و لگن سورج کو کشتی میں لیے ہوئے مشرق کی طرف چلا آتا ہے اور صبح ہونے پر پھر وہی پہلے دن کا صاحب ہوتا ہے۔

بطلمیوس کا نظام اور یہ پھر پوپ توہمات یورپ میں ازمنہ مظہر میں تقریباً ڈیڑھ ہزار برس تک مقبول خاص عام ہے ہیں۔ سولہویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس (Copernicus) نے جو ۱۵۴۳ء میں لینڈ میں پیدا ہوا تھا اور نیوٹن اعظم کی پیدائش سے پوری ایک صدی پہلے ۱۶۴۲ء میں مرا تھا بطلمیوسی نظام اور ان قدیم توہمات اور دیوپری کی قصہ کہانیوں کا قلع قمع کیا۔ اس نے ثابت کیا کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور یہ کہ سورج نظام شمسی کا مرکز ہے نہ کہ زمین! لیکن کوپرنیکی نظام باوجودیکہ پہلے نظاموں سے بدرجہا اعلیٰ اور بہتر تھا اور آج تک صحیح مانا جاتا ہے لیکن اُس وقت یہ نہیں بتا سکتا تھا کہ زمین کیوں سورج کے گرد گھومتی ہے۔ اس کے لیے ابھی ایک اور صدی کی علمی تحقیقات اور علم دوستوں کی تین پشتوں کی ضرورت تھی۔ کیپلر (Kepler) نے ۱۵۷۱ء سے ۱۶۳۰ء تک اور (Galileo) گلیلیو نے ۱۵۶۴ء سے ۱۶۴۲ء تک اور سب سے زیادہ سرانیزک نیوٹن نے ۱۶۴۲ء سے ۱۷۲۷ء تک اپنی قیمتی عمر کی لگاتار محنت کے بعد بیشمار دوسرے ہیئت دانوں کی عمر بھر کی محنتوں کا فائدہ اٹھا کر نظام شمسی کے مختلف افراد کی حرکتوں کو قوانین حرکت سے منضبط کیا۔ سب سے زیادہ قابل قدر کام جو انکی وسیع تحقیقات نے سرانجام کیا۔ لہ و لگن ایک دیوتا کا نام ہے۔

وہ حرکت کے پہلے قانون کو صحیح طور پر سمجھنا تھا۔ کیپلر نے سیارگان نظام شمسی کی حرکت کے انضباط کے لیے تین قوانین وضع کیے جو قوانین کیپلر کے نام سے موسوم ہیں لیکن وہ بھی اس عقدہ کو کہ سیارے ایک ہی مرکز کے گرد کیوں گھومتے رہتے ہیں حل نہ کر سکا۔ یورپ کے دایم جہالت کے توہم پرستوں کی طرح اُس نے بھی ہر سیارے کا محرک (حرکت دہندہ) ایک جابک سوار دیوتا یا روح مقرر کیا جو اپنی اُن تھک طاقت سے سیاروں کو ان کی گردشوں میں سست نہیں ہونے دیتا تھا۔ سب سے بڑی بات جو انسانی دماغ میں موجزن تھی وہ سیاروں کی گردش کے متعلق تھی۔ سیارے کیوں متحرک ہیں؟ اُس زمانہ میں عام طور پر یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ہر متحرک چیز کی حرکت قائم رکھنے کے لیے ایک لگانا کام کرنیوالی طاقت کی ضرورت ہے۔ یہی ایک خیال تھا جس کا ظہور مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا تھا۔

گیلیلیو کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ کوپرنیکی نظام کا ثبوت اور زمین کی حرکت کا سبب بیان کرنا ہی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ ہم گیلیلیو کے طریقہ ثبوت پر نظر ڈالیں ہم چاہتے ہیں کہ اس حلیل 'لقدیر' عالم کی پُر آشوب زندگی سے ناظرین کو مختصر الفاظ میں واقف کرا دیں۔ گیلیلیو فلورنس کے ایک معزز گھرانے میں ۸ فروری ۱۵۶۴ء کو پیدا ہوا تھا۔ ۷ برس کی عمر میں پیرامیو جی کی یونیورسٹی میں طب کی تعلیم کے لیے داخل ہوا۔ طالب علمی کے زمانہ ہی میں گیلیلیو نے اپنی خداداد ذہانت کا ثبوت اس طرح دیا کہ اپنے معلموں کو گرنے والے اجسام کے متعلق انکی غلطی سے متنبہ کیا۔ گے لیو کے زمانہ تک ارسطو کا لیس یعنی ارسطو کی متابعت میں تمام یورپ اس بات کا قائل تھا کہ ایک ہی بلندی سے گرنے کا وقت مختلف وزن کی چیزوں کے لیے مختلف ہے۔ دنیا میں اگر بڑے نام نے صدیوں تک بنی نوع انسان کو گمراہ کیا ہے تو وہ ارسطو کا کلام ہی۔ ارسطو کا معمولی تھا کہ ناکافی مشاہدات کی بنا پر غلط نتائج جلدی

سے مترتب کر لیتا تھا۔ ہم کسی دوسرے موقع پر ارسطو کی غلطیوں کے متعلق بحث کریں گے۔ یہاں صرف یہ دکھانا مطلوب ہے کہ علی حوصلہ نام سے نہیں ڈرتا۔ بلکہ رعب میں آنے کے بجائے تجربہ کی طرف راجع ہوتا ہے۔ گے لیو نے تو اپنے اُستادوں کے غلط ادعا سے متاثر ہوا اور نہ ارسطو کے باسطوت نام سے مرعوب ہوا۔ ایک دن علی الصبح شہر پیرا کے مینار لہزاں کے اوپر دو پتھر لے کر چڑھ گیا۔ ایک کا وزن ۵۰ سیر کے قریب تھا اور دوسرے کا نصف سیر۔ ارسطو کے قانون کے مطابق چاہیے تھا کہ اگر ۵۰ سیر وزنی پتھر زمین پر ۵ ثانیہ میں گرے تو نصف سیر وزنی پتھر اس وقت سے سو گنا زیادہ وقت میں گرے یعنی ۵۰۰ ثانیہ میں۔ گے لیو نے نہایت شد و مد سے اس غلط فلسفہ کی تردید کی اور علی طور پر دکھا دیا کہ دونوں پتھر اگرچہ ان کے وزن میں بہت فرق تھا ایک ہی وقت میں گرتے ہیں۔ اُس نے مینار کے کنارہ پر دونوں پتھروں کو بکھدیا اور پھر ایک ساتھ نیچے گرا دیا۔ دونوں ایک ساتھ گرے اور ایک ساتھ ہی سطح زمین سے ٹکرائے۔ یہ صحیح ہے کہ ہلکے اجسام مثلاً کاغذ کے ٹکڑے وغیرہ ہوا کی وجہ سے آہستہ گرتے ہیں لیکن یہ فرق ذاتی نہیں ہے بلکہ ہوا کی رکاوٹ کی وجہ سے ہے۔ اگر کسی جسم میں سے ہوا نکال لی جائے اور دو مختلف چیزیں ایک ہلکی اور ایک بھاری ایک ساتھ گرائی جائیں تو وہ یکساں رفتار کے ساتھ اس خلا میں گرتی ہیں۔ اسی امر کی توضیح کے لیے ایک عام تجربہ **Guinea and Feather Experiment** گنی اور بر کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ گے لیو نے ایک مقبول عام خیال کی تردید کی اس لیے پیرامیو اسکی ہر دلعزیزی میں فرق آگیا اور بہت سے فلسفیوں کو اس سے کینہ ہو گیا۔ لہذا ۱۶۹۲ء میں اس نے باڈوا کی یونیورسٹی میں پروفیسری قبول کر لی۔

دوسرا بڑا کارنامہ جو گے لیو نے اپنی زندگی میں کیا وہ دوربین کی تکمیل ہے۔ ہم گے لیو کو دوربین کا موجد نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس

توبہ کے بعد فی الفور زمین کی حرکت سے انکار اور اسکے چٹپٹا ہونے کا بیان تمام یونیورسٹیوں میں بھیجا گیا تاکہ یہ و فیسیٹینی اپنی جماعتوں میں طلبہ کو پڑھ کر سناٹیں۔ فلٹن کی طرح گئے لیو کی زندگی کے آخری ایام نورانی اندھیرے میں کٹے۔ وہ جس نے دوسروں کو علم کی روشنی دکھائی اور آسمانوں کی سیر کرائی تھی خود اندھا ہو کر اپنے اس پاس کی چیزوں کے دیکھنے سے عاجز ہو گیا۔ علم کی بڑھتی ہوئی روشنی کے رومانی دشمنوں نے بہت ہاتھ پاؤں مارے کہ گئے لیو کی زندگی کا خاتمہ کرنے کے ساتھ اُس کے کام کا بھی خاتمہ ہو جائے لیکن انسانی کوششیں کبھی ایسے نمایاں طریقہ سے ناکام نہیں ہوئی تھیں جس طرح رومانی کوششیں علم کی روشنی کے مٹانے میں ناکامیاب ہوئیں۔ جس سال گیلیلیو اُسی سال نیوٹن پیدا ہوا اور جو کام گئے لیو نے شروع کیا تھا نیوٹن نے اُسے پایہ کمال تک پہنچایا۔

رومانی کوششوں سے گئے لیو کی تقریباً ساری کتابیں جلا دی گئیں تھیں خود اسکے بیٹے نے اپنے باپ کے بہت سے مسودے آگ کے سپرد کر دیے تھے لیکن اسکی ایک تصنیف حرکت اور مشینوں کے متعلق لموسوم مینیک (Mechanics) خوش قسمتی سے اسکے ایک شاگرد رشید کی وساطت سے بچ گئی تھی۔ شاگرد موصوف گئے لیو کو اسکی موت سے دو تین سال قبل ملنے آیا تھا اور جسٹن اتفاق سے یہ کتاب اپنے ساتھ لے جاتا تھا۔ ازان بعد اُس نے اسکو ہالینڈ میں شائع کر دیا گئے لیو نے مدت العمر کی محنت سے اجسام کی حرکت کے متعلق اپنی جملہ معلومات کو چند قوانین کی شکل میں بیان کیا تھا۔ نیوٹن نے بعد ازاں انھیں قوانین کو نہایت قابلیت کے ساتھ مختصر الفاظ میں رکھا۔ آج زمانہ میں نیوٹن کی بڑھی ہوئی شہرت کے غلبہ سے حرکت کے تین قوانین نیوٹن کے قوانین حرکت کہلاتے ہیں۔

حرکت کا پہلا قانون نیوٹن کے الفاظ میں یوں ادا کیا جاسکتا ہے

جبریت انگیز ایجاد کا قہر سنہ ۱۶۸۷ء میں ایک یونک سا زڈل برگ کے رہنے والے ہنس لپرسے (Hans Lippershey) کے شاگرد پیشہ لڑکے کے حصہ میں آیا ہے۔ لڑکے نے دو عینک کے شیشوں کو کھیل کے طور پر ایک دوسرے کے آگے رکھ کر دیکھا تو نزدیک کے گرجا کی چوٹی اُلٹی اور بہت نزدیک نظر آئی۔ افواہ ہو کہ جرمنی کے ایک سیر آدمی نے لڑکے سے اُس کھلونے کو خرید لیا اور ایک شہزادہ کو بطور نذر پیش کیا لیکن ہمارے لیے جو ضروری بات یہ ہے کہ اس واقعہ کی خبر کسی نہ کسی طریقہ سے گئے لیو تک پہنچ گئی۔ خبر سنتے ہی اُس نے اس کے متعلق تحقیقات شروع کر دی۔ وہ تمام رات جاگا اور بالآخر سنہ ۱۶۸۷ء ہی میں اس نے دو زمین کے نظریہ کو عملی طور پر ایک کمال تک پہنچا دیا کہ مشتری اور چوٹی (Jupiter) کے چاند دریافت کیے۔ زہرہ اور عطارد کو دیکھا کہ وہ چاند کی طرح گھٹتے بڑھتے اور ہلال اور بدر کی شکلیں اختیار کرتے ہیں۔ زحل کے حلقے دیکھے اور اس طرح کو پرنیکی نظام کو دو زمین کی مد سے ایک مضبوط بنیاد پر کھڑا کر دیا۔ آخری حصہ عمر میں گئے لیو کو نیوٹن اجسام کے مطالعہ سے حرکت کے قوانین کی بنیاد ڈالتا رہا۔ آخر عمر میں اس نے ایک کتاب شائع کی جس میں بطلیموسی نظام اور کو پرنیکی نظام کے متعلق چار مکالمات درج ہیں۔ روم کے پوپ کا حکم صادر ہوا تھا کہ زمین چپٹی ہو ساکن ہے اور عالم کا مرکز ہے۔ اس کے خلاف عقیدہ رکھنا کفر تھا۔ سنہ ۱۶۸۷ء کی عمر میں گئے لیو کو کفر کے الزام سے روم میں طلب کیا گیا وہاں قید اور نکالیف شدیدہ کے بعد پورے آدمی نے تنگ آ کر گھٹنے ٹیک کر اور ہاتھ باندھ کر زمین کے گول اور متحرک ہونے سے انکار کیا باوجود ان تمام سزائوں کے بقیہ عمر کے لیے گئے لیو سرکاری طور پر قید رہا۔ اسکی

لے روم میں کافروں کی تادیب کے لیے ایک ظالمانہ عدالت بنام انکویریشن (Inquisition) قائم تھی جس کا ادنیٰ کارنامہ یہ ہے کہ علم اور حق کی حمایتی بادش میں سیکڑوں دیوتا پر جلائیے گئے اور ہزاروں کنبہ کی مصائب میں مبتلا کیے گئے۔

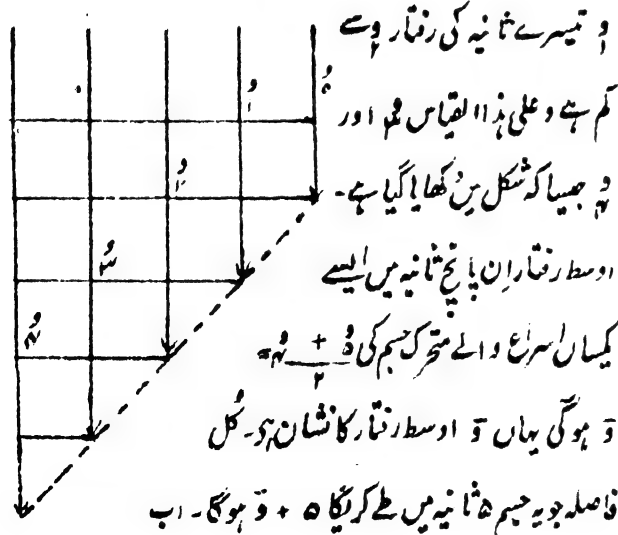
”ہر ایک جسم تا وقتیکہ اُس پر کوئی طاقت عمل نہ کرے اپنے سکون یا حرکت کی حالت پر قائم رہتا ہے“ یا بالفاظ دیگر ”اگر کوئی طاقت ایک متحرک جسم پر عمل نہ کرے تو وہ یکساں رفتار کے ساتھ متحرک رہتا ہے“

اس زبردست قانون کے متعلق چند باتیں قابل غور ہیں۔ اگر ایک جسم ساکن ہو تو وہ خود بخود متحرک نہیں ہو سکتا۔ ایک ساکن جسم میں حرکت جیسی پیدا ہوتی ہے جب کوئی طاقت اُس پر عمل کرے۔ اگر وہ جسم متحرک ہے تو وہ اپنے آپ کیساں رفتار کے ساتھ حرکت کرتا رہیگا۔ اس کی حرکت میں کمی بیشی یا کجی جیسی واقع ہوگی جب کوئی طاقت اُس پر عمل کرے۔ ایک متحرک جسم کی حرکت قائم رکھنے کے لیے کسی طاقت کی ضرورت نہیں۔ طاقت کی ضرورت صرف اُسکی حرکت میں تبدیلی پیدا کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ حرکت میں تبدیلی دو طرح پر ہو سکتی ہے۔ یا تو رفتار میں کمی بیشی یعنی اسراع اور تعویق ہو یا سمت بدلی جائے۔ نیوٹن اور گیلیلیو

۲۱ حرکت کے متعلق چند اصطلاحات ضروریہ کی تشریح مناسب معلوم ہوتی ہے۔ اگر ایک جسم کبھی ایک مقام پر اور کبھی دوسرے مقام پر ہو تو اُس جسم کو متحرک کہتے ہیں گویا حرکت نقل مکانی کا دوسرا نام ہے۔ جتنا فاصلہ ایک متحرک جسم ایک ثانیہ میں طے کرتا ہے اُسے رفتار کہتے ہیں۔ مثلاً ایک متحرک جسم ایک منٹ میں بیس گز چلتا ہو تو اسکی رفتار Velocity یا گز فی منٹ یا ایک فٹ فی ثانیہ ہوگی۔ جس رفتار میں کمی بیشی نہ ہو یعنی مختلف اوقات پر برابر عرصہ میں برابر فاصلے طے ہوں اُسے یکساں رفتار یا حرکت (Non-accelerated Motion or

Uniform Velocity) کہتے ہیں۔ جس کی رفتار میں کمی بیشی ہو اُسے بری ایل دلاشتی (Variable Velocity) کہتے ہیں۔ ایک ثانیہ میں رفتار جس قدر بڑھتی یا گھٹتی ہے اُسے اسراع (Acceleration) یا تعویق (Retardation) کہتے ہیں۔ مثلاً ایک ریل گاڑی اسٹیشن سے روانہ ہونے کے بعد پہلے پانچ منٹ میں دو میل اور دوسرے پانچ منٹ میں ۴ میل فاصلہ طے کرے تو اُسکی اسراع ۶ میل فی منٹ ہوگی۔ اگر ایک جسم کو غلبہ

کے اس حصہ کام کی زیادہ وقعت اس لیے ہے کہ ان مقدمات کی مدد سے عالم میں ستاروں وغیرہ اجرام فلکی کی حرکات بالعموم اور نظام شمسی کے افراد کی حرکات بالخصوص بنی نوع انسان کو ایسے طریقے پر سمجھ میں آگئی ہیں کہ اب ان میں شک و شبہ یا اور کسی طرح کے رد و بدل کا امکان نہیں ہے۔ موجودہ سائنس یہ کہنے سے عاجز ہے کہ سب سے پہلے اجرام فلکی کی حرکت کس طرح شروع ہوئی۔ لیکن اگر یہ سوال خارج از بحث کر دیا جائے تو باقی مسئلہ تمامہ سائنس نے کما حقہ سمجھ لیا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ مشیت ایزدی سے اجرام فلکی متحرک ہو گئے تو اور کسی بیرونی طاقت کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تشریح کے لیے ہم زمین ہی کی مثال لیتے ہیں۔ جب یہ ایک دفعہ اپنے محور کے گرد گھومنی شروع ہو گئی تو حرکت کے پہلے قانون کے مطابق اب کسی طاقت کی ضرورت اس محوری حرکت کے قیام کے لیے باقی نہیں رہتی۔ متقدمین کی سب سے بڑی غلطی یہ تھی کہ ان کے ۳ پر سے نیچے کی طرف پھینکا جائے تو زمین کی کشش سے اسکی رفتار لمحہ بلمحہ بڑھتی جائیگی چونکہ کشش زمین ایک نہ بدلنے والی طاقت ہے۔ ہر لمحہ اسراع برابر مقدار سے ہوگی۔ فرض کیجیے کہ ایک متحرک جسم کی رفتار یکساں اسراع کے ساتھ بڑھ رہی ہے یعنی پہلے ثانیہ میں رفتار ۱ دوسرے ثانیہ کی رفتار ۲ سے اتنی کم ہو جتنی کہ



اگر اسراع کو ۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ - ۷ - ۸ - ۹ - ۱۰ - ۱۱ - ۱۲ کو پکڑ لیا جائے تو پہلے ثانیہ میں رفتار کی زیادتی ۱ ہے (باقی برصغیر آئندہ)

زودیک حرکت جاری رکھنے کے لیے ایک مستقل طاقت کی ضرورت تھی اور اسی لیے انھیں اتنی دور از کار زما ولین کرتا پڑتی تھیں۔ ایک آدمی جو بائیسکل پر بیٹھا ”بائیسکل چلا رہا ہے“ فی الاصل اپنی طاقت بائیسکل کو حرکت دینے میں صرف نہیں کرتا بلکہ اُس مزاحمت کے اثر کو رفع کرنے کے لیے طاقت صرف کرتا ہے جو بوجہ راستہ کی رگڑ اور ہوا کی رکاوٹ کے بائیسکل کی رفتار میں تعویق پیدا کرتی ہے۔ اگر راستہ بالکل صاف اور بغیر رگڑ (Friction) کے ہو تو صرف ہوا کی رکاوٹ باقی رہ جاتی ہے اور اس حالت میں بائی سکل کی رفتار کیساں رکھنے کے لیے کم طاقت صرف کرنا پڑتی ہے ازاں بعد رفتار کی کمی جو رگڑ اور ہوا کی مزاحمت سے پیدا ہوتی ہے طاقت کے صرف سے پوری کی جاتی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بائیسکل ابد الابد تک ایک سیدھی لکیر میں کیساں رفتار کے ساتھ چلتی رہے یعنی یہی مثال اجرام فلکی کی حرکت کے لیے مفید ہو سکتی ہے۔ اجرام فلکی ایک دفعہ متحرک کیے گئے ہیں۔ ان کے رستہ میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو حرکت کی مزاحم ہو سکتی ہے۔ اس لیے اب ابد الابد انکی حرکت کیساں حالت (بقیہ صفحہ گزشتہ) دوسرے میں $a + b$ تیسرے میں $a \times b$ وغیرہ وغیرہ۔ ثانیہ میں رفتار کی زیادتی = $a \times b$ آخری ثانیہ کی رفتار برابر ہوتی ہے حاصل جمع رفتار کی زیادتی کے۔ اسلئے ثانیہ کے بعد قطعی رفتار = $a \times b$ = لہذا اوسط رفتار = $\frac{a+b}{2}$ = $\frac{a+b}{2}$ = $\frac{a+b}{2}$ اور کل فاصلہ جو اس ثانیہ میں طے ہوا = $a \times b$ = $\frac{a+b}{2} \times \frac{a+b}{2}$ اگر ایک جسم سکون کی حالت سے شروع ہو تو چونکہ $\frac{a+b}{2}$ صفر کے برابر ہے $\frac{a+b}{2} = 0$ اگر ایک جسم ساکن زمین کی طرف سکون کی حالت سے گرایا جائے تو شاہد سے دیکھا گیا ہے کہ پہلے ثانیہ میں ۱۶ فٹ گرتا ہے دوسرے ثانیہ میں ۶۴ فٹ تیسرے میں ۱۴۴ فٹ وغیرہ القیاس۔ گریا پہلے ثانیہ میں رفتار ۱۶ فٹ فی ثانیہ دوسرے میں ۶۴ فٹ فی ثانیہ تیسرے میں ۱۴۴ فٹ فی ثانیہ ہوتی ہے۔ لہذا زمین کی کشش کا ہر ۱۶ فٹ فی ثانیہ ہے۔ کل فاصلہ جو یہ جسم ایک ثانیہ میں طے کرتا ہے ۱۶ فٹ ہے۔ دوسرے میں ۶۴ فٹ تین ثانیہ میں ۱۴۴ فٹ وغیرہ القیاس۔

میں جاری رہیگی۔ راستہ کی رگڑ وغیرہ کے علاوہ اور بھی اسباب حرکت کے مانع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً اگر بائی سکل کے بریک باندھ دیے جائیں تو بائیسکل کی رفتار کم ہو جائیگی۔ اسی طرح زمین کی محوری حرکت کی حالت میں جہاں تک سائنس کی معلومات کام کر سکتی ہیں کوئی ایسی طاقت از قسم راستہ کی رگڑ وغیرہ نہیں ہے۔ اس لیے سائنس داں امید کرتے ہیں کہ اگر کوئی اور ایسی طاقت جس کا انھیں فی الحال علم نہیں ہے زمین کی محوری حرکت بند یا سست نہ کر دے تو زمین ہمیشہ کیساں رفتار کے ساتھ اپنے محور کے گرد حرکت کرتی رہیگی اور گردش بیل و نہار کبھی منقطع نہ ہوگی۔

زمین کی سالانہ حرکت جس میں سورج کے گرد یہ گھومتی ہے اسی طرح نقص یا زیادتی سے آزاد خیال کی جاتی ہے۔ حرکت کے پہلے قانون کے مطابق زمین کو ایک خط مستقیم میں حرکت کرنا چاہیے لیکن یہاں ہم ایک اور مستقل مرکزی طاقت سے واسطہ پڑتا ہے۔ سورج چونکہ زمین سے بہت بڑا ہے اس لیے تاجاذب مادی کے عالمگیر قانون کے مطابق زمین سورج کے مرکز کی طرف کھینچی جاتی ہے۔ پس یہاں دو طاقتوں کا مقابلہ ہے۔ ایک تو وہ طاقت جس نے ہمیشہ کے لیے زمین کو ایک خط مستقیم پر چلا دیا ہے اور دوسری سورج کی کشش جو ہر لمحہ عمل کر رہی ہے۔ ان دونوں قوتوں کی مثال آسانی سے یوں دی جاسکتی ہے۔ ایک پتھر کو کسی رسی کے ایک سرے سے باندھیے۔ دوسرے سرے کو پکڑ کر پتھر کو زور سے گھمائے۔

آپ محسوس کریں گے کہ پتھر کی Centrifugal Force

(یعنی وہ طاقت جس کی وجہ سے پتھر مرکز سے دور بھاگنا چاہتا ہے) کی وجہ سے رسی آپ کے ہاتھ سے چھوٹ جانا چاہتی ہے لیکن آپ کے ہاتھ کی Centripetal Force (یعنی وہ طاقت جو پتھر کو مرکز

کی طرف کھینچتی ہے) پتھر کو ایک دائرہ میں گھماتی ہے۔ جتنے زور سے آپ لے رہے ہیں ایک جداگانہ مضمون میں جس کا عنوان ”کیا زمین کی حرکت فی الواقع

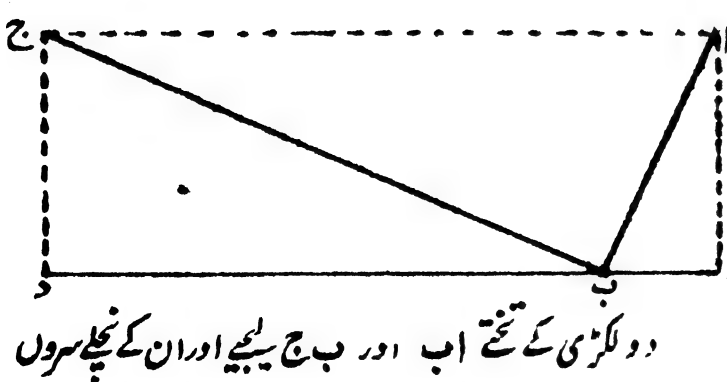
سست ہو رہی ہے“ ہے اس موضوع پر مفصل بحث لکھی ہے۔

پتھر کو گھمائیں گے اُتے ہی زور سے آپ کو مضبوطی کے ساتھ سی پکڑی ہوگی اور جتنی رسی لمبی ہوگی اُتنا ہی زیادہ وقت ایک دائرہ کی گھل کے لیے درکار ہوگا۔ اگر آپ رسی کو ہاتھ سے چھوڑ دیں تو پتھر سیدھا ایک سمت میں جائیگا اُسی سمت میں جس میں وہ اُس وقت حرکت کر رہا تھا جب آپ نے ہاتھ سے رسی چھوڑی۔ بالکل یہی حالت سورج اور زمین کے درمیان ہے۔ رسی کے بجائے یہاں تجاذب مادی کی باہمی کشش ہو جسکے لیے کسی مادی میڈیم (Medium) (اُس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ یا جس کے بیچ میں سے گزر کر کوئی اثر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتا ہو) کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک سورج کی کشش میں کوئی فرق نہیں آئیگا زمین اپنی سالانہ گردش میں متواتر مصروف رہیگی۔

پس ہم دیکھتے ہیں کہ قدرت کے تجربہ خانہ (مسل)۔ نے بے لوثی (Laboratory) میں حرکت کے پہلے قانون کا ثبوت ہمارے مشاہدہ میں ایک عظیم الشان پیمانہ پر آتا ہے۔ ہمارا نظریہ ہے کہ فضا بیحد کے اتھر میں یہ خاصہ ہے کہ اجرام فلکی اس میں بغیر رگڑ کے حرکت کرتے ہیں لہذا چونکہ حرکت کی کمی کے لیے کسی طاقت کی ضرورت ہے اور اجرام فلکی کی حرکت کم کرنی والی کوئی طاقت نظر نہیں آتی امید ہے کہ یہ حرکت ہمیشہ کے لیے قائم رہیگی یہاں تک کہ کوئی غیر متوقع حادثہ جو سردست ہمارے ادراک سے باہر ہو نظام عالم کا خاتمہ نہ کرے۔ ہم زمین پر حرکت کے پہلے قانون کا ثبوت صرف ایک نامکمل طریقہ سے دے سکتے ہیں۔ اس لیے کہ رگڑ وغیرہ حرکت کی کم کرنی والی قوتیں ہم کبھی معدوم نہیں کر سکتے ہاں ان کو ایک خاص حد تک جتنا چاہیں کم کر سکتے ہیں اور اس حد تک اپنے مشاہدات کو وسیع کر سکتے ہیں۔ گزشتہ صدی کے ایک نہایت ہی قابل سائنس دان کلرک میکسویل (Clerk Maxwell) نے حرکت کے پہلے قانون

کو اس طرح ثابت کیا تھا کہ اُس نے مخراج الموائے کے ذریعہ سے ایک برتن میں سے جہاں تک اس سے ہوسکا تمام ہوائے نکال لی اور پھر اپنا بنایا ہوا ایک بہت بڑا ٹوپ (Top) اس کے اندر گھمایا تو گھٹنوں تک اُسکی حرکت بند نہیں ہوتی تھی۔ حالانکہ کھلی ہوائیں بہت جلدی اُسکی گردش جاتی رہتی تھی۔ اسی طرح صاف زمین پر ایک گول پتھر بہت دور تک لڑھکتا ہو اچلا جاتا ہے اور اگر برتن کی صاف سطح میسر ہو تو پتھر کی حرکت بہت سا فاصلہ طے کرنے کے بعد ضائع ہوتی ہے۔ رگڑ کے کم کرنے کے لیے کٹوں کے پرزوں کو تیل (جس کو اصطلاح میں لبری کنٹ Lubricants کہتے ہیں) لگایا جاتا ہے۔ گرافائٹ (Graphite) جس سے غلط طور پر مشہور سیسہ کی پینسلین بنتی ہیں رگڑ کم کرنے کے لیے کئی تیلوں سے بہتر ہے۔ لیکن کیسا ہی عمدہ سے عمدہ لبری کنٹ کیوں نہ ہو تھوڑی بہت رگڑ ضرور باقی رہتی ہے۔ لہذا یہ تمام تجارب جن میں ایک ٹھوس جسم کی حرکت دوسرے ٹھوس جسم کے مقابلہ میں دیکھی جاتی ہے۔ ذیل کے تجربہ سے افضل نہیں ہیں۔

ایک باریک دھاگہ یا تار کو کسی اونچی جگہ باندھیے اور نیچے سرے کے ساتھ ایک بھاری جسم لٹکا کر اسے ہلا دیجیے۔ آپ دیکھیں گے کہ کہ وہ بھاری جسم بہت دیر تک اُدھر سے اُدھر تک حرکت کرتا رہیگا اور اگر یہی تجربہ غلامیں کیا جائے تو اور بھی زیادہ کامیاب ہوگا۔ گے لیو کا اصلی تجربہ جس کی بنا پر حرکت کا پہلا قانون وضع ہوا ہوا تھا اس قابل ہے کہ اسے غور کے ساتھ سمجھا جائے۔



کو لاکر ڈھلوان رکھ دیجیے اس طرح کہ خطہ مستقیم تسب سے ان کے اوپر کے سروں کا عمومی فاصلہ برابر ہو۔ گے لی لیونے مشاہدہ کیا کہ اگر ایک جسم ایک تختہ کی چوٹی پر رکھ کر چھوڑ دیا جائے تو اس میں اتنی حرکت پیدا ہو جاتی ہے کہ دوسرے تختہ کی چوٹی تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر دونوں تختے کافی صاف ہوں اور گڑبست کم ہو تو دوسرے تختہ کی لمبائی خواہ کتنی زیادہ ہوڑھلکتا ہو جسم اسکی چوٹی تک پہنچ جائیگا بشرطیکہ اسکی عمومی بلندی پہلے تختہ کی عمومی بلندی کے برابر ہو۔ یہ الفاظ دیگر رفتار کی کمی اگر

رگڑ نہ ہو تو صرف عمومی بلندی سے واقع ہوتی ہے پس انتہائی حالت میں اگر دوسرے تختہ بالکل افقی ہو اور اس میں رگڑ نہ ہو تو حرکت و رفتار میں کوئی کمی واقع نہ ہوگی متحرک جسم ابد الابد تک ایک افقی خطہ مستقیم میں یکساں رفتار کے ساتھ حرکت کرتا رہے گا۔

حرکت کے پہلے قانون کا یہ نظری ثبوت اس قابل ہے کہ اس کے متعلق مفصل بحث کی جائے لیکن ہم طوالت کے خوف سے اسی اجمال پر اکتفا کرتے ہیں۔

فیروز الدین مراد

تحصیل سائنس کی اہمیت

انگلستان کے مشہور فلاسفر فرانسس بیکن نے ایک کتاب نیو اٹلانٹس (New Atlantis) کے عنوان سے لکھی تھی جس میں کامل سائنس اور قابل نمونہ نظام ریاست سے بحث کی ہے۔ وہ ایک جگہ تسلیمان کے مکان کی بابت کہتا ہے :-

اس سے ہمارے مقصد یہ ہے کہ موجودات کی مخفی حرکات، انقبوبات اور مہاب کا علم حاصل کریں، اور بنی آدم کی سلطنت کی حدود کو وسیع کریں تاکہ وہ سب چیزوں پر حاوی ہو جائے۔

اس سے بیکن نے علم سائنس کا مہتاے کمال ظاہر کر دیا ہے جس کی غایت نہ صرف کائنات کے اندرونی تغیرات و تبدلات کے اسباب نتائج کا کھوج لگانا بلکہ انسانی علوم کو اتنا وسیع کرنا ہے کہ کوئی شے زمین و آسمان میں ان کے احاطے سے باہر نہ رہنے پائے۔

تجربی علم کی ضرورت

لوگ پوچھتے ہیں کہ سائنس کے کیا فائدے ہیں؟ کیوں اپنے لڑکوں کو طبیعیات کیمسٹری وغیرہ پڑھائی جائے؟ اس سے تو کچھ فائدہ نہیں پہنچ سکتا ہم ایسے غیر مفید علوم کی تحصیل میں کیوں اپنا وقت، اپنی دماغی محنت،

اور۔۔۔ یہ صرف کریں؟ جو لوگ زندگی کو میاگری کے مہول پر بسر کرنا چاہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ جو آدمی نیے بقاوں کی طرح ہر معاملہ میں نفع و نقصان کو مد نظر رکھتے ہیں انہیں جیالوجی، فلکیات، بائی، زواہی، بیالوجی، کے مطالعہ کے استفادہ سے خبر نہیں لیکن سائنس کی کائنات اسی جگہ ختم نہیں ہوتی۔ وسیع ترین معنی میں اس کا اطلاق تمام ان علوم و فنون پر ہوتا ہے جو انسان نے صدیوں کی دماغی محنت شاقہ اور ذہنی کاوش سے حاصل کیے ہیں اور نیز اس سے مراد ایسا علم بھی ہے جس کی صحت کی تجربہ سے تائید و تصدیق ہو سکتی ہے ایسا علم حاصل کرنا ہر ایسے انسان کے لیے لازمی ہے جو کشاکش زیست میں اپنے ہم جنسوں کے مقابلہ میں عمدہ برآہوتا اور مہذب و تمدن اقوام کے افراد کے ساتھ مساوات برقرار رکھنے کا ارادہ مند ہے۔

تحصیل سائنس کے فوائد کا پوچھنا گویا علم کی ضرورت اور اہمیت پر شک کرنا ہے۔

سائنسی اختراعات کی خدمات

سائنس کے فوائد پر مطول بحث کرنا لامحالہ ہے۔ ہم اس کے بعض اہم اور فتوحات کا مختصر ذکر کیے دیتے ہیں جس سے اس کی فیض رسانی آج آپ

ہے۔ جب طبیعت کو ایک دفعہ خطا مل ہو گیا تو وہ بعد ازاں بد مزہ اور پھلکی ہونے لگتی ہے۔ مگر علم کی خوشی کی کیفیت جو طبیعت بھرتی ہی نہیں۔ جی اکتا تا نہیں بلکہ جتنا حاصل کرو اور لطف اٹھاؤ اتنا ہی اشتیاق بڑھتی ہے۔ اس لیے تحصیل علم کی خوشی مستقل، اعلیٰ، اور پاک ہے۔

اس امر پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ خوشی اور شادمانی اخلاقی، روحانی، ذہنی اور جسمانی زندگی کے لیے کتنی ضروری اور مفید ہے۔ سو غذاؤں کی ایک غذا خوشی اور شادمانی ہے۔ اگر آپ کا دل منہمک اور کمبید ہو تو آپ کوئی کام انجام نہیں دے سکتے اگر طبیعت پر ظلم کر کے کیا بھی تو وہ خوبی اور کمالات کبھی نہیں پیدا ہو سکتی جو شاد و خوش دل سے ممکن ہے۔ اس واسطے سائنس کے مطالعہ اور نئی نئی باتوں کی ٹوہ میں رہنے سے راحت قلبی اور لطف عقلی حاصل ہوتا ہے جو زندگی کے پھلکے کے پیوں کے لیے بمنزلہ تیل کے ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو شور و غل پیدا ہوتا اور رفتار دھیمی رہتی ہے۔

سائنس اور روزانہ زندگی

تحصیل سائنس کے لیے ضروری نہیں کہ آپ اپنا گھر بار چھوڑ کر کسی بڑی یونیورسٹی میں داخل ہوں اور وہاں اسکے مختلف شعبوں کا بڑے بڑے محققوں اور عالموں کے زیر نگرانی مطالعہ کریں۔ نہیں نہیں۔ آپ سائنس کے مسائل سے روزمرہ کے کاروبار میں دوچار ہوتے ہیں اور جس ڈھنگ سے مختلف ملکوں اور صدیوں میں روزانہ ضروریات زندگی کو بہم پہنچانے کی کوشش کی گئی اس سے سائنس کو ترقی نصیب ہوئی۔ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ اگر آپ سائنس کے مسائل کی تاریخ پر نگاہ ڈالے گا تو یہ امر بخوبی ثابت ہو جائیگا۔ آپ علم نباتات کو لیجیے۔ باغوں کے پودوں، ان کے خواص و فوائد، کھیتوں کی جڑی بوٹیوں کی معمولی واقفیت سے اسکی ابتدا ہوئی۔ یہی حال طب کا ہے۔ جڑی بوٹیوں کے خواص اور فوائد کے علم کی وسعت سے اس علم کی بنیاد پڑی۔ جو علم الحیوۃ (بیالوجی) کی ایک شاخ ہے۔ پھر پودوں کو پھل پھول کی خاطر لگانے اور ان سے عمدہ اور بکثرت پھل

منگت ہو جاتی ہے۔ یہ تار جو تھوڑی سی دیر میں ایک روپیہ کے صرفہ سے آپ کے عزیز کو آپ کا پیام بھیجی میں پہنچا دیتا ہے سائنس کی اختراع ہے۔ تیل گاڑی کا انجن جو ہزاروں من بوجھ ایک من میں سیکڑوں میلوں پر لجا کر ڈال دیتا ہے سائنس کے توسط سے وجود میں آیا تھا۔ دیاسلائی کی ڈبیا جس سے آپ کئی ہفتوں تک کام لیتے ہیں سائنس کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے۔ اسی طرح آٹا پیسنے، کپڑے بننے، سوت کا تنے، کپڑے سینے کی کلیں، گاڑیاں، موٹر گاڑیاں اور سیکڑوں آلات جو ہماری جسمانی راحتوں کے ضروری ستون ہیں سائنس ہی کے مخرج ہیں۔ یورپ کیوں تمام دنیا پر حکمران ہے؟ سائنس کے زور سے جاپان نے کیوں روس ایسی زبردست سلطنت کو جس سے بڑی بڑی سلطنت خائف رہتی تھیں تھوڑے ہی عرصہ میں تمام دنیا میں ذیل و خوار کیا اور اب ترقی یافتہ اقوام کی اگلی قطاریں کھڑا ہے؟ سائنس کی بدولت۔ بغرض کہاں تک بیان کیا جائے۔ سائنس کے اکتشافات کے لیے ایک قدر کار ہے۔

سائنس کا مقصد

سائنس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اشیاء کے انقلابات کا مشاہدہ کرے۔ شیا اور ان کے تغیرات کے درمیان جو تعلق ہو اسے دیکھے۔ اور نیز یہ دریافت کرے کہ شیا یعنی اسباب نتائج کا ایک دوسرے کے ساتھ کیا لگاؤ ہے اور جو شخص موجودات کے مشاہدہ اور اپنے مشاہدہ کے صحیح صحیح حالات قلم بند کرنے یا کاغذات کے اندر کوئی بڑا قانون معلوم کرنے کی دھن میں مستغرق رہتا ہے وہ سائنس کے فوائد کی دہان سننے کی چنداں پروا نہیں کرتا۔ کئی اعتبار سے سائنس صناعی کی طرح ایک ہنر بن جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ صنایع قلم اور برتن سے مختلف رنگ ملا کر ایک صورت پیدا کر دیتا ہے مگر سائنس اس اپنے قلم سے شیا کا ایسا چشم دید اور واضح بیان لکھتا ہے کہ پڑھنے والے کی آنکھوں کے سامنے ایک لفظی تصویر کھنچ جاتی ہے۔ سائنس ایک ہنر یا پیشہ ہے جو انسان کی ذہنی راحت و اخلاقی سترت کا موجب ہوتا ہے۔ لیکن کہتا ہے :-

اور جتنی خوشیاں ہیں ان میں ایک بات عجیب ہے کہ ان سے طبیعت بت جلدیہ جاتی

مساحت کی معنی زمین کا پیمانہ ہے۔ مصریوں کی سب سے پہلی اور پرانی کتاب اس فن پر مشتمل ہے۔ یہ تصنیف ہوائی تھیں جس میں سطح ستون، مخروطی مینار، کھلیان، اور دیگر چیزوں کی پیمائش کا ذکر ملتا ہے۔ الفرضی ریاضیات کا آغاز محسوسات سے ہوا اور روزمرہ مجردات کی بحث میں غائب ہو گیا۔

سائنس کا دھرم پتا

یہ امر قابل غور ہے کہ سائنس نے ہمارے معمولی پیشوں اور ہنروں کے گلے میں خیم لیا تھا مگر یہ ایک اہم اخلاقی پہلو بھی لیے ہوئے ہے۔ مشر بن فرد لکھتے ہیں۔ ہم اپنے بزرگوں کی یاد کو فراموش نہیں کر سکتے جیسے محقق طبیعات کو ہمارے اسی طرح ماہر نباتات کسان۔ اور عالم حیوانات شکاری۔ جغرافیہ دان ملاح، مورخ بافروش ڈاکٹر جادوگر، اور قانون دان ملّا ہے۔ رہا ریاضی دان، اس کا علم بہت سے پیشوں اور ہنروں سے ماخوذ ہوا ہے اور سب سے پرانا ہے۔ اگر وہ اپنے علم کی ابتدا اور اسکی عمدہ عمدہ ترقیوں پر غور کرے تو وہ اپنے کو تمام زمانوں اور قرون کے پیشہ وروں کا وارث پائے گا۔ پھر اسے ہمارے تمام دھندوں سے بہت ہمدردی پیدا ہوگی۔ اس اہم امر کو کبھی مت بھولو کہ تمام علم اور علمی مسائل اور علوم کے شعبے ابتدائے تجربہ سے وجود پذیر ہوئے جو انسان مختلف ہنروں سے حاصل کیا تھا۔ یہ مت بھو کہ سائنس کوئی جانور ہے جو آسمان میں اڑتا پھرتا ہے۔ اور اسے ہمارے دنیا کے روزانہ مضمون سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہے اور کسی ماسلوم طریقہ سے ترقی کرتا رہتا ہے۔ سائنس شروع شروع میں ان کوششوں اور خواہشوں سے پیدا ہوا تھا اور پیدا ہو رہا ہے جو اسکے ہول میں موجودات کے انقلابات اور باہمی راہ ورسم کی تہ میں تبدیلی اصول دریافت کر کے اپنے پیشوں میں کمال حاصل کرنے کے متعلق پیدا ہوئی تھی۔

مختلف علوم کی گونا گوں خدمات

سائنس کے فوائد اور اس سے انسان جو خدمات حاصل کر رہا ہے انکا ذکر قد سے وضاحت سے کرنا چاہیے۔ ۱۹۱۲ء کے شروع میں سٹرنٹس نے ایک کتاب طبیعات پر لکھی تھی اور ایک جگہ اُسکے علمی فوائد کا ذکر کیا ہے جسے ہم نقل کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے :-

حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لیے خاص طریقہ وضع کیے جاتے ہیں جو سب کے سب علم نباتات کے تحت میں آتے ہیں۔ یہی کیفیت علم حیوانات (زواا لوجی) کی ہے جو خانگی جانوروں یعنی کتے، بلی، گائے، بھینس، گھوٹے، خچر، بھیر، بکری، مرغ، کبوتر، تیتیر، شیر سے شروع ہوتا ہے۔ پھر اس کا تصرف علاقہ کے جانوروں پر ہوا۔ بعد ازاں منلج پھر صوبہ پھر ملک اور اخیر میں تمام دنیا کے چرند و پرند اسی کے ماتحت نظر آتے ہیں۔ گویا سائنس ہمارے گھروں میں وجود قبول کرتا ہے اور ہماری خدمت گزار سی کے لیے ہے جسے اگر وفادار خانہ زاد کے نام سے پکارا جائے تو غیر موزوں نہ ہوگا۔

روزمرہ ضروریات زندگی سے سائنس پیدا ہوا

پروفیسر ایسیٹس کا یہ مقولہ ہے کہ عمل خیال پر مقدم رہتا ہے یعنی ہم علم سائنس کی بہت سی باتیں سیکھ لیتے ہیں۔ تجربے کرتے رہتے ہیں لیکن نظریہ یا مسئلہ بعد ازاں بنتا ہے جبکہ ہم اپنے علم کو معقول اصول اور طریقہ سے ظاہر کرتے ہیں۔ اب آپ اس سے اندازہ کر لیجیے کہ سائنس کا ہماری علمی زندگی سے کتنا اہم اور قریبی تعلق ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہے کہ روزمرہ کے مشاہدہ اور تجربہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ نامعقول اور سائنس کے متضاد نہیں جیسا کہ سائنس کی چند کتابیں پڑھ کر بعض لوگ اپنے کو منتی تصور کرنے لگتے ہیں اور بعض مرد جب دستوروں اور رایوں کو دنیا فوسمی، فرسودہ، ناموفق زمانہ، ٹھکانے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصل یہ ہے کہ تمام علوم، سائنس کا لوجی اور توشیا لوجی کے ماسوا، قوم کے روزانہ کاروبار اور تجربہ سے وجود قبول کرتے ہیں۔ ریاضیات مجرد علم سے سمجھا جاتا ہے لیکن اسکی تاریخ بھی ظاہر کرتی ہے کہ تجربہ اور روزانہ کاروبار کے درمیان اسکی ولادت ہوئی تھی۔ پروفیسر ٹی۔ کیس صاحب لکھتے ہیں :-

حساب کی ابتدا ہاتھ دیا نوؤں کی انگلیوں کی گنتی سے ہوئی تھی اور مساحت نے ہاتھ پاؤں اور بازوؤں کی لمبائی چوڑائی سے وجود حاصل کیا تھا۔ مدت تک ہاتھ اور بازو کی لمبائی اجسام کے طول و عرض کی پیمائش کا پیمانہ تسلیم ہوتی رہی۔

جہاز رانی تعلیمات ہی کے وسیلہ سے ہوتی ہے۔ زمین کی پیمائش کرنے اور نقشے مرتب کرنے والے اسی علم کی بدولت روٹی نکالتے ہیں۔ وہ دنیا کو صحیح وقت بتاتے ہیں۔ سمندری جہاز چلتے ہیں۔ فلکی انجینئرس پیام بے تار کے وسیلہ سے دن اور وقت بتاتے رہتے ہیں۔ کیمسٹری کے موضوع پر جو میں آنے سے پہلے یوزہ کشی، صابون سازی اور رنگ سازی کا رواج تھا لیکن علم کیمیا کی بدولت کتنی دست کاریاں اور فن پھیل رہے ہیں ان کا بیان کرنا ہی دشوار ہے۔ عام سونے چاندی اور دیگر دھاتوں کو اسی علم کے وسیلہ سے صاف اور خالص کیا جاتا ہے۔ کول تار سے برقی بجلی بنی ہے اور اس سے اسکے اور بہت سے مرکبات تیار ہوتے ہیں۔ مصنوعی رنگ جیسے نیل کیمیا ہی کے وسیلہ سے تیار ہوتا ہے۔ فولاد کو بہتر بنایا جاتا ہے۔ برقی قوت کے وسیلہ سے جو چیزیں تیار ہوتی ہیں وہ کسی اعلیٰ ہوتی ہیں۔ زمین کو زرخیز بنانے کے لیے نائٹروجن سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ سب کیمسٹری کے ترشے ہیں۔ طبیعیات کی بدولت تار، ٹیلیفون، بجے تار برقی، برقی بجلی، اور آواز کے کلیں تیار ہو گئی ہیں۔ جمادات اور علوم ارضیہ کی بدولت لوہا، سیسہ، تانبا، اور دیگر فلزات، کوئلہ وغیرہ معدنیات پر انسانی کے فائدہ کے لیے دستیاب ہو رہی ہیں۔ دبے خزانے حکم زمین سے برآمد ہو گئے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ سمندر سے مچھلیاں نکل رہی ہیں اور علم حوادث ارض و سما سے جانیں بچ جاتی ہیں اور فصلوں کی بابت پہلے ہی سے کچھ علم ہو جاتا ہے کہ کیسا موسم چوکا اور اس سے کس قسم کی فصلیں ہونے کی امید ہے۔ اس علم سے موسموں کے تیز تبدیل اور اسکے وسیلہ سے زرعی پیداواروں کی آئندہ کیفیت معلوم ہو جاتی ہے۔ بیکٹریا (Bacteria) جراثیم کے اکتشافات سے فن جراحی، حفظان صحت اور ابتدائی عہدہ اثر پڑا ہے اور اس سے اشیاء خوردنی بھی دیر تک محفوظ رہ سکتے ہیں۔ فزیالوجی کے اکتشافات سے افعال اعضا کے عیب معلوم ہو گئے ہیں۔ مٹل کے معلوم کردہ قانون تواریث (Mendel's Law of Heredity) سے ہم گھریلو جانوروں کی نسل عمدہ بنا سکتے ہیں اور اس سے کام لیکر پودوں کی قدرتی حالت کو بدل سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے تیرہ اختراعات

ڈاکٹر آؤس نے ایک کتاب لکھی جس میں انیسویں صدی کی اختراعات کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں گذشتہ صدی میں تیرہ اختراعات سے روزانہ کاروبار میں کام لیا گیا اور انکی بدولت ہمارے طرز معاشرت میں مستقل تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ وہ مسبیل ہیں۔ ریلوے، اسٹیم انجن کے وسیلہ سے جہاز رانی، تار برقی، ٹیلیفون، دیاسلانی، گیس کی روشنی، برقی روشنی، فوٹو گرافی، فوٹو گراف، ایکس، اسپیکٹر اسکوپ کے ذریعہ سے تاروں کے اجزائے ترکیبی معلوم کرنے کا طریقہ، مخدرات (Anesthetics) کا استعمال اور اپریشن کے بعد زخم کو ایسے طریقہ سے باندھنے کا ڈھنگ جس سے مضر جراثیم اسے خراب نہ کر سکیں۔ اس سے پیشتر کی صدیوں کی نہایت مفید اختراعات دو رہیں، چھاپہ، قطب کے بحری، اعدا، اور رسم الخط ہیں۔ اور انکے ساتھ مقیاس الوہ اور اسٹیم انجن بھی شامل ہو سکتا ہے۔ علم ترشہاے مخروطی اور علم ہندسہ سے جہازوں، قلعوں، عمارتوں وغیرہ کے بنانے میں ہیں کس قدر فائدہ حاصل ہو رہا ہے بیسویں کلیں اقلیدس کے قاعدوں سے بنتی اور چلتی ہیں جس سے ہمارے سیکڑوں کام انجام پذیر ہوتے ہیں اور ہمیں جدید نفع پہنچ رہا ہے۔ فرانس کے مشہور محقق پاستور (Pasteur) کی تحقیقات سے بنی آدم کو کتنا عظیم نفع پہنچ رہا ہے اسکے مسئلہ جراثیم کے اکتشافات سے کیمیائی حرفتوں میں انقلاب پیدا ہو گیا۔ اب سب گزیدگی کا خاطر خواہ علاج ہوتا ہے۔ مرغوں مرغیوں اور مویشیوں کی وبا کا افسوس ہو سکتا ہے۔ اسکی دریافت سے جو زنف لستر نے جراحی میں کام لیا اور اس امر کا خاطر خواہ انتظام کر لیا کہ اپریشن کے بعد زخم سڑنے نہ پائے۔ الغرض کہ ان تک بیان کیا جائے کہ سائنس انسان کی خدمت کس طرح کر رہا ہے۔ ہر برٹ اپنہرنے اسکا فیصلہ کر دیا ہے۔ وہ کہتا ہے ”سائنس زندگی کے لیے ہے اور زندگی سائنس کے واسطے“۔ پروڈیئر تھرے ٹامسن کہتے ہیں :-

بیشک سائنس زندگی کے راحت و آرام کے لیے ہے۔ مگر ”زندگی“ کی نسبت کئی نیچ خیال نہ ہونا چاہیے۔ کیا زندگی کھانے پینے سے زیادہ نہیں ہے اور کیا لباس سے بہت زیادہ چھانچا نہیں ہے؟ آج کل کی مذہب قوموں کے زبواؤں کی زندگی کا کچھ

حسد سائنس کی تحقیقات کے لیے بھی ہونا چاہیے ورنہ وہ تہذیب کے تمام لوازم سے بہرہ یاب نہیں ہوں گے۔ ہماری سڑکوں پر کہ سائنس ہی مذہب آدمی کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچاتا ہو بشرطیکہ اسے کام کرنے کا موقع دیا جائے۔

سائنسی مطالعہ فطرت کا اثر خلاق ذہن اور روح پر

سائنس ہماری تمدنی راحت و آرام میں اضافہ کثیر کرنے کے علاوہ ہمارے ذہن کی تربیت کرتا ہے۔ ہمیں صحیح مشاہدہ کرنے کی تلقین دیتا ہے۔ ہمارا دماغ سوچنے اور غور کرنے کے قابل بناتا ہے۔ ہماری قوتِ تیز ہوشیہ اور قوتِ استدلال صائب اور قوی بنتی ہے۔ سائنس سے موجودات اور اپنے ارد گرد کی اشیاء کا بغور ملاحظہ ضروری ہے۔ اس سے ہم ان کے درمیان مشابہت یا اختلاف اتحاد نوعی یا تفریق جنسی دیکھتے ہیں جس سے رفتہ رفتہ ذہن بال کی کھال اُٹانے کے قابل ہو جاتا ہے۔ ہمارے خیالات اور آرائشیں، اصابت اور عقلیت حاصل کرتے ہیں۔ اس سے ہمارا علم حقیقی اور صحیح علم بنتا ہے۔ کتابی علم مردہ ہوتا ہے۔ سائنس ہمارے اخلاق کو بھی سدھارتا ہے۔ ہم کائنات کی خوبصورتی کی قدر کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم مناظرِ طبی سے حظ حاصل کرتے ہیں۔ زمین و آسمان کی اشیاء ہمارے مشاہدے کے لیے ہیں اور ہم ان سے لطف اُٹھانے کے مجاز ہیں اور سب کے اخیر میں سائنس ہمارے مذہب اور ایمان کا دلیلیں کو قوی اور اعلیٰ بناتا ہے۔ ہم کائنات کے اندر ہزاروں عجائبات دیکھتے ہیں اور جب ان کی بنیاد اور اہمیت پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو صانعِ حقیقی کی عظمت

کارپوں اور اسکی حکمت و دانش کی بید تعریف کرتے ہیں بلکہ عقلِ خیران ہو جاتی ہے اور اسکی قدرتِ لایزال اور ہستی لازوال کی بے اختیار داد دیتے ہیں۔ ہم اپنی طبیعتِ کمزوری اور خامی سے واقف ہو کر اس ہستی کی طرف رجوع ہوتے ہیں جو دائمی اور حکمت کی مصدر، زمین اور آسمان کی خالق و مالک ہے۔

تاروں بھری رات میں ذرا مکان کی چھت پر چڑھ کر کھکشاں اور دیگر تاروں کو دیکھو۔ انگلی اہمیت پر غور کرو۔ تھوڑی سی دیر کے بعد سوچتے سوچتے عقلِ آپ سے آپان روشن بلوروں اور نامعلوم عالموں کے بنائوالے کی طرف مائل ہو گئی اور اپنی لاچاری اور مجبوری سے ہو کر خداوندِ قادرِ مطلق کے سامنے جھک جائیگی اور اسکی ثنا خوانی میں محو ہو جائے گی۔ اس وجہ سے مطالعہ سائنس روحانیت پیدا کرتا ہے۔ حاسہ مذہب کو بیدار کر کے اُسے استحکام بخشتا ہے۔ کیونکہ اس سے خدا کی حکمتوں اور صنعتوں کے راز ہیرا آشکارا ہوتے ہیں۔ اور اس کے ذریعہ سے ہمارا ایمان زور پکڑتا اور کفر و الحاد دم و باکر چلے جاتا ہے۔ سائنس کے فوائد پر کتاب بھی جاسکتی ہے مگر ہمارے مطلب کے لیے یہی کافی ہے۔ اس سے بڑھنے والوں کے دلوں میں اس کے استغنائے کا علم پیدا ہو گا اور وہ بلوغتِ دوسو چنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔

جے۔ آر۔ لے

بکے دعوے کا اعلان

مندرجہ ذیل سنگلاخ کتابیں آج بھگے کی مل: کر سکا۔ میں نے پتھروں کو پانی کر کے بنا دیا :-

- (۱) ملِ کلیات اور دھڑا غالب بلوی قیمت ۱۰۰ روپے (۲) ملِ نکات میرزا محمد علی قادریہیہ قیمت ۱۰۰ روپے (۳) ملِ تصانیف قانی۔ کورنشی عالم وی لے قیمت ۱۰۰ روپے (۴) ملِ تصانیف قانی۔ کورنشی عالم وی لے قیمت ۱۰۰ روپے (۵) ملِ تصانیف قانی۔ کورنشی عالم وی لے قیمت ۱۰۰ روپے (۶) ملِ تصانیف قانی۔ کورنشی عالم وی لے قیمت ۱۰۰ روپے (۷) ملِ تصانیف قانی۔ کورنشی عالم وی لے قیمت ۱۰۰ روپے (۸) ملِ تصانیف قانی۔ کورنشی عالم وی لے قیمت ۱۰۰ روپے (۹) ملِ تصانیف قانی۔ کورنشی عالم وی لے قیمت ۱۰۰ روپے (۱۰) ملِ تصانیف قانی۔ کورنشی عالم وی لے قیمت ۱۰۰ روپے

مشترکہ: مجدد ہند مشرقیہ سید احمد حسن شوکت۔ مطبع شمعہ ہند۔ شہر میرٹھ

حیات بعد المات

(۱)

زندگی کیا ہے؟ عناصر کا ظہور ترتیب موت کیا ہے؟ انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے لیکن عقائد میں کچھ متاثر تفریق نظر آتی ہے۔ وہ سزا و جزا کے توفیق و قائل ہیں لیکن ایک دوسرے طریق سے۔ وہ کیا ہے روح انسانی کا مرکز اصلی ذات حقیقی ہے۔ پتلہ خاک کے فنا ہو جانے کے بعد روح (جو غیر فانی ہے) اور جسکے ہر دو فریق قائل ہیں) کچھ مدت مقررہ کے لیے ایک دوسرے عالم میں رکھی جاتی ہے جسے عالم ارواح کہتے ہیں۔ کسی ایک خاص روز میں کائنات عالم فنا ہو جائے گی اور اُس روز نہر ہستی کی روح کو اپنے اپنے افعال کی سزا یا جزا ملے گی۔ سزا یہ ہوگی کہ دوزخ میں روئیں والی جائینگے اور جزا یہ ہوگی کہ بہشت میں۔ ناظرین اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دونوں عقائد میں کس درجہ کی روحانیت پائی جاتی ہے اور قریب قریب جتنے فرقے ہیں وہ سب اپنے اصول کو روحانیت کی عمیق تہ میں رکھتے ہیں۔ نئی روشنی کے سائنٹفک لوگ اس مسئلہ ہی سے کچھ بیزار ہیں کہ وہ اس پر خامہ فرسائی نہیں کرتے۔ بہر حال ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ واقعی قابل اطمینان حل زندگی کن کن اصولوں پر مبنی ہے۔ ہر چیز کے ثبوت کا انحصار اسکے علمی یا ذہنی تجربا پر ہے۔ ہر شخص جو کچھ بذات خود دریافت یا معلوم کرتا ہے وہ دوسروں پر ظاہر کرتا ہے اور اُسکی تعلیم دیتا ہے۔ اُسکے خیالات کا صائب ہونا اُسکے مذاق سلیم پر منحصر ہے۔ اب تک انسان نے جو کچھ ایجادیں کیں یا اصولات قائم کیے اُسے بذات خود ایک دفعہ تجربہ کر لیا ہے یا ہدایت کی رُو سے ایک حقیقی اصول قائم کر لیا ہے۔ اس امر کو جانے دیجیے کہ اُسکے تجربات کو لوگوں نے صحیح مانا یا نہیں یا اُسکے خیالات کا ایک صحیح معیار قائم کر سکے یا اُسکو غلط ٹھیرا لیکن شخص مذکور نے خود تو

کائنات عالم کے نظام تمدن میں خلاق عالم نے کچھ ایسی گونا گونی و دل فریبی پیدا کر دی ہے کہ عقل انسانی باوجودیکہ عقل کل کی ایک ذاتی قوت ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اس کی عقدہ کشائی سے بالکل عاجز و حیران ہے۔ بظاہر تو قدرت کی کرشمہ سازیاں انسانی قلوب کو اپنا گرویدہ بنا ہی لیا کرتی ہیں لیکن نہایت جانفرواہ پریشاں کن خیالات ہیں جو دماغ میں ایک حوس نخل کی طرح ہمیشہ جکر لگایا کرتے ہیں اور جن کا ماخذ یہ ہے ”حیات بعد المات“ یعنی ہستی انسانی کے فنا کے بعد صورت نگون و وجود کیا رہتی ہے۔ یہ نہایت ہی اہم و جامع مسئلہ ہے۔ یہی وہ خیالات ہیں جو زمانہ کے مختلف دور میں قومی رفارمروں نے ترقی و دوست دے دے کر لوگوں کو سکھائے اور ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ لیکن ٹھنڈے دل سے غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لایعنی مسئلہ ہے۔ بہر حال جہاں تک لوگوں نے اسکی تحقیقات کی ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق انسانی ہستی سے بالکل روحانی ہے، اور بقا و ہستی کا تعلق ایک دوسرے عالم سے ہے جسے ہم عالم ارواح کے نام سے تعبیر کرتے ہیں۔ عالم ارواح خود ایک مسئلہ متنازعہ ہے۔ کچھ لوگ اسکے وجود کے قائل ہیں اور کچھ اسکی ہستی کے منکر۔ علمائے ہنود آواگون (تنازع روح) کے پیرو ہیں اور انکا عقیدہ ہے کہ روح (ہستی) ہمیشہ نقل قاب کرتی ہے اور اُسکی اچھی یا خراب حالت اُسکے پچھلے افعال کی جزا یا سزا ہے۔ اسکا فنا، نقل قاب کرتے کرتے بالکل پاک ہو کر ہستی حقیقی میں مل جاتا ہے جس کو وہ نردوان یا آتما کا پرما تمانیں وصل ہو جانا یا دوسرے الفاظ میں ”دھل جی ہو جانا“ کہتے ہیں۔ اسلامی فلسفہ اسکے بارے میں کچھ اور کہتا ہے۔ فی نفسہ دونوں

اُسکو جان لیا ہے۔ اسی طرح مسئلہ فنا و بقا کو ہر شخص تسلیم تو ضرور کر لیا۔ تسلیم کرنے سے یہ مراد نہیں کہ جو کچھ اصولِ ٹھیرا دیے اُسکو مان لیا بلکہ یہ کہ ہر شخص ایک دفعہ پیدا ہوتا ہے اور پھر مرتا ہے اور اُسکو ہنریٰ مٹا ایک نہ ایک دفعہ ہمیشہ جھپکتا ہے۔ لیکن کوئی شخص آج تک ایسا نہ پیدا ہوا (فرضی و مذہبی قصص سے قطع نظر کر کے) جو یہ بتا سکے کہ وہ کس حالت سے مرے؟ مرنے کے بعد کیا کیا مراحل پیش آئے؟ کیا اُسکو انہی پھلپھلی ہستی یا دھنسی؟ کیا اُسکو معلوم تھا کہ مرنے کے بعد پھر اُسکی کیا حالت ہوگی؟ کیا نقلِ قالب کرتے وقت اُسے نقل کی کیفیت محسوس ہوئی تھی؟ اُس دوسرے عالم کی کیا کیفیت تھی وغیرہ وغیرہ۔ میرا تو خیال ہے کہ کوئی شخص ایسا نہ ہوگا جو ان سوالات کا اطمینان بخش جواب دینے میں سچا اتر سکے۔ کوئی شخص عالمِ ارواح سے انھیں جو اس انھیں خیالات کے ساتھ واپس نہیں آسکا کہ اُس سے وہاں کی کچھ کیفیت معلوم ہو سکتی۔ اب اگر کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ یہ سب باتیں کشف و ضمیر سے معلوم ہوئیں تو یہ مسئلہ ذرا تو ضیح طلب ہے۔ یہ بات غالباً ہر شخص مان لے گا کہ ہر فرد انسانی میں ایک نہایت اہم و زبردست قوت ہوتی ہے جسے ہم قوتِ ارادی کہتے ہیں۔ قوتِ ارادی ہی گویا اس مرکبِ عنصری کی روحِ رواں ہے۔ یہی قوت ہر فرد میں کیساں صورت میں پیدا کی گئی ہے اور اسکے خواص و واقفیت ہر حالت ہر زمانہ ہر قوم میں بالکل ایک طرح کی ہوتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص کہے کہ نہیں قوتِ ارادی بالکل کیساں نہیں پیدا کی گئی ہے تو اُسکا دعویٰ بالکل بوجہ ہے۔ کیونکہ تیلہِ فنا کی کامناغ حقیقی ایک ہی ہے اور مادہ و تکوین وجودِ حیاتِ انسانی ایک ہی مادہ کثیف یا لطیف سے مرکب ہے۔ حیات و موات بالکل عناصرِ اربعہ کی ترتیب و پریشانی پر منحصر ہے۔ بہر حال انسان بصورتِ ساخت و وجود ہمیشہ کیساں ہے۔ تفریقِ مشرب و مذہب تفریقِ ساخت و ہستی سے بالکل جداگانہ ہے۔ یہاں سے یہ بات پایہ

ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ہر انسان کی قوتِ ارادی ایک ہے۔ اب رہا یہ مسئلہ کہ کسی میں کم کسی میں زیادہ یہ انسان کے مختلف قولے ذہنی کے سرچے احمس یا بطنی احمس یا مضبوط یا کمزور ہونے کی وجہ ہے۔ کشف و ضمیر کیا ہیں؟ اپنے قولے ذہنی و قوتِ ارادی میں ایک ایسی حرکت غیر متناہی پیدا کرنا کہ جب اُس میں ذرا سی ہل چل ڈال دیجیے ذاتِ خود میں وہ روشنی کا تلامطم پیدا ہو کہ انسان (مراد ہستی انسان) اپنی موجودہ حالت کو بالکل بھول جائے اور عالمِ استغراق میں ہو کہ اپنی ہستی کو چشمِ باطن میں سے ملاحظہ کرے۔ بہر حال یہ تو صوفیائے کرام کا کشف تھا۔ علمائے فلسفہ جدیدہ یہ کیسے گئے کہ کشف وہ ہے کہ انسان اپنی قوتِ ارادی کو اس درجہ تکمیل کو پہنچائے کہ وہ کئی دوسرے شخص کے قولے ذہنی کو اپنی قوتِ ارادی کے ذریعہ سے متاثر کر سکے۔ اب اگر عالمِ ارواح کا پتہ کسی نے لگا لیا ہوگا تو محض اپنی قوتِ ارادی ہی سے۔ لیکن جہاں تک ہم دیکھتے ہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ جتنے ہاتھوں نے رشیوں پیغمبروں اور وردیشوں نے اس عالم راز کا پتہ لگا یا سبھوں نے اُسے مختلف حالتوں میں پایا اور ہر ایک نے مختلف اصول قائم کیے۔ ہنود کے علمائے اس عالم کو دوسری حالت میں پایا۔ اسلامی فلسفہ اہلِ بابت کچھ اور کہتا ہے۔ داتا گاندہ کے اقوال اور ہیں۔ مسیحی پیشواؤں نے ایک دوسرا پہلو اختیار کر لیا۔ غرض مختلف مذاہب میں مختلف صورت میں عالمِ ارواح کی تعلیم دی گئی ہے۔ قطع نظر مذہبی اختلاف کے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ آخر اس بین تفریق کی وجہ کیا ہے؟ سب سے بڑی وجہ اس باہمی اختلاف کی یہ ہے کہ پیشواؤں نے اصول تو سائے و آسان مقرر کیے لیکن امتداد زمانہ سے اُس میں فروعات ایسی پیدا کر گئیں کہ اب وہی سہل الاصول قواعد کچھ ایسے عجیبہ ہو گئے کہ ایک قابلِ اطمینان صورت میں پائے جاتے ہیں۔ یہ آفت ہر مذہب میں پائی جاتی ہے۔ یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ روحانیت کا مسئلہ ہی ایسا ہے۔ علوم تو

سمجھ ہی نہیں سکتے، رہے تعلیم یافتہ لوگ ان میں بھی ایک مقول تعدد محض تقلید ہی تقلید کرتی ہو۔ کچھ لوگ ہیں جو شاید سمجھے ہوئے ہیں لیکن ان کا سمجھنا ہی کیا وہ بالکل محکم کلمہ رہتے ہیں۔ بہر حال یہ بات نہیں ہو کہ اس عالم اجسام کے سوا اور کوئی عالم ہی نہیں ہو۔ لیکن ہاں یہ ضرور ہو کہ اسی اُس کی کافی چھان بین نہیں ہو سکی ہو اور لوگ اس کے آخری زینہ تک نہیں پہنچے ہیں۔ یہ ضرور ہو کہ متقدمین نے اسکی تلاش میں بڑی سرگرمی کی ہو اور روحانیت اور عالم ارواح پر بڑی بڑی ضخیم کتابیں لکھی ہیں لیکن افسوس ہو کہ اب تک قابل اطمینان صورت نہیں پیدا ہو سکی۔ اس کے فرقے بھی بالکل جدا ہو گئے لیکن وہ بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچے۔ مختلف مذاہب ہوئے لیکن وہ بھی آخر میں ناکامیاب رہے۔ یہ مطلب نہیں ہو کہ یہ سب باتیں لامائل و فضول ہوں لیکن ہاں یہ ضرور کہوں گا کہ قابل اطمینان راستہ ابھی تک ان لوگوں کو نہیں ملا ہو۔ اگر لوگوں نے اس کا پتہ لگالیا تو پھر اُنکی تعلیم میں یہ اختلاف کیوں ہو؟ ہر ایک پیشوا کو ایک ہی تعلیم دینی چاہیے تھی۔ کیونکہ سب لوگوں نے ایک ہی قوت ارادی سے عالم ارواح کا پتہ لگایا تھا۔ روحانیت کا سوال اب تک حل نہیں ہوا اور حیات بعد المات ایک ایسے گہرے راز سے تعلق رکھتا ہو کہ نہایت کوفتا ہونے کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہو اور جب وہ فنا ہو گیا تو اُسکے معلومات بھی فنا ہیں اور یہ مسئلہ جوں کا توں ہی رہ گیا۔

مادہ نگین و وجود ہستی میں اگر فلسفہ جدیدہ کا لحاظ رکھا جائے تو اثبات باری میں ایک نہایت اہم رکاوٹ پیدا ہوتی ہو۔ جن اشیاء موجودہ میں مذاہب مختلفہ نے ایک ناویدہ دست قوت کو صانع حقیقی گردانا ہو ان کی ساخت و صنعت میں علمائے متاخرین نے ایک ترکیب ساخت مادی کا اصول قائم کیا ہو۔ ان دو مخالف تعلیموں کا ہمارے مضمون سے ایک گہرا تعلق ہو۔ جن متقدمین نے اصول روحانیت

کو صورت ہستی کا ایک حقیقی معیار گردانا ہو اُنکی تعلیم کا دائرہ دنیا (مراد نظام عالم کی صورت موجودہ) ہی تک جا کر ختم نہیں ہوتا بلکہ وہ صورت حال و صورت ماضی کا انحصار ایک نئی جامع و اہم مستقبل پر رکھتے ہیں اور منزل ہستی کو عالم بقا کے زائرین نہیں بلکہ ہاجرین کی جادہ پیمائی کا ایک دور وسطی سمجھتے ہیں۔ مسئلہ روحانیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں یہ مانتا پڑتا ہو کہ انسان کا لبد خاکی کو چھوڑنے کے بعد ایک اور ہی عالم میں ہوتا ہو۔ لیکن صورت ہستی بقاے دوام کی منزل پر پہنچنے کے بعد ایسی نہیں رہتی کہ اُسپر اصول ہستی کو مدنظر رکھ کر ہم وجود حقیقی کا اطلاق کر سکیں۔ وجود حقیقی سے یہ مراد نہیں ہو کہ وہ شے (روح۔ آتما۔ ہستی وغیرہ) بصورت کسی خاص نوع معلومہ کے ہو بلکہ وہ ایسی صورت میں ہوتی ہو جس پر محض ایک ہستی کا قدام ہو سکتا ہو۔ قدم ہستی کے وجود کا معیار دنیا کے لوگ نہیں کر سکتے۔ اب یہاں سے یہ مسئلہ حل ہو جاتا ہو کہ انسان کشف و ضمیر سے اُس وجود حقیقی کا اندازہ کیسے کر سکتا ہو؟۔ عالم دوام و بقا کے وجود ہستی کا معیار اُس حواس سے کیونکر معلوم ہو سکتا ہو جبکہ عالم ارواح کے وجود کا نظام صورت موجودہ سے بالکل جداگانہ ہو۔ دنیاوی معین اپنی اُس صورت کو کیونکر معلوم کر سکتی ہیں جو اپنے قالب کو دنیا کے پورے نظام تمدن میں نہک چھوڑ کر پرواز کر گئی ہیں۔ ہر شے کی صورت ماضی صورت موجودہ سے ان حالتوں میں اختلاف کرنے لگتی یا ان وجود سے چیزیں بطور خود اختلاف کرنے لگتی ہیں (۱) شے مذکور کا نظام اسباب (۲) مختلف حواس خمسہ سے معیار قائم کرنا (۳) عالم متحدہ کے مختلف نظام قدرت۔ ان اصولوں کو مد نظر رکھ کر ہم موجود مذہبی تعلیم کی کسوٹی پر کہاں تک پہنچے اتر سکتے ہیں۔ صرف مسئلہ روحانیت کو لے لیجیے کیونکہ ہمیں کسی اور شے سے بیان مطلب نہیں ہے۔ عالم دنیا و عالم بقا کے ہستی دوام میں کتنی تباہ و تفریقیں نظر آتی ہیں

اس بات میں تو غالباً کسی فرد کو عذر نہ ہوگا کہ صرف روح ہی ایک ایسی شے ہے جو ان دونوں عالم میں ایک بن تفریق ڈالے ہو ہے۔ لیکن روح بذاتِ خود ایک سلسلہ معرکہ آرا ہے۔ بہر حال خواہ جو کچھ ہو میرا مطلب اُس شے موجودہ ہے جو قالبِ انسان کو چھوڑ کر علیحدہ ہو جاتی ہے اور جسکے نکل جانے پر انسان کو مردہ کہا جاتا ہے۔ اب صورتِ حال و صورتِ مستقبل سے اسکا مقابلہ کچھ ہم انہیں اصولات کو مد نظر رکھ کر اسکا معیار قائم کرینگے جنہیں ہم اوپر درج کرائے ہیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے اسکا اندازہ ہر سہ اصولات سے ہو سکتا ہے۔

(۱) شے مذکور کا نظام اسباب - نظام اسباب ملاحظہ فرمائیے۔ انسان کے وجود کی بنا اُسکے قالب میں یا نظامِ جسم میں ایک حرکت غیر استراحتی پیدا ہونا۔ مختلف عادات - حرکات - سکناات وغیرہ سے اُسکا تربیت پانا۔ اخلاقی و معاشرتی زندگی بسر کرنے سے روح پر نیک اثر ہونا اور بُرے خیالات و افعال قبیحہ سے اُسکو متاثر نہ کرنا۔ ان صورتوں سے انسان کے اعصابی رُسیہ متاثر ہو کر روح پر اپنا ایک گہرا تصرف اور اُسکی شکل نوعیہ میں تفریق ڈالتے رہتے ہیں۔ ہر سہ دفعات بذاتِ خود ایک نہایت بسیط مضمون سے تعلق رکھتے ہیں۔

(۲) مختلف حواس خمسہ کا معیار قائم کرنا۔ جن حواسات سے لوگ معیار ہستی قائم کرتے ہیں چونکہ وہ بذاتِ خود اختلاف رکھتے ہیں اس لیے ثبوت میں بھی اختلاف ہونا ضروریات سے ہے۔ جس شخص نے کسی چیز کی ماہیت محض آوازیں کر دریافت کی ہے اُس کے خیالات گو بذاتِ خود درست ہوں لیکن اُس شخص کے خیالات سے مطابقت نہیں کر سکتے جس نے اُس کو چھو کر دریافت کیا ہے۔ اثباتِ وجودِ ہستی کا جس شخص نے محض قیاسی اصول قائم کیا ہے جبکہ فلسفیوں اور منطقیوں نے دعوے کیا ہے، اُنکا دعوے از سر تا پا اختلاف کرے گا اُن لوگوں سے جنہوں نے اس کا علمی اصول قائم کیا ہے جیسا کہ صوفیوں اور درویشوں کا اصول ہے۔

اب رہا تیسرا اصول ”عالم مختلفہ کے مختلف نظام قدرت“ ہر شے

دو مختلف عالم میں ہونے سے اختلاف کرنے لگتی ہے۔ اگر کوئی شخص عالمِ موجود میں ہو تو اُسے وہ چیزیں جو اُس نے عالمِ بیداری میں دیکھی ہیں مختلف نظر آئیں گی۔ کیونکہ ایک تو اُسکے دماغ کی کیفیت حالِ دگرگوں ہے اور دوسرے ہر دو نظام اسباب ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ اسکے خلاف کرنے کا یہ باعث نہیں ہے کہ اُس شخص نے اُن چیزوں کو ہر حالت میں مختلف پایا بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہر عالم میں نظام قدرت ہی جداگانہ ہوتا ہے۔

آدم بر سر مطلب - ان حواسات ظاہری سے عالم ارواح کا پتہ ہم کیسے لگا سکتے ہیں جبکہ اسباب دریافت ہر حالت میں اختلاف رکھتے ہیں دنیا کے نظام اسباب اور ہی ہیں۔ حواسات بالکل جداگانہ ہیں۔ عالم ارواح ان تمام باتوں سے بالکل مبرا و منزہ ہے۔ رہا کشف و ضمیر کشف و ضمیر سے انسان کسی دوسرے عالم کا پتہ نہیں لگا تا بلکہ وہ ذاتِ خود میں اس درجہ منہمک ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی ذاتِ ہستی کو بالکل بھول جاتا ہے۔ اس لیے اگر اُس نے کسی بات کا پتہ لگایا تو بس یہی لگایا کہ ذاتِ خود سے ذاتِ موجودہ کو کیا تعلق ہے۔ یاد دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ انسان اپنے جذبات میں بالکل جذب ہو جاتا ہے (لفظ انسان یہاں پر بحث طلب ہے۔ انشاء اللہ آئندہ کسی نمبر میں ہم لفظ ”انسان“ کے مادہ و معنی پر کافی روشنی ڈالینگے) گویا وہ اُس وقت ایک دوسرے عالم میں ہوتا ہے لیکن وہ عالم ارواح میں نہیں ہوتا۔

عالم ارواح کی ایک یہ بھی صفت ہے کہ وہ روح کے پروا ہو جانے کے بعد روح کا سکون ہو جاتے ہیں اور جب تک روح کو جسم سے تعلق ہے اس کا وہاں تک گزر ہونا ناممکن ہے۔

رشید احمد (صدیقی)

میر ہندی مجروح

خاک پاکِ آئی میں فی کے بعد سودا اور میر نے جو محفل برپا کی تھی اور جس کی صدارت کی عزت بمراتب سید انشا، شاہ نصیر، ذوق، اور غلام کے حصہ میں آئی تھی میر ہندی حسین مجروح اسی کی آخری شمع تھے محفل کو اُجڑے اور اہل محفل کو اس جہان سے گزرے زمانہ گزرا۔ لیکن اس شمع کی روشنی اُس دلچسپان کے درہم برہم ہونے پر بھی ابھی تقریباً نو برس پہلے تک بزمِ شینوں کا نام چمکاتی رہی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ اسکی ضوہر کم و متہ کم نہیں پہنچی لیکن جس طرح جنگلِ بیابان میں چراغِ سرمزار بھولے بھٹکوں کی رہنمائی کرتا ہے اسی طرح میر مجروح باوجود گوشہ خموشی میں پڑے رہنے کے غلابانِ فن کے لیے بلاشبہ مشعلِ ہدایت کا کام دیتے تھے۔

ہاں وہ طبعا شہرت پسند نہ تھے لیکن اگر وہ عوام سے پورے طور پر رُو شناس نہیں ہوئے تو اس کے اور اسباب بھی ہیں جن میں سے اہم ترین سبب یہ قرار دیا جاسکتا ہے کہ دہلی کی بربادی اور کھلاے دہلی کی مفارقت نے اُن کے دل و دماغ کو اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ اُنہیں اپنے چہرے شاعری کی تشہیر کا خیال تک نہ آیا۔

میر مجروح اُن خوش نصیبوں میں ہیں جن کو دہلی کی گلیوں کی گونگائی و دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا ہے۔ حکومتِ تو جسمِ حیاں تھی لیکن اُس وقت بھی دہلی ہندوستان کا قریبہ و بغداد بنی ہوئی تھی۔ جو شخص یہاں کی کیفیت کا شاہدہ عروج کے زمانہ میں کرچکا ہو اُسکے واسطے تباہی و بربادی کا منظر کس قدر قیامت خیز نہ ہوگا۔ تجروں کی مثال اُس بلبل کی سی ہے جس نے باغ کو بہار میں دیکھا ہوا اور پھر خزاں میں بھی دنیاوی نشیبِ فراز اور کمالِ زوال کی یہ مجسم تصویر دیکھنے کے بعد یقینی بات ہے کہ میر مجروح کا دل ٹھیکہ گیا ہوگا۔ اسی مایوسی اور ناکامی کا پر تو ہم اُن کے کلام میں بھی پاتے ہیں۔

مجروح کے عالمِ طفلی میں دلی گلزار تھی اور غالب، ذوق، امین، آرزو، شفیقہ، صہبائی، تیر وغیرہ اسکے چمکتے ہوئے طائرِ خوش ناک تھے۔ ان کی نغمہ سنچیاں آج بھی علمی حلقوں میں سامعہ نوازی کا دلپذیر ذریعہ سمجھی جاتی ہیں۔ لیکن یہ خوش آہنگیاں جس شخص نے اپنے کانوں سے سنی ہوں بلکہ جسے ہسفیری کی عزت بھی مل چکی ہو وہی خوب بتا سکتا ہے کہ یہ صدائیں کان سے گزرنے کے بعد دل پر کیا خوشگوار اثر ڈالتی تھیں۔ میر مجروح کو شاعری کا شوق عالمِ شباب سے تھا۔ اگرچہ انسان فطری مناسبت کے بغیر کسی فن میں مشاق نہیں ہو سکتا تاہم بعض خارجی اثرات سے اُسے تکمیل مقصد میں کافی مدد پہنچتی ہے۔ مجروح کو وہ ذہنی و دماغی فائز حاصل تھیں جن پر اکتسابِ کمال کا انحصار سمجھا جاتا ہے لیکن چند اور بھی اسباب اُنکی تشویق کا ذریعہ ہوئے۔ باپ میر حسن فکا خود ایک خوشگو شاعر تھے بھائی چچا دونوں قابل، آپ خود تعلیم یافتہ، اہل کمال کی صحبت، ان تمام باتوں نے اُن کے طبعی شوق کے ساتھ تیز زور و خش پر کوٹے کا کام کیا۔ اُستاد بھی نصیبوں سے غالب ملے جن کا نظیر دنیاے شاعری اُردو و ہنگ پیدا نہیں کر سکی۔ غرض مجروح کے لیے غیب سے مفید مطلب مان مٹا تھے پھر اگر اُنھوں نے فنِ شعر کو درجہ اعلیٰ پر پہنچایا تو اُس سے ناواقفوں کے لیے تعجب کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔

وہ لڑکا جو اپنے خاندان کا نام روشن کرے سپوت ہوتا ہے اسی طرح جو شاگرد اپنے اُستاد کی عظمت و شہرت کا باعث ہو اُسکے سرمایہ ناز ہونے میں کیا تنگ ہو سکتا ہے۔ مجروح نے غالب کا نام روشن نہیں کیا کیونکہ وہ خود آفتاب تھے لیکن وہ اپنے اُستاد کی زندہ یادگار ضرور تھے۔ وہ اصل کی ایک ہو ہو نقل تھے۔ وہ آسمانِ سخن کا ماہتاب تھے۔ جس طرح چہا نی الحقیقت آفتاب سے اکتساب نور کر کے آسمان و زمین کو منور کر دیتا ہے

اسی طرح مجروح نے جو افامے حضرت غالب سے حاصل کیے اُن سے تمام طالبان کمال کو مستفید کیا۔ وہ شاگرد خوش نصیب ہو جس پر استاد کی فخر آمیز نگاہیں پڑتی ہوں۔ مجروح بلاشبہ ایسے ہی شاگرد تھے جن پر غالب کو بجا طور پر ناز تھا۔

استاد و شاگرد کے تعلق عموماً بے تکلفانہ نہیں ہوتے لیکن یکتیہ غالب اور مجروح پر صادق نہیں آتا۔ غالب یوں بھی اپنے تلامذہ سے بے تکلف ملنے جلنے کے عادی تھے لیکن مجروح کے ساتھ اُنکے روابط سید بڑھے ہوئے تھے۔ اس کی شہادت اردوے معلیٰ کے صفحات دے سکتے ہیں جو اُنکے نام کے خطوط سے معلوم ہیں۔ یہ خطوط اُس زمانہ کے ہیں جبکہ قندھار کے بعد دہلی میں افراتفری پڑ گئی تھی اور شرفا بنجیاں تھنڈی آبرو ترتر ہو گئے تھے۔ مجروح یہاں سے پانی پت پہنچے اور کچھ زمانہ تک ہاں انصاریوں کے محلہ میں مقیم رہے۔ پانی پت سے انھیں ہمارا راجہ اور نے بلا بھیجا اور یہ وہاں گئے۔ ہمارا راجہ کے انتقال پر یہ کچھ دنوں بے پور میں رہے اور بالآخر وطن کی کشش انھیں پھر واپس لائی۔ یہ زمانہ مفارقت استاد اور شاگرد دونوں کے لیے صبر آزمائی تھا۔ زبان سے باتیں ہونا غیر ممکن تھیں۔ خط کے ذریعہ سے جو کچھ ہونا کہہ سن لیتے تھے۔ مرزا غالب کے طرز تحریر سے اُنکی قلبی محبت اور دلی اُبنسیت کا ثبوت ملتا ہے۔ اللہ اللہ کیسے محبت بھرے دل تھے او کیسے محبت کی قدر جاننے والے۔ اب ان کا نشان بھی نہیں ملتا۔

میر مجروح کے کلام کی تقسیم تین حصوں میں کیا جاسکتی ہے۔

۱۔ غدر کے پہلے کا کلام۔

۲۔ درمیانی کلام۔

۳۔ آخری کلام

پہلی شق میں اُن کے کلام کا وہ حصہ سمجھا جاسکتا ہے جو دہلی کی بربادی و تباہی سے پیشتر لکھا گیا تھا۔ اس وقت طبیعت میں اُننگ تھی۔ مشاعرے کثرت سے ہوتے تھے۔ اہل کمال کا مجمع تھا۔ مسلم الثبوت ماہران فن کی واہ

حوصلہ افزا ہوتی تھی۔ درمیانی کلام اُس وقت کا ہے جب اُنھیں وطن سے دور رہنے کی ضرورت آپڑی تھی۔ اس میں اُس وقت کا کلام بھی شریک ہو سکتا ہے جب سفر سے واپس آکر دہلی میں آ رہے تھے۔ اس زمانہ میں طبیعت میں وہ ترنگ تھے تھے پھر بھی بعض پچھلے یاروں دوستوں کی کجیاں سے مزاج میں اطمینان سا ہو گیا تھا۔ اور بے بڑی تقویت کی چیز حضرت غالب کا وجود تھا جو اُنکی واپسی دہلی کے بعد بھی کچھ عرصہ تک بقید حیات رہے۔ آخری نمبر پر اُنکی فکر سخن کا وہ حصہ آتا ہے جو حضرت غالب کی وفات کے بعد لکھا گیا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ثبوت اس کا نہیں کہ کون سی غزل کس عہد کی ہے لیکن اگر شاعر کا کلام اُس کی طبیعت کا رنگ کچھ بھی دکھا سکتا ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو غزلیں شوخی کلام اور محاطات کے مضامین سے پُر ہیں وہ کلام اولیں ہیں اور عہد وسطیٰ کی خصوصیات یہ ہونا چاہیے کہ شوخی بیانی کے ساتھ کچھ حصہ رنج و مایوسی کا بھی پایا جائے۔ اور آخری یادگار اُن کے وہ شعار ہو سکتے ہیں جو سوز و گداز کا مرتع کہلانے کا حق رکھتے ہیں۔ میر مجروح طبعاً بہت رقیق لقلب تھے اور پُر درد دل رکھتے تھے چنانچہ یہ خصوصیت اُن کے کلیات میں تمام و کمال پائی جاتی ہے۔ لیکن آخر انہیں اُن کا اصلی رنگ ہی بن گیا تھا۔ غزل کی غزل حسرت و یاس کے مضامین سے لبریز ہے اور ناظر یا سامع ممکن نہیں کہ اُن کا کوئی شعر پڑھ یا سن کر موثر ہوے بغیر رہ سکے۔ کہتے ہیں کہ ”آپ بیتی کا اثر دل پر ہوتا ہے“ مجروح نے بھی گویا وہی باتیں لکھی ہیں جن کا تجربہ اور شاہدہ انھیں اپنی زندگی میں کرنا پڑا۔ اس لیے ان کی سرگزشت تاثیر سے کیونکر خالی رہتی۔

انسوس ہو کہ ہمیں باوجود سعی کے مجروح کے صحیح تفصیلی کوائف نہ مل سکے ورنہ اُن کا قلب بند کرنا خالی اندوچہ نہیں نہ ہوتا۔ دہلی سے باہر پانی پت اور اورنج پور میں ان کا قیام رہ چکا ہے اور یہ جہاں رہے اپنا نام اُچھالتے رہے۔ اول الذکر ریاست کا حکمران ہمارا جہ شیوہ ان سنگھ بہت علم دوست آدمی تھا۔ مجروح کے بھائی سید سرفراز حسین

اُس کے یہاں مصاحبت سے سرفراز تھے۔ میر مجروح کو بھی ناب تحصیلداری اور پھر تحصیلداری کے عہدہ پر ممتاز کیا۔ حسن اتفاق سے دہلی کے شعراء میں سے ظہیر اور آنور بھی یہاں موجود تھے۔ بہر حال رئیس کی قدردانی سے الورا ایسے غیر آباد و دور دراز مقام پر مجروح و ظہیر ایسے صاحب کمالوں کا اجتماع خاص دلچسپی کی چیز تھا۔ شیودان سنگھ خود شاعر نہ رہے ہوں لیکن شعر فہم ضرور تھے۔ ہر ہفتہ باغ و گلستا میں جلسہ مشاعرہ ترتیب دیا جاتا اور وہ خود اُس میں شریک ہوتے اور شعرا کا کلام سنتے تھے۔ ہمارا بہنوئی کی غیر متوقع اور بیوقوف موت نے اس مجھ کو پریشان کر دیا ورنہ شاید شیودان سنگھ کی راجدھانی میں لکھنؤ اور دلی کی کیفیت انگیز حالت پیدا ہو جاتی میر جمدی مجروح نے ہمارا راجہ کی شان میں دو قصیدے بھی کہے ہیں۔ ایک کے چند تمہیدی اشعار جو زبان کی شستگی کے باوجود معنوی خوبیاں رکھتے ہیں قابل ملاحظہ ہیں۔

ہمیری اُس دہن تنگ ہو کس طرح کسے غنچ ظاہر میں تو خوشبو ہو پودہ بات کہاں
مین جو کتا ہوں تجھے قتل ہی میر منظور کس صفائی سے وہ میا خنہ کتا ہو کہاں
پردہ ہی یار کا بہتر ہے کہ جوں شبنم و نہر وہ اگر سامنے آیا تو یہ بیتاب کہاں
جد لازم ہو ہر اک کام میں گر غور کرو نہ تو مشکل کوئی شکل ہو نہ آساں آساں
یاد رہتی ہو فقط نام سے دیکھ غنقا کو نام نہنے کے لیے اُس نے مٹایا ہر نشان
خوش دلی کے ہم سبب کا ہونا معلوم دل کہاں وقت کہاں عمر کہاں یار کہاں
تسکوہ الفاظ کا نمونہ بھی ملاحظہ ہو۔

تعالی اللہ ہوا قریب ابھی اور اس کا کہ تھا تو سین سے نزدیک تر زانو محمد کا
کیا سجدہ ملائک نے اُسی کی بھیکر غفلت و دیت جبہ آدم میں تھا جو نور احمد کا
خدا نے سب فضل ترکیا اسلاف کو یہ خلیل اللہ القاب ہایوں تھا تھے جد کا
وہ قدس پہ ہر ذرات جگو شغل جابوئی نہ برہم زن کہیں! ابو اس عیشِ مخلص کا
ہمارے شیب کیسے

کچھ نہ بگ سے اس فصل میں ہر خوش بہا! غباں کی نہیں کچھ سخی گلوں کو درکار
اس قدر باغ میں ہو غنچہ و گل کی کثرت کہ ہوا باد صبا کا بھی گزرا نہ دشوار
سبز عالم کو کیا ابرو ہوانے ایسا آشیان بنے کو بلبل کے نہیں میں خس و خاثرا
ابر نے محو کیے جزو کہ درت یاں تک ہو گیا صاف اگر تھا کہیں لکھنؤ میں غبا
معتدل فیض ہوا ہے یہ طبعِ عالم کوئی نرگس کی صفت میں نہیں لکھا بیار
لیکن اہل نظر کا خیال ہو اور اس کے صحیح ہونے میں شک کو سطلق
دخل نہیں کہ میر مجروح کا ایک حقیقی شاعر ہونے کی تصدیق ان کے قصیدوں
سے نہیں بلکہ غزلیات سے ہوتی ہے۔ غالب کی طرح اُنھوں نے قصیدے
کے ضروریں اور اچھے کہے ہیں لیکن صرف ان کی غزلیات استاد کی
سند کا کام لے سکتی ہیں۔

غزل گوئی کے میر مجروح پورے ماہر تھے اور اس صنف سے اُن کو
خاص مناسبت تھی۔ اُنھوں نے غزل کو محض عشقیہ مضامین تک محدود
کر دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ سچ پوچھیے تو جو باتیں غلطی سے عشق و محبت

یہ تو بہ! اب پکارتے کے دن ہیں خوشی سے مست ہو جانے کے دن ہیں
گئی اگر فصل گل ہے ابر موجود ابھی کیا آپ میں آنے کے دن ہیں
نہ دے تو قطرہ قطرہ کا ساقی یہ ساغر کے پھلک جانے کے دن ہیں
نکلتا گھر سے کیسا فصل گل میں یہ آپ سے نکل جانے کے دن ہیں
خیمے کی طرح سے بے خودانہ ہمارے جوش میں آنے کے دن ہیں
ہے ایسی کثرتِ عیش و طرب کیوں مگر خلعت کے یہ آنے کے دن ہیں
سری شیودان سنگھ لبتہ خوش ہوں کہ اُن کے عیش فرمانے کے دن ہیں
یہ قصیدہ غزل کی زمین میں کہا گیا ہے۔ اس میں وہ جزئی خصوصیات لبتہ
ناپید ہیں جو عموماً قصیدے سے منفک خیال کی جاتی ہیں لیکن اس سے یہ نشانیں
کہ وہ قصیدہ نگاری پر قادر نہ تھے۔ وہ بیشک ذوق کی طرح اس فن کے کامل
نہ تھے لیکن اُن کے قصیدے بہت سے مشہور شعرا کے قصائد سے بعض اوقات
بہتر سمجھے گئے ہیں۔ دیکھیے اس شیب پر سودا کا دھوکا ہوتا ہو۔
خانوں کو جگر و دل گر لے ضبطِ فغان بکھینا آتشِ شمعِ شش سے اُٹھے نہ دھواں

نہیں راز ہستی جانے کے قابل
یہ پردہ نہیں ہوا اٹھانے کے قابل

مطلب کی بات بسا خستہ زبان پر آ جاتی ہے اور کہتے ہیں ۵

خانماں سوزِ ماسوا ہوں میں اپنے سایہ سے بھی جدا ہوں میں
آنکھ تک ڈالتا نہیں گا ہک کچھ عجب جنسِ ناروا ہوں میں

بڑھا دیتا ہوں ہم جنسوں کا رتبہ مثالِ نقطہ گو بے کار ہوں میں
آبل سے مجھے دیکھو تو جاؤ کہ اک گنجینہ اسرار ہوں میں
خود شناسی کی اعلیٰ ترین منزل ملے کر کے پھر عجزِ نعم کا اقرار کرنے لگتے ہیں
کہ ۵

حقیقت ہی نہیں کھلتی ہے میری

عجباں عقدہ دشوار ہوں میں

ان اشعار سے خیالات کی وسعت اور نظر کی بلندی کا اندازہ ہو سکتا ہے
اس میں شک نہیں کہ مجروح کے کلیات کے مطالعہ سے اعلیٰ جذبات متحرک ہوتے
ہیں اور دل پر وجہ کی سی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ انصاف کیجیے کہ اشعار
ذیل کس پایہ کے ہیں۔ کیا اردو شاعری کے خزانہ میں آج تک ان سے قیمتی ہیرا
بھی ملے ہیں ۵

یہاں کی بھی ہے سیر کرنی ضرور سفینہ کو جانے دو گرداب میں

ذغبت میں کی بات تک خضر سے رہے غرق یہ یاد اجاب میں

نکر شور اسے ناڈ بے ادب یہ ہیں کس کی آنکھیں شکر خواب میں

خبر کیا سنی مرگ مجروح کی

اُداسی ہے کچھ بزمِ اجاب میں

ہے ہم شبیہ شکل - گردیدہ درکماں نرگس میں وہ نگاہ محبت اترکماں
کیوں میری بود و باش کی پیش ہو ہر گھر تم تو کہو کہ رہتے ہو دود پرکماں
جنت میں دل لگانے در خلد کچھ چپا لہجائے دیکھیے ہمیں ذوقِ نظر کماں

کی مترادف سمجھ لی گئی ہیں اور عام شعراء انھیں کے پیچھے رہتے ہیں وہ مجروح
کے کلام میں حتیٰ الوسع جگہ نہیں پاسکیں۔ انھوں نے عاشقانہ راز و نیاز کا نقشہ
جہاں کہیں دکھایا بھی ہے تو نہایت مسانت کے ساتھ۔ اس میں کلام نہیں کہ
عشق ایک فطرتی جذبہ ہے اور اس کے معاملات بھی نیچرل ہوتے ہیں، لیکن
ہمارے بعض شعراء نے اس امر خاص میں اعتدال کو مد نظر نہیں رکھا اور
اسی کا نتیجہ ہے کہ اکثر ناواقف اردو شاعری کو قفسِ کلامی کا دوسرا نام خیال
کرتے ہیں۔ مجروح نے فلسفہ محبت کے رموز پر جہاں قلم اٹھایا ہے وہاں زیادہ
بہت بلند جذبات کا اظہار کیا ہے جنھیں قیاسی خیالات سے صلتا تعلق نہیں
چنانچہ مندرجہ ذیل شعر کو دیکھیے - تسلیم و رضا کی تفسیر ہے ۵
ذمعی عشق وہ کامل ہے کہ لذت پائے -

جب ملکِ یزید زنجوں پہ نکلداں تیرا

اسی کے ساتھ ایک اور شعر نیا زمندی کا نوٹ ہے ۵

میں رضا مند ہوں تو دوزخ و جنت بھر دو

ایک ہے عدل ترادوسرا احساں تیرا

معلوم ہوتا ہے کہ انقلابِ عالم کے ذاتی تجربہ نے انھیں ہستی انسانی کا راز بتا
دیا تھا۔ اس مضمون پر ان کے دیوان میں بیشتر اشعار موجود ہیں اور تخیل کے
لحاظ سے انھیں فلسفہ زندگی کا پورا پورا کما جاسکتا ہے۔ اس قسم کے منتخب اشعار
ہم درج کرتے ہیں ناظرین خیال فرمائیں کہ ایک ہی مضمون پر انھوں نے
کیا کیا جولانیاں دکھائی ہیں ۵

اپنی ہستی ہے خواب کی صورت بُو د ہے یہ جاب کی صورت

اور ہی کچھ بگڑتی جاتی ہے اس جہانِ خراب کی صورت

ہے یہ جانِ نزار کی صورت جیسے اُجڑے دیار کی صورت

کاوشِ غم یہ ہے کہ پسلو میں دل کھٹکتا ہے خار کی صورت

یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ ۵

کیا بتاؤں نشان منزلِ دوست دیر و کعبہ تو اسکی راہ میں ہیں
مہر و قہر ان کا کچھ نہیں کھٹکتا ہم تو مدت سے ہتباہ میں ہیں
نجلت سے گناہوں کی یہ دنیا میں ہڈی عالم اک دوزخ جاوید میں ہناہوں پھنسائیں
غزل اول کا دوسرا شعر محویت کی ایک موثر تصویر ہے۔ اسی قسم کا ایک اور شعر
استغراق کے مضمون پر قابلِ دید ہے۔

کس کو معلوم جان کب نکلی محو تھے ہم تو یادِ جاناں میں
اُس کے نیچے کا شعر عام رنگ میں ہے لیکن مصرعہ ثانی کی استغنائیہ ترکیب قابلِ
داد ہے۔ دوسری غزل کا پہلا شعر کتبائے اور معنی خیز ہے۔ علیٰ ہذا منزلِ دوست
والا شعر جس میں معرفت کا گہرا رنگ دیا ہے۔ اب تک شعرا نے اس قسم کے
مضامین باندھے ہیں کہ یار کا مکان حرم ہے، دیر ہے، رگ گردن ہے وغیرہ لیکن
مخروج سب آگے نکل گئے ہیں اور کہتے ہیں منزلِ دوست کا پتہ کیا بتاؤں
کیونکہ دیر و حرم جنہیں آخری سرحد خیال کرتے ہیں اسکی راہ میں پڑتے ہیں اور
وہ اُن سے بھی آگے ہے۔ جزا کا لہ

آخری شعر کی معنوی خوبی کے ساتھ دوزخ جاوید کی ترکیب نہایت پسند
ہے۔ خیالات کی نیزگی اور تخیل کی گونا گونی ان کی غزلیات کو گلزار بنائے ہوئے
ہے۔ ہم اس جگہ مختصراً یہ دکھانے کی کوشش کریں گے کہ اُن کی طبیعت میں نہایت
پسندی کہاں تک تھی اور وہ معمولی باتوں کو بھی کس معنی خیز پیرایہ میں بیان
کرتے تھے۔ مندرجہ ذیل شعر میں ”شوق“ اور ”رُشک“ کی کیفیات بالکل فطری ہیں
شوق کہتا ہے اُسے دیکھ تو لو ہر غصہ

رُشک کہتا ہے مجھے کب یہ گوارا ہوگا
شوق کی ہنسی تعریفِ مصرعہ اولیٰ سے بہتر ممکن نہیں۔ محبوب کے ہمارے غیر دکھنا
عاشق کو کبھی گوارا نہیں ہو سکتا۔ لیکن شوق دیدار اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ وہ
اس حالت میں بھی نظارگی ہونے کا متقاضی ہے۔ بالکل نئی بات ہے۔

مجنوں آج تک دیوانہ تھا لیکن میر مخروج کی تخیل زانے کس خوش اہلوی
سے دیوانہ بکار خود ہشیار کی سند سے اُسے زمرہ عاقلین میں لاکر شریک کر دیا

ہے۔ کہتے ہیں ۵
دیوانہ بن کے مطلبِ اصلی کیا حصول مجنوں بھی عاقلوں میں بہت ذی شعور تھا
اسی زمین کے یہ دو شعر بہت اچھے ہیں ۵
کہتے ہیں دردِ عشق سے کیوں مر گئے نہ تم لو اور سنئے یہ بھی ہمارا قصور تھا
زاہد کا زہد دیکھ لیا۔ ہے مآل ایک میں ست بادہ اور دستِ غرور تھا
محبوب کے یوفا ہونے کے باوجود یہ کہہ کر کہ ۵

رُشک اعدا تو سلم ہے وے سچ یہ ہے جبہ اپنا نوا دوست تو کس کا ہوگا
اپنے دل کو اطمینان دلاتے ہیں کہ جب وہ ہم ایسے عاشق صادق کا نہ ہوا تو
دشمن کا کیا ہوگا۔ اس شعر میں تغافل کی شان کتنی نیچرل ہے ۵
وہ مجھ سے کہتے ہیں تو نام تو بتا اپنا تمام عمر کی محنت کا یہ مآل ہو ا
فلسفہ محبت کی سچیدگی کا اظہار ان الفاظ میں ہوتا ہے کہ ۵
ہر اک کو پیش آتا ہو نیاز رنگ کھلے کس طرح اسرارِ محبت
یہی خیال دوسرے پیرایہ میں یوں کہا ہے ۵

ہو اسلئے عشق کا حل نہ اُن سے ہوئے دم بخودیاں زمانے کے قابل
لیکن پہلا مضمون بہت سچا، موثر، اور نیچرل ہے۔
اس شعر میں رُشک کی کیفیت دکھائی ہے ۵

گوارے عام جلوں سے ہو بہرہ و جہاں پر ہکو فرطِ رُشک سے تاپِ نظر کہاں
غالب کا یہ شعر اس سے بہت ملتا ہوا ہے ۵
چھوڑا نہ رُشک نے کہ تے گھر کا نام لوں ہر اک سے پوچھا ہوں کہاؤں کہ ہر کوں
اور مخروج کا یہ شعر گویا بالکل غالب کا ہے ۵

نہیں لیتا ہوں فرطِ رُشک سے نام ہر اک سے پوچھا ہوں وہ کہاں ہے
لیکن ”رُشک“ کا مضمون نیچے کے شعر میں نہایت لطیف اور سچا ہے
کہتے ہیں ۵

لو رُشک بھی اب چھوڑ دیا مضطرب میں
ہر ایک سے کہتا ہوں کوئی یار کے گھر چلے

قوتِ تخیل کی بند پروازی گویا آسمان سے تلے توڑ لانے کے لیے ہر قوت تیار رہتی تھی۔ حق یہ ہو کہ اگرچہ کلامِ مجروح میں محاورات و معاملات کی نگینی نہیں دیکھی لیکن ذوقیات کی تلاوت اس درجہ موجود ہو کہ دل اُسکے منے میں پڑ کر کسی اور طرف نہیں بہکتا۔ زبان کے لحاظ سے مجروح کا دیوان اُردو لٹریچر کا بہترین کارنامہ ہے۔ بعض الفاظ ایسے ضرور موجود ہیں جو مجروح کے آخرِ عمر میں متروک ہو گئے تھے۔ مثلاً ۵

یہ کس سے ہو سکے ہے یز فیضِ مصطفیٰ جو مصیبت میں نہ کھائے خواب کا کل نشہیں تھا وہ بت مسجد میں گرا جاتا ایاں سے کہو یار و پھر کس سے رہا جاتا چمن تو پاس ہو پر کیونکہ جھانک کر دیکھو ہر ایک وقت تو رہتا ہے پاساں صیاد اصل یہ ہو کہ یہ الفاظ میر مجروح کے غالب حصہ زندگی میں رائج تھے۔ انکی زبان پر بھی چڑھے رہے ہونگے اور ضرطاری طور پر وہ استعمال کر گئے ہونگے یہ بھی ممکن ہے کہ اس قسم کے اشعار ان کے ابتدائی کلام کا جزو ہوں اور اُس وقت یہ الفاظ متروک نہ تھے۔ اس سے قطع نظر کر کے دیکھیے تو زبان کی شگلی و صفائی بے نظیر ہے۔ خیالات میں غالب کی افکار کا رنگ کافی طور پر پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن زبان کی وہ پیچیدگیاں جنہوں نے غالب کی شاعری کو بعض محالوں کو بے معنی ہونے کا یقین دلادیا تھا مجروح کے کلام میں ناپید ہیں۔ حتیٰ الوسع زبان نہایت سیدھی سادھی ہے میر کی زبان کا لطف آتا ہے۔ زبان فصیح، جملوں کی ترکیب بھی ہوئی، استعلا قریب الغم، تلمیحات مانوس، غرض جو صفات کسی شعر کو ذوقِ سلیم کے لیے پُر لطف بنا دیتے ہیں ان کے کلام میں بوجہ اس موجود ہیں۔ منجھے ہوئے طرزِ بیان کی بہترین مثال یہ اشعار ہیں ۵

صبر کیوں آج دل میں آیا ہے اُس سے کہہ دیکھیاں نصبت ہو
میرا مانسا جو اُس بُت نے ہنسکے بولا غرقِ رحمت ہو
خود بھی جا کر لوں تو کہتے ہیں
تم تو مجروح بے مروت ہو

تھارا شکوہ اور میری زبانی معاذ اللہ کہتے بدگساں ہو
ہمیں شکوہ ہی لک بیدا گر کا۔ اب اس میں آپ ہوں یا آسمان ہو
یہ اشعار کہتے برجستہ واقع ہوئے ہیں ۵
یہ جو بچکے سے آئے بیٹھے ہیں لاکھ فتنے اٹھائے بیٹھے ہیں
وہ نہیں ہیں تو درد کو اُنکے سینہ سے ہم لگائے بیٹھے ہیں
یہ بھی کچھ جی میں آگئی ہوگی کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں
لا ابالی خدام ہے تجروح وضع کیسی بنائے بیٹھے ہیں
کل تقدس مآب مسجد تھے آج رندوں میں آئے بیٹھے ہیں
مندرجہ بالا اشعار سے ناظرین خیال فرما سکتے ہیں کہ راسخ لکھامی کے
کے ساتھ اُنکا رنگ تغزل کس قدر دلچسپ ہے۔ مندرجہ تحت شعروں کو دیکھیے
اور بیباختگی کلام کا لطف اٹھائیے ۵
غیروں کو بھلا سمجھے اور محبو بُرا جانا سمجھے بھی تو کیا سمجھے جانا بھی تو کیا جانا
ماگوں تو سہی بوسہ پر کیا ہے علاج سکا یاں ہونٹھ کاہل جانا داں بات کا پا جانا
کچھ عرضِ تمنائیں شکوہ نہ ستم کا تھا میں نے تو کہا کیا تھا او تاپ نے کیا جانا
اک عمر کا دکھ پائے سوتے ہیں فراغت سے لے غلغلہ محشر ہم کو نہ جگا جانا
مجروح ہوئے مائل کس آفتِ دوراں پر
لے حضرت دل تنے بھی دل نہ لگا جانا
عشق و الفت کی چھپر چھاڑ، عاشق و معشوق کے راز دنیا ز، ہجر و وصل
کا تذکرہ بھی کیا ہے لیکن اس سیا نہ روی کے ساتھ جس کا مطالعہ وجدانِ صحیح
پر گراں نہیں ہو سکتا ۵

نہ تھے تم غیر کے گھر چ ہے لیکن یہ چرچے ہوئے ہیں جا بجا کیا
دل جو کھپتا ہے بد رکال پر ہے کسی کے شباب کی صورت
وہ جاتے ہیں دامن بچائے ہوئے تجھے جراتِ شوق کیا ہو گیا
ہیں اس تند خو سے یہ گستاخیاں
تم تو مجروح کیا ہو گیا

دل میں اک شے جو کھٹکتی ہی بہت تھکتی۔ وہ تیرے گرد و زکا پیکان تو نہیں
آخری شعر والی غزل میں زاہد کا انسان نہ ہونا کس مذہب طریقے سے ثابت
کیا ہے۔ کہتے ہیں ۵

ہمنے مانا کہ میں زاہد میں صفاتِ ملکی خوبیاں سب ہیں سلم مگر انسان تو نہیں
اسی کے ساتھ زمانہ کی ناقدری کی کیا صحیح تصویر دکھائی ہو ۵
ہم ہنر لیکے کہاں جائیں کسے دکھلائیں جنس اچھی ہی پراسکا کوئی خواہاں تو نہیں
مندرجہ ذیل نعتیہ شعر کا مضمون کس قدر نادر ہو۔ آج تک لوگ
”گرد پس کا رواں“ باندھتے تھے لیکن مجروح نے نہایت جدت سے اسکا
عدم ثابت کیا ہو ۵

رہتی ہو اشتیاقِ مدینہ میں ساتھ ساتھ اس قافلہ میں گرد پس کا رواں نہیں
اس میں اشتیاق کی من و عن حالت بتائی گئی ہو۔ اسی قبیل کا ایک شعر
کہیں اوپر آچکا ہو جس میں ”شوق دید“ کی انتہائی کیفیت کا نقشہ کھینچا گیا ہو
ان اشعار میں اپنے استاد کا رنگ قائم رکھنے کی کوشش کامیابی کے
ساتھ کی ہے ۵

محفل طراریاں وہ کہاں اب تو کام ہی گھر میں پڑے ہیں درو دیوار دکھینا
کیا شکایت کروں رقیبوں کی وہ ہی جب اپنا آشنا ہوا
یاس اس درجہ ہو گئی ہو کہ اب وصل بھی آرزو منزا ہوا
حیات اپنی ہے وابستہ نفس سے عطا ہے خاص ہو یہ دبدم کیا
ترحم طالبِ طاعت نہیں ہے مرا محتاج ہے اُس کا کرم کیا
مرزا غالب کی ہم طرح خولیں ان کے دیوان میں ہونا چاہیے تھیں مستعد ہیں
اُمتا و اور شاگرد کا مقابلہ کیا۔ اور پھر غالب ایسے مسلم الثبوت نغز گو شاعر کے
ساتھ۔ لیکن ہم یہاں انھیں غزلوں کے منتخب اشعار لکھتے ہیں۔ اربابِ فہم
اندازہ کریں کہ کیسے ہیں۔ غالب کی ایک مشہور غزل جو حسبِ ملاحظہ ہو ۵
کوئی دن گزر نہ لگانی اور ہے ہمنے اپنے جی میں ٹھانی اور ہے
اسی طرح میں مجروح کے کلام کا رنگ ملاحظہ ہو ۵

یہ جو اب لہجہ زبانی اور ہے کچھ مری الفت بڑھانی اور ہے
جانشیں ہیں اُسکے پیچیدہ ستم طرزِ جوہر آسمانی اور ہے
ہو گئے نابود۔ پر باقی ابھی اک نشانِ بے نشانی اور ہے
کیا مزاج اور واقف ہو گئے لذتِ درو نہانی اور ہے

یوں تو میں مجروح سب شاعر فصیح

تیر کی پر خوس بانی اور ہے

ایسے ہی یہ شمار غالب کی ایک ہر طرح زمین میں ہیں ۵

غم سے چھٹ جانے کی حکمت ہی سی جان دینا اُسے رشوت ہی سی
کچھ تو ہے تلخیِ غم کی تدبیر لب شیریں کی حکایت ہی سی
کوئی لیجائے مجھے قاتل تک غلبہ شوق شہادت ہی سی

ہاں شبِ غم تو سہر ہو مجروح

صبح کو روزِ قیامت ہی سی

ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں کہ فسادِ غدر میں دہلی کے اکثر شرفاء ترکِ دھن کر کے
جہاں تہاں چلے گئے تھے کچھ مدت کے بعد جب دہلی میں امن ہوا تو یہ لوگ بھی
رفتہ رفتہ واپس آ گئے۔ ان کے اجتماع کے بعد ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں
داغ، فخر، شفیقہ، نیر، انور (اور شاید خودِ غالب) وغیرہ
شریک تھے۔ مشاعرہ کیا تھا دہلی کی مرثیہ خوانی اور دردِ دل کی کہانی تھی
طرحِ دیگنی تھی زبانِ دہلی۔ مکانِ دہلی۔ دو چار شعر میر مجروح کے بھی سنئے
وہ کہاں جلوہ جاں بخش تباہِ دہلی کیونکہ جنت پہ کیا جاے گمانِ دہلی
انکڑے وجہ نہیں ٹوٹ کے ہونا برباد ڈھونڈے ہیں اپنے کینوں کو مکانِ دہلی
ہر زور۔ خاک کو کرتا ہو۔ یہ سچ ہے لیکن اس سے کچھ بڑھکے ہیں صفا نظر ان دہلی
وہ تم دیکھ چکے تھے کہ رہے آسودہ فتنہ و حشر میں آفتِ زوگانِ دہلی

کربت و غربت و تنہائی شہاے دراز

اور مجروح دل انگار۔ بیانِ دہلی

شاعر کے پختہ طبیعت ہونے کا ایک ثبوت سمجھا جاتا ہو اگر وہ مشہور و

جذبہ حسن کی کشش قابلِ ملاحظہ ہو کہ سیاد کو دیکھ کر صید خود دوڑا
چلا آتا ہے ۔

داغ کا یہ مطلع ۵

اللہ اندری پریشانی مری زلفِ جاناں بھی ہو دیوانی مری
ہر پہلو سے بہتہ بلین ہو لیکن مجروح نے بھی اپنی غزل کا مطلع اپنے
دل میں بے نظیر کہا ہے ۵

جس کا رو ہو ویرانی مری اُسے صورت تک نہ پہچانی مری
اسکے ساتھ یہ دو شعر بھی جانِ غزل ہیں ۵

ہر ہر ذرہ ہے ہر قطرہ محیط اللہ اندری فراوانی مری
دل میں نشتر کو نہ دیکھا ہو اگر دیکھ کا دشنام پہنچانی مری

ایک بہت مشہور اور پامال طرح ہے ۔ آہ میں ۔ نگاہ میں ۔ امیر داغ اور
دیگر مؤخرین نے اس پر خوب خوب طبع آزمائی کی ہے ۔ امیر کا ایک مطلع ہے ۵
ہوں زار اس قدر کہ تری جلوہ گاہ میں چھپ جاؤنگا بے پردہ گردِ نگاہ میں
لیکن مجروح نے اس سے کہیں زیادہ بلند خیالی سے کام لیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں
اُسے لائی آنکھ نہ گھر میں نہ راہ میں کیا کیا غل ہو اہوں عدو کی نگاہ میں
امیر کہتے ہیں ۵

کس کام کی ہو آنکھ تری جلوہ گاہ میں کیا امتیاجِ شمع تماشے ماہ میں
مجروح کا مطلع ہے ۔ ناظرین خیال کریں کہ یہ مضمون گلستانِ نخل کا کیسا
دل فریب پھول ہے ۵

جانا زبیں ضرور تھا اُس جلوہ گاہ میں ہم دیرو کبہ چھوڑ گئے دونوں اہ میں
میر ۵

اے خوشہ تو بہ کریں ہم شراب سے لغزش نہ تازباں کو ہو عذر گناہ میں
مجروح ۵

ہاتھ لٹوانے خود لب گویا عطا کیے

ورنہ زبان لالہ تھی عذر گناہ میں

متداول طرحوں پر جنہیں قاصر الکلام اساتذہ پامال کر چکے ہوں اپنے اسلوب
سخن کو قائم رکھے ۔ مجروح کی ایسی بہت سی غزلیں ہیں جنکے بالمقابل
مقدمین و معاصرین کا کلام موجود ہے ۔ اس امید کے ساتھ کہ مجروح کا
موازنہ کسی دوسرے شاعر کے ساتھ کرنے میں ہماری نیک نیتی پر حرف نہ لگے
ہم دکھانا چاہتے ہیں کہ ایک ہی شاخ پر بیٹھ کر دوسرے طائر ان چین کی نوا
سنجیوں میں وہ کس دھب سے شریک ہوتے ہیں ۔

زندگی کی ایک نہایت مشہور غزل ہے ۵

کھلی ہے گنجِ قفس میں مری باں میاں میں باجرے چین کیا کروں بیاں میاد
دکھایا گنجِ قفس بجو آب و دانے نے وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں میاد
اب دیکھیے مجروح اپنی کہانی کس ڈھب سے کہتے ہیں ۵

شجرہ برق کا کھٹکا زمیں پسِل کا ڈر ہم آشیانہ بنائیں بھلا کہاں میاد
نہ سو جھتی ہو رہائی نہ موت آتی ہے نہ مہربان ہو قسمت نہ مہرباں میاد
تمام عمر رہا قید اب رہا کیسا ہوں مجھے تو یاد نہیں اپنا آشیانہ میاد
کبھی نہ دانہ پہ گرتے نہ دام میں پھنستے کہیں میں اپنی نہ ہوتا اگر نہاں میاد
آخری شعر کس قدر بلین ہے ۔ غنی کا شمیری کا ایک شعر مناسب اپنے سائے دیوان
کے عوض میں لینا چاہتے تھے ۔ اس غیر انصاف پسند زمانہ میں آج کسی
شعر گو کو ایسی حوصلہ افزائی کی امید فضول ہے لیکن ہم کہیں گے کہ مجروح
کا دانہ و دام والا شعر اکثر شعراء کے ہزاروں اشعار پر بھاری ہے ۔ غنی کا
وہ شعر یہ ہے ۵

سبز خط بہ خط سبز مرا کرد اسیر

دام ہر گنگ میں بود گر فدا رشید

لیکن مجروح کا خیال بہت عمیق ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ دانہ کی ہوس یا دام
کی گرفت نے ہمیں نہیں پھنسا یا بلکہ خود میاد کین میں موجود تھا اور اُسے
دیکھ کر ہم خود جا گرفتار ہوئے ۔ بظاہر مضمون سادہ ہے لیکن جب غور کیجیے
کہ شکوہ میاد کو اگر دیکھ لیتا ہے تو دانے کی طرف بھی رخ نہیں کرتا لیکن یہاں

امیر مرحوم کی ایک دل سپند غزل ہے ۵
کرم کہ تیرے کرم کا امیدوار ہوں میں
گناہگار ہوں یا رب گناہگار ہوں میں

دیکھ لے رقیب سامنے آنا نہ تو میرے میں دستِ روزگار میں تیرے کشیدہ ہوں
اس خاکداں سے طبع کو ہوتا نہیں لگاؤ کس جوہر لطیف سے میں آفریدہ ہوں
تیرے تقی کی طرح مجروح کی غزلیات بحرِ خفیف اعلیٰ قادر الکلامی کا اہل
ثبوت ہیں جن میں مضامین آفرینی اور زبان کی شستگی و صفائی کے ساتھ
اسلوب بیان اتنا سلجھا ہوا ہو جسکی منزلت وجدانِ سلیم پر منحصر سمجھی جاسکتی ہے۔
ناظرین ملاحظہ فرمائیں ۵

اس میں کے چند اشعار یہ ہیں ۵
فسردگی ہے مری باعثِ خزانِ چمن شگفتگی میں تماشے نو بار ہوں میں
ہوا جو قصرِ فریدوں میں کل گزرا پنا صدایہ آئی کہ اُجڑا ہوا مزار ہوں میں
اتھی آئے کوئی حدِ باغِ جنت سے اُلجھ رہا ہوں کہ تنہا تہ مزار ہوں میں
اب ان کے مقابل مجروح کے ترانہ کی کے قابلِ شنید ہے ۵

رنگ کچھ اور اُنکولا نے ہیں میری بدخونی کے بہانے ہیں
رحم اے اضطرابِ رحم کہ آج اُن کو زخمِ جگر دکھانے ہیں
کیا ہماری نماز کیا روزہ بخشہ دینے کے سوا بہانے ہیں
بسکہ اک جنسِ ایسا ہوں میں جتنا ارزاں کیوں گراں ہوں میں
لطف پایا ہے خاکساری میں ہوں زمیں کو کہ آسماں ہوں میں
دل کی جھپٹیاں گئیں نہ کہیں اک کھٹک سی رہی کہیں نہ کہیں
اتنا مردود ہوں کہ ڈر ہے مجھے قبر سے پھینک دے زمیں نہ کہیں
میں تو سمجھا ہوں عشقِ غیر غلط اُنکو ہو جائے پر یقین نہ کہیں
اُسکا ملنا تو ہے بہت دشوار گم ہوں اس راہ میں میں نہ کہیں

سدا عروج پہ مانندِ حسنِ یار ہوں میں خزاں کو دخل نہیں بہار ہوں میں
مفید ہونے میں گو چند نچتہ کار ہوں میں مگر مزاج میں عالم کے ناگوار ہوں میں
شبِ فراق کی بے چینیاں معاذ اللہ کہ ایک آن میں مرتا ہزار بار ہوں میں
فروغِ بخشِ نظر ہوں نہ زیب کا شانہ فضا ہے دہریں شمعِ سوزِ مزار ہوں میں
نظر جو چھپکے بھی اُلی ہو چشمِ میگوں پر نگاہِ نازیہ کہتی ہو ہوشیار ہوں میں
ہے اُس سے دینِ خوباں کا یہی ایسا کہ لالہ ہو اگر تم تو لالہ کار ہوں میں
انصاف پسند غور فرمائیں کہ مجروح و امیر میں باعتبار تخیل و نزاکت

بزمِ کب ہیں چھوڑنے والے

ہونگے مجروح یا کہیں نہ کہیں

شعری کیا فرق ہے۔ اسی زمین میں امیر نے یہ شعر بہت اچھا کہا ہے ۵
ہزار مردوں میں زندہ رہا جو ایک تو کیا زمانہ مست ہو کیا خاک ہوشیار ہوں میں
لیکن دیکھیے اسی مضمون کو مجروح کس جدت سے ادا کرتے ہیں ۵

زمانہ اہلِ غفلت سے بے لبریز رہوں تنہا اگر ہوشیار ہوں میں
درد اور سودا کی مشہور غزلیں ہیں پییدہ ہوں۔ آبدیدہ ہوں۔ اس
طرح پر مجروح کی غزل کے یہ چند اشعار اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ ہر جگہ اپنا
خاص رنگ قائم رکھنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں ۵

محاورات کا چٹخار اکلامِ مجروح میں بہت کم ہے لیکن اسکی تلافی اور کئی
خوبیوں نے کر دی ہے۔ صحتِ زبان کے اعتبار سے وہ کسی اہلِ زبان سے
کم نہیں اور اچھے اچھوں سے بڑھے ہوئے ہیں اور اس اعتبار سے
اُنھوں نے خزانہٴ ادب اور دو کو نہایت بیش قیمت جواہرات سے پر کر دیا
یہ لعل و گوہر وہی ہیں جو کسی زمانہ میں مرزا غالب کی ”دولتِ تھی“ اور
پھر اُسے ”ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلہ کار ہنے والا لوٹ لیا“
مجروح کی زبان کے محاسن کا اندازہ جہاں اُن کے کلام سے ہو سکتا ہے
وہاں اس امر سے بھی کہ خود اُنکے ”استادِ رشک“ کرتے تھے۔ اُن کے

میں آہ ہوں تو خونِ جگر میں پییدہ ہوں میں زخم ہوں تو سودہٴ الماس پییدہ ہوں
طوفانِ جبل نے مرا جوہر مٹا دیا میں اک کتا خج ہوں پرتاب دیدہ ہوں
کیا کیا نہ بعدِ مرگ کے آسائشیں ملیں میں قبر میں مسافر منزل رسیدہ ہوں

کلام میں تاثیر ہو اور ممکن نہیں کہ کوئی سامع اُنکا پُرورد کلام سنکر اثر اندوز نہ ہو۔ کہتے ہیں کہ پڑھنے کا طرز بھی بہت موثر تھا کہ سننے والے مجھ جاتے تھے حضرت حالی مدظلہ العالی میر تجرّج کے اُستاد بھائی ہیں۔ اول الذکر فن سخن کی جس شاہراہ پر چلے ہیں اُسے مد نظر رکھ کر ان دونوں کا موازنہ چندلں موزوں نہ کیا جائیگا لیکن اس سے کچھ دل چسپی ضرور پیدا ہو سکتی ہو لوگ دیکھیں گے کہ ایک ہی اُستاد کے دو شاگرد، ایک ہی زمانہ دیکھے ہوئے ایک ہی قسم کی تعلیم پائے، اور ایک ہی چشمہ فیض سے سیراب ہوئے، جذبات و خیالات میں ایک دوسرے سے بے تعلق ہونے کے باوجود کبھی کبھی کس طرح ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ حالی کی ایک مشہور غزل جو جس میں دہلی کی اُس پاک اور مقدس سوسائٹی کی جسکے ساتھ دلی کی آن بان بھی رخصت ہو گئی تھی تصویر دکھائی گئی ہے۔ پہلا شعر اُسکا یہ ہے

بیعتی جی موت کے تم ٹھہیں نہ جانا ہرگز دوستوں نہ لگانا : لگانا مسرگز
اس میں عشق کو خطاب کر کے کہتے ہیں

کوچ سب کر گئے دلی سے تھے قد شہا قدریاں رہ کے اب اپنی نگہنا ہرگز
مجروح کی غزل اسی طرح پر ہو اور جو ہر شر باسین مولنا حالی نے اپنے
شعاریں لکھایا ہو اُنکی رنگ آمیزی مجروح کے قلم نے بھی کی ہو۔ اُن کے چند
اشعار ملاحظہ ہوں

حرف تم اپنی نزاکت پہ نہ لانا ہرگز ہاتھ بیداد ستم سے نہ اٹھانا ہرگز
تم بھی چوری کو یقین ہو نہ کوئے چھا اب ہمیں دیکھ کے آنکھیں چرانا ہرگز
ذکر بادی دہلی کا سنا کر ہدم نشتر زخم کمن پہ نہ لگانا ہرگز
میں ہوں اک مجمع احباب کا بچھڑا چھیں مجھو گلہ مستہ رنگیں نہ دکھانا ہرگز
دار فانی میں نہ کر فکر قیام لے ناواں گذریل ہے یاں گھر نہ بنانا ہرگز
جن کے ایوان تھے ہم پڑ قصر قصر اُن کی۔ مٹائیں قبروں کا ٹھکانا ہرگز

قصر حالی کے حوالی میں ذرا تم مجروح

اپنی ڈیڑھ اینٹ کی سجدہ نہ بنانا ہرگز

اس قسم کی بعض غزلیں دہلی کے اُن مشاعروں میں پڑھی گئی تھیں جن میں لوگ خاص اہتمام سے طبع آزمائیاں کرتے تھے۔ مولنا حالی کا ایک شعر ہے

داغ و تجروح کو سن لو کہ پھر ہر گلشن میں : نہ گے گا کوئی لبیل کا ترانا ہرگز
اس میں شک نہیں کہ یہی لوگ تھے جن سے آخر آخر میں دلی کی غفلت شان زندہ تھی۔ مجروح خود کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں

گرد دیتی ہے کارواں کا پتہ یادگار گدشتگاں ہوں میں
افسوس ہو کہ اب یہ یادگار بھی دنیا میں باقی نہیں۔ لیکن اگر مجروح زندہ نہیں تو اُن کے علمی کارنامے ایک طرف اُن کی ذاتی بقا کے فیصلے اور دوسری طرف اُن نامور اسلاف کا نام روشن رکھیں گے جنکے وہ سرمایہ ناز یادگار تھے۔

۱۵۔ اکتوبر ۱۹۰۲ء آخری دن تھا مجروح کی سبکدوشی کا حقیقت حال تو یہ ہو کہ وہ آخر حصہ عمر میں بالکل گوشہ گیر ہو چکے تھے، بنیائی جاتی رہی تھی اسلئے مشاعروں کی شرکت یا اسی قسم کے اور مشاغل سے وہ کنارہ کش تھے لیکن علی گڑھ کا تاریخی مشاعرہ غالباً بلکہ یقیناً سب آخری جلسہ تھا جس میں میر تجروح نے شرکت کی تھی اور اپنا کلام طرحی حاضرین کو سنا کر محو حیرت بنا دیا تھا۔ اُن کی یہ غزل

اغیار کے آنے کے دکھاؤ دکھاناں اور بس چپ ہو کھلاؤ نہ اب میری زباں او
یوں شوق کہنا بہت آسان ہو مجروح پر ہو روش غالب اعجاز بیاں اور
اُن کا آخری کلام ہونے کے سبب یادگاری چیز ہو۔ ارباب فن متلاشیان کمال اسے تبرک سمجھ کر آنکھوں سے لگائیں۔

۱۶۔ اُنکا سال وفات ۱۹۰۲ء دہلی کی کردہات سے کنارہ کئے درگاہ قدس شریف کے صحن فیضی آرام کی مٹی میں سوزے ہیں اور اپنے اس شعر کا مضمون زبان حال سے ادا کر رہے ہیں

کیا کیا نہ بعد مرگ کے آسائشیں میں میں قبر میں مسافر منزل رسید ہوں
سید محمد فاروقی

..... قوتِ خیال

انسانی غصہ میں دو بڑے قیمتی جوہر رکھے گئے ہیں عقل اور خیال۔ عقل مفہیم کلیہ کا خزانہ اور خیال جزئیات کا خزانہ ہے۔ ان دونوں ظرفوں میں مضبوط آتے جاتے رہتے ہیں لیکن بہت کم انسان ہیں جو مفہیم کلیہ اور جزئیات ذہنیہ کی ایک دوسرے سے شناخت کر سکیں۔ مثلاً ہمارے ذہن میں جب انسانیت کلی کا خیال آئیگا تو فوراً معلوم ہو جائیگا کہ یہ وہی انسانیت ہے جو تمام افراد انسانی میں پائی جاتی ہے۔ یہ وہی ماہیت کلیہ ہے جس سے تمام افراد انسانی متصف ہیں پس مفہوم کا جملہ افراد پر صادق آنا مفہوم کلیہ ہے اور ہر فرد کی نسبت جُدا جُدا خیال ہونا مفہوم ذہنی ہے۔ مثلاً زید کا تصور عقل میں نہیں ہے بلکہ خیال میں ہے۔ یہی اور کلکتہ وغیرہ کے تصور کا خزانہ عقل نہیں بلکہ خیال ہے جو جب ہم غرض کرتے ہیں تو یہ فرق فی الفور محسوس ہو جاتا ہے۔ یعنی مجرد انتقال اور صدور کے معلوم ہو جاتا ہے کہ فلان شے کا تصور عقل میں ہے اور فلان کا خیال میں۔ خیال میں قدرت نے بڑے بڑے اثر رکھے ہیں اور اسکو بولعجب حکمتوں سے مرکب کیا ہے۔ تمام کاروبار اور تمام سلطنتوں کا انتظام محض خیال ہی پر موقوف ہے خیال میں ایک قوتِ مقناطیسی بھی موجود ہے جو ایک انسان سے دوسرے انسان پر سرایت کرتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کی جاننے سے تمہارے دل میں رنج اور کدورت ہے تو فوراً اُس کے دل میں بھی کدورت پیدا ہو جائیگی اور جس طرح تم اُس سے کھنچو گے وہ بھی تم سے کھنچے گا۔ ”دل سے دل کو راہ ہونے کے یہی معنی ہیں ایسے ہی ہر شخص کو اپنے دوست یا دشمن کی غائبانہ حالت بھی اسی خیال کے ذریعے سے معلوم ہو جاتی ہے۔ مثلاً کوئی حرمان نصیب عاشق فراق یا رین تمام رات بسترِ غم پر لوٹے اور یا جفا کار کسی رقیب کے پہلو میں رہے مگر صبح ہوتے ہی جب ان دونوں کی آنکھیں چار ہو گئیں تو شب کا پردہ کھل

جائیگا اور عاشق شرم آلود نگاہوں کو دیکھ کر صحت کہ دے گا۔
بھکو کھڑی کھڑی کی خبرات بھری
تم تھے جہان وہیں مرا یک خیال تھا ندرت
جن لوگوں نے کچھ حاصل کیا ہر صفت تصنیف خیال اور انجاد حق
خیال سے خیال ہمیشہ منتشر رہتا ہے اور اسکو انسانی تعلقات زیادہ منتشر رکھتے ہیں جب کسی شخص پر مصائب نازل ہوتے ہیں اور افکار کا ہجوم ہوتا ہے تو قوتِ خیال بھی تنگ جاتی ہے کیونکہ اُسکو کسی ایک کام پر چبھنے کا موقع نہیں ملتا۔ بہت سے خیالات کا تراکم اور تراجم ہو کر ایک خیال بھی اپنے ظرف میں جکڑ نہیں رہ سکتا۔ رُوح جو مدبر بدن ہے خیالات کی اصلاح چاہتی ہے مگر بہت سے خیالات کا جھنڈا تو درکنار ایک خیال بھی پناہ قدم نہیں جاسکتا پس ناقص اور فاسد خیالات کو دل سے نکالنا انسان کا پناہ منہض ہے۔

کسی کی نسبت تمہارا عمدہ خیال ہو گا یا جس کو تم عمدہ بہتر اور پیارا سمجھو گے وہ بھی تم کو ایسا ہی سمجھے گا اور اُسکو تمہارے ایسے خیال کی کسی ذریعے سے ضرور اطلاع ہو جائے گی جب کوئی ”چھکی“ لیتا ہے تو عوام یہ خیال کرتے ہیں کہ ہکو کوئی یاد کر رہا ہے اور جب عورت کوئی ”باہین“ آکھ پھڑکتی ہے تو وہ یہ خیال کرتی ہیں کہ اُن کا کوئی پیارا اُن سے ملے گا۔ یہ کیا بات ہے وہی تو خیال ہے جس کی کشش کا اثر دل سے گزر کر انسانوں کے جسم تک پہنچتا ہے۔ تصوف کے تمام لٹکے سمر زیم وغیرہ کے شعبہ سے اسی قوتِ خیال سے وابستہ ہیں۔

حیوانات میں اگر عقل نہیں لیکن قوتِ خیال ضرور ہے جس کو وہ ہمہ کو یا آخڑہ مشہور ہے کہ ہرستانی ملک کے طیور جب موسم سرما میں کابلِ خیر سے آتے ہیں تو دہان انڈے دیکر چھوڑتے ہیں اور گو وہ ہندوستان کی چھیل

کا پورا نقشہ اتر سکے۔ مگر ان جتنی انسانی تاریخیں موجود ہیں ایک محل طور پر انسانی خیال کے نقش کو لوح خاطر پر رسم کرتی ہیں۔ فرہاد و شیرین کا قصہ، لیلیٰ و مجنون کا افسانہ، نل و من کی داستان، وامق و عذرا کی کہانی تئیرات خیال کا نمونہ ہیں۔

یہ دل کیا تھا ایک خیال تھا خیال ہی نے تیشہ فرہاد میں روانی اور بارہ میں طاقت پیدا کی ورنہ کون اُمید کے بھروسے پر اتنی مدت تک سنگ ترشی کرتا۔ اگر مجنون کا خیال کسی قدرتی خوبی سے نہ لپٹا ہوا ہوتا تو عرب کے دشوار گزار میدان اور پر خار گھل ایک جلیل القدر شہزادہ پایادہ طے نہ کرتا اور لیلیٰ کے تصور میں اپنی عمر عزیز کو فضول نہ کھوتا۔ آہ کیا خیال تھا کہ ایک معشوق مجازی کے پرے میں شاہد حقیقی کی تلاش تھی۔ معشوق ظاہری کا نہ ملنا ہی دلالت کرتا ہے کہ اسکو شاہد باطنی کا جلوہ نظر آ گیا تھا اور وہ ایک ٹیٹی کی آڑ میں شکار کھیلتا تھا۔ وہ یہ خیال بھی کیا رفیق طریق ہو کہ کبھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ زوال میں سایہ بھی ساتھ نہیں دیتا۔ مگر خیال اُس وقت بھی برابر کشور دل میں اور نگہ نشین ہو کر جلوہ ریزی کرتا ہے۔ ایک شاعر نے اپنے خیال کو کس خوبی سے باندھا ہے۔

میرا خیال بعد مرے پرفشان ہے

افسوس ہو کہ میں نہ رہن ارجلن رہا

ریل سے تار سے نگاہ سے جلد پہنچنے والا یہی خیال ہو۔ تاریقی تو دو گھنٹہ میں لندن تک پہنچتی ہو مگر ہم اپنے خیال کو آٹا فائنا میں عالم بالائیک پہنچا سکتے ہیں۔

علماء جہلاء کے خیال میں صرف صحت و غیر صحت کا فرق ہوتا ہے ورنہ ماہیت نے میں کچھ اختلاف نہیں۔ علماء ایک صحیح خیال اُس شے کا کر سکتے ہیں جس کو وہ سوچتے ہیں برعکس اسکے جہلاء غلطی کرتے ہیں محسوسات میں تو شاید جالون کا خیال بھی چند ان غلط نہیں ہوتا مگر تصورات میں اکثر غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اس واسطے ناقص خیال کے درست کرنے کا آلہ تعلیم

اور تالابون میں ایک عرصے تک رہتے ہیں لیکن محض خیال کی سرگرمی سے ان کو سیتے ہیں اور ہندوستان سے واپس جانے پر بچے پاتے ہیں۔ گویہ بات ایک عام قصے کے طور پر مشہور ہے۔ لیکن جب ہم خیال کی معنطیسیت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہر چند ان تعجب معلوم نہیں ہوتا۔

خیال بھی بے شک عمدہ چیز ہے لیکن تصفیہ خیال بڑی چیز ہے۔ اسکی مثال ایسی ہو کہ جس طرح خالص سونا ناقص دھات ملنے سے معشوش ہو اور پھر کوئی شخص کسائی قوت سے تجربہ کر کے سونے کو علیحدہ کر دے۔ اسی طرح تصفیہ خیال سے ناقص خیالات جُھا ہو کر انسان کا دل سچے اور پاک خیالات کا مسکن بن جاتا ہے۔ جب انسان اپنے دل کو تصفیہ کی صیقل سے صاف کرتا ہے تو دل آئینہ کی طرح روشن ہو جاتا ہے اور اسکو عجائبات قدرت معلوم ہونے لگتے ہیں اُمور قدرت میں جو تہذیب و تفکر کی ہدایت کی گئی ہو تو اسکے ہی معنی ہیں کہ دل کو ناقص خیالات سے صاف کر دو تو جلوہ حقیقت ملے گا نظر آئے گا آئینہ رنگ اور کدورت سے صاف ہو تو اصل جو ہر آشکارا ہو جائے۔ اب رہا یہ امر کہ تصفیہ خیال کیونکر ہوا اور اسکے لئے کونسا بہتر ذریعہ اور آگاہ ہو تو میں عجب دو گنگا کہ اُس سچے معبود سے لو لگنا چاہیے جس کے وجود کی کم و بیش تمام مذاہب ہدایت کرتے ہیں گو بسا اوقات جھوٹ میں سچ اور کھوٹے میں کھرا ملا ہوا ہوتا ہے۔ یہ امر ہر شخص کے کاغذ نفس پر منحصر ہے کہ جس طریقے کو وہ بہتر سمجھتا ہو اسکے ذریعے سے منزل مقصود پہنچنا چاہتا ہو خواہ اُس کا خیال کیسا ہی ہو۔

ہر شے کے واسطے حدود اور انتہا ہے مگر خیال کا میدان اسقدر وسیع ہے کہ اسکے لئے فی حد ذاتہ کوئی انتہا قائم نہیں کی جاسکتی۔ ابھی یہ خیال سمندر میں پیرتا ہے ابھی یہ خیال آسمان میں تھکلی لگتا ہے۔ ابھی یہ خیال اپنے گھر کی چار دیواری میں محدود ہو جاتا ہے مگر معلوم ہونا محال ہو ایسے ہی انسان کیلئے ظاہر و باطن میں خیال کا اندازہ و تخمینہ محال ہے۔

انسانی خیال کی تاریخ بھی کوئی ایسی نہیں جس سے اسکے مختلف پہلو

قرار دیا گیا ہے

مویہ خیال شاید منطق سے زیادہ کوئی شے نہیں صغریٰ کبریٰ اور متحجہ خیال ہی کی سطح ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کا خیال صحیح اور درست ہو۔ یہ حکماء و متقدمین کا خیال ہی تھا جس نے زمین کو متحرک ثابت کر دیا اور نہ جمیع نظام کے باشندے ساکت خیال کرتے تھے اور کر رہے ہیں۔ یہ خیال کتنا وسیع ہے کہ طبیعت میں نئی شکل سے پیدا ہوتا ہو اور ایک دوسرے کا خیال لگانا نہیں کھاتا۔ جب قومی خیال ایک سمت میں یکساں ہو جاتا ہو اس وقت اس قوم کی ترقی شروع ہونے لگتی ہو۔ قومی خیال کی شراب ایسی طربنگ ہو کہ سر پر قوم اسکو وہسکی اور شا پکین سے جو محض حیوان بنائیکے آلات ہیں کہیں بہتر

سمجھتے ہیں اور اسکی ملامت کو دل و جان سے پسند کرتے ہیں۔ اگر یہ قومی خیال تنہا تو نیولین کی فوج نظر منوج کبھی مصر و فرانس پر قابض نہ ہوتی۔ قومی خیال کے ولدا بڑے مبارک لوگ ہیں۔ پچھلے ازمین لوگ ان کو ولی کہتے تھے اور اس زمانہ میں قومی سرپرست اور لیڈر بولتے ہیں۔ جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ قوتِ خیال فی حد ذاتہ ہر حال میں اپنا اثر دکھاتی ہے اور اسکی کوئی حد اور انتہا نہیں تو ہم اتنا ضرور کہیں گے کہ اسکی توسیع میں علمی مذاق کو ضرور شامل کرنا چاہیے کیونکہ بغیر علمی تائید کے یہ قوتِ خیال کچھ بھی نہیں۔

نُدرت میرٹھی

کلام حمید

میں دلسے رو رو کے پوچھتا ہوں کہ ایسے عاشق کہاں رہینگے
جو دوسروں کے لیے مرے ہیں وہ زندہ جاوہاں رہینگے
اُٹھے جو پردہ مغائرت کا تو سب پہ وہ مہرباں رہینگے
تو برہمن اور شیخ کب تک تپ ستم سے تپاں رہینگے
مرید کیسے وہ پیر بن کر فداے پیرناں رہینگے
مٹی ہے پیری بھی اس طرح کی کہ عمر بھر وہ جاں رہینگے
ہمیں تو اُن کی وفا کے چرچے مدام دروڑیاں رہینگے
کہ ان کی تیغ ادا کے سبل اُسی طرح نیجاں رہینگے

جناب زاہد یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم فداے جاناں رہینگے
کمالِ اُلفت کا مقتضا ہے کہ خود کو انسان بھول جائے
نہیں ہے کوئی کسی کا دشمن ہم اپنے خود ہی عدوے جاں ہیں
سنا ہو دیو و حرم کی راہیں رہہ داسے مٹی ہوئی ہیں
جنہوں نے نی ہوئے معارف وہ راز ہستی سمجھ گئے ہیں
بھریں نہ پیر مغاں کا دم کیوں کہ لطف اُن کے میکشوں کو
لگے ہیں تیر ستم ہزاروں مگر یہ دل ہے اُسی ہوا میں
نہوگا اسے چارہ اگر کسی سے علاج در جب گہرا

حمید یاروں کی تلخ باتیں سنوں تو ہر گز بُرا نہ مانوں
کھلے گی اُن حقیقت آخر وہ کب تلک بدگماں رہیں گے

حمید کوٹلوی

..... تنقید کتب

خیالات عزیز | فارسی کی یہ مثل بھی کس قدر صحیح اور پُر معنی ہے۔
 نوشتہ باند سیہ بر سفید نویسنده رانیت فدائید
 انسانی زندگی ایک فنا ہونے والی چیز ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ جیسا
 مستعار کی جلتی گاڑی کب رُک جائیگی۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم کا وہ
 وفات اسی قبیل کا تھا۔ ملک آپ کی خبر انتقال سننے کیلئے بالکل تیار
 تھا لیکن آئی ہوئی ساعت ٹلتی نہیں اور یہی ہوا کہ غیر متوقع طور پر
 ہندوستان کے علمی، ادبی حلقوں کو آپ کا ماتم منانا پڑا۔ مولوی صاحب
 منصور ہندوستان کے بہترین ادیب و انشا پرداز تھے اور آپ کی
 ذات سے صد ہائے تائیں اور آرزوئین وابستہ تھیں اور اس میں شبہ
 نہیں کہ آپ کے اچانک ارتحال نے اُن تمام متناون اور آرزوؤں پر
 پانی پھیر دیا۔ سب سے زیادہ افسوس اس کا ہے کہ فرائض منصبی کی مصیبت
 نے مرحوم کو کافی موقع ہی نہیں دیا کہ وہ اپنے علمی کارناموں کی فہرست
 وسیع کر سکتے۔ دو ایک کتابیں از قلم ”گلگشت فرنگ“ اور ”سیرۃ محمود“
 لاکلام آپ کی خداداد قابلیت و تحقیق پسندی کا مکمل نمونہ ہیں۔ لیکن
 و حقیقت یہ کتابیں نمونہ تھیں۔ آگے چل کر آپ کے طبی جوہر اور فطرتی
 کمال کی جو جیتی جاگتی تصویریں بزم ادب کی زیبائش کا سامان مہیا
 کرنے والی تھیں اُن کے محاسن کا اس وقت اندازہ کرنا بھی محال ہے۔
 افسوس موت نے مرحوم کو ملت نہ دی اور اب ہمارے لئے سوائے
 اسکے چارہ کیا ہے کہ آپ کی موجودہ الوقت تصانیف و تراجم وغیرہ کو
 غنیمت سمجھ کر اُردو زبان کے ایک گرانقدر محسن کی یادگار کے طور پر
 انھیں سر آنکھوں پر لین مینی دیا زائن صاحب نغم کا خدا بھلا کرے
 کہ آپ نے مرحوم کے اکثر علمی ادبی و تاریخی و ملکی مضامین کو ترتیب کر کتاب
 کی صورت میں چھپوا دیا ہے۔ مولوی عزیز مرزا مرحوم اُردو ادب کے

زبردست حامی اور اسی لحاظ سے زمانہ کے غلصہ سرپرست تھے اور
 ایڈیٹر زمانہ نے ان مضامین کو شائع کر کے اُس خلوص و انیسیت کا ثبوت
 دیا جو جس کا ان دنوں قحط پڑ ہوا ہے۔ خدا کرے اُنکی یہ کوشش مشکور ہو۔
 خیالات عزیز کے محاسن باطنی کے متعلق کچھ زیادہ لکھنا تحصیل حاصل
 ہے۔ مرحوم کے قلم سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ عزت و احترام کا مستحق ہے۔
 زبان دانی، انشا پردازی، مکث شناسی، تحقیق پسندی، طرز بیان، ہر اعتبار سے
 خیالات عزیز کی ایک ایک سطر بمثل ہے مولوی عزیز مرزا مرحوم کے مضامین
 کی ایک ماہر الاقتیار خصوصیت آپ کا انداز تحریر ہے جس میں سلامت
 کے ساتھ متانت کی عجیب و غریب شان نظر آتی ہے۔ اس مجموعہ کا ہر ایک
 مضمون اس خوبی کا مشترک دعویٰ دار ہے۔ شروع میں نواب قار الملک
 بہادر کا لکھا ہوا ایک دیباچہ ہے جس کے مطالعہ سے مصنف ”خیالات عزیز“
 کے دلچسپ حالات زندگی کے پہلو پہلو کی علمی مصروفیت اور ادبی ذوق
 شوق کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مصنف کی ہاٹ ٹون تصویر بھی شامل ہے جس نے
 کتاب کی ظاہری دلچسپی و غنیمت اور اضافہ کر دیا ہے۔ لکھائی، چھپائی، کاغذ
 سب چیزیں اچھی ہیں اور عمر میں یہ گرانقدر ضرس بالکل ارزان ہے۔ منیجر
 صاحب زمانہ کا پیوستہ طلب کرنا چاہیے۔

الدلیل علی المولد والخیل | ہندی مثل ہے کہ خربزہ کو دیکھ کر خربزہ
 رنگ پکڑتا ہے۔ اسکی تطبیق زبانوں پر بھی ہو سکتی ہے کہ جب دو مختلف زبانوں
 کا میل جول ہو تو ایک کا دوسرے سے متاثر ہونا لازمی امر ہے
 اُردو زبان نے سنسکرت، عربی اور فارسی کے ہاتھوں تربیت پائی ہے۔
 لیکن اس وقت اگر اُردو کا کوئی جامع لغت تیار کیا جائے تو انگریزی الفاظ
 ہزاروں کی تعداد میں مبین گے، اور نہ صرف انگریزی بلکہ پرتگالی، اور فرینچ
 زبانوں کے الفاظ بھی۔ یہی عالم اس وقت عربی زبان کا بھی ہے کہ اس میں

سے زیادہ رد و کد سے کام نہیں لیا اور ”لکھنؤ“ اور ”دلی“ سے فتوے شنگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ اپنی سمجھ سے اصل اصطلاح میں کچھ تغیر و تبدل کر کے اُسے اپنے مطلب کا بنا لیا اور اُس کا استعمال شروع کر دیا اور رفتہ رفتہ اُس کا رواج تمام ملک میں ہو گیا۔ اس بارے میں سب سے زیادہ کام اخبارات اور موقت بیسٹور رسائل نے کیا ہے اور اخبارات بھی اسی قبیل سے اپنی زبان کی بیش قیمت خدمت کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لیے دو مندی اور ضرورت شناسی درکار ہے۔

ہمیں اُمید کرنا چاہیے کہ اردو اصطلاحات کا مجموعہ اگر کبھی مکمل ہوگا تو اُسکی ترتیب میں مولنا سید سلیمان کی اس مفید تالیف سے بہت مدد مل سکے گی جو بقیہ عہد معین اندوہ لکھنؤ کے پتے دستیاب ہو سکتی ہے۔ توزک قیصری اینڈ تہ برج موہن دتاریہ کیفی دہلوی اس اعتبار سے مستغنی عن التعریف ہیں کہ پنڈت جی کی اکثر قابل قدر نظائیں ملک کے علمی رسائل میں شائع ہو کر مقبولیت عامہ کا خلعت پہنچیں ہیں۔ سید کیفی جو مشہور ”مسدس حالی“ کے طرز پر لکھا گیا تھا اس بات کا شاہد ہے کہ حضرت کیفی کو تاریخی واقعات کے قلمبند کرنے میں کمال حاصل ہے اور اس کا تازہ ثبوت ”توزک قیصری“ سے بھی ملتا ہے۔

”توزک قیصری“ دہلی دربار السنۃ کی یادگار میں لکھی گئی ہے جو تاریخی نظم کا درجہ رکھتی ہے اور حسین ہند کے قدیم تاریخی واقعات سے لیکر دور جدید کے حالات تک نظم ہوئے ہیں۔ حضرت کیفی ایک شائق سخن گو ہیں لیکن ”توزک قیصری“ کے صفحات زبان دانی کی اکثر معمولی اسقام سے مملو نظر آتے ہیں۔ خواہ اسکی وجہ یہ ہو کہ آپ ان کی پروانہ کرتے ہوں یا اس قسم کا سقم آپ کے نزدیک سقم نہ ہو۔ مثال کے طور پر اس جگہ چند فروگزاشتوں پر صنف کو توجہ دلائی ضرورت معلوم ہوتی ہے۔

تخت ہلی پر تھا تنگن پتھر اراں دنون
جبکی تدوین فارس اور خلفاء عباسی کی

اکثر الفاظ غیر زبانوں کے کچھ سطح آکر شامل ہو گئے ہیں کہ اصل مستعار میں کوئی تین فرق نظر نہیں آتا یہی سبب ہے کہ ہندوستان میں اکثر عربی خوان اصحاب، مصر کے عربی اخبارات پڑھ کر تفہیم مطالب میں قاصر پائے جاتے ہیں۔ مولنا سید سلیمان عربک پروفیسر دارالعلوم ندوۃ اسی قسم کے تقریباً چار ہزار الفاظ کو مندرجہ بالا نام سے ایک جگہ جمع کیا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ مولنا کی یہ کوشش خاص طور پر قابل تعریف ہے۔ اسکی مدد سے عربی اخبارات و رسائل اور جدید تصنیفات کا مطالعہ ازس آسان ہو سکتا ہے۔

شروع میں مولنا سید سلیمان نے زبانوں کے اصناف و اقسام پر نہایت قابلیت بحث کی ہے اور یہ دکھایا ہے کہ عربی زبان میں ضروریات تمدن کے سبب سے جدید اصطلاحات و محاورات کیوں اور کس طرح خال ہو گئے ہیں۔ اپنے تمام الفاظ اصطلاحات جدیدہ کو دو قسموں تقسیم کیا ہے۔ یعنی مودہ اور وحیل (یا معرب) پھر ہر ایک کی جدا گانہ اصناف کو مثال و نظائر کے ذریعہ سے واضح کر دیا ہے اور آخر میں اپنی کتاب کا موضوع حسب ذیل الفاظ میں قلمبند فرمایا ہے۔

اس کتاب میں صرف وہ وحیل اور مودہ الفاظ لئے گئے ہیں جو اب تک مستعمل ہیں اور کتب لغات قدیم میں وہ مدون نہیں ہوئے۔ جو الفاظ اب متروک ہیں یا لغات میں ملتے ہیں انکی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

”الدلیل علی المولد والذیل“ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لسانی ضروریات کی تکمیل، بشرطیکہ اُس کے لیے حقیقی طور پر کوشش کی جائے کہ قدر سہولت سے ہو سکتی ہے۔ اردو میں اصطلاحات جدیدہ کی تدوین کا خواب برسوں سے دکھایا جا رہا ہے لیکن اُس کا نتیجہ معلوم۔ عربی میں دیکھئے تقریباً ہر جدید اصطلاح کے لیے کوئی نہ کوئی لفظ ایسا موجود ہے جس سے بہتر ہو نہیں سکتا۔ عربی زبان دانوں کی وسیع النظری کا اس سے زیادہ کیا ثبوت ہوگا کہ انھوں نے اپنی ادبی ضرورتوں کے رفع کرنے کے خیال

فہم عالمگیر میں لیکن زمین آیا یہ راز
 "شکل کی نت اور خلفائے کلام ساکن نہیں بلکہ متحرک بہ فتح ہوا
 چاہیے اور قیصر مصرع میں "نہیں" کی جگہ نہ تقدیم و تاخیر کا عیب کثر
 اشعار میں موجود ہے۔ بعض بخار سے خالص پنجابی ہیں اور گو ان کا
 استعمال اخباری تحریرات میں پایا جاتا ہے تاہم زبان دانان اُردو نے
 انھیں اب تک صحیح نہیں تسلیم کیا مثلاً

جن میں تازہ جوش تھا اسلام نے پھونکا ہوا

ان ان اسقام سے قطع نظر تو زک قیصری میں بہت سی خوبیاں
 بھی ہیں۔ تاریخی واقعات کے نظم کرنے میں غیر معمولی قوت فکر سے کام لیا
 پڑتا ہے۔ اور اس کا خاص رکھنے کے بعد حضرت کبھی کو انکی کامیابی پر کباد
 دینا پڑتی ہے۔ بعض مقامات خصوصیت قابل تعریف ہیں کہ میں کہیں
 سلاست بیانی کے ساتھ تخیلات کی تازگی نے عجب پر لطف کیفیت
 پیدا کر دی ہے۔ مثلاً انگریزی راج کی مدح سرائی کرتے ہوئے یہ اشعار
 کہنے اچھے کہ گئے ہیں ۵

دور اکبر اور تھا قیصر کا دوران اور ہر ضابطہ کچھ اور ہر شخصی فرمان اور ہر
 پہلے شاہی حکم تھا حکم خدا کا ہر دین ملک میں اب حکم شاہنشہ کا ہر ان اور ہر
 حکم حاکم اب نہیں مرگ مفاجات سجگہ اب یہاں تنقید جمہوری کا لہجہ اور ہر
 ہر عیا صدق سے بادشہ کی جان تبار

جاننا ہے شاہ اسکا آپ کو خدمت گزار

تو زک قیصری کی کا بیان جو معمولی طور پر جلد بھی ہیں، قیمت پر
 حضرت مصنف کے جاندھر شہر کے پتہ پر درخواست کر نیسے مل سکتی ہیں۔
 کلام قیصر علی حضرت حضور ملک معظم اور برٹش تاج سے اہل ہند کو
 جو دلی ارادت و عقیدت ہے اسکا یہ قدرتی اور لازمی نتیجہ سمجھنا چاہیے
 کہ ذات شاہ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز ان کے خیال میں غیر معمولی
 عزت و احترام کی مستحق ہے۔ گزشتہ دربار دہلی کے موقع پر حضور موصوف کا

محض رعایائے ہند کے خاطر بحری سفر کی صعوبات برداشت کے،
 ہندوستان تشریف لانا، انگریزی تاریخ ہند میں اپنے قسم کا پہلا واقعہ تھا۔
 اہل ہند نے بھی جس خلوص و عقیدت کے ساتھ اپنے بادشاہ جم جاہ کو
 خیر مقدم کہا وہ بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے عظیم النظر چیز تھی۔ لندن
 ہندوستان کا دروازہ تسلیم کیا جاتا ہے اور جو جس وفاداری و ارادت
 کے اظہار کی شروعات بھی وہیں سے ہوئی۔ یعنی حضور ملک معظم کی خدمت
 میں وہاں کے لوگوں نے ایڈریس پیش کرنے کا سب سے پہلے فیوض حاصل کیا۔
 ہندوستان میں خاص قدام رنجہ فرمانے کے بعد حضور لامع النور کو مختلف شہروں
 میں مختلف طبقوں اور طبقوں کی جانب سے ایڈریس منظور کرنے اور
 ان کا جواب ارشاد فرمانے کی ضرورت پڑی۔ کچھ شک نہیں کہ لفظوں
 "کلام الملوک، ملوک الکلام" علی حضرت حضور ملک معظم کی تاج جامع اور
 مانع تقاریر جن میں سے اکثر اہل ہند کے ملکی و معاشرتی حقوق کی
 توثیق کا ذریعہ اور سند ہیں، خاص اہمیت و وقعت رکھتی ہیں۔ مسٹر
 ایم۔ ایل۔ رلیا رام بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی، اور منشی غلام قادر فرخ
 ایڈیٹر انسان امرتسر تعریف و توصیف کا استحقاق رکھتے ہیں کہ آپ
 دونوں صاحبوں نے اپنی مشترکہ مساعی جمیلہ سے ان تمام تقریریں
 اور جوابوں کو کتاب کی شکل میں مدون کر کے انھیں مستقل بالذات
 بنا دیا ہے۔ قابل ملاحظہ ہے اپنی مختصر لیکن کارآمد و دلچسپ تالیف
 کو مزید دلفریب و مفید بنانے کی غرض سے، اس میں کئی ایک جگہ اچھی
 نظمیں اور دو ایک نثر مضامین بھی اضافہ کر دیے ہیں، مثلاً ملک معظم
 و ملکہ معظمہ کی مختصر سوانح عمری، یا نادر کا کوروی، اور حضرت اقبال
 کی درباری نظمیں اور اشعار کا شرح ترجمہ میں سلاست اور روانی کا
 زیادہ خیال رکھا جاتا ہے کیونکہ بحالت موجودہ اس میں یہ صفات مفقود
 ہیں۔ لفظی ترجمہ کی پابندی سے بسا اوقات زبان پائے فصاحت کے ساتھ
 ہو جاتی ہے اور نقص "کلام قیصر" میں بہت بڑی حد تک موجود ہے۔ بار

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ کھپوں کی پرورش اور شہد کی پیداوار تجارتی اور اقتصادی فوائد کے لحاظ سے بہت نفع بخش ہو اور مالک یورپ اور بعض حصص عرب و اسیریقہ میں شہد کی کھپوں کے پلٹے کا عام دستور بہت قدیم ہے۔ مولف کا بیان ہے کہ قلم روس و جرمن میں اس کا رواج خصوصیت سے بہت زیادہ ہے۔ ہمارے یہاں ہندوستان میں شہد کی ضرورت سہم ہو اور اکثر جگہوں پر نہایت اعلیٰ درجے کا شہد پایا جاتا ہے لیکن آج تک کسی نے کبھی اس کی تجارت کو بات ساعدہ بنانے اور اسے فروغ دینے کا خیال نہیں کیا۔ بلکہ آج کل یہاں جس طرح سے شہد حاصل کیا جاتا ہے وہ بہت ظالمانہ اور قابل اعتراض ہے، جس سے اندیشہ ہو سکتا ہے کہ شاید کسی وقت عمدہ نسل کی کھپیاں اور اعلیٰ درجے کا شہد یہاں سے قطعاً تاپید ہو جائے۔

حضرت مولف وعدہ فرماتے ہیں کہ اگر ان کا یہ رسالہ جس میں کھپوں کے واقعات زندگی میں قدردانی کی نظر سے دیکھا گیا تو آئندہ ان کی پرورش کے متعلق مبسوط و شرح کتاب لکھ کر ملک کے سامنے پیش کریں گے۔ مناسب تو یہی تھا کہ ”واقعات زندگی“ اور ”طریق پرورش“ پر جداگانہ رسائل لکھنے کی جگہ یہ دونوں مضامین ایک ہی مستقل کتاب کی شکل میں قلمبند کیے جاتے اور مؤرخانہ ذکر کی اشاعت کو ملک کی قدردانی کی شرط سے مشروط نہ کیا جاتا، تاہم اب چونکہ پہلا حصہ نکل چکا ہے اس لیے یہی استدعا کافی ہوگی کہ وعدہ کا بہت جلد ایقا فرمایا جائے کیونکہ حقیقتاً ”زراعت و تجارت کی ترقی“ اُسی پر منحصر ہو سکتی ہے ورنہ موجودہ رسالہ سے کسی مستقل فائدہ کی امید کرنا فضول ہے لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ ”انخل“ کی اشاعت فضول ہوئی ہو بلکہ اس کے مطالعہ سے من جہی طبیعتیں ضرور متحرک ہو سکتی ہیں اور تحریک و تشویق کا اچھا سامان پیدا ہو سکتا ہے۔

”انخل“ کی قسم کا مفید و کارآمد طریقہ ہماری ”لنگو افرنیکا“ میں

ملکہ مظلمہ و کٹوریہ، حضور آید و رد، مفت، ملکہ الکترنڈرا، حضور جابج خامس و ملکہ میسری اور لارڈ ہارڈنگ کی ہاؤس ٹون جداگانہ تصاویر سے کتاب کی دیدہ ریزی اور دل آویزی کئی حصے بڑھ گئی ہے۔ قدر دانان علم و فن کو اس کتاب کا ایک ایک نسخہ اپنے پاس ضرور رکھنا چاہیے۔ مولفین نے عام ضروریات کو مد نظر رکھ کر کلام قیصر کے ہندی اور گورکھی ایڈیشن بھی شائع کیے ہیں۔ اردو اور ہندی نسخہ ۶۰ میں اور گورکھی ۸۰ میں مینجر صاحب رسالہ انسان امرتسر سے طلب کرنا چاہیے۔

انخل | اس چھوٹی تقطیع کے تقریباً سو سو صفحے کی دیدہ زیب و دلپسند کتاب کے لیے جس میں محاسن باطنی و ظاہری بحشہ وافی موجود ہیں ملک کو جناب سید راحت حسین صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ایل کامنوں ہونا چاہیے۔ سید صاحب دو جدید کے اہل قلم طبقے میں ممتاز و موقر شخصیت رکھتے ہیں اور آپ کی کارآمد اور عالمانہ تحریریں اب سے بہت پہلے مقبولیت عامہ کی سند حاصل کر چکی ہیں ”انخل“ میں جیسا کہ نام سے ظاہر ہوتا ہے شہد کی چھوٹی کھپوں کے حالات غیر معمولی شرح و بسط سے قلمبند کیے گئے ہیں۔ سید صاحب کو اس قسم کے مضامین پر قلم فرمائی کرنے کی غیر معمولی دستگاہ حاصل ہے۔ اس کا ثبوت اس تازہ تالیف سے بھی ملتا ہے۔

سید صاحب نے اپنی اس جدید تالیف کی غرض و غایت ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے۔

اول فائدہ جو اس مضمون کے مطالعہ سے ہکو حاصل ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری معلومات زیادہ ہوتی ہیں..... یہ کتاب ہکو واقعات کی پابندی لگا تا محنت کام کرنے کی علت، کفایت شکاری، موزیاست و تمدن وغیرہ کا ایسا اچھا سبق سکھاتی ہے کہ اب زور سے لکھنے کے قابل ہے۔ لیکن اس رسالہ کو لکھنے میں مولف کی بالکل دوسری غرض ہے اور وہ زراعت اور تجارت کی ترقی ہے۔

اسلامی پنچائیت ڈھاکہ | ہندوستان کے اُن کثیر التعداد شہرؤ میں جن کے نام کے ساتھ اکثر متم بالشان تاریخی واقعات اور اسلامی روایات وابستہ ہیں، ڈھاکہ ایک امتیازی شہرت رکھتا ہے۔ صرف اسی قدر کہ دنیا، ثبوت کیلئے کافی ہوگا کہ باوجود مرد و ہوا کے دہان بعض نہایت قدیم رسم و رواج کا اس وقت بھی پتہ چلتا ہے اور پُرانی تہذیب و تمدن کی دلچسپ مثالیں وہاں اب تک باقی ہیں جن کے سبب سے اسلامی پنچائیت سٹم خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اسی سٹم کی مشرح و مبسوط کیفیت مندرجہ عنوان نام کے ایک رسالے میں خان صاحب خواجہ محمد عظیم صاحب رئیس عظم ڈھاکہ نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ قلمبندی کی ہے جو اس وقت ہمارے پیش نظر ہے۔

خواجہ صاحب نے سب سے پہلے لفظ ”پنچائیت“ کی شرح فرمائی ہے اور اسکے مخرج کے متعلق کئی روایات پر نظر تنقید ڈالنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں:-

ہر ایک پنچائیت میں پانچ ایسے منتخب ممبر ہوتے ہیں جو بہ لحاظ بن و سال عقل و تجربہ دوسرے ممبروں سے ممتاز خصوصیت رکھتے ہیں۔ ان پانچ شخصوں کا نام پنچائیتی اصطلاح میں پانچ لائق برادر ہے۔ یہی لائق برادر سردار کی کونسل کے ارکان انتظامی ہیں اور انھیں پراکثر امور کا دار مدار رکھا جاتا ہے۔ پس چونکہ یہ جماعت حقیقت اپنے اصلی اجراء مقاصد میں پانچ شخصوں کی تابع ہے اس لیے جماعت کا نام پنچائیت رکھا گیا۔

خواجہ صاحب کی رائے میں ”یہ توجیہ دیگر توجیہات سے زیادہ قرین قیاس ہے“ اور ہم بھی اسکے ساتھ اتفاق کرتے ہیں۔ ”اسلامی پنچائیت ڈھاکہ“ کے حالات غایت درجہ دلچسپ قابل دید ہیں اور خواجہ صاحب متعدد اسباب و علل پر بحث کرنے کے بعد اس امر کے دعویدار ہیں کہ اس اسلامی پنچائیت کی ابتدا اُس وقت سے ہو جبکہ بنگال میں مسلمان حکمرانوں کا قدم تک نہ پہنچا تھا اور اہل اسلام ہندو حکومت کے زیر سایہ

بہت کم ہو، اور اس اعتبار سے سید راحت حسین صاحب کا یہ راء جو علم حیوانات سے متعلق ہو قابل قدر چیز ہے۔ شہد کی مکھڑوں کے معمولی حالات، شاید عام لوگوں کو بھی معلوم ہوتے ہیں لیکن اس کتاب میں وافر معلومات علمی اور سائنٹفک ہیں جن کا مطالعہ خواص و عوام دونوں کیلئے بہیکار نہیں ہو سکتا۔ مکھڑوں کے حالات، اُن کے کام، اُن کی معاشرت اُن کے تمدن اور اُن کی زندگی کے ہر شعبے پر اس خوبی سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ باید و شاید عبارت کی سلامت اور طرز بیان کی خوبیوں نے اس روکھے پیکے مضمون کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے اور واقعات اس ترتیب اور اس سلوب سے درج کیے گئے ہیں کہ ناظر کو پڑھنے میں اُلجھن بے طلق نہیں ہو سکتی بلکہ اُسے ناول کا لطف آتا ہے۔ گویا اس کتاب میں علمی پہلو سے قطع نظر ادبی نقطہ نگاہ سے بھی بہت سی خوبیاں موجود ہیں۔ مکھڑوں کے عجیب و غریب اور محیر العقول طرز معاشرت و نظام تمدن کا خاکہ جن الفاظ میں دکھایا گیا ہے وہ بجائے خود مستقل دلچسپی کی چیز ہے۔ دُعا ہو کہ ”العل“ تک میں عام قدر دانی کے ہاتھوں لیجائے اور مولف کی وہ ساری متنائیں پوری ہوں جن کو مد نظر رکھ کر اس کی ترتیب و تدوین کی زست گوارا کی گئی ہو۔ قیمت ۱۰ روپے اور حضرت مولف سے جموئی ضلع مونگیر کے پتے سے مل سکتی ہے۔

القرض | یہ ایک ”لطیف مسدس“ ہے جو منشی واحد علی ابرق دوانی کے نتائج انکار میں سے ہے۔ یہ نظم ماہ فروری میں مسلمانوں کے ایک عام جلسے میں بمقام رامپور جسکی غرض انعقاد خریداری تمسکات ترکی سے متعلق تھی پڑھی گئی تھی۔ مسدس کی زبان اور میاں خٹکی قابل تعریف ہے۔ اور اکثر اوقات ادائے مطلب کیلئے کچھ ایسا دردناک پہلو اختیار کیا گیا ہے جس کو پڑھ کر اخوت و ہمدردی کا جذبہ دل میں از خود پیدا ہوتا ہے۔ اس سے پہلے یہ مسدس اخبارات میں شائع ہو چکا ہے قیمت وغیرہ رسالے پر کہیں درج نہیں ہے۔

بطور رعایا کے زندگی بسر کرتے تھے۔ گویا مسلمانوں نے امداد باہمی کے اصول کو مد نظر رکھ کر اپنے یہاں اس طریقے کو رائج کیا تھا۔

”ڈھاکہ پنچایت“ کے نظام عملی کی تفصیلی کیفیت نہایت حیرت انگیز اور سبق آموز ہے اور بالخصوص اس زمانے میں ایک نادر الوجود چیز ہے۔ اس کا مختصر حال یہ ہے کہ ایک محلہ میں ایک ایک پنچایت ہے۔ تمام لوگ ایک خاص شخص کے ماتحت ہوتے ہیں جسکو زمانہ سابق میں ”میر محلہ“ اور اب ”سردار“ کہتے ہیں۔ ”سردار کا عہدہ پہلے موروثی تھا لیکن اب اس کا تقریر بذریعہ انتخاب عامہ ہوتا ہے۔ فرائض کی انجام دہی میں سہولت پیدا کرنے کی غرض سے ”سردار“ کے ماتحت ایک نائب ”سردار ہوتا ہے۔ ہر ایک محلہ دار پنچایت میں ایک خبر رساں ہوتا ہے جو برادری کی شادی وغنی کی اطلاع تمام لوگوں کو کرتا ہے۔ جماعت پنچایت میں ”پانچ لائق برادر“ ہوتے ہیں جو امور مابہ النزاع کے فیصلہ کے وقت ”سردار“ کی کونسل کے ممبر کے طور پر کام دیتے ہیں۔ محلہ کی تقریبات شادی وغنی میں مناسب مدد دینا، تنازعات باہمی کا فیصلہ کرنا، پنچایت کا اصل اصول ہے۔ یہ بات خصوصیت لکھنے کے قابل ہے کہ ڈھاکہ کی اسلامی آبادی ضرورت کے وقت کسی شیعہ در کی محتاج نہیں بلکہ جیسا کہ خواجہ صاحب نے پنچایت شادی وغیرہ کی خبر گھر گھر پہنچانا، یہ کام جیسا کہ ہندوستان بھر میں رائج ہو نالی کا نہیں بلکہ اس کو ایک پنچایتی عہدہ دار انجام دیتا ہے جسے ”گریہ“ (جنوں) کہتے ہیں۔ سطح مزہ شواہد کو رکن خاص پیشہ ور لوگ نہیں ہیں بلکہ اسکو بھی پنچایت کے ہر ایک ممبر جو اس قابل ہوں انجام دیتے ہیں اور یہ

یہاں عیب کے بے تحسن خیال کیا جاتا ہے۔ اتفاقاً، اخوت باہمی اور ایثار نفس کی اس سے زیادہ قابل قدر مثال ملنا ناممکن ہے اور مسلمانان ڈھاکہ اس کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔

یہ تمام محلہ دار پنچایتیں دو حصوں میں منقسم ہیں۔ ایک کو بارہ اور دوسرے کو بائیس کہتے ہیں۔ یہ دونوں فرق ۱۳۲ پنچایتوں مشتمل ہیں جن کے اوپر ایک سپرنٹنڈنٹ ہوتا ہے۔ جدا کا شکر ہے کہ آجکل یہ قومی عہدہ ”اسلامی پنچایت ڈھاکہ“ کے مرتب مولف جناب خان صاحب خواجہ محمد اعظم صاحب کو حاصل ہو چکی ہے اور ان کی وسعت نظری کی وجہ سے بہت سی قابل تدریج اصلاحیں اس وقت تک عمل میں آچکی ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ”اسلامی پنچایت ڈھاکہ“ ہندوستان بھر میں ایک عدیم المثال معاشرتی جماعت ہے۔ یہ اگرچہ قرن قیاس ہو کہ اس میں ضروریات موجودہ کے لحاظ سے کچھ ترمیم و اصلاح کی گنجائش نکل سکے لیکن قیود و شرائط کی بھرمار کر دینا کسی طرح مناسب نہوگا۔ پنچایت کا بہترین نفع یہی ہے کہ اس کے ذریعے سے مختاصمین کی نزاع کا فیصلہ بغیر قانونی پابندیوں کے ہو سکتا ہے۔

خواجہ صاحب نے اپنے رسالہ کا ایک انگریزی ایڈیشن بھی شائع کیا ہے اور خوب کیا ہے۔ قیمت وغیرہ کتاب پر کہیں درج نہیں ہے۔

ستید القلم

ضرورتیں

ایک خوشنویس کاتب کی ضرورت ہے۔ درخواست کے ہمراہ کتاب کا نمونہ اور نقل سارٹیفکٹ ضرور روانہ کی جائیں۔ سارٹیفکٹ یافتہ خوشنویس کو ترجیح دی جائے گی۔ تنخواہ کا تصفیہ خط کتابت سے طے ہوگا۔ درخواستیں اس پتہ پر ارسال کی جائیں۔

پیارے لال شاکر۔ مالک و ایڈیٹر رسالہ العصر لکھنؤ

گر مسکین

مولراج نام کا کوئی ملتان میا واقف نہ تھا اس لیے کس قدر تامل کے بعد
مین نے پھر کہا آپ نے مجھے کیسے پہچانا؟

اس نے ہنس کر جواب دیا "پنجاب میں ایسا کون ہو جو آپ کو نہیں
پہچانتا۔ آپ کے برابر ملی اصلاح و فلاح میں حصہ ..."

مین نے بات کاٹ کر پوچھا "خیر اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"
اُس نے ہٹے محل سے جواب دیا "جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ ابھی آپ کے
عرض کر دین گا۔ باتیں بہت سی ہیں اگر آپ تھوڑا وقت سرج کر کے
غور سے سنیں تو آپ کی عنایت ہو۔ اتنا کہ اُس نے آنکھیں نیچے کی طرف
جھکا لیں۔

مین حیران تھا کہ کیا اسرار ہو۔ آخر یہ سوچ کر کہ شاید کچھ مانگتا ہو گا
مین نے اپنا منہ پھیر کر کہا "بہتر آپ جو کچھ چاہتے ہیں کہ ڈال لے۔"
وہ بولا "جناب ذرا تنہائی میں چلیے تو کچھ عرض کروں۔ آپ نے وہ
خالی ہے۔"

معاملہ کی تہ کو معلوم کرنے کی نیت سے مین "چلیے" کہہ کر آگے آگے
چل پڑا۔ چند قدم چل کر مین اسٹیمر کی ریلنگ کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ بھی
میرے بغل میں کھڑا ہو کر میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

اسکی یہ صورت دیکھ کر میرے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ شاید وہ
کسی وقت ابھی حالت میں ہو گا اب اتفاقات زمانہ سے اس سے بہت
کو پہنچ گیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سوال اس کے منہ تک آ کر رک گیا
تھا۔ آخر چند منٹ کی خاموشی کے بعد وہ بولا آپ کچھ سمجھے ہیں نے
آپ کو کس لیے تکلیف دی ہے؟

مین نے جواب دیا "بالکل نہیں"

مین اسٹیمر پر بیٹھا ہوا ڈیرہ اسماعیل خان جا رہا تھا۔ میری بیوی بھی میر
ساتھ تھی جس کمرے میں ہم دونوں بیٹھے تھے اُسے مین نے پہلے ہی
سے زور دے کر لیا تھا۔ آپس میں باتیں کرتے کرتے دوپہر دن گزار دیا۔
شام ہونے سے کچھ عرصہ پہلے دریائے سندھ کی سرد ہوا کے جھونکوں
نے میری بیوی کو سنا دیا۔ مین نے سوچا اور چھت پر چل کر غروب آفتاب
کا نظارہ دیکھوں اور ہوا خوری کر دوں۔

اُس وقت اسٹیمر دریا خان کے گھاٹ سے روانہ ہو چکا تھا کہ مین کے اندر
معلوم ہوتا تھا کہ سورج غروب ہو چکا ہے لیکن جب نظر کلا تو دیکھا کہ سورج
ابھی تیزی سے چمک رہا ہے۔ اس لیے چھت پر جانا مناسب نہ سمجھا۔ ٹوک
بدی اور اُدھر اُدھر ٹھٹھنے لگا سندھوندی کی فراخ چھاتی پر ٹکی ٹکی موجیں اُٹھ
رہی تھیں۔ پانی میں بھگی ہوئی ہوا بدن کو آ کر لگتی تو نہایت حسرت
معلوم ہوتی تھی۔ مین دوڑتے کنا رہ کو دیکھ رہا تھا کہ ایک مفلوک لڑکا
نوجوان نے آ کر میرے پیروں کو چھوا اور بڑے ادب سے تعظیم کی۔

مین نے عینک تار کر اُس نوجوان کی طرف بڑے غور سے دیکھا لیکن
حافظہ پر بہت زور ڈالنے کے باوجود معلوم نہ کر سکا کہ اس سے پہلے مین نے
کہاں دیکھا ہو۔

اسکی عمر کم و بیش ۲۵ سال کی ہو گی۔ اکہرا بدن، آنکھیں اندر کو
گھسی ہوئی، سر پر بڑے بڑے بال اور اُن پر سفید پٹری شکل وصورت
کو دیکھ کر خود بخود میرے دل میں خیال پیدا ہوا کہ وہ کسی تکلیف میں
مبتلا ہے۔

مین نے بعد اُن کو کس قدر ٹھیک کر پوچھا "آپ کون ہیں؟"

اُس نے جواب دیا "میرا نام مولراج ہے اور میں ملتان کلہنڑ والا ہوں"

وہ کہنے لگا آپ میرے باپ ہیں۔
مجھے پہلے تو اسکی بات پر غصہ آنے لگا لیکن پھر بے اختیار ہنسی آگئی۔
میں رے زور سے اہا اہا مار کے ہنس پڑا اور پوچھا ”کیسے“
میری ہنسی پر وہ کیسے رشتہ بن کر کھڑا ہو گیا اور بولا آپ
میرے باپ ہیں یا نہیں، میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا۔ البتہ آپ کی اہلیہ
محترمہ میری والدہ ہیں۔ اتنا کہہ کر اسے آسمان کی طرف دیکھنا شروع کیا
اور ہاتھ جوڑ کر پر نام کرنے لگا۔

میں اسکی حالت اور اسکی حرکت کو دیکھ کر یہی سمجھا کہ کوئی دیوانہ ہو۔
میرے دل میں جو غصہ اور نفرت پیدا ہوئی تھی اس کا احساس
اب دور ہو گیا اور اس کے بجائے رحم کا خیال پیدا ہوا۔

وہ میرے چہرے سے میرے دلی خیالات کا اندازہ کر کے گویا ہوا آپکو
میری بات پر یقین نہیں آیا؟ یا شاید آپ مجھے پاگل سمجھتے ہیں۔ معاف
کیجئے گا میں آپ کا کچھ قصور نہیں۔ آپ کے بجائے اور کوئی ہوتا تو آپ
دل میں بھی ایسے ہی خیالات پیدا ہوتے لیکن یقین مانیے کہ میں نہیں
اپنی ماما ہی سمجھتا ہوں آج پانچ برس کا عرصہ مرنے کو آیا کہ میں وق کے دفناک
مرض میں مبتلا ہوں۔ میٹھا ریبیدون ڈاکٹرون اور حکیمون سے علاج کرایا
کچھ فائدہ نہیں ہوا۔ میں ڈی لے دی کالج کے بی اے کلاس میں پڑھتا تھا
اُس تعلیم کو بھی بند کرنا پڑا۔ دیکھیے اب بدن میں کچھ نہیں رہا۔ صرف ہڈیاں
ہی ٹھیلان ہیں۔ اب میں زیادہ سے زیادہ چند روز کا همان ہوں آج
کم و بیش ایک ہفتہ کا عرصہ ہوا کہ میں شہر کے باہر پر ہلا دیوی کے مندر
میں جا کر دن بھر گزارا۔ کتنا رو دکتنا چلایا۔ دیوی کے سامنے بہت پرقتنا
کی۔ آخر کو کچھ رات گئے گھر لوٹا۔ سوتے میں خواب دیکھا کہ دیوی میرے
سر ہانے کھڑی ہیں۔ میں نے انکے قدم پکڑ لیے وہ آپ کا نام ٹیکر کہنے
لگیں ”ان کی استری تیری اگلے جنم کی ماما ہیں۔ ایک روز شراب
پی کر تو نے انھیں بہت سخت گالی دی تھی۔ اسکا نتیجہ تو اس مرض کی

صورت میں جھٹکتا ہوا۔ ان کے پاس جا اب بھی تیرا کچھ نہیں بگڑا۔
جا انھیں کاچر نامرت پی۔ اچھا ہو جائے گا۔ اتنا کہہ کر دیوی نظروں
سے غائب ہو گئی۔

اس قدر کہنے کے بعد وہ چپ ہو گیا۔ میں حیران تھا کہ اس تہذیب
اور روشنی کے زمانے میں ایک بی لے کا طالب علم جو شب و روز
ہنسنے اور ڈارون جیسے دہریوں کی جمعیت میں رہتا ہو اس قدر
ضعیف الاعتقاد کیونکر ہو سکتا ہو۔ لطف دیکھیے کہ دیوی نے نام بھی
بتایا تو ایک ایسے شخص کی بیوی کا جو راسخ الاعتقاد ہندوؤں سے
بہت کم دلچسپی رکھتا ہو اور جو آریہ سماج کے اندر دنی حلقہ میں
داخل ہے۔

باوجود ان خیالات کے میں نے سارا معاملہ معلوم کرنے کی
نیت سے پوچھا ”پھر اب آپ کیا چاہتے ہیں؟“
دونوں ہاتھ جوڑ کر اس نے جواب دیا ”سب کچھ تو آپ نے سنا
اسپر بھی آپ مجھ حقیر کو ”آپ“ کے لفظ سے مخاطب کرتے ہیں! تو“
یا زیادہ سے زیادہ ”تم“ کہیے۔“
اتنا کہہ کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا جوتا چھوا اور
انھیں ہاتھوں کو سر آنکھوں پر لگایا۔

میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر پوچھا ”اب تم کہاں جاتے ہو؟“
وہ کہنے لگا ”میں سیدہالاہور سے آ رہا ہوں جہاں میں آپ کو
تلاش کرنے گیا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ آپ ڈیرہ اسماعیل خان
اپنے ایک رشتہ دار کی بیمار پرسی کے لئے روانہ ہو گئے ہیں۔ اسلئے
میں بھی وہاں سے سیدہالاہور ہی کو چل کھڑا ہوا۔
میں نے پوچھا ”لاہور میں آپ کو کس نے بتایا تھا کہ میں ڈیرہ
اسماعیل خان کی طرف روانہ ہو گیا ہوں؟“
وہ بڑی آزر دگی سے کہنے لگا ”آپ مجھے پھر ”آپ“ ہی کے لفظ سے

مخاطب کرتے ہیں۔

میں نے سکر کو کہا "خیر ترسیء بتاؤ" تمہیں "کس نے بتایا تھا؟" وہ بولا "کسی نے بھی نہیں اور سبھی نے کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ جیسے پبلک مین کی نقل و حرکت پوشیدہ رہ سکتی ہو؟ آپ اس زمانے میں پنجاب کے۔۔۔۔

وہ کوئی لمبا چوڑا تعریفی فقرہ کہنا چاہتا تھا۔ میں نے ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا "چلو اچھا ہوا کہ میں ایک دن منگمری میں ٹھہر گیا تھا اس لیے آج تم سے اس جگہ ملاقات ہو گئی ورنہ ممکن تھا کہ تم کو میری تلاش میں زیادہ سرگردان ہونا پڑتا۔"

وہ چند منٹ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر بڑی تعظم کے لہجے میں پوچھنے لگا "میری ماما آپ کے ساتھ ہی ہیں؟"

میں نے جواب دیا "ہیں تو سہی۔ کیا تمہیں آج ہی چر نلرت دکا رہی؟" وہ بولا "اگر آج ہی جاتے تو کل تک کس لیے ٹھہر دوں؟"

کوئی اور موقع ہوتا تو شاید میں ایسے ضعیف الاعتقاد شخص کی ایسی لغو باتیں ماننے پر ہرگز آمادہ نہ ہوتا مگر اس وقت میں نے اسے ایک قریب لڑکے کی آخری خواہش سمجھا کیونکہ واقعی مرض نے اسے قریب لڑکے بنا رکھا تھا۔ پس میں اسے "اچھا ٹھہرو" کہہ کر کیمبن کے اندر داخل ہوا۔

کیمبن سے باہر آئے ہوئے مجھے ۲۰ منٹ سے زائد گزر چکے تھے۔ اندر جاتے ہی میرے پاؤں کی آواز سے میری بیوی کی آنکھ کھل گئی۔ مجھے دیکھ کر اس نے منہ کو ہاتھ سے ڈھک کر جان بچانے لیتے ہوئے پوچھا "اتک کہاں تھے؟"

میں نے اُس کے بستر کے قریب بیٹھ کر اُس کے ریشم ایسے مائلم بالون میں اُنکلیاں پھیرتے ہوئے جواب دیا "تم سو رہی تھیں، گریبان ایک بڑی ہی دلی ہوئی ہو۔"

وہ حیران ہو کر پوچھنے لگی "کیا؟"

میں نے جواب دیا "تمہارا ایک لڑکا آیا ہوتا تھا کہتے ہی میرے دل میں اپنی زندگی کے بعض گزشتہ افسوسناک سانچے تازہ ہو گئے۔ اس فقرے سے مجھے توجہ تھوڑا بہت رنج ہوا سو ہوا میری بیوی کو بہت ہی تکلیف پہنچی۔ درحقیقت اس واقعہ سے ڈیڑھ سال پہلے ہمارا دواں لڑکا اکو تاجہ ہمیں دلغ جڈائی دیکھ گیا تھا۔ دل لگی میں فقرہ کہنے کو تو کہہ دیا لیکن پھر میرے دل میں سخت پشیمانی ہوئی کہ ہائے کس لیے میں نے اسے بے فائدہ رنج پہنچایا چند منٹ تک وہ چپ چاپ بیٹھی رہی اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چند قطرے بھی گرے۔ پھر وہ ایک گہری سانس لیکر اٹھ بیٹھی اور بولی "تم کیا کہہ رہے ہو؟"

میں نے اسے اپنی طرف کھینچ کر کہا "سٹیمین ایسے سنیا سنی دین ہو اور وہ میرا تھوڑا کھلکھلتا تھا کہ تمہارے ایک بیٹا بہت جلد ہونے والا ہے۔"

میں ایک آریہ سماجی کی حیثیت میں سنیا سنی لوگوں کی پیشین گوئی کا مطلق قائل نہیں ہوں مگر اس وقت جلدی میں اور کچھ نہ سوچا تو "ٹالنے کی غرض سے یہی کہہ دیا۔ لیکن میری یہ دو غلطی بھی ضائع ہی گئی۔ اسکی دونوں آنکھوں سے آنسوؤں کا تار بدستور بندھا رہا۔ چہرے پر پڑ مردگی چھائی ہوئی تھی۔ آواز بھاری ہو گئی تھی۔ ڈیڑھ برس پہلے کا واقعہ اس کے دل میں پھر سے تازہ ہو گیا۔ اس لڑکے کی سب باتیں بتدیج ایک تصور کے مانند اسکی نگاہ تخیل کے روبرو پھرنے لگیں۔ اسکا رونا، اسکا ہنسنا، اسکی پیاری پیاری مٹھی باتیں سب اسے یاد آنے لگیں۔ جون جون اس زمانہ کے واقعات اسے یاد آتے اسکی آنکھوں کے دونوں کونوں سے آنسوؤں کے قطرے اور بھی تیزی سے بہنے لگتے تھے۔ میں نے اسکی یہ حالت دیکھ کر اس کے دواں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور اسے اپنی طرف کھینچ کر تسلی دینے کے لیے چھاتی سے لگایا۔ اس کے منہ کو بوسہ دیا۔ اس کے ساتھ خود بھی آنسو بہائے

اسکے بعد جیب سے رومال نکال کر اپنی اور اسکی آنکھوں کو پونچھا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کمزبات ٹالوں۔

کھڑکی میں سے دیکھا تو سوچ غروب ہونے کا وقت تھا۔ مین نے کہا ”چلو چھت پر چکر غروب آفتاب کا نظارہ دیکھیں۔ دریائے سندھ میں سورج کا غروب ہوتا تو کبھی دیکھا ہی نہیں۔“

وہ اٹھی۔ دوسرے کمرہ میں جا کر ٹھہر ہاتھ دھویا۔ بالوں میں کنگھی کی اور پھر باہر آئی۔ ہم دونوں چھت پر جا کر ٹھہرنے لگے۔ تھوڑی دیر میں سورج غروب ہو گیا اور شام ہو گئی۔ اسٹیم کو اب تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنا باقی تھا۔ ہم لوگ بھی چھت پر سے نیچے اتر آئے۔

سیڑھی کے پاس ہی مولراج کھڑا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی کہنے لگا ”کیا یہی ماما ہیں؟“ جواب کا انتظار کیے بغیر ہی اُس نے میری بیوی کو ڈنڈوت کی۔

وہ یہ دیکھ کر حیرت سے ایک طرف کو کھڑی ہو گئی اور میرے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ مین نے کہا ”ایک بات ہو کہیں میں چکر کھوں گا۔“ مولراج سے مخاطب ہو کر مین نے کہا ”ٹھہریے آپ اسقدر کیوں گھبراتے ہیں؟ وہ جلدی میں دہان سے ہٹ گیا اور کہنے لگا ”مین اس انجن کے قریب ٹھہرتا ہوں۔“

کہیں مین جا کر مین نے اپنی بیوی سے سب باتیں کہ سنائیں۔ اسنے ہنس کر کہا ”مین اپنے پاؤں کا دھوون نہیں لے سکتی۔“

مین نے کہا ”اسمیں تمہارا کیا ہرج ہو؟“

وہ بولی ”کیا تم اس گنجیری کی بات پر اعتبار کرتے ہو؟“

مین نے کہا ”اعتبار تو نہیں لیکن انسان کی اچھا شکستی (قوت ارادی) بڑی زبردست ہو۔ اگر اُسے (اس دھوون ہی پر یقین ہو تو اسے یقیناً فائدہ پہنچے گا۔ اس بحث پر تو مغرب والوں نے صد ہا کتابیں لکھی ہیں۔“

وہ پہلے تو سن کر چپ ہو رہی پھر تھوڑی دیر کے بعد بولی ”اچھا تھوڑا پانی پونہ کیوں نہیں دے آتے؟ ضرورت تو صرف اسکے یقین کی ہے۔ تم اُسے یقین دلادینا کہ یہی میرے پاؤں کا دھوون ہو۔“

مین نے کہا ”اسطرح دھو کہ دینے سے کیا حاصل؟“

اتنا کہتے ہوئے مین نے چائ کی پیالی میں تھوڑا پانی اُٹڈیا۔

ہنستے ہنستے میری بیوی موزہ اُتار کر بولی ”ات تیرے کی! بجانے اس نے تمہیں کتنا سادہ لوح سمجھا ہو؟ مجھے تو اس بات کا تعجب ہو کہ تمہیں اسقدر بھولا بھالا دیکھ کر ولایت میں کسی سیم نے تم سے شادی کیوں نہ کر لی۔“

مین نے ہنس کر جواب دیا ”پھر تم یہ دکھ کیوں کر بھو گتیں؟“

میری بیوی مذاقیہ گفتگو میں بڑی تیز تھی لیکن اسکی بات پر جواب دیا جاتا تو چڑھ جاتی تھی۔ برداشت نہ کر سکتی۔ میری بات سن کر بولی ”جاؤ جاؤ معلوم ہوا بڑے رسک ہوا۔“

مین نے اسکا کچھ بھی جواب نہ دیا اور اسکا پاؤں دھونے کی غرض سے ہاتھ میں لیا۔ وہ جلدی سے پاؤں کو پرے ہٹا کر کہنے لگی۔ ”پیر کیوں چھوتے ہو؟“ پھر خود ہی میرے ہاتھ سے پانی کی پیالی لے آئیں اپنے پاؤں کا انگوٹھا ڈبو کر کہنے لگی ”نو کر سے کو لے جائے۔“

مین نے اٹھ کر کہا ”اسے نو کر کیا جالے؟ مین خود ہی جا کر لے آتا ہوں۔“ یہ کہہ مین نے پیالی اٹھالی۔ وہ کہنے لگی ”یہ کیا کرتے ہو؟ جو کہتے ہیں وہ کیوں نہیں سنتے؟“

مین نے کسی قدر غصیدگی سے جواب دیا ”دیکھو عورتوں کو کھنا پڑھنا سکھانا گویا آگ پر گھی ڈالنا ہو۔ تم نے اتنا کھنا پڑھنا سکھا مگر ضد ابھی تک نہ گئی۔“

اتنا کہتے ہوئے مین کہیں سے باہر نکل آیا۔

ڈیرہ اسماعیل خان میں مین اپنے دوست کے ہاں صرف چند ہی یوں

سے پانچ روپیہ کا ایک نوٹ نکال کر حوالہ کیا اور کہا "جا کر کسی ڈاکٹر سے ملو یا سیٹھ پہاڑ کو چلو۔ بھلے آدمی علاج کر دے تو بچو گے۔ کہیں پاؤں دھو نیو کا پانی پینے سے مریض اچھے ہوا کرتے ہیں!"

ٹھیک اسی وقت کوٹھی کے سامنے مسٹر ہرناداس کپور کی گاڑی آکر ٹھہری۔ مین نے مولراج سے جلدی مین کہا "اب تم جاؤ۔ مین آج ایک خاص کام مین مصروف ہوں۔"

وہ چپکے سے نوٹ کو جیب مین رکھ کر چل دیا۔

اگلے روز صبح کے وقت جب میری آنکھ کھلی تو بہت دن چڑھ آیا تھا۔ چارپائی سے اٹھ کر مین تازہ ہوا کھانے کی غرض سے کھرکی مین ہو بیٹھا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک شخص کا لے سرج کی چادر اوڑھے ادھر ادھر ٹہل رہا ہو۔ جب تک اسکی پھیری طرف تھی مین اسے پہچان نہیں سکا لیکن جونہی اس نے منہ پھیرا تو دیکھا کہ مولراج ہو۔ اسے دیکھتے ہی گویا میرے تن بدن مین آگ لگ گئی۔ کم بخت دن نکلتے ہی آپہنچا۔ ابھی دربان سیٹ لیکر آتا ہوگا۔

چائے کی سیر پر صبح کے اخبار کے ساتھ ہی اسکا کارڈ بھی آپہنچا۔ میری بیوی ابھی تک ادیر نہ آئی تھی۔ مولراج نے آتے ہی پہلے بڑے ادب سے میرے پاؤں کو چھوا پھر بولا "رات بھر مجھے نیند نہیں آئی۔ آپ نے کل میرے ساتھ جو سلوک کیا ہو اس سے میری سخت دشمنی ہوئی ہو۔ مین کون ہوں یا کون نہیں ہوں آپ اس کا تو خیال نہ کیجیے۔ مجھے صرف اس بات کا رنج ہو کہ آپ نے میرا دم سمجھنے مین غلطی کی ہو۔ مجھے دو اسکے لیے ان پانچ روپیہ کی ضرورت نہیں آپ لے لیجیے۔"

اتنا کہہ کر اس نے جیب سے کل والا نوٹ نکال کر میرے ہاتھ دیا۔

مولراج کی ان باتوں سے میرا غصہ کسی قدر کم ہوا مین نے کہا "نہیں! نہین! روپیہ واپس کیٹی کیا ضرورت ہو۔ آپ کے دو ادوارو مین کام آئیگا۔" وہ پھر کھانسنے لگا اور تھوڑی دیر بعد بولا "ہمارا مولراج میرا یقین تو

ٹھہرا اور اس کے بعد لاہور واپس آ گیا۔ ایک روز شام کے وقت جب مین دن بھر کی کلفت کے بعد آرام سے ایک انگریزی رسالہ پڑھ رہا تھا ہمارا دربان سیٹ ہاتھ مین لیے اندر آیا۔ مین نے یہ دستور قرار دے رکھا تھا کہ جو حضرات گھر سے وزٹنگ کارڈ نہیں لاتے تھے انکے لیے ایک سیٹ رکھ چھوڑی تھی۔ سیٹ ہاتھ مین لیکر نام پڑا تو پھر لکھا تھا "مولراج ملتانی"

دو مینے کا پڑا ناواقف بیکار ایک ذہن مین نہ آیا۔ سوچا کوئی نیا موکل ہوگا، بلو ابھیجا۔

مولراج کی صورت دیکھتے ہی مین نے اسے پہچان لیا۔ اس نے سامنے آتے ہی بڑے ادب سے بندگی کر کے میرے پاؤں کو چھوا۔ مین نے پوچھا "کیسے آپ کیسے ہیں؟ کچھ فائدہ بھی ہوا کہ نہین؟" مولراج نے جواب دینے سے پہلے اپنی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر کہا "نا شروع کیا۔ پھر بولا" ہمارا کچھ دن کے لیے تو مین خاصہ اچھا ہو گیا تھا۔ کھاؤں! کھاؤں! کھاؤں! (کھانسی کی آواز) "پھر کھاؤں! کھاؤں! کھاؤں! پھر پانچ سات دن کھاؤں! کھاؤں! کھاؤں!..."

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ کھانا کھانا پاس ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

جس وقت اسکی کھانسی کا روز کسی قدر کم ہوا تو مین نے کہا "تمہارا مرض اب اس حالت کو پہنچ چکا ہو کہ پاؤں کا دھوون پینے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا۔ دھرم پور مین جا کر سینی ٹوریم مین رہو اور باقاعدہ علاج کرو۔" "افسوس مین کہاں جاؤں؟" اتنا کہہ کر اس نے پھر بڑے زور سے کھانا شروع کر دیا۔

اس روز ہمارے یہاں ڈر تھا چونکہ ساڑھے سات بج چکے تھے اسلئے خیال پیدا ہوا کہ تھوڑی دیر مین ہمارے آنے لگیں گے۔ پیغوس اس وقت کہاں سے آ بیٹھا ہے آسانی سے دفع کرنے کے خیال سے مین نے اپنی جیب

سب بڑھکر پراتا ہی کی طاقت پر ہو۔ ڈاکٹری یا بیدک پر میرا قطعاً اعتقاد نہیں۔ ایسی حالت میں دو اؤن پر روپیہ ضائع کرنا فضول نہیں تو اور کیا ہو؟

میں نے کیس قدر سوچ کر کہا ”بیشک اگر تم اس بارے میں بالکل ہی غیر متعقد ہو تو دو اکامفید ثابت ہونا مشکل ہے۔“

اس نے جواب دیا ”میرا تو دلی اور پکا یقین ہی ہے کہ اگر میں اپنی ماما کا چرنا مرت (ماما کا لفظ کہتے ہوئے اُس نے بڑی تعظیم سے پر نام کیا) دو نوں وقت پیون اور صبح و شام انھیں پر نام کر سکون تو میرا یہ مرض بالکل دور ہو جائیگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو اس مرتبہ میرا بچسنا شکل ہی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنی آنکھیں آنسوؤں سے بھر لیں۔

میں نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا ”جہاں تک میرا خیال ہے میرا بیوی دو نوں وقت اپنے پاؤں چھوانے اور انھیں دھلا کر اس کا پانی آپ کو پینے کے لئے دینے میں رضامند نہ ہوگی۔“

ٹھیک اُسی وقت وہ بڑے زور سے کھانسنے لگا۔ اس کے خشک مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر میرے دل میں رحم آیا اور میں نے دُمین سوچا ”بے چارہ واقعی قابلِ رحم ہے۔ جس طرح بھی بن پڑے گا میں اپنی بیوی کو اس بات پر رضامند کروں گا کہ وہ اسکے کھنے کے مطابق اسے صحت حاصل کرنے میں مدد دے۔ دُمین لوگ محتاجوں کی کئی طرح پر امداد کرتے ہیں۔ اگر اس ذرا سی بات سے اسکی جان بچ سکے تو ضرور اسے بچانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ اسکے مولراج سے مخاطب ہو کر میں نے کہا ”تم نیچے جا کر نوکروں کے کمرے میں بیٹھو میں ابھی بوا بھیجوں گا۔“

اسکے چلے جانے پر میں اپنی بیوی کے کمرے میں گیا۔ خادمہ سے معلوم ہوا کہ وہ غسل خانے میں ہے۔ باہر آتے آتے اُس نے آدھ گھنٹہ صحن (دبا) غسل خانے سے نکل کر وہ دالان میں ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور اپنے

بالوں کو خشک کرنے لگی۔ میں نے قریب کھڑے ہو کر کہا ”مولراج پھر آیا ہو۔“

اس نے حیرت سے پوچھا ”وہی اسٹیم والا مولراج؟ اب پھر کون آیا ہے؟“

میں اپنی بیوی کی زبردست قوتِ حافظہ کا ہر دل سے مدح ہونے والی مرتبہ جب میں نے اس شخص کا نام سلیٹ پر لکھا ہوا دیکھا تو یہ نہیں سمجھ سکا تھا کہ وہ کون ہے۔

مندرجہ بالا سوال کے جواب میں میں نے کہا ”اس کی کھانسی پھر بڑھ گئی ہے۔“

وہ کہنے لگی ”میں تو اب اپنے پاؤں کا دھوون نہ دے سکون گی۔ ایک ہی بار دیکر میں نے اپنے عقیدے کے خلاف کیا ہے۔ میں کوئی پیریا ولی نہیں ہوں کہ میرے پاؤں کے دھوون سے اسکا مرض دور ہو جائے؟“

میں نے ہنس کر کہا ”ساری دُنیا تمھاری طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ اور نئی روشنی کی نہیں ہے۔ اگر اُسکا اسی پر یقین ہے تو ممکن ہے اسی سے صحت یاب ہو جائے۔ وہ کہتا بھی ہے کہ پہلے میں اس سے صحت یاب ہو گیا تھا۔“

میں بھلنے لگا کہ اب کے اسے منانے میں ضرور وقت پیش آئے گی۔ اسکی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سمجھ رہی ہے کہ اس مرتبہ بھی ایک پیالہ دھوون دیکر چھٹکارا ہو جائے گا۔ اگر اس نے یہ سنا کہ یہ بیش قیمت چیز دُمین دو با بقاعدہ دینا پڑے گی تو شاید اسکا تحمل جاتا رہیگا۔ باوجود اس کے میں نے حوصلہ کر کے کہہ ہی ڈالا۔

مجھے جس قدر مخالفت کی امید تھی اتنی ظہور میں نہیں آئی۔ وہ حیران ہو کر بولی ”کیا اسے ڈاکٹر حکیم بیدکسی پر یقین نہیں ہے۔ دو نوں وقت میرا دھوون یہے گا اور اس سے اچھا ہو جائے گا؟“

اس بات کا ذکر رات کو مین نے اپنی بیوی سے کہا۔ وہ بولی ”کنہت دودا اردو تو پتیا نہیں کہیں خالی دھودن پینے سے مرض دور ہوا کرتے ہیں اسکی بھی عجیب ضد ہے“

مین نے کہا ”قوت ارادی سے بہت سے کام پورے ہو جایا کرتے ہیں جس وقت اُسے اپنے پاؤں کا دھودن دینے لگو تو اس بات کا دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ اس سے اس کے مرض کو افاقہ ہوگا“

میری بیوی نے ہنس کر جواب دیا ”دن بدن تم ایک سوانگ بن رہے ہو کیا میں ہی غلطی کرتی ہوں یا تم ہی روز بروز سماجک خیالات کو چھوڑ کر سنانک توہمات میں پھنستے جا رہے ہو۔ تمہارے ترقی یافتہ خیالات پر پردہ چڑھا جا رہا ہے“

مین نے کہا ”تجسس تمہارے ترقی یافتہ خیالات نے میرے ترقی یافتہ خیالات کو کیوں خارج کرنا شروع کر دیا“

وہ بولی ”یہ تو میں جانتی نہیں مگر ہاں اب ولایتی مور کا پر تھا ہاں بدن سے گرا جا رہا ہے“

مین نے کسی قدر بناوٹی غرور کے ساتھ جواب دیا ”تم نے ایک طرح مجھ کو ابنا یا۔ اگر میں ایسا ہی کالا تھا تو بیاہ کس لیے کیا تھا؟“

اس پر وہ کچھ ناراض نہیں ہوئی بلکہ کہنے لگی ”جی ہاں معلوم ہوا اگر تمہارے ایسے بھی کالے ہوتے تو پھر کیا تھا“

یہ بات کچھ جھوٹ نہ تھی۔ مین درحقیقت ایک شکیل اور وجیہ آدمی ہوتا جسکی تصدیق ولایتی سوسائٹی کی لیڈیوں سے بھی ہو سکتی ہو۔

(۳)

اس دن کے بعد مولراج کی حالت روز بروز روبہ اصلاح ہوتی گئی۔ اسکی کھانسی بھی کم ہو گئی۔ منہ کی زردی بھی دور ہو گئی۔ آنکھیں جو اندر

مین نے ملائت سے جواب دیا ”وہ تو یہی کہتا ہے۔ اسکا بیان ہو کہ اگر مجھے ہر روز دو وقت چرنامرت نہ ملا تو اب کب مین نہ بچوں گا۔ سطح بن پڑے غریب کی آس پوری کرو۔“

وہ خاموش رہی جس سے مین نے ”نیم رضا“ کا اندازہ کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد ہم دونوں نیچے آئے جب مین نے مولراج کو یہ خوش خبری سنائی تو وہ مارے خوشی کے پھولا نہ سمایا۔ لیکن چند ہی منٹ بعد ایک آہ بھر کر بولا ”افسوس میرا بیان کوئی نہیں ا“

مین نے پوچھا ”پھر تم کہاں رہو گے؟“ وہ میری طرف دیکھ کر کہنے لگا ”کیا آپ زراہ عنایت مجھے یہیں تھوڑی سی جگہ نہ دے سکیں گے؟“ اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔

مین نے کہا ”تم اگر چاہو تو شاگرد پیشہ کے مکانات میں رہ سکتے ہو۔ وہ کہنے لگا ”اگر آپ مجھے اس کی اجازت دیں تو اور کس بات کی ضرورت ہو۔ کل رات میں نے وہیں کھانا کھایا تھا۔“ اتنا کہہ کر وہ پھر زور زور سے کھانسنے لگا جب کھانسی کا زور کسی قدر کم ہوا تو کہنے لگا ”اگر آپ مجھے اجازت دیں تو میں ماما جی کے درشن کر آؤں۔“

مین اُسے اپنی بیوی کے پاس لے گیا۔ اس نے اسکے پاؤں چھوئے۔ میری اہلیہ اسکے چہرے کی طرف رحم کی نظر سے دیکھنے لگی۔ میسر پر گلاس میں پانی رکھا تھا مولراج نے اس میں سے تھوڑا پانی ہاتھ میں لے مٹی پر ٹھیکر چرنامرت لیا اور اسکا جو حصہ باقی رہ گیا اسے سراد آٹکھوں پر لگایا۔

اسی طرح اس نے دو تین دن گزار دیے۔ لیکن مجھے اسکا مرض کسی طرح کم ہوتا نظر نہ آیا۔ آخر وہ ایک دن مجھ سے کہنے لگا ”کیا ماما جی مجھے اپنے سن سے چرنامرت نہیں دے رہے ہیں؟ کیا بات ہو میں ابکے اچھا نہیں ہوتا؟“ اتنا کہتے ہی اسے اس زور کی کھانسی چھڑی کہ آنسو بہنے لگے۔

کو گھسی ہوئی تھیں بھرنے اور روشن ہونے لگیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور میں نے دیکھا کہ میری بیوی بھی بہت مطمئن ہو۔ وہ مولراج سے گاہ بگاہ کھرا کام بھی لیا کرتی تھی۔ جس کام پر بھیجنے کے لیے کوئی نمبر نوکر نظر نہ آتا اس پر مولراج کو بھیج دیا جاتا تھا۔ ۲۷ بیاکھ کو میرے ایک دست کے ہاں شادی تھی۔ وہاں سے ہم لوگ بہت رات گئے لوٹے والے تھے۔ بات یہ تھی کہ رسوم شادی کے بعد ناک ہونے والا تھا جسکی وجہ سے ہم رات کے ۲ بجے سے پہلے کسی طرح گھر واپس نہ آسکتے تھے میں نے اسکا ذکر اپنے نوکروں سے کر دیا۔ اس سے چند روز پہلے میں نے اپنے کتب خانے کا انتظام مولراج کے سپرد کیا تھا۔ اس روز سے میں اس سے کہا ”تم آج کتب خانہ ہی میں سونا اور ذرا ہوشیار رہنا“

اس نے جواب دیا ”آپ بے فکر رہیں جب تک آپ واپس نہ آئیں گے میں جاگتا ہی رہوں گا۔“
بعد میں جو کچھ ہوا اس سے یہ بات ثابت بھی ہو گئی کہ وہ سچ بچ جاگتا ہی رہا تھا۔

باوجود بہت سی دوڑ و دوپ کے ہم لوگ رات کے ۳ بجے سے پہلے گھر نہ آ سکے۔ واپسی پر میری بیوی کپڑے بدلنے اندر گئی اور میں نے خواہ گاہ کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھولتے ہی جو نظارہ مجھے دکھائی دیا اس نے ایک دم مجھے حیران و ششدر کر دیا۔

دیکھتا کیا ہوں کہ مولراج بڑے صندوق کے سامنے بیٹھا ہوا ہے۔ اسکے چاروں طرف سونے چاندی کے برتن پھیلے پڑے ہیں۔ برتن الی الماری کے دونوں پٹ کھلے ہیں۔ مجھے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر وہ ”بتاجی“ بتاجی“ کہہ کر چلانے لگا۔

قریب جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ بندھا ہوا ہے۔ حقیقت اس صندوق میں ایک خاص کل لگی ہوئی تھی جسکا ذکر اس جگہ ضروری معلوم ہو رہا۔ جن دنوں میں ولایت میں تھا نیلام میں یہ صندوق کیسے دگران قیمت

پر خریدا تھا۔ اس میں کسی قسم کا نقل بالکل نہ تھا۔ اس کے بجائے ایک چھوٹی سی کل لگی ہوئی تھی جو مختلف دھاتوں کے چھوٹے چھوٹے گول ٹکڑوں سے مرکب تھی اور جس پر چند حروف کندہ تھے۔ ان حروف کو ملا کر ایک خاص نام بنا پا رہا تھا۔ جب یہ نام بنجا تا تو کل کو کھینچنے سے صندوق خود بخود کھل جاتا تھا۔ اس کل کے ساتھ ایک چھوٹی سی پن لگی ہوئی تھی جسے صندوق کو کھولنے سے پہلے ہٹالینا ضروری تھا اگر کوئی شخص پن کو ہٹائے بغیر صندوق کھولنے کی کوشش کرتا تو دھڑک سے کمانیاں نکھڑ کھولنے والے کے ہاتھوں کو جکڑ لیتی تھیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ کسی روز میری بیوی کی عدم توجہی کے باعث مولراج نے صندوق کو کھولنے کا نام تو معلوم کر لیا مگر پن کی کاریگری معلوم نہ کر سکا۔

مولراج کو اس حالت میں دیکھ کر میری آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ دل نے کہا دنیا میں کسی پر اعتبار کر کے راحت نہیں ملتی۔ مولراج کی بیوقوفی ایسی صورت کو دیکھ کر کون جان سکتا تھا کہ اس میں یہ گن بھی موجود ہوں گے۔ اس وقت کے بعد یہ عقیدہ ہو کہ جو لوگ کسی کا پہرہ دیکھ کر اسکی سیرت کا اندازہ کرنے کے دعویدار ہیں وہ بیوقوف ہیں۔ میں نے اس کے قریب جا کر غصے کے لہجے میں کہا ”سوے بہ نخبہ یہ کیا حرکت ہے؟ کیا بیٹے باپ کے ساتھ ہی سلوک کیا کرتے ہیں؟“
جوش و غضب میرا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ مولراج نے روتے روتے کہا ”بتاجی میرا قصور نہیں۔“

اسکی زبان سے یہ سنتے ہی میں آئی کہ منہ پر زور سے ایک طمانچہ ددن لیکن میں نے اس ضبط سے کام لیکر جو میرا خاصہ ہے اپنے آپ کو سنبھالا۔

ٹھیک اسی وقت میری بیوی بھی اسی کمرے میں داخل ہوئی۔ مولراج کو اس حالت میں دیکھ کر وہ بھی حیران رہ گئی اور میری طرف

سابقہ عنایات کا ذکر کرنے کے بعد اس نے لکھا تھا کہ میرا پڑا مرض پھر عود کر آیا ہو۔ اب کے شاید نہ بیچ سکون گا۔ کئی بار ارادہ کرتا ہوں کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوں لیکن صورت دکھانے کا حوصلہ نہیں خط کے آخر میں لکھا تھا:۔

اگر میں دوبارہ آپ کی خدمت میں رہ کر ماما جی کا چرنامہ بتا سکتا تو شاید میری ناپاک روح اس کثیف جسم کے ساتھ چندے اور وابستہ رہتی۔ لیکن اب میں کس مُتھ سے آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ میرے کمرے کی یہ سزا جو کہ میں قبل از وقت مرنے والا ہوں۔

میری بیوی نے اس خط کو شکر کہا "میری ایک بات مانو گے؟" میں نے پوچھا کیا؟

کہنے لگی "مولراج کو یہاں آنے کو لکھ دو"

میں نے کہا "وہ تو نوکری کر رہا ہو۔ یہاں آکر کیا کریگا؟" کہنے لگی "لکھ دو چھٹی لیکر چلا آئے"

میں نے مذاقہ لہجے میں کہا "چرنامہ تو دینا چاہتی ہو؟ یہی خواہش ہو تو دو چار دنس کی شیشی میں بند کر کے پارسل کر دو۔"

وہ بولی "نہیں نہیں۔ اُسے دیکھئے کہ بہت جی چاہتا ہو۔ تم جانتے ہو وہ اپنی زندگی کے لیے میرا ممنون ہو۔ اسے چونکہ مجھ سے فائدہ پہنچا ہوا ہے اس لیے قدرتی طور پر مجھے اس کے ساتھ گونہ دلچسپی ہو۔ گو میں مانتی ہوں کہ یہ بھی ایک انسانی کمزوری ہو۔"

میں نے کسی قدر سنجیدہ لہجے میں جواب دیا "میں مبارک ہوں جسکی بیوی ایسی ہو جس کا چرنامہ بتا دے کہ لوگ نئی زندگی پاتے ہیں وہ بولی مذاق کیوں کرتے ہو۔ میں یہ تو نہیں کہتی کہ اس نے چرنامہ بتا دیا کہ نئی زندگی حاصل کی ہو میری مراد دراصل اس معاملے سے ہے کہ اگر تم اُس روز میری بات نہ مان کر اسے پولیس کے حوالے کر دیتے تو یقیناً اُسکی زندگی ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جاتی۔"

مخاطب ہو کر بولی "یہ کیسا معاملہ ہے؟"

اسے دیکھ کر مولراج نے اور بھی زور زور سے رونا شروع کیا میں غصہ سے کہا "چپ رہ سو۔ مارتے مارتے ہڈی پسلی توڑ دوں گا۔" میری بیوی نے کہا "چلو اُس کمرے میں چلین" یہ کہہ کر اور میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لے چلی ہو دوسرے کمرے میں جا کر وہ ایک کوچ پیٹھ لگی اور پوچھنے لگی "اب کیا ہو گا؟"

میں نے جواب دیا "ہونا کیا ہو۔ بد ذات کو پولیس کے حوالہ کر دینا" وہ تھوڑی دیر چپ چاپ بیٹھی رہی۔ پھر بولی "دیکھ پولیس میں دینے سے کچھ حاصل نہیں۔ میری مانو تو اسے چھوڑ دو۔ اسنے لالچ کے بس میں آکر یہ حرکت کی ہو۔ یہ اسکا پہلا جرم ہو اور اسکی خطا قابل عفو معلوم ہوتی ہو۔ اسے اس کا موقع ملنا چاہیے کہ اپنے آپ کو سدھارنے کی کوشش کرے۔ اگر اسے پولیس کے حوالہ کر دے تو اسکی زندگی تباہ ہو جائے گی" میں نے دل میں سوچا مولراج اگر چوری کر کے بھاگ جاتا تو ہیرا رحم کرنا ناممکن تھا لیکن اسکا کام تمام ہی رہ گیا۔ سنار سب سے کہی پہلی خطا پر گذر کیا جائے لیکن پھر خیال پیدا ہوا کہ ایسا کرنے سے کہیں سوائی میں حرف گیری نہ ہو۔ اسکا ذکر میں نے اپنی بیوی سے بھی کیا۔

وہ بولی "نہیں اسے حوالہ پولیس کرنے میں زیادہ چرچا ہو گا۔ ایک ذرا سی بات کے لیے کسی شخص کی زندگی تباہ کر دینا کوئی قابل داد کام نہیں ہو۔"

تھوڑی غور کے بعد میں نے مولراج کو چھوڑ دیا۔

اس واقع کے تین سال بعد مولراج کا ایک خط ملا۔ ان دنوں وہ لاہور میونسپلٹی میں ٹیکس داروغہ کا کام کرتا تھا۔ اس خط سے معلوم ہوا کہ اس کے ماموں نے ۵۰۰ روپیہ ضمانت داخل کر کے اُسے یہ آسامی دلانی ہو۔ کچھ دنوں اسے بہت تکلیف برداشت کرنا پڑی تھی۔ وہ ادھر ادھر سے بھیک مانگ کر گزارا کیا کرتا تھا۔ ہماری

مین نے جواب دیا "اس اخلاقی زندگی سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو نفس زندگی کے لیے بھی وہ تمہارا ہی ممنون احسان ہو۔ اگر تم اسے اپنا چرنامت نہ دیتین تو وہ کبھی کام چکا ہوتا۔"

میری بیوی یہ سنا کر خوب ہنسی۔ مین اسکی اس ہنسی کا مطلب بالکل نہ سمجھ سکا اور حیران ہو کر اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا جب اسکی ہنسی کسی قدر کم ہوئی تو مین نے وہ دریافت کی وہ کہنے لگی۔ "تم شاید ابھی تک یہی سمجھ رہے ہو کہ مولراج میرا چرنامت پی کر اچھا ہو گیا تھا؟"

مین نے جواب دیا "چرنامت پینے سے نہیں تو کیا تمہارے پاؤں کو ہاتھ لگانے سے؟"

بولی "جی نہیں۔ یہ ایک چھپا ہوا معاملہ ہے۔"

مین نے نہایت حیران ہو کر پوچھا "وہ کیا؟ وہ کیا؟"

کہنے لگی "بات دراصل یہ ہے کہ جب مین نے پہلے دو تین روز کے اندر دیکھا کہ اسے میرے چرنامت سے کچھ فائدہ نہیں ہوتا تو مین نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ دو نون وقت اس مین ایک ہو میو پیٹھک دو اکی چند بونڈین ڈال دیا کرتی تھی۔ وہ اسے خالی پانی کا دھوون

سمجھ کر پی جاتا تھا۔"

مین اپنی بیوی کی عقل اور دراندیشی کا قائل ہو گیا۔

چند روز بعد مین نے مولراج کو لاہور چلے آنے کے لیے لکھا۔ مگر اس نے جواب دیا "مین نہیں چاہتا ہوں کہ کالاسٹھ آپ کو نوکو دکھاؤں۔ مجبوراً مین نے ہو میو پیٹھک دو خرید کر اس کے پاس بھیج دی۔"

اس کے ہفتہ بعد پارسل لوٹ آیا۔ اسی روز شام کے وقت پولیس کا ایک اہلکار مجھ سے دفتر میں ملاقات کرنے آیا۔ اس سے میری پہلے کی جان پہچان تھی۔ مین نے مولراج کے نام جو خط لکھا تھا اسے نکال کر اس نے پوچھا "آپ کو اس شخص کا کچھ پتہ معلوم ہو؟" باعث دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ مولراج میونسپلٹی کا بارہ ہزار روپیہ لیکر مفقود انجر ہو گیا ہے۔

جب اس بات کا ذکر مین نے رات کے وقت اپنی بیوی سے کیا تو اس نے یہ کہہ کر ڈال دیا "ہرے رام! اس بیچارے پر کتنی بڑی تمت لگائی گئی ہے۔"

روشن لال

کلام شاد

از ہمارا جہاد سر راج کشن پرنشاد صائب القابم

دست از دنیا و از اہل کرم بایکشید
از یقین و اندولت گر تہم وجہ اللہ را
رخت ہستی را بمیدان عذم بایکشید
طالب دیدار باشد گر کسے از صدق دل
دست از دیر و کلیسا و حرم بایکشید
ملکہ داری بزیر سنگ دست خوشیستن
یک نفس دریا و جانان صبحدم بایکشید
چند بار منت اہل کرم بایکشید

گردن خود از فرمان قضا ہرگز متاب
شاو رہ خود نہ از جہا القلم بایکشید

تصویر خموشی

(۱)

چمن دلپذیر یہ دلکش ادا کی شان ملتی ہوئی گلون سے رُخِ خوشاکی شان
حیرت نادر ہاں سکوتِ تشاکی شان ہر سرِ بون بخت سی صورتِ خدا کی شان
اندازِ خاموشی نے بڑھایا دہن کا حُسن
ایسے سکوتِ ناز بہ صد سخن کا حُسن
کس سوچ میں کھڑی ہو کہ یونٹن حال تو کیوں ہو غریقِ فکر و رینِ طال تو
لے خوش حال کچھ تو بتا اپنا حال تو تصویرِ سکوت کی اک بے مثال تو
ڈوبی ہوئی ہو بحرِ تفکر میں اس قدر
خود اپنی ہی تجھے نہیں لے ناز میں خبر

کسے خیال نے تجھے بخود کیا ہر آبِ محویت و سکوت کا انداز ہر عجب
رکھی ہو کس ادا سے ایکشتِ نیر لب اس حسن پر ہر یہ سری وارِ فلکی غضب
آخر نگاہِ ناز ہو کس سے لڑی ہوئی
حیرت سے کہتی ہو کسے تو کھڑی ہوئی
تو اپنے منہ سے کچھ نہ کہے پھر بھی لگھڑا اس وقت کے سکوت سے حالت ہو شکار
بلکہ نہیں جھپکتی ہیں حیرت میں چا کچھ اور خاموشی سے بڑھا حُسن کا وقار
کیفیتِ دلی کو چھپایا تو کیا ہوا
زنگ پریدہ رُخ کا حقیقتِ ناہوا

گودل ہجومِ فکر و تردد سے ہو نگار جوشِ شباب ہو مگر حُسن پر بہار
رعنائیاں ہیں صورتِ زیبا سے شکار لبِ لعل اور لالے کے ڈھول ہیں خدار
سانچے میں ہو ڈھلا ہوا تار کٹن ترا
دارِ فکلی میں بھی ہو وہی بانگین ترا

باغِ جان میں کون کرے تجھ سے ہم سری فطرت نے تجھ کو حُسنِ بیا عیب سے بری
ہر عضو ہر ادا سے نمایاں ہے دلبری زنگتِ خذلے خوب ترے حسن میں بھری
لے دُشہ منبر کی زنگن تصویرِ ملاحظہ ہو (ایڈیٹر)

تو صفحہٴ جہان پہ ہر اک نقش و نشین
میں جلوہ گاہِ دہر میں تجھے بھی کم حسین

کسنی ٹکی ہو شیر پہ یہ نازِ قہر ہے پہلِ شک رہا ہو یہ اندازِ قہر ہے
آنکھیں بلا ہیں قد سرفرازِ قہر ہے رے حسین کا حسنِ خدا سا ز قہر ہے
ساری کی خیتون نے بڑھائی بڑھان
ہر سطر ہر شکن میں تم دستاں حُسن
مالا ہو موتیوں کا گلے میں گران ہا ہاتھو میں یہ طلائی کڑے بھی ہیں ڈربا
پوشاکِ جسم صاف ہے پچھو خوشنا تلوے کے ٹیکنے کی بھی ہو دلنشین ادا
خود رفتگی نہیں ہو یہ ہو جانِ دلبری
محوی کو بھاگتی ہو ترسی شانِ دلبری
محوی لکھنوی

(۲)

خموشی سے ہمیشہ آبر و عزتِ بشر ہے کرے جب جس دم غواصِ دما میں گہرائے
جو دیارِ دلِ خموشی سے ہم آغوش ہوتا ہے سمندر میں گیا سیلاب تو خاموش ہوتا ہے
لبِ خاموش چن محفوظ آفاتِ جانی سے گلِ تصویرِ مرجھا تا نہیں بادِ خزاں سے
زبانِ چکرِ رفاقت چھین لیا یگی مردم سے بشر کے دلبون میں تفرقہ ہو گا کلم سے
لبِ خاموش کا دونوں جان میں لبِ لاہو وہی آرام سے ہو جبکہ دروازے میں تالا ہو
نہوتی گز زبانِ شمع تو گل گیر کیا کرتا نہوتی گز زبانِ خامہ قطارن کیوں ہا کرتا
مے تابِ خموشی سے بشر مدہوش ہو جائے سراپا چشم بن جائے ہم تن گوش ہو جائے
بلا تحریک کے تا قوس کب کچھ منہ سے کہتا ہے وہ اپنی بے زبانی سے سدا ہنست لہی تاتا ہے
جو پہلِ نظرِ فضلِ زبان ہرگز نہ کھولے گا مثالِ مروک سب کی کھل بھی کچھ نہ بولے گا
ضیاء لبِ چینی میں بہت قریب ہوتی ہے صدقِ منہ بند رکھتی ہو تو گوہرِ باب ہوتی ہے
سکوتِ شبِ بشر کو خدا پا بخت میں لاتا ہے سکوتِ لبِ مزہ حسنِ خیل کا بڑھاتا ہے
طریقِ بے خودی سے سلسلہٴ حقِ نبوتی ہے عجب کیا اگر خدا ملجائے اندازِ خموشی سے
در بڑا جگاڑی ہو وہی نظرِ نیچے جھکتی ہے سبیلِ گفتگو میں کم سخن کی بات بڑھتی ہے

پیمانہ گل ہے اور سے بھی
از اڑ کے ہوا میں لٹ سنبھل
ڈالی ڈالی ہری بھری ہو
گلشن میں ہیں دیدنی گل تر
تھریک ہوا سے چل رہے ہیں
غنچوں کی چٹک میں یہ صدا ہو
پردہ زین چھپی کھڑی ہو شوخی
تائیر کی جھلکیاں دعائیں
تسلیم کو بیلین کھڑی ہیں
خاموش ہر ایک شخص بالکل
دربار ہے شاہ رشک جم کا
غنچوں کی نظر بھی راہ پر ہے
قلب پہل ہے اور سے بھی
بنجاتی ہے چتر شاہر گل
نظروں میں ہر اک چمن پری ہو
دل کی صورت روش روشن ہو
گلگون کو تل ٹل رہے ہیں
عثمان کا دور آگیا ہے
آنکھوں میں حیا بنی ہو شوخی
اڑتی ہوئیں برفیں ہوئیں
گلزار میں پلٹنیں جمی ہیں
آواز نقیب صوت بلبس
غل ہے تو نگاہ برت دم کا
اور نذر کو مٹھیں میں زہر ہو

ساتی مے جانفرا پا دے
دہ مے جو ہے سن حق پرستی
تکلیف عمار سے بری ہو
نیشے سے بری وہ بکے نکلے
ان جام پہ جام آب لیے جا
سرکار ہوئے جلوس مندرما
بگڑے ہوئے بخت کو بنا دے
وہ مے کہ خدا ہے جیسے مستی
وہ مے ہو کہ کشت دل ہری ہو
ادان بے مل سے تنگے نکلے

وہ کون کہ خسرو مظہم
حسن مہرچ دولت دہال
سلطان کن کریم دباذل
روفق دوسند حکومت
مقبول زمانہ جان عالم
اور نگ نشین جاہ و اقبال
حامی غربا کے شاہ عادل
ظہر خالق پے رعیت
زخم دل بیکسان کا مرہم
آفاق میں دستگیر عالم
عثمان علی ہے نام نامی
شکل میں ہر ایک کا جامی

کھلے گی جب کلی تو پھر لکڑالی سے ٹوٹے گی
رقعت کلامی میں سرفرازی کی کھاتیں ہیں
معز ہون اگر طول سخن عموماً کم کر دین
زبان سکی ہو قابو میں اُسے دنیا سے کیا ڈھونڈ
دل فرزند جو پر تاب ہو نور خموشی سے
جہالت کی کثافت دست خاموشی سے جاتی ہو
کے شمع کا جب کٹے ٹھکے پھول ٹھٹھکے ہیں
زیادہ بونا گویا سخن کی قدر کھو نہا ہے
خمشوئی سو بلائیں ٹالتی ہو یہ سلم ہے
کوئی دلسوز ہدم بے ضرورت ثابت کھوٹے گا
زبان کھوٹے گا عالی ظرف مطلب کی نڈیا کر
شنا تا ہو یہ شعر فارسی کس اگر خموشی سے
منی کا پرچہ العصر تصویر خموشی سے
پہلے ہم ہیچ مضمون۔ زب لب تن نئی آئے
خمشوئی سنی دار و در کہ گفتن نمی آید

طالب بناری

بہار دکن

جو بن پہ وہ گلشن دکن ہو
ہستی ہوئی اسلیل صہبا
میخوار دن میں شغل ہے پستی
قرآن نسیم ہر نفس پر
شہرہ ہر سو چین چین ہو
ڈوبا ہوا دامن تنہا
رنگ عشرت مٹھ ہوں پر
مغور طرب نگاہ ز گس
مستی میں جو آگے جھومتی ہے
منہ غنچہ دہن کا چوستی ہے
یہ نظم حسن نظام کی مست نشینی کے وقت پر کہی گئی تھی۔ اس وقت کہیں شائع ہو سکی اس ماہ
چند کہ حضوری سا لکھو کا جشن منایا جا رہا ہو لہذا امید ہو کہ اسکی اشاعت بروقت نہ بھی جا سکی ۱۱۰

اللہ اللہ ہے کیا حکمت اقبال خداوندتہ دوت
شمت بھی خوشی میں جھوتی ہو جھک جھک قدم کو چمتی ہو
سرور سے جمال سے ہے گویا یہ زبان حال ہے
یہ ساری رخت ہو مبارک یہ تخت یہ تخت ہو مبارک

ستاؤ اسکو نہ بہر شہ نہ غلام کرو کہ گھر میں آپ کے یہاں ہے اُردو
غلط ہو یہ کہ ہو الفاظ کی کمی اس میں بہت سوچ ہماری زبان ہے اُردو
حرفیت اسکو کبھی زیر کر نہیں سکتا یہ رزم گاہ میں وہ پہلوان ہے اُردو
انہیں سے لونگا فصاحت کی داد اُردو
جو کہ رہے ہیں کہ میری زبان ہے اُردو

زوارِ آبادی

تصویرِ جاں

اللہ اللہ کہ قدر دلکش تری تصویر ہو جسکی خاموشی میں لطف شوخی تقریر ہو
عارضِ روشن تراؤ اشک کی تفسیر ہو یا بیاضِ صبح کی پھیلی ہوئی تنویر ہو
حسن کی دیوی ہو یا کوئی پری پیکر ہو
کاندی ہو پیر ہن تیرا عجب دلبر ہو تو

غنچون نے جو دیکھی شگفتہ پاری ٹوپی بہرِ سلام اُناری
گردن شاخون نے بھی جھکا دی تسلیم و رضا کی خود کھادی
بہل کے ہن چار سو تراسنے بجتے ہن خوشی کے شاد لینے
حسن رخ شاہِ افلاک ہے فستراں نگاہِ مردک ہو
جاری ہے ہمایہ ہر زبان پر یارب دامن رہن یہ سرور
جب تک کہ زمین پہ آسمان ہو
عثمان علی ہوں اور جہان ہو

سلام

اُردو کیا ہے

فصاحت اور بلاغت کی جان اُردو قسم خدا کی انوکھی زبان ہے اُردو
غلط نہیں ماردعوئی یہ مدعی ہن عین عزیز خلق ہو مٹھی زبان ہے اُردو
سلیس ایسی کہ چڑھ جاتی ہر زبان پور نفیس ایسی کہ ملکی زبان ہے اُردو
محیط ایسی کہ ہندوستان میں پھیلی ہو ہر ایک شخص کی پیاری زبان ہے اُردو
ادب ایسی کہ علم ادب سکھاتی ہے وسیع ایسی کہ سب کی زبان ہے اُردو
ظفر نے دھوم مچادی ہر سنانے میں کہ فتح اُسکی ہے جسکی زبان ہے اُردو
خراب اسکو نہ لے دوستو اُردو ہرگز بڑی ہے عیسے ابھی زبان ہے اُردو
بل کے قافیہ کرا نظم کرتا ہوں کہ اسے قابو ہے میری زبان ہے اُردو
فاک آتی ہیں میہم صدائیں کاونہیں زمین شعر پر اک آسمان ہے اُردو
محاورات ہیں انکے کہ لعل کے ٹکڑے غرض ضرور فصاحت کی گان ہے اُردو
بہت سادہ ہیں الفاظ کے جتنے ہیں جدید طرز کی گویا کہ سان ہے اُردو

بے زبان ہو تجھ میں نہ انداز گویا بی نہیں وہ لہجہ بخش و انجازِ سیحانی نہیں
وہ گلِ خسار کی دھچپے عنائی نہیں حسن عالم سوز کی وہ عالم آرائی نہیں
وہ ترافتنا نہیں نقاش نے کھینچا ہے
نقل تیری وہ نہیں ہر اصل کا دعویٰ ہے

کاش گویا بی بھی ہوتی پیکر تصویر میں کاش ہوتی صوفتانی حسن پر نور میں
کاش دتا سحرِ بابل کا اثر تفسیر میں ہوتی زیت اس سے بزم عاشق و لگیر میں
تو دکھا دیتی تاشاکِ نیالے جانِ حسن
اور ہو جاتی دوبالا اس سے تیری شانِ حسن

پیکر تصویر کے الما نہ بھی کچھ کم نہیں بزم ہستی کی ہر وفی تجھ سے لے ماہِ مبین
شانِ عنائی بھی معشوقہ نہ جاتی ہر کہیں حسن پر تنویر تیرا خوشنماؤ و نشین
باغِ عالم میں شگفتہ اک گلِ شاداب ہو
لے رہو جی تو رشکِ مہرِ عالم تاب ہو

انگ تیری شرم انگ تیرا اندازِ حجاب رے روشن کو چھپایا زیرِ دامن نقاب

کیوں ہوئی جاتی تھوڑا حیا سے آب زلف بھی شانے پہ ترے کھا رہی پیچ تاب
آسمان حسن پر جو یہ گنٹا چھائی ہوئی
یارتے شانے پہ جو زلف رسائی ہوئی

فتنہ عشرے بڑھکر ہے قدر عمارتا بونا پٹا سایہ قدس صنوبر ہو گیا
رہے روشن دیکھا آئینہ کو سکتا ہوا محو حیرت بکے پہون شوق سے دیکھا کیا
آئینہ بھی ہوئے رخ کی صفائی پر شمار

لعل صندل پندان پر تے گو ہر شمار
زکس شہلا ترے آنکھیں ہیں چشم غزل صورت آئینہ حیران میں ہتا ہون ال
میں تری چشم فسون گرسے ہوا ہون پال برش تیغ نگہ نے کر دیا محکو حلال
رجھی چوں سے جو دیکھا اکٹ انداز سے
دل ہوا سہل ترے تیر نگاہ ناز سے

وہ وصل علی کیا دلکش تصویر ہے اس میں شان دلبری ہو دہا تصویر
سچ تو یہ ہے آفتاب یہ معجز نا تصویر ہے عکس بول ٹھٹھا ہو خود دیکھو کیا تصویر
ہو مصور رنگ آئینہ بھی حیران دیکھ کر
اتنی دہراؤ دونوں ہیں شبان دیکھ کر

ادج - گیادی

ہو جو بالائے چین جنم کا ٹیکا شکا
دیدہ مخور سانی کہ رہا ہوا رات دن
مہر کو آنکھیں دکھائے دیدہ آفت نظر
باد بے داد جب یار جوان ہو جائیگا

طرز خود رانی سے خط و رسم انی میں کہاں
دانش ایام پیری - اسچ انی میں کہاں
کم سخن ہو کر گل خورندگی چھتا ہو کون
ہو جوان میں گرچہ لازم ہو یہ نورانی صفا

خانہ دلین مینا ہو بیان سامان عشق
ہو جوانی کی سہ سستی شب رنج و بلا
دشمن میں دشمنی دل - دشمن فرزاگی
دامن دلیسے افزون کوڑہ دل کی ترنگ

ہو کمال اس عہد کا سایہ جان کیو سٹ
اُس جوانی میں خوشی کی کون فراوانی ہو
روشنی لازم ہو صبح زندگانی کے لیے
ہن گمراز و بخترا سچ انی کے چراغ

کہ گئے ہیں شرکیا ہی بے بدل سدا داغ
ہر ادستانہ سے پانون تک چھائی ہوئی
ان تری کا فر جوانی پوش پائی ہوئی
کہ گئے ہیں شرکیا ہی بے بدل سدا داغ

طالب بناری

طالب بناری

جذبات و فاقہ

قوم میں جو آجکل فیشن کا پھیلا روگ ہو اے اپنی کم نصیبی کا یہ خاصا سوگ ہو
اب مسلمان آریہ سب ہنر بان کہتے ہیں یوگ کے بیسے مسل نازک بدن کا جوگ ہو

کچھ نہیں پروا اگر لطفال زن کون مرین گھر میں کھانے کو نیلیکن بڑا سا پیٹ ہو

نشد شباب

(اس نمبر کی رنگین تصویر ملاحظہ ہو)

کیفہ دوران جوانی نشہ دور شباب پردہ ایوان قدرت خواب ہویش شباب
زنگبہ فروز رخ حسن سہستی شباب زندگی کا عین جو بن جو ہر سستی شباب
رہزن ہوش فراست دیدہ مست شباب دیکھئے کیسی بھری ہو دو کٹورون میں شراب
ہموہوش جوانی - سرکشی کی لاگ ہے ظلم پر یہ ظلم گویا اک میں دراگ ہے!
یہ تغافل ایسا آڑہ پن یہ ہتھکنا کہاں؟ جدو حسن آفرین جو اسچ انی میں عیان
تاک باونین سراسر تانابان اربین ہو خط فقرہ محک پر برق خندان اربین

جان جائے قرض کے غم میں مایوس فویشن
اتھ میں تپتی پھری، کوٹا در تلوں بیٹ

مغلط حسنہ

دہم تو نہیں جیب میں مغزور ہیں ہم
برہم ہیں کہ مفلوک ہیں مجبور ہیں ہم
عسرت ہو بہت قوم میں سجدہ نفاق
افسوس کہ میں خوار تو مسرور ہیں ہم

دیکھنے جاتے ہیں ہر در مسلمان تھیر
کب تک کھین گے بربادی کا پانی بٹر
اب خدا رحم کرے اپنی حالت جو فنا
بڑھ گیا حد سے بہت قوم کا تھر مایٹر

خواری و ذلت اٹھائی لیڈون سے قوم نے
لیگ مسلم اک طرف اور لگی گھائی اک طرف
یہ نسل آتی ہو صادق یہی حالت چرنا
سبائی اک طرف جو روکا بھائی اک طرف

مرشد ہیں بنے جب سے یہ سب کٹھن ملا
دیتے ہیں مرید کو بہشتی حلد
تسبیح زبان پر ہے، مگر دلمین یہ
گھسہ بار مرید کا ہو غائب غلہ

بیکار امیدوار کو اس بھی ہو
اک طرح سے اس کا ستیا ناس بھی ہو
بیچارہ شکایت جو کرے حاکم سے
مٹا ہو جواب "تو مل پاس بھی ہو"

جبکہ ہم فیشن کے نائق ہیں تو پھر کیا دیرو
بوجھ سے اُسکے ہے بھاری کے ٹوٹی ہوئی سہی
واٹس ایس تو طرز میں دخل تو اپنی دیکھیے
بال ہون ابرٹ فیشن ایک جٹو بھی سہی

دشت یہ تہذیب نہ تہذیب کی دم
اسے ہندو یا شرامو یہ کیا کرتے ہوم
تہذیب کی تقلید اسے کہتے ہیں
مشوق ہے ساتھ لندین خم کے خم

انسان کی بربادی میں اک زہی ہو
کو دینے کو سب نظر ناز بھی ہے
کتا ہو گلا پھاڑ کے اُبھر اجو بن
مشوق طرح دار ہو ہم باز بھی ہے
غلام محمد دقا۔

دُنیا ہو کیا؟ سر ہو کب ٹھہرنیکی جا ہو
عالم سراب کا ہو رکھائی سہین کیا ہو
بتلا یہ خاک کا جو انسان میں جان کیا ہو
دم اس میں گزرا ہو پانی کا بکلا ہو
ہر چیز کو فنا ہے یارب اچھے بقاء ہو
تو مالک حقیقی دُنیا جان کا ہو
ایذا دہی بڑی ہو ایذا رسان بڑا ہو
کبر اور ہو بشر میں کیا تجھ کو ہو گیا ہو
مٹی کے پتے ہر دم کیون خاک چھانتا ہو
جو چاہ تیرے آگے دُنیا کی چاہ کیا ہو
اسان میں غیبی احسان ہو گیا ہو
کیون نام کی ہو خواہش سکھان ہو
کل پر نہ اُسکو رکھو جو کام آج کا ہو
نیرنگیوں سے جا پھورنگے مانا کیا ہو
گر ہونہ آدمیت وہ آدمی ہی کیا ہو
جو یکسو نہ ہو پوچھ کیا اُس کا پوچھا ہو
دے ساتھ وقت بد میں کون ایسا آتا ہو
ہے قابل پرستش جو یار با وفا ہو
نیکی جو حق کی رحمت لیکن بدی بلا ہو
دلین بدی کا آنا آفت کا سامنا ہو
بیدار ہیں عاقل غافل اتو سو ہا ہو
برباد ہو گا اک دن سر میں اگر ہوا ہو
کر ترک زر کی خواہش آفت دلا ہو
ہو وقت مال دولت تو مفت کھو ہا ہو
عزت کا پاس لکھو یہ پیٹ کو ہر ہے
جو زندگی اسکی جس شخص میں حیا ہو
بے کس کی آہ سے ڈر یہ مارے صدا ہو
ان اباحت بتا ہی بے رحمی دھا ہو
ہونا ہو جو وہ ہو گا کیون نہج کر ہا ہو
ہو عمر تیری کتنی؟ کیون غم میں بٹھا ہو
صحبت بڑی صحبت اک آفت اک بلا ہو
ہو لطف زندگی کا دلین اگر وفا ہو
عزت میں جو ہو عزت کامل ہی جانتا ہو
جو کام سب کے لئے ہادی ہے رہنا ہو
درد آنا سے پوچھو لفت میں لطف کیا ہو
دورنگی جہان دیکھ اک منم اک گدا ہو
چشم کرم بشر سے؟ ذلت کا سامنا ہو
اُس کا دیا ہو روشن جس شخص نے دیا ہو
اگر دل نہ ہو مگر رجام جہان نا ہو
حال سیلہ کاران عبرت کا آنا ہو
ہر چیز ہے مودب چشم خود جو دا ہو
ہو ایک خلق تابع احسان خلق کیا ہو
سننے تھے حال دُنیا دیکھا ذہن کیا ہو

موجان میں ساکب کوئی آشنا ہو
یارِ اودھن کو بس تیرا ہی سر ہو

غلام مصطفیٰ دین

خدا کا شکر ہے

لاٹ صاحب کی ہوئی صحت خدا کا شکر
خیریت شل گئی آفت خدا کا شکر
ہو مبارک غسل صحت ہو گیا مدوح کا
مختر اُجلا ہوا بھارت خدا کا شکر
مرجا شائستہ لیدی ہو گئی صد آفرین
ایسے خطرہ میں بھی یہ ہمت خدا کا شکر
لاٹ صاحب بچکے صدے عم کے بال بال
آگئی آٹے تری عصمت خدا کا شکر
کھیل ہی سارا رگڑا رگڑا ناجو یہ
بنگیا لہ تھی اچل پرست خدا کا شکر
بنگیا لمون قاتل کر کے بے لذت گناہ
رگیا ناکام بد نیت خدا کا شکر
کیا صد کے دار کا ہوتا اثر مدوح پر
ہم قدم تھی دار کے رحمت خدا کا شکر
اپنے آقا پر ہوا قربان ہو جنت نصیب
چھتری دلے نہیں کی ہمت خدا کا شکر
جارج پنجم کے ہوا اقبال کا سار اخیل
ہم کی زندگی بچ گئی خلعت خدا کا شکر
لاٹ صاحب کی لڑائی ہو جو ہند
ہو سوا پیلے سے اب آفت خدا کا شکر
باغ ہستی لاٹ صاحب کے پھولا پھلا
انگشتی ہے یہ دعا خلعت خدا کا شکر
کیون نہ ہو شرع تیرا مصری کی لی
ہو تو شیریں زبان شربت خدا کا شکر

سکھ دیو پودا مہر

العصر کا خیر مقدم

ساتی باز مین میں لا باجم سخن
العصر نے زندہ کر دیا نام سخن
ہین صوٹ زندان مضامین تمام
چڑھا دو کہ آب و دہن میں نام سخن

قرن بھی ادیب بھی تازہ بھی پڑھا
اور علم ادب نیا پڑا بھی پڑھا

العصر جو ہاتھ میں ہلے آیا
باقی تھا سخن کا خزانہ بھی بڑھا

العصر کی شان ہو زالی بیشک
بندش بے مثل طرزِ عالی بیشک
مانے کو نکست از ہارِش پیداست
ہین اس کے مضامین لائی بیشک

ہزار کا نقش ہو کہ مانی کا نگار
العصر ہے باغ علم میں فصل سار
دھپ ہے دلپند ہو دلکش ہو
حاسد کی نظر میں ہو یارِ بد خا

العصر رمالو نہیں زالا ہو جات
سب میں لائانی یہ رسلا ہو جائے
ختر کی دعا ہو کہ ہر ایک پسند
شاکر کا جہان میں بول لا ہو جائے

ختر کشنوی

تازہ غزلیں

مجدد الوقت مولانا سید حسن صاحب ثبوت (میرٹھی)

بھونکا چلے جو رحمت حق کی نسیم کا
ہر شعلہ باغِ خلد ہونا مجسم کا
رد امنی پر اپنی میں آب آب جے ہون
داغ گنہ پھول ہے باغِ نسیم کا
کائنات کا پد رحمت حق نے بھکا دیا
کسکار داغ بارگشاہِ عظیم کا
لغزش کا پاؤں کو نہ الم تھا صلیب پر
ہاتھ نہیں تھا عصا جو اعلامِ یم کا
حمد خدا و نعمتِ محمد سے ربط ہے
نغمہ صریح ملک میں ہو حاویم کا
رحمت کے آگے پاؤں نہ بچشمنِ جم کے
لشکر شکست کھا گیا امید و یم کا
گزار شتابِ شب میں سید ہوئے نصیب
قدح کے حلقہ بنگیا بابِ کریم کا
لے شیخ دورا ہون میں نغم کی چاہ میں
گر ناظر سے دیکھ کے دُزیم کا
تھکھو ہوا تباؤ نگا لے شہرِ ہما
ہے سایہ میر سے حرم کی حطم کا
جنتا ہون میں جو ساتی کو شکرِ عشق میں
دل سرور دُشتر ہے ماہِ یم کا
اند برق کو نہ گیا باہم عرش پر
ہے جرم تھا براق کے عزمِ یم کا

شوکت کو دھیان ابرے نور خدا کا ہو
عالم ہر اسکے قلب میں او دو نیم کا
مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکنوی

وفا کی داد گردینا تو یوں او بیوفادینا مراد دل تو کر رسم محبت کو اٹھا دینا
یہ تاثیر بیان لائے کہاں سے اہل انہی جہان بابیٹنا مغل کی محفل کو لا دینا
ہے محمد و موسیٰ تاکہ شوش انتری کی ہمارے شوق کی بھی ادا کوائے خدا دینا
رسانہ خرم جگر اس زور کی انگریزی کی میں قیامت کر گیا نشہ میں تیرا سکر دینا
میان بزم ساقی کون سنتا فقیر دلی ہمارا کام یہ ہو روز آنا اور دعا دینا
مذاق اہل دل خلوت میں ان مرقعہ کی کبھی کچھ رنگ بھولانا کبھی کچھ سکر دینا
تنائے سوال یک لک نفس ہے یہ قوتی تو جہان تک جلد ہو سرمایہ سستی شاد دینا
سائل دوست کار از حقیقی کھل گیا آئند وہ آنا نزع میں چلی وہ تیرا سکر دینا
جس کا پوچھنا کیا عام ہو سائے نہیں تم اپنے منہ سے درد دلی ہما وحدت بتا دینا
مروا شکونکی سوز بھر میں کرم قاری گریبان میں لگا کر آگ میں تک جلا دینا
ابھی خیر ہو پھرے چا شوق اسکی مغل میں کہ حسن وضع ہو جس کا ہم ایسوا کھا دینا
ہم قصد تغافل اب ہاتھ رکھ لیتا ہوں پیشہ گئے وہ دن کہ جب تقاسم لڑنا کو لا دینا
ہمارا درد دل گویا کہ شرح لن برانی جو کسی صورت ممکن ہی نہیں ہو سکا دینا
نہ جانے خط میں بجا تا ہو کیا اور فطنا کا کہ بیرون بیٹھ کر کھنا کھڑی بھرینا دینا
کوئی پہلے پہل قاتل بنے گا ہوتی ہو نیت ہمارے خون کا سازگت بھی لے خدا دینا

وہ خود ہی روتے ہیں اس روز کا کامی محشر

جنہیں کچھ بھی تھا دشوار دے تو ہنس دینا

سید امین الحسن صاحب بسل

جلوہ ریز سنائی خود ہوا کھار اپنا عشق کے گلے ڈالا حسن نے جو ہار اپنا
اب خزان کو فرصت ہو چکا ہے تھا ہونا کام کر چکا پورا موسم ہار اپنا
کیون کیسی اسیدین خاک میں لائیں آپ جھوٹے سہ کر کے کیون کھوئے وقار اپنا
شوق نے کیا بخود وہ تھوڑا بے چین میں آج ہو گیا حُصّت ہے اعتبار اپنا

آزائین تنگین کو آؤ ایک سترگر کی آج چکے کھلائیں ان کو حال زار اپنا
مرے جھاکے منے پر جم آگیا ان کو
کام مے کیا بسل آج انکسار اپنا
مدد یی ضمیر لہرین صاحب عرش گداوی

نقطہ دلمین ہو اپنے آج یاد رفتگان باقی نہیں تو نام باقی ہو نہ ہوا نشان باقی
مٹاؤ الاسے بھی ہائے رقتار زمانہ نے وہ جواک نام کو تھا نقش پے رہن باقی
مٹانے کو ہو بساں کن جنبش موج ہوا جھکو ہسان نقش پیا نقش سستی کا نشان باقی
نہ ہو وہ موج موج اپنی طبیعت میں وہ کرمی نہ دیا جو ذاب دیا تار ہو دھوان باقی
شایا جھکو کیا سالم نے اپنے کو مٹایا ہے گل و بلبل کے دم تک بھی باکستان باقی
تن لاغر کے بلے خاک تھوڑی ہی جوت میں کین تو چل بسے ہو نام کو انکا نشان باقی
گھٹا چھائی چھاپے غم غلام کر نیکی کی صورت نہ ساقی کو غاسل پانا وہ مے کی دھوان باقی
سترگر نے درو دیوار کو کاٹوٹے ہانکا ہو بتانے کو پتہ لیکن ہو شک آستان باقی
یہاں رونے کا بھی موقع نہیں اظہار نام کو کہ روتے روتے انکو نہیں نہیں شک ان باقی
جلاو شمع جا کر شام کو کو مرغیان میں اسی سے اب تو گناہوں کا تو دم نشان باقی

ہم پیری طبیعت میں ہو کر می عرش سترنی

سحر کو سمع مرد میں ہو جیسے کچھ دھوان باقی

منشی محمد عبد الغنی صاحب صلیق

دل غیر کا ہو گا کہ نہ مرے دل کے برابر تارا بھی ہو اہو مہر کامل کے برابر
لے چارہ گرد و بتاؤں تجھے کیا کیا بیتاب جگر بھی ہو مہر دل کے برابر
خونریزی عاشق نے یہ تاثیر دکھائی بیتاب جگر بھی ہو مہر دل کے برابر
کیا دیکھ لیا ہو یہ کسی شوخ ادا کو ہاتھوں جو پھلتا ہو جگر دل کے برابر
ٹھوکر وہ دگا کر می رت پر یہ بونے یہ کیوں ہوئی خاک میں مل کے برابر
عاشق کیلئے نزل لفت میں کوئی او خضر رہ مقصد و نہیں دل کے برابر

اُس نر کی شرکت کہیں آسان ہوا دق

شکل بھی نہیں ہو تو ہر شکل کے برابر

ایڈیٹوریل

العصر کا خیر مقدم جس جوش و خروش اور فراخ دلی کے ساتھ کیا گیا ہو؟ ہمارے لئے نہایت حوصلہ افزا ہو۔ ملک کے مقتدر و رد و انگریزی اخبارات نے اس علمی و ادبی خدمت کو نہ صرف مفید بتایا بلکہ اس رائے کی ضرورت بھی تسلیم کی ہو۔ بعض ایسے حضرات نے بھی ہماری محنت و کوشش کی داد دی ہو جو دینی معاملات میں خاص تجربہ و بصیرت رکھتے ہیں۔ البتہ الناظر نے العصر کی عظمت کو بے موقعہ اور غیر ضروری بتایا ہو۔ ممکن ہو کہ یہ رائے درست ہو مگر ان آراء کے مقابلہ میں جو کثرت کے ساتھ العصر کے انظار پسندیدگی میں آئی ہیں الناظر کی رائے کو ہم قابل وقت نہیں سمجھتے۔

اول نمبر میں ہم نہایت وضاحت کے ساتھ بتا چکے ہیں کہ العصر کا نصب العین یا ماہہ الامتیا کیا ہوگا۔ کسی پرچم کے صرف ایک ہی نمبر کو پیش نظر رکھ کر اس کی آئندہ روش کے متعلق قطعی فتویٰ صادر کر دینا ہم نہیں سمجھتے کہ کہاں تک تسخیر خیال کیا جاسکتا ہو۔ جائز کلمۂ چینی کے ہم ہرگز مخالفت نہیں مگر ہاں یہ ہم ضرور چاہتے ہیں کہ العصر کے متعلق جو رائے قائم کی جائے وہ محض مخالفانہ نہ ہو۔ ابتدائی نمبر کی اشاعت پر یہ عام طور پر کہا گیا تھا کہ یہ نمبر صرف نمونہ ہی ثابت نہ ہو بلکہ کوشش کی جائے کہ اسکی موجودہ حالت قائم رہے ہم سمجھتے ہیں کہ العصر کے آئندہ نمبروں سے یہ ممکنائی دفع ہوگئی ہوگی۔ تاہم یہ بتا دینا ضروری ہے کہ العصر کی نہ صرف موجودہ حالت ہی قائم رکھی جائیگی بلکہ قدر دانوں کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کے حجم اور تصاویر کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہے گا۔ العصر کی خصوصیات قائم رکھنے کے ہم ذمہ دار ہیں اور اس کے کثیر اخراجات کی کفالت قدر دانان علم ادب پر ہونی چاہیے۔ اگر وہ فون اپنی اپنی ذمہ داریاں محسوس کرتے رہیں تو کچھ شک نہیں کہ العصر بہت جلد اپنی ارقھائی منازل کو طے کرے گا۔

عام طور پر مشہور ہے کہ ہندوستان کا باد آدم زلا ہو؟ یہاں کام کرنے والے

کے کام کو نہیں دیکھا جاتا بلکہ سب پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کا مذہب کیا ہے۔ آپ ملکی کام کیجیے خواہ قومی، علمی خدمات انجام دیجیے خواہ ادبی مگر یہ ناممکن ہو کہ اہل ہند مذہبی سوال درمیان میں نہ لائیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو ان کے ہندوستانی ہونے ہی میں شک ہوگا خواہ جس نظامی صاحب نے "توحید" کے پہلے پرچہ میں العصر پر یوگ کیا ہو۔ آپ فرماتے ہیں کہ چونکہ مصر کے مسیحی پرچوں میں مذہبی تصاویر بھی ہوتی ہیں، لہذا العصر میں بھی مذہبی تصاویر ہونی چاہئیں۔ گویا آپ کی رائے میں العصر مسیحی پرچہ اور اسکی وجہ سوا اسکے اور کچھ نہیں ہو سکتی کہ اس کا ایڈیٹر مسیحی ہو۔ انھیں تنگ خیالوں نے ہندوستان کو تباہ کیا ہے اور تادفیکہ یہ مذہبی سوال درمیان سے اٹھ جائے ہندوستان ہرگز ترقی کا منہ نہیں دیکھ سکے گا۔ العصر میں اب تک کوئی ایسا مضمون نہیں شائع ہوا ہے جسکی نسبت یہ کہا جاسکے کہ وہ مسیحی نقطہ خیال سے لکھا گیا ہو اگر کہیں اس قسم کا کوئی مضمون چھپ جاتا تو نہیں معلوم خواہ صاحب کیا فتویٰ صادر فرماتے لیکن اگر العصر میں مذہبی مضامین بھی شائع ہوں تو اس میں کیا گناہ ہو مذہب "ہوا" نہیں ہے کہ اس سے خوف کھایا جائے بلکہ مذہب سب تعلق کا نام ہے جو انسان اپنے سے کسی اعلیٰ ہستی کے ساتھ رکھتا ہے خواہ اسکی بنیاد خوف پر ہو یا ذاتی کمزوری پر جو بیرونی امداد کی تلاش کرتی ہو یا اس خواہش پر جو اپنے سے بہتر کے ساتھ میل جمل رکھنے میں اپنی ہمدردی اور ترقی سمجھتی ہو یا اس حس باطنی پر جو ایک اعلیٰ ہستی کے ساتھ اپنا رشتہ محسوس کر کے اس سے کامل طور پر پیوند ہونا چاہتی ہو جب ہم مختلف مذاہب پر نظر کرتے ہیں تو ان میں اسی تعلق کا اظہار مختلف صورتوں میں پاتے ہیں۔ انسان کیا ہو؟ وہ اعلیٰ ہستی جسکے ساتھ وہ تعلق ڈھونڈتا ہے کیا ہو؟ اور اس تعلق کی شرائط یا حقیقت کیا ہیں؟ اخلاقی قوانین اور طریق عبادت محض فروعی باتیں ہیں جو ان اصولی امور سے مستبط ہوتے ہیں۔

پستی ترقی کی اصل جڑ سچا مذہب ہے۔ مگر ترقی جو جو نشوونما پاتی ہو اسکی شاخیں ہر طرف پھیلی جاتی ہیں۔ اس کا تعلق نہ صرف طائفہ انسان سے بلکہ قوم اور ملک سے بھی ہے۔ اس سے فقط ظاہری حالت ہی نہیں سدھرتی بلکہ اخلاقی اور

تمدنی حالت بھی۔ اسکا اثر نہ صرف تجارتِ عالم و ہنر اور صنعت و حرفت میں پایا جاتا ہے بلکہ تعلیم اور علم ادب میں بھی۔ اور اس صورت میں یہ نہایت نامناسب ہے کہ مذہب کا نام سننے ہی ہم آتش زیر پا ہو جائیں۔ دنیا میں جو نئی نئی دریافتیں آتی یا ذہنی اخلاقی یا روحانی عالم میں ہو رہی ہیں انہیں کل نبی آدم کا حصہ ہو اور وہ سب فائدے کے لیے ہیں اور فی الحقیقت ہم سب ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ سائنس کے ایجادات سے بھی ہم متمتع ہو رہے ہیں۔ اخلاقی دریافتیں رفتہ رفتہ قبول کر لی جاتی ہیں پھر کیا وجہ ہو کہ روحانی دریافتوں سے ہم دور بھاگ لیں؟

اب وقت آگیا ہے کہ ہم ان تنگ خیالیوں کو ترک کریں اور ٹھنڈے دل سے مطالعہ مذاہب پر کمر بستہ ہوں۔ محض مذہبی حمایت کو نہیں بلکہ حق کی دریافت کو اپنا اصلی مقصد ٹھہرائیں۔ مذہب کا مطالعہ علمی اصول کے مطابق شروع کریں اور ان خصوصیات کو معلوم کر کے جو مذہب کی بنیاد ہیں اور جن کا فطرتِ انسانی کے ساتھ گہرا تعلق ہے تاریخی اور فلسفی اور سائنٹیفک نقطہ سے مذاہبِ عالم پر نظر ڈالیں تب ہم پر ان امور کی حقیقت کھلے گی محض سطحی نقطہ سے دوسرے مذاہب کو دیکھنا، ان کو بُرا کہنا، اور ان پر ہتان باندھنا سراسر ظلم ہے۔

العصر کی پالیسی کے متعلق بعض حضرات کو سخت غلط فہمی ہوئی ہے۔ مذہبی مباحث اور موجودہ پالیسی سے علیحدگی کے یہ منی نہیں ہیں کہ اس میں مذہبی اور ملکی معاملات سے بحث نہیں کی جائیگی، بلکہ وہ مذہبی معرکہ آرائیان جو ملکی ترقی کی رفتار میں سنگ راہ ہیں انہیں ہمیں چھڑی جائیں گی اور حکومت وقت کے طرزِ عمل پر کسی قسم کی نکتہ چینی روانہ رکھی جائیگی۔ ان امور سے قطع نظر کہ تمام ان مذہبی اور ملکی معاملات کے لیے جو دائرہ اوکے اندر ہوں اور جن سے ابناے ملک فائدہ اٹھا سکیں انہیں کے صفحات میں کافی گنجائش ہے۔

باوجودیکہ بہت کثرت سے انہیں کے متعلق تعریفی آراء موصول ہوئی ہیں مگر ہم اب بھی یہی سمجھتے ہیں کہ ہمیں اور آگے قدم بڑھانا چاہیے۔ اگرچہ ہماری بے مالگی اور بے بساطی ہمیں اس امر کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے بعض دیگر

معاصرین کی طرح بھاری وعدے کر کے یا بڑے بڑے انعام دیکر لوگوں کو العصر کی خریداری کی ترغیب دیں، مگر ہم انہیں یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ہماری دلی خواہش ہے کہ ہم بھلے اس قسم کے انعاموں کے خواہ انہیں کو ایک ایسا عمدہ انعام ثابت کریں کہ لوگ ایسے انعامات کی طمع سے نہیں بلکہ خود اسکی خاطر اسکی قدر دانی کرنے پڑیں۔ کسی پرچے کی عمدگی کی دلیل اس کے مضامین ہوتے ہیں اور یہ ظاہر ہی ہے کہ عمدہ مضامین ہمیشہ مفت نہیں ماکرتے جس قدر مضامین ایک لکچر میں شائع ہو چکے اگرچہ انہیں بھی زیادہ ترجیحی ہی تھے تاہم اب ہم عام طور پر اعلان کرتے ہیں کہ عمدہ مضامین کے لیے العصر کی حیثیت کے مطابق ہم نقد معاوضہ بھی نہ دے کر کے کو تیار ہیں۔ معاوضہ کی شرح لحاظ مضمون نگار کی ادبی شہرت یا نوعیت مضامین کے دو ہونگی یعنی ایک روپیہ فی صفحہ اور آٹھ آنے فی صفحہ۔ یہ معاوضہ صرف اور بچل مضامین کے لیے دیا جائیگا۔ تاہم کے لیے بذریعہ خط و کتابت فیصلہ کرنا چاہیے۔

ہم نے چند خاص عنوان بھی تجویز کیے ہیں جن کے تحت میں ان تمام اہل العصر میں مضامین جمع ہو کر نیچے جو اصحاب ہماری ہدایت کے مطابق اس سلسلہ میں ہماری امداد فرما نا چاہیں ہم سے خط و کتابت کریں۔ کام کی نوعیت کے لحاظ سے نقد معاوضہ بھی پیش کیا جائے گا۔

اس ماہ کے اوائل میں علیحضرت شہنشاہِ معظم دام ملک کا جشن سالگرہ تمام ٹیٹس گورنمنٹ میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ منایا گیا ہے۔ اس مبارک تقریب کی تیاری میں ہم حضور ملک معظم و جناب ماکہ معظمہ کی تصاویر ہیہ ناظرین کرتے ہیں۔ صورت ہماری نہیں بلکہ تمام رعایاے ہند کی یہ دلی دعا ہے کہ خدا حضور کو عرصہ دراز تک سلامت باکرامت رکھے اور اہل ہند آپ کی سایہ عاطفت میں طرح پھولیں پھلین آمین

ماہِ حجبِ محراب کی پہلی تاریخ (جون) علیحضرت قدر قدرت بندگانِ عالی مقامی مظہرِ العالی کی سالگرہ مبارک کا روزِ مسعود ہے جو رعایاے دکن کے لیے عید سے بھی بڑھکر سرتینخش ہوا سال بھی اس موقع پر رعایاے دکن نے خوب خوب

بشن ملے اور اپنی دلی مسرت و عقیدت مندی کا اظہار کیا۔ ہم بھی اس نمبر میں قمر
اقدس داعی کی تصویریں شکرگزاری کے ساتھ شائع کرتے ہیں جو حضور کی علمی
سرپرستی سے العصر پر فرض ہو۔ اس پر آشوب زمانہ میں صرف حیدر آباد ہی ایک
ایسی ریاست ہو جہاں ہمیشہ امور خیر اور علم و فضل کی اشاعت و معاونت ہوتی
رہی۔ ناخیر العصر کی بھی بہت سی توقعات حضرت اقدس داعی کی ذات ستون
صفات سے وابستہ ہیں حضور ہی کی ادنیٰ توجہ سے یہ معرض وجود میں آیا اور
حضور ہی کی امداد و توجہ مبارک پر اسکی زندگی کا انحصار ہے۔

تمام وابستگان وہی خواہان دولت تصفیہ کی یہ دلی تمنا و دعا ہے کہ آپ کا
عہد کن اور کل ہندوستان کے حق میں امید اور توقع سے بڑھ کر روشن اور
بارکت ہو، اور آپ کا سایہ ہمایا عرصہ دراز تک قائم رہے۔ آمین

شاہین میں وہ جنت کا جو عالی پایہ صادق ہو اور لولائس کا جس پایہ
رحمت ہو اگر ذات مبارک اے نور ہے نفل ہمایون بھی خدا کا سایہ

۲۰ جون کو لاہور ڈھارڈنگ بھلہ بانقاہ والسرے ہندی سختیابی کا جشن تمام
ہندوستان میں نہایت دھوم دھام سے منایا گیا۔ ناظرین کو وہ مکر وہ حادثہ یاد ہو گا
جو ۲۲ دسمبر ۱۹۱۷ء کو دہلی میں پیش آیا تھا کسی شقی انقلابی حضور دلیسرے پر جبکہ وہ
شاہانہ عیون کے ساتھ باقی پرچاندنی پوکٹ گزر رہے تھے بم سے حملہ کیا وہ ہندوستانی
قربان ہو گئے اور حضور دلیسرے کو بھی شدید چٹا بھندہ ایڑی اڑنگ صاحبہ ان ل
نئی نئیں اور اس موقع پر آپ نے عضب استقلال دکھایا۔ یہ ایسا واقعہ ہو کہ اسکی
نظر دنیا کی تاریخ میں نہ ٹپکی سور بار بدستور کیا گیا جس میں حضور دلیسرے کی جگہ
نواب اقصیٰ گورنر بہادر پنجاب نے تقریر بھی جس میں صاف طور پر کہا گیا کہ مجھے
ہندوستانی رعایا پر کامل اعتماد ہو اور کہ اس مکر وہ حادثہ سے گورنمنٹ ہندی کی پالیسی
میں کوئی فرق نہ آئے گا اس سے ظاہر ہو کہ آپ جتنا کس قدر رحمدل اور تحمل طریق ہیں
فوری واقعات کی ایک کئی طرح کو مشتمل نہیں کر سکتے۔ بیشک ایک والسرے کی شان
ایسی ہی ہونا چاہیے۔

ہندوستانیوں کے ساتھ آپ کی ہمدردی، محبت بھی خیر خواہی اور سود و بہبود کی
کوشش ایسی باتیں ہیں جسکے ذریعہ آپ سید ہرود عزیزی حاصل کر سکتے ہیں عورت
بہار و آریسہ کی علیحدگی ہندوستانیوں کو سیلف گورنمنٹ ملنے کا امکان اور تعلیمی توسیع
بھی ایسی باتیں ہیں کہ ہندوستانی عرصہ دراز تک نہ بھولیں گے۔

آپ ۱۹۱۷ء میں پیدا ہوئے۔ بیرواد رتنی کالج کیمبرج میں تعلیم پائی اور بعد
تکمیل تعلیم ۱۹۲۱ء میں منصب سفارت پر مامور ہوئے۔ اس کے بعد کچھ عرصہ ملک و دفتر
کے پرائیوٹ سکریٹری کی حیثیت سے کام کرتے رہے اور پھر منصب سفارت پر واپس آکر
بالترتیب برلن، واشنگٹن، قسطنطنیہ، صوفیہ، پیرس میں برٹش سفیر کی حیثیت سے کار فرما
انجام دیتے رہے۔ اس کے بعد ۱۹۲۶ء سے برٹش سفارت لندن کے سکرٹری اور ۱۹۲۹ء
میں سینٹ پیٹریکس برگ (دار الخلافہ روس) کے برٹش سفیر بنے۔ اور ۱۹۳۰ء تک اسی
خدمت پر مامور رہے۔ یہ وہ نازک زمانہ تھا جبکہ روس اور جاپان کے درمیان غمخاک
جنگ جاری تھی اور پولش سائل نہایت پیچیدگی اور اہمیت پیدا کر رہے تھے۔ مگر
آپ نے اس موقع پر اعلیٰ تدبیر معاملہ فہمی اور کامل دوراندیشی کا ثبوت دیا اور یہ
آپ ہی کی مساعی حیلہ کا نتیجہ تھا کہ مسئلہ ۱۹۳۱ء میں روس اور برٹش گورنمنٹ نے
درمیان معاہدہ ہو کر ان دونوں سلطنتوں کے مابین تمام نزاع باحسن اوجہ
معدوم اور تمام غلط فہمیاں مٹ کر دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے۔ اس کے بعد آپ
نائب وزیر معاملات خارجہ بنائے گئے اور ہندوستان کی والسرانسی کے منصب
پر سرفراز ہونے کے دن تک اسی منصب پر مامور رہے۔

آپ کی شادی تھائی لارڈ ایشنگٹن بہادر کی دختر نیک اختر آریسہ بل نیفر ڈائسوارٹ
کے ساتھ ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ آپ کی اولاد میں دو لڑکے اور ایک لڑکی ہیں۔ آپ کے
خاندان کا ہندوستان سے بہت پرانا تعلق ہے چنانچہ آپ کے جد بزرگوار لارڈ ڈارڈنگ
بہادر ۱۸۳۳ء میں گورنر جنرل کی حیثیت سے ہندوستان تشریف لائے تھے اور
سکھوں کی دوسری جنگ میں انگریزی فوج کی گمان پر مامور تھے جسکے صلہ میں انکو
”ہیرن ہارڈنگ“ نام لایا اور ان کا خطاب عطا ہوا تھا۔ چارے والسر بہادر نے ہندوستان کی اعلیٰ
خطبات متناہیں بلکہ روس، سوڈان، ہسپانیہ، آرمینیا اور جرمنی میں بھی پکا خاص اثر کیا جاتا ہے۔



تد بیر الدوله سید مظفر علی خان "اسیر" لکھنوی

العصر

کیا زمین کی حرکت سست ہو رہی ہے؟

جدید علمی تحقیقات کے حیرت انگیز انکشافات میں سے ایک وہ ہے جس سے ہمارے عنوان کے سوال کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ علمی دنیا میں یہ بات عام طور پر مانی جاتی ہے کہ ہمارے دن رات آہستہ آہستہ لیکن متواتر چلے ہوئے ہیں یا بالفاظ دیگر یون کہتے ہیں کہ آج کا دن گزشتہ دن سے کسی قدر زیادہ لمبا ہو اور آئندہ سے کسی قدر کم۔ اس کا امکان اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ زمین کی محوری حرکت جس کے باعث دن رات کی گردش ہوتی ہے سست ہو رہی ہو اور ایک گردش کی تکمیل میں دن بدن زیادہ وقفہ درکار ہوتا ہو۔ ایک شبانہ روز کی لمبائی گلیتہ زمین کی محوری حرکت پر منحصر ہے اور جہاں تک سائنس نے آج تک ترقی کی ہے زمین کی محوری حرکت کا اسکی سالانہ حرکت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے سال میں ایک دفعہ کرہ زمین سورج کے گرد پورا چکر کاٹتا ہے اور یہی سالانہ گردش موسموں کی تبدیلی وغیرہ کی ذمہ دار ہے۔ سردی ہمارے شمسی سال میں تین سو سو بیس ٹھہرون سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا ہے لیکن جب تک زمین اور سورج کے بعد اور ان دونوں کی علیحدہ علیحدہ مقدار مادہ میں کسی قسم کی تبدیلی واقع نہ ہو سال کی معیار ایک معین معیار

ہو جسے دن رات کی لمبائی سے براہ راست کچھ تعلق نہیں۔ اگر ہماری زمین اپنے محور کے گرد ۳۶۵ گھنٹہ میں ایک چکر کاٹتی تو ہمارا سال ہمارے جدید دن رات کی معیار کے مطابق سات سو ساڑھے تیس دن سے کچھ زیادہ بڑا ہوتا۔ لہذا زمین کی محوری حرکت کے سست ہونے کے نتائج ہیں۔ ایک طرف تو دن رات بڑے ہو رہے ہیں اور دوسری طرف سال چھوٹا ہو رہا ہے۔ سال کے چھوٹا ہونے سے مراد یہ ہے کہ آئندہ سال میں موجودہ سال کی نسبت سورج کا طلوع و غروب کم دفعہ ہوگا۔ ورنہ فی الاصل جیسا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں سال کی پہلی معیار کا زمین کی محوری حرکت سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اس لیے جس وقفہ کا نام بہ نظر سہولت ہم نے ایک سال رکھا ہے اس میں بذاتہ کوئی کمی بیشی نہ ہوگی۔ فرق صرف تناسب میں ہوگا۔ اگر اکائی بڑھ جائے تو باقی اعداد اسی تناسب سے گھٹ جائیں گے۔ جو فاصلہ انچون میں ۳۶ عدد کہلاتا ہے وہی فاصلہ فٹون میں ۱۲ کہلاتا ہے۔ فاصلہ تو وہی ہے لیکن اکائی ریونٹ (Unit) کی تبدیلی سے اس کے معیار میں تبدیلی ہوتی ہے۔ سطح

موجودہ حالات میں ہم موجودہ دن رات کے وقفہ کو اکائی مان کر سال کے وقفہ کو ایک خاص عدد سے تعبیر کرتے ہیں گویا اس خاص عدد اور موجودہ دن رات کے وقفہ کا حاصل ضرب سال کا وقفہ ہو۔ اب اگر اصل ضرب میں کمی بیشی نہ ہو اور ضرب شدہ اعداد میں سے ایک بڑھ جائے تو دوسرا لامحالہ کم ہوگا۔ لہذا ماننا چاہئے کہ اگر دن رات کا وقفہ بڑھ رہا ہو تو سال کے وقفہ کا معیار دن رات کے بڑھتے ہوئے وقفہ کو اکائی مان کر لکھ رہا ہے۔

اس امر کا ثبوت کہ زمین کی حرکت فی الواقع سست ہو رہی تین مختلف طریقوں سے دیا جاسکتا ہے جن میں سے ہر ثبوت اس بات کا مستحق ہے کہ اس پر شرح و بسط کے ساتھ بحث کی جائے۔ دلائل کی پختگی اور راست لال کی نفاست کے لحاظ سے یہ بحث ہمیں بہت سے مفید مطلب سبق سکھاسکتی ہے ہم بہ نظر اختصار ان تینوں ثبوتوں کو موجودہ مضمون میں محدود کر چکی کوشش کریں گے۔

زمین ایک گول کرہ ہے جو فضا میں بیسٹیمین معلق ہے اور اپنے محور کے گرد تقریباً ۲۴ گھنٹہ میں ایک دفعہ گھومتی ہے۔ زمین کا محور زمین کے مرکز میں سے ہو کر گذرتا ہے۔ اس کے انتہائی سروں کو قطبین یعنی قطب شمالی اور قطب جنوبی کہتے ہیں۔ محور محض ایک سمت کا نام ہے۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ زمین اپنے محور کے گرد گھومتی ہے تو محور سے مراد کوئی ٹھوس مضبوط سلاخ نہیں ہوتی بلکہ اس خط استقیم کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو زمین کے مرکز سے گذرتا ہوا شمالی جنوبی سمت میں واقع ہے۔ اپنے بازاروں میں شعبہ بازوں کو دیکھا ہوگا جو ایک تھالی کو چھڑی کے اوپر تول کر زور کی گردش کے بعد ہوا میں اچھال دیتے ہیں جہاں تھوڑی دیر کے لیے ہوا میں معلق رہ کر تھالی ایک محور کے گرد گھومتی رہتی ہے جس کی سمت حرکت نہ ہونے کی بجائے لمبائی ہوتی ہے۔ یہ طریقہ کے دبشی چاک کی ضربوں سے گول لٹو ہوا میں گھماتے ہیں۔ جتنی دیر ان کی حرکت کا فی تیز رہتی ہو لٹو ایک

محور کے گرد ہوا میں گھومتا رہتا ہے۔ کرہ زمین کی محوری حرکت کی مثال ایک طریقہ سے بھی دی جاسکتی ہے۔ کہار کا بھاری چاک جب وہ اسے لکڑی کے ساتھ تیز حرکت دینے کے بعد چھوڑ دیتا ہے تو ایک حد تک زمین کے مشابہ ہوتا ہے۔ دونوں کی حرکت میں فرق صرف یہ ہے کہ چاک ہوا کی مزاحمت کی وجہ سے تھوڑی دیر گھومنے کے بعد ساکن ہو جاتا ہے لیکن زمین کے ارد گرد ہوا کے بجائے ایک ایسا رقیق جسم (ایتھر) ہے کہ قرون میں بھی اسکی رگڑ اور مزاحمت کا اثر محسوس نہیں ہوتا۔ زیادہ تر فرق شکل میں ہے۔ اگر ہم چاک کے بجائے ایک مدور کرہ فرض کریں جسے پتہ کی طرح گھا کر چھوڑ دیا جائے تو وہ بجسہ زمین کے مشابہ ہوگا لیکن زمین کی حرکت اس کے مقابلے میں نہایت سست ہوگی اس لیے کہ دونوں کے حجم میں بہت بڑا فرق ہے۔ زمین کا قطر تقریباً آٹھ ہزار میل ہے حالانکہ ہمارے شمسی کرہ کا حجم گز بھر سے زیادہ نہیں ہوتا۔ اب اگر آپ نے یہ فرق صحیح طور پر سمجھ لیا ہو تو زمین کی حرکت کے کم ہونے کا پہلا ثبوت باسانی ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کہار چاک کو کیساں طاقت کے ساتھ گھما رہا ہے یعنی ہوا کی مزاحمت سے چاک کی رفتار میں جو کمی تعویق پیدا ہوتی ہے اس کی تلافی کرتا جاتا ہے یہ بھی فرض کر لیجئے کہ کہار اپنی طاقت اس کیساں تناسب کے ساتھ دیر تک صرف کر سکتا ہے۔ اب اگر آپ چاک کے اوپر آہستہ آہستہ خاک پھیلتے جائیں تو اس کو چونکہ اپنی گردش میں مادہ کی زیادہ مقدار اٹھانا پڑتی ہے اس کی رفتار سست ہو جائے گی تا وقتیکہ کہار جون جون چاک پر مادہ کی مقدار زیادہ ہوتی جاتی ہے زیادہ طاقت نہ صرف کرے۔ بعینہ یہی حالت کرہ زمین کی گردش کی ہے۔ آسمانی خاک اور ٹوٹنے والے ستاروں کے ریزے ہر لحظہ زمین کی سطح پر گر رہے ہیں لہذا زمین کی حرکت کے متعلق مفصل معلومات ہمیں اپنے سابقہ مضمون "حرکت کا پہلا قانون" میں حرکت کے پہلے قانون کی تشریح کرتے ہوئے ہم پہنچے ہیں ان اصطلاحات اور مطلب کی تفسیر کے لیے اس مضمون کا مطالعہ لازمی ہے۔

زمین کی حرکت میں ضرور ایک نمایان تبدیلی ہو گئی ہوگی۔

دوسرا سبب ایسا ہے کہ اس اثنا پہلے سبب کے اثر سے کہیں زیادہ ہو اور ان دونوں اسباب کے مجموعی اثر کی نظری بحث کے بعد ہم تیسرے ثبوت کا یعنی حرکت کی کمی کی عملی تصدیق کا ذکر کریں گے جس سے یہ امر حتماً ثابت ہو جاتا ہے کہ پہلے دو اسباب میں جو دلائل اور طریقہ استدلال اختیار کیا گیا ہے وہ بالکل صحیح اور درست ہے۔

چاند کی کشش سے سمندر کا پانی مدوجز کی شکل میں کھینچا جاتا ہے۔ پانی کا مدوجز سطح زمین کے اوپر ہوتا ہے زمین کی محوری حرکت کو روکتا ہے پو سمجھئے کہ جس طرف چلتی گاڑی کو بریک باندھنے سے روک کیا جاتا ہے اسی طرف جوار بھاٹا کا عمل زمین کی محوری حرکت کے لیے ایک کمزور بریک کا حکم رکھتا ہے جس کا تدریجی قلیل اثر اگر سالوں میں نہیں تو ہزار ہا صدیوں میں ضرور نمایان طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل ہم کسی دوسرے مضمون کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں مختصراً مدوجز کے متعلق چند ایک امور بطور اشارات تحریر کرتے ہیں۔

سب سے پہلے اس امر کو ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ مدوجز کا چاند کے ساتھ کیا تعلق ہے اور یہ تعلق کیسے دریافت ہوا جن لوگوں کو ساحل سمندر پر جانے یا بحری سفر کا اتفاق نہیں ہوا ان کے لیے مدوجز ایک نئی چیز ہوگی لیکن سمندر کے قریب رہنے والوں کے لیے مدوجز ویسی ہی معمولی چیز ہے جیسے خشکی پر رہنے والوں کے لیے چاند کا گھٹنا بڑھنا۔ غالباً سب سے پہلے یہ امر مشاہدہ میں آیا ہوگا کہ نئے چاند اور بدر کے موقع پر مدوجز نہایت شدت کے ساتھ ہوتا ہے اور پہلے ربع اور تیسرے ربع کے موقع پر نہایت کمزور ہوتا ہے لیکن اس سے زیادہ مضبوط تعلق یہ معلوم ہوا ہوگا کہ ایک شبانہ روز کے دو متواتر جوار بھاٹوں کا درمیانی وقفہ بجائے ۲۴ گھنٹہ کے ایک شمسی دن رات ہونے کے ۲۴ گھنٹہ اکاؤنٹ منٹ کا ایک قمری دن ہوتا ہے۔ چاند بوجہ اپنی ماہواری گردش کے ایک دن رات میں سوچ

اور چون زمین اپنی سالانہ گردش کرتی ہوئی نئے نئے مقامات پر سے گذرتی ہو آسمانی خاک کی ختم ہونی والی بارش اس کے حجم اور وزن کو بڑھاتی رہتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال باہر سے زمین پر ایک کروڑ ٹن یعنی تقریباً ۲ کروڑ من خاک پڑتی ہے۔ گو ہر سال زمین کا وزن ۲۴ کروڑ من بڑھ رہا ہے جیسا ہم نے اوپر ذکر کیا اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مثالی چاک کی رفتار کیسا رہے تو چون زمین اس کا وزن زیادہ ہو کھار کو زیادہ طاقت لگانی چاہیے لیکن اگر کم ہار صرف ہوا کی مزاحمت اور جو کی رگڑ وغیرہ کی تلافی پورا کرنے کے لیے کافی طاقت صرف کرے تو لحظہ بہ لحظہ چکر کی رفتار سست ہوتی جائیگی۔ زمین کی حالت میں کوئی بیرونی طاقت اس کی حرکت کے قیام کے لیے درکار نہیں ہے لیکن جو زائد مادہ اس کے بوجھ میں اضافہ کرے گا اس کی وجہ سے حرکت میں جو کمی واقع ہو رہی ہو اس کی تلافی بھی کوئی طاقت نہیں کر رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ زمین کی حرکت سست ہو رہی ہو یہاں اس امر کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ زمین کا مجموعی وزن ۱۰۰ کروڑ من ہے اور اس عظیم الشان بوجھ کے مقابلے میں ۲۴ کروڑ من کی زیادتی بالکل ہچکچاہٹ کی قلیل عرصہ میں محض اسی سبب سے زمین کی گردش میں بہت تھوڑی کمی واقع ہونے کا امکان ہے۔ اتنی تھوڑی کمی کہ اس کا اندازہ لگانا بھی انسانی طاقت سے باہر ہے لیکن اس مقام پر ایک نہایت غور طلب مسئلہ یہ ہے کہ اگر یہی حالت مدت دراز تک رہے تو فی سال ۲۴ کروڑ من کا اضافہ آخر الامر اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہے گا۔ اس وقت تک

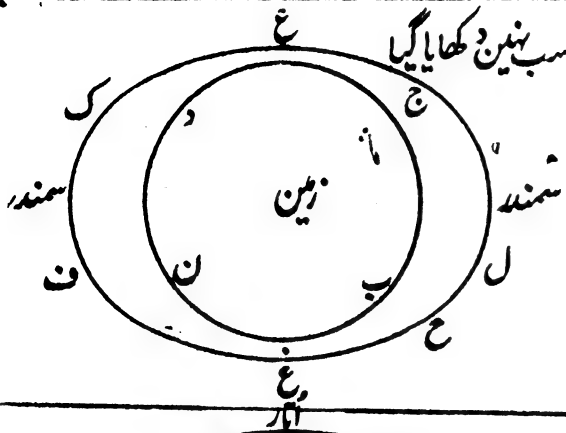
۱۔ ہم نے اپنے ایک سابقہ مضمون کو دہرائی کے متعلق دلچسپ معلومات دین کر دہرائی کا مجموعی وزن دریافت کرنے کے لیے زمین کا وزن مختصراً دریافت کیا تھا۔ زمین کا نصف قطر تقریباً ۴۰۰۰ میل جو لہذا اس کا حجم $\frac{4}{3} \times \frac{22}{7} \times 4000^3$ مکعب میل ہے چونکہ زمین کی کثافت اٹھانی بمقابلہ پانی کے ہے اس لیے زمین کا وزن $4000^3 \times 22 \times 4$ مکعب میٹریں فی وزنی کبریا ہے ایک فیٹ پانی کا وزن ۱۰۰۰ گرام ہے اس لیے زمین کا وزن $4000^3 \times 22 \times 4 \times 1000$ گرام ہے

سے اکاونٹ منٹ پیچھے رہ جاتا ہے اور مدوجز بھی اسی مقدار وقت کے ساتھ لگاتار شمسی دن سے پیچھے ہٹتا جاتا ہے۔ سمندر کے پانی میں مدوجز کے متعلق ایک دلچسپ لیکن شروع میں پریشان کن نیوالی بات یہ بھی ہے کہ ہر بندرگاہ میں ایک قمری دن میں ایک دفعہ پانی اُترنے چڑھنے کے بجائے دو دفعہ اُترتا چڑھتا ہے گویا ۲۴ گھنٹہ اکاونٹ منٹ میں دو دفعہ سمندر میں پانی کی سطح معمول سے زیادہ اونچی اور دو دفعہ معمول سے زیادہ نیچی ہوتی ہے۔ اگر ہم سہولت کے خیال سے یہ مان لیں کہ تمام کرہ زمین کے گرد کیسا گہرائی کی پانی کی ایک تہہ ہو تو یہ بات بادی النظر میں زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ اگر چاند کی کشش سے (دیکھو شکل نمبر ۱) سمندر کے اس حصہ سطح کا پانی جو چاند کے قریب ہو چاند کی طرف کھینچا جاتا ہو تو دور کے حصہ کن میں چاہیے کہ پانی کم رہ جائے کی وجہ سے پانی کا غیر معمولی اُتار ہوتا اور سطح سے ہر قمری دن میں صرف ایک دفعہ کسی مقام پر پانی کا چڑھاؤ ہوتا اور ایک دفعہ اُتار لیکن جیسا کہ شکل اول میں دکھایا گیا ہے حالات واقعی اس نقطہ خیال سے ایک ممہ کی سی صورت پیش کرتے ہیں۔ اگر باجماع نظر غور کی جائے تو چاند کے نیچے سطح زمین پر دو بالمقابل مقامات پر پانی کا چڑھاؤ ہوتا اور چاند کی سمت کے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے دو مقامات پر پانی کا اُتار ہونا فوراً ایک معقول پیرایہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔ سطح سمندر کے حصہ سطح کا پانی زمین کی نسبت چاند سے زیادہ قریب ہونے کی بدولت زمین سے زیادہ چاند کی طرف کھینچ جاتا ہے اور وہاں چڑھاؤ کی حالت ہوتی ہے اسی طرح زمین کا قریب حصہ بوجہ بعید حصہ دن کی نسبت چاند سے آگے ہزار میل کے قریب کی وجہ سے سمندر کے پانی کف سے پرے ہٹ جاتا ہے اور وہاں بھی پانی کا چڑھاؤ ہوتا ہے اور اس لیے سمندر کے ان دو حصوں میں جوع غ کی جگہ میں اُتار کی حالت ہوتی ہے۔ اس تشریح سے ہر قمری دن میں دو دفعہ اُتار چڑھاؤ ہونا آسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ اب صرف یہ امر محتاج تشریح ہے کہ کیوں نہ چاند اور بدر کی حالت میں اُتار چڑھاؤ معمول

سے زیادہ ہوتا ہے اور کیوں پہلے اور تیسرے ربع پر معمول سے کم جیسا کہ ہم کسی دوسری جگہ زمین کی سالانہ گردش کا ذکر کرتے ہوئے بیان کر آئے ہیں زمین سورج سے بہت چھوٹی ہے اور اسی وجہ سے سورج کی کشش اس پر غالب ہو کہ یہ سورج کے گرد گھومتی ہو۔ لیکن گو سورج بہت بڑا ہے تاہم بوجہ اپنے بعد کے اس کی جوار بھاٹا پیدا کرنے کی طاقت چاند کی نسبت نصف سے بھی کم ہے۔

شکل اول کی تشریح کو مد نظر رکھ کر شکل دوم اور سوم سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ کیوں نہ اور پورے چاند کی تاریخوں پر اُتار چڑھاؤ معمول سے زیادہ ہوتا ہے اور ان دونوں حالتوں میں چاند اور سورج کی کشش مل کر کام کرتی ہے اور نتیجہ اسی تناسب بڑا ہوتا ہے۔ پہلے اور تیسرے ربع کی حالت شکل چہارم سے واضح ہوتی ہے۔ اس حالت میں سورج کی کشش چاند کی کشش کے خلاف عمل کرتی ہے۔ جن مقامات پر چاند کی کشش محض سے اُتار ہونا چاہیے وہاں سورج کی کشش سے چڑھاؤ ہوتا ہے اور برعکس اس کے جہاں چاند کی کشش سے چڑھاؤ ہوتا ہے وہاں سورج کی کشش سے اُتار ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُتار چڑھاؤ معمول سے کم ہوتے ہیں اس لیے کہ سورج کی کشش چاند کے اثر کو نصف سے کچھ کم زائل کر دیتی ہے۔ ہم بیان مدوجز کے وسیع نظریہ کے متعلق کچھ نہیں لکھنا چاہتے۔ ہمیں یہاں صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ پانی کے اُتار چڑھاؤ کا اثر زمین کی حرکت کو کم کرتا ہے۔ بعینہ اسی طرح جس طرح کہ ایک کمزور بریک کسی تیزی سے حرکت کرنے والے جسم کی حرکت کو کم کرتی ہے۔ اول چار شکلوں سے یہ غلط نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ ہر مقام پر پانی کا زیادہ سے زیادہ چڑھاؤ دن میں ایک دفعہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ چاند اس مقام کے اوپر سب سے زیادہ اندی پر ہو اور دوسری دفعہ اس سے بارہ گھنٹہ اور ۲۵ منٹ بعد لیکن واقعی مشاہدات اس سادہ حالت کے بالکل خلاف ہیں۔ مختلف بندرگاہوں میں پانی کے چڑھاؤ کا وقت چاند کے سب سے زیادہ

نوٹ - ان اشکال میں زمین سورج اور چاند کے حجم اور فاصلہ کا اصلی تناسب نہیں دکھایا گیا

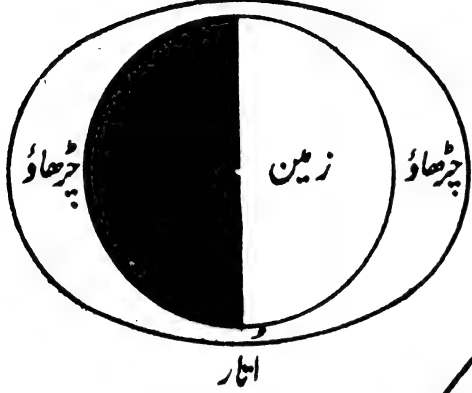


چاند کی کشش

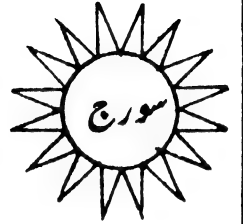
چاند

شکل اول

شکل دوم



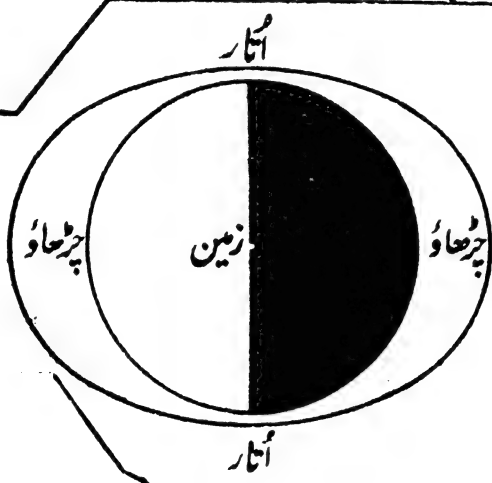
سورج اور چاند کی متحدہ کشش



شکل سوم



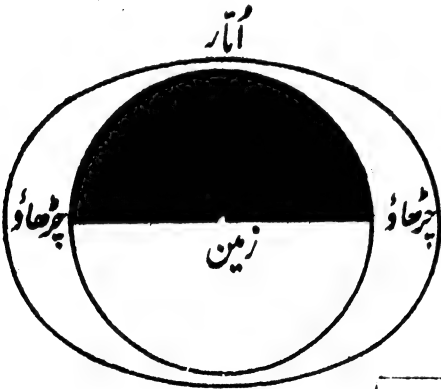
سورج کی کشش



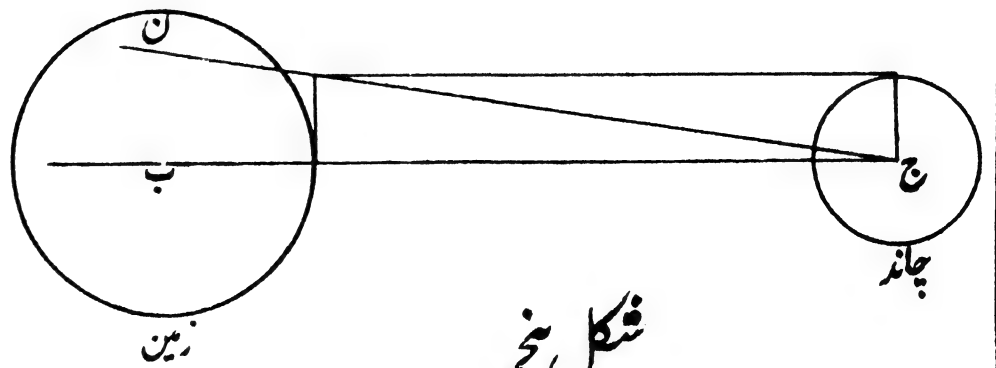
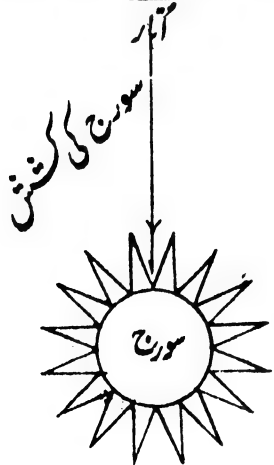
چاند کی کشش



شکل چہارم



چاند کی کشش



شکل پنجم

کے گرد ایک دفعہ گھومتا ہو۔ گویا چاند کا دن اور مہینہ ایک برابر ہیں۔ کیونکہ زمین انحصار اس لئے کہ زمین کی کشش سے چاند کی سطح پر جو مد و جزر ہوتے تھے ان کی بدولت چاند کی محوری حرکت بمقابلہ زمین کے بند ہو گئی۔ یہی حالت زمین کی حرکت کی آج سے بہت عرصے کے بعد ہو گئی تب ہمارا دن اور قمری مہینہ برابر ہونگے اور چاند والے زمین کا صرف ایک ہی نرخ دیکھ سکیں گے۔

ہم نے اس مضمون کے شروع میں کہا تھا کہ علاوہ ان دو نظریوں کے جو ہم ابھی ختم کر چکے ہیں زمین کی رفتار کم ہونے کی ایک عملی تصدیق بھی موجود ہے۔ زمانہ حال اور ماضی کے مشاہدات فکلی کا موازنہ کرنے سے ہم دن رات کی لمبائی معلوم کر سکتے ہیں۔ لارڈ کیلون نے اس حصہ مضمون کو نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کیا ہے۔ ہم بیان اس کی مثال پر اکتفا کریں گے۔ ۱۹۔ مارچ ۱۸۷۲ء قبل از مسیح یعنی آج سے ۲۶۳۴ سال پہلے قدیم بابل (Babylon) میں چاند گرہن ہوا تھا۔ بابل کا ایک ہیئت دان اپنی تحریر چھوڑا ہے کہ اس نے گرہن کو شروع ہوتے پہلی دفعہ جس وقت دیکھا اس وقت چاند کے طلوع کے بعد کامل ایک گھنٹہ گزر چکا تھا۔ ہم شکل سوم اور چارم کے متعلق ایک نوٹ میں جہاں کہیں کہ چاند گرہن ہمیشہ بدر کی حالت میں ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں چاند اور سورج کے طلوع و غروب کا وقت زمین کی محوری گردش پر منحصر ہے۔

چاند گرہن کے متعلق یہ ایک دلچسپ معلومات ہے کہ ہر ۱۹ سال اور ۱۱ دن (۶۵۸۵ دن) یا زیادہ صحیح طور پر ہر ۶۵۸۵ دن اور ۸ گھنٹہ کے وقفہ کے بعد چاند گرہنوں کا ایک جدید دور شروع ہوتا ہے۔ مثلاً اگر آج سے ۱۹ سال اور ۱۱ دن تک کے تمام چاند گرہنوں کا وقت اور کیفیت درج کر لیجائے تو آج سے پہلے اور بعد کے کل چاند گرہن اسی وقت اور کیفیت کے مطابق ہونگے۔ اسی قاعدہ کی مدد سے قدیم ہیئت دان پہلے سے چاند گرہن کے اوقات دنیا کے سامنے ظاہر کر دیتے تھے حالانکہ اس

بندی پر ہونے کے وقت کے بعد (مختلف وقفوں کے بعد) ہوتا ہے بعض میں ایک گھنٹہ کا فرق ہے بعض میں پانچ گھنٹہ کا وغیرہ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چاند کے پیچھے پیچھے سمندر کا پانی دوڑتا پھرتا ہے اور چونکہ پانی کی یہ حرکت زمین کی محوری حرکت کے خلاف ہوتی ہے اس لیے چاند کی کشش سے زمین کی حرکت ضائع ہوتی رہتی ہے۔

سمندر کے پانی کا چاند کی کشش کی سمت سے پیچھے رہنے کا باعث زمین کے خلاف پانی کی رگڑ ہے اور کچھ تک پانی کی اندرونی رگڑ بھی۔ ہم اس نتیجہ کو شکل غیم کی مدد سے آسانی سمجھ سکتے ہیں۔ اگر کسی قسم کی رگڑ نہ ہوتی تو چاند کی کشش کا اثر زمین کے مرکز کی سمت میں ظاہر ہوتا، لیکن رگڑ کی وجہ سے کشش کا اثر اس کے بجائے سمت ج ن میں ہوتا ہے جو زمین کے مرکز میں سے نہیں گذرتی سمت ج ن میں عمل کرنے والی طاقت دو سمتوں میں منقسم کیجا سکتی ہے۔ ایک جز عودی سمت میں اور ایک افقی میں۔ ان میں سے ایک جز زمین کی حرکت کم کرتا ہے اور دوسرا چونکہ زمین کے مرکز میں سے گذرتا ہے لہذا اس کا اثر زمین کی حرکت پر کچھ نہیں ہوتا۔

طوالت کے خوف سے ہم اس دلچسپ بحث کو نہیں چھوڑ دیتے ہیں لیکن اس بات کا ایک عملی ثبوت کہ مد و جزر کی رگڑ فی الواقع کسی جسم کی حرکت روکنے کے لیے کافی ہو سکتی ہے، ہمیں چاند کی حالت میں ملتا ہے۔ چونکہ زمین چاند سے بہت بڑی ہے اس لیے جب چاند زمانہ سابقہ میں سیال حالت میں تھا تو زمین کی کشش سے چاند کی سطح پر نہایت شدت کے ساتھ اٹا پڑھا ہوتا تھا۔ آپ نے بار بار سنا ہوگا کہ چاند ہمیشہ اپنا ایک ہی رخ زمین کو دکھاتا ہے۔ کبھی انسانی آنکھ نے چاند کا دوسرا رخ نہیں دیکھا۔ صرف کبھی کبھی اس رخ کے چھوٹے سے حصہ کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ چاند اپنے محور کے گرد اسی عرصہ میں ایک کامل گردش پوری کرتا ہے جتنے عرصے میں وہ زمین

۱۳۰۰ء تا ۱۳۰۰ء علیٰ ہذا القیاس ساری صدی میں ۲۵۰ تا ۲۵۰ ضائع گئے۔ اب اگر ہر صدی کے نقصان کو جمع کریں تو مجموعی نقصان کا پتہ چل جائیگا یعنی یہ معلوم ہوگا کہ آج زمین گھڑی سے کس قدر پیچھے گئی ہو۔ حاصل جمع یوں ملے گا۔

$$(۲۵ + ۴۵ + ۱۲۵ + ۱۴۵ + ۱۳۲۵) \text{ تا ۱۳۲۵}$$

$$۲۵۰ (۱ + ۳ + ۵ + ۷ + ۹) \text{ تا ۵۳}$$

$$۲۵۰ + ۵۷ + ۲۴ = ۲۴۰ + ۲۵۰ = ۴۹۰ \text{ گھنٹہ ۲ منٹ ۲۵ تا ۲۵۰}$$

فیروز الدین مراد

ہوتا ہے کہ پہلی صدی میں زمین گھڑی سے ۲۵ تا ۲۵ پیچھے رہ گئی اس طرح دوسری صدی کے پہلے سال میں زمین نے نصف تا ۲۵ گھوٹا۔ دوسرے سال میں ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۰ اور سوین سال میں پورے ایک تا ۱۳۰۰ گواہی دیتی ہے کہ دوسری صدی میں گھڑی سے ۵۰ تا ۵۰ پیچھے رہ گئی اس طرح دوسری صدی کے اختتام پر زمین گھڑی سے ۱۰۰ تا ۱۰۰ پیچھے ہو گئی۔ اس طرح ہر صدی میں زمین گھڑی سے زیادہ زیادہ پیچھے ہوئی گئی ستائیسویں صدی کے شروع سال میں زمین ۱۳۰۰ تا ۱۳۰۰ ضائع گئے۔ دوسرے سال میں

تاریخی تصورات کا انقلاب

دیا اور مسیحی دین کے بانی کی پیدائش سے چار ہزار سال قبل دُنیا کا وجود پذیر ہونا ٹھہرایا۔ یہ تاریخ بعض بائبلوں کے حاشیہ پر مطبوع ہو کر مروج رہی۔ اس طرح سے دُنیا کی عمر چھ سات ہزار سال شمار ہونے لگی۔ لیکن انیسویں صدی سائنس کی تحقیقات، عالمانہ تنقید اور محققانہ طریقہ استدلال کے لیے اپنی سابقہ ہنوں پر ہمیشہ ممتاز رہیگی مخالفوں کے ایک گروہ نے بشپ اشٹرک تخمینہ کو تہ و بالا کر کے بالکل ناقابل اعتبار قرار دیا۔

سائنسی اکتشافات سے ہمارے خیالات پر بہت گہرا اثر ہوا ہے اور پرنے تصورات بالکل بدل گئے ہیں۔ اسکے کئی وجوہ ہیں اور سب سے بڑی وجہ علوم طبیعی کی غیر معمولی ترقی ہے۔ اس سے ہماری مراد انسانی طبعیات، کیمسٹری، فلکیات، اور اثرات (آرکیولوجی) سے ہے۔ علم مذاہب، علم انواع انسان، اور علم السنہ کی ترقیوں نے بھی اس انقلاب میں بڑا بھاری حصہ لیا ہے۔ مگر تاریخی تصورات کی تبدیلی سہرا سب سے پہلے اثرات پیرایات اور اخیر میں علم معاشرت (سوشیالوجی) کے دو شعبوں علم نوع انسان اور علم مذہب کے سر بندھنا اور تاریخی زمانہ کی توسیع کی نیکنامی کا طرہ اثرات کے محققوں اور عالموں کی ترقی

انیسویں صدی کی علمی کوششوں اور ترقیوں نے جہاں ہمارے اور خیالات پر گہرا اثر ڈالا اور ہمارے تخیل کا رخ بدل دیا ہے وہاں ہمارے تاریخی تصورات میں بھی اہم انقلاب واقع ہوا ہے۔ اٹھارہویں صدی کی دُنیا بہت محدود تھی اور کرۂ ارض دو شیعہ معلوم ہوتی تھی۔ تاریخی زمانے بالکل کم سن پختے تھے، لیکن جب ان پر انیسویں صدی کے اکتشافات کی روشنی میں نگاہ ڈالی جائے تو وہ نوع نہیں بلکہ ضعیف العمر اور سفید ریش نظر آتے ہیں۔ تاریخی زمانہ ضعیف سن۔ بچہ نہیں بلکہ بچہ جوان اور اشد شباب میں نظر آتا ہے۔

دُنیا کی چھ ہزار سال عمر کا خیال

دُنیا کو چھ ہزار سال سے قائم سمجھنا ایک معمولی بات تھی اور لوگ لکیر کے قیصر اور بزرگوں کی آرا کے ایسے پابند تھے کہ کچھ چون و چرا کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یورپ جو تمام علمی ترقیوں کا مصدر و مسکن ہے دُنیا کو چند ہزار برس سے سمجھتا تھا۔ اسکی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ سترھویں صدی میں آئرلینڈ کے آئرش صاحب اثر نے بابل میں جن بزرگوں کا ذکر آیا ہے انکی نسلوں کو جمع کر کے انکی ولادت اور موجودگی کا ایک زمانہ قرار

مین لگنا چاہئے۔ انسان کی قدامت اور دنیا کی عمر کے باب میں جو قوی شہادہ ہم پہنچی ہو وہ اثریات سے نہیں بلکہ ارضیات اور (Palæontology) پیلینٹالوجی یعنی علم سحجرات حیوانی اور (Anthropology) انٹروپولوجی یعنی علم الانسان اور ایتھنالوجی (Ethnology) یعنی علم الاقوام کے اکتشافات سے ہاتھ لگی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اثریات نہایت وسیع معنی میں انسان کی نہایت پرانی تاریخ کے ہر شعبہ پر حادی ہو جو بقدمات (Antiquities) سے متعلق ہر چاہے وہ بحیرہ بائک کے کنارے کے یا دگاری پتے ہوں یا فرانسس کی سمجھ پڑیاں اور منقش ہڈیاں یا چھتاق کے اوزار رومی کے برتن مصر کی مومیات عراق عرب کی خشتی لوحین اور ابھرے کام کی اشیاء یونان اور روم کے سکے اور سنگ تراشی کے نمونے ہوں یا کتبے یا لاکھ کی لوحین چرمی تحریریں یا پٹیلہ گھاس پر لکھے ہوئے نسخے الغرض زمانہ مقدم تاریخ کی بابت جو خیالات ہم قائم کرتے ہیں وہ پرانے زمانے کے پشتون غاروں اور ندن مقبروں جھیل کے اندر مکانون کے آثاروں نہایت قدیم زمانے کے برنجی یا سنگین اوزاروں انسان کی کھوپڑیوں اور پجروں سے جو معدوم جانوروں کے پادبہ پلو پائی گئی ہیں ابتدائی انسان کے اوضاع و اطوار اور اس کے تمدن پر معقول روشنی پڑتی ہو اور ہم نہایت قدیم زمانہ کے آدمیوں کی طرز زیست کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

زمین اور انسان کی قدامت

زمین کی عمر کے باب میں جو تغیر ہمارے خیال میں واقع ہوا ہو اسکی وجہ ارضیات اور پیلینٹالوجی کے محققوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے جسے اثریات سے بالواسطہ تحریک اور مدد پہنچی ہو۔ ایک انگریز عالم حیمبرٹنٹن نے اٹھارھویں صدی کے آخری ایام میں صلیح شروع کی ولیم سمٹھ نے انگلستان میں اور کورنر نے فرانس میں اسے بہت ترقی دی لیکن زمین کو بہت پرانی قرار دینے والا سرچارلس لائل انگلستان کا ماہر ارضیات تھا جسے

اپنی معرکہ الآرا کتاب اصول ارضیات میں اپنے خیالات کو خوب واضح کیا تھا۔ یہ کتاب ملکہ وکٹوریہ کے تخت نشین ہونے سے چند سال قبل شائع کی گئی تھی۔ اس میں اس نے ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ قرون ارضی کی داستان اسی وقت بخوبی سمجھ میں آسکتی ہو جب طبقات الارض کی ترکیب و ساخت کے لیے وسیع زمانے قرار دیے جائیں۔ اس پرانے خیال کے حامیوں اور سرچارلس لائل وغیرہ کے طرفداروں میں ایک عرصہ تک حیرتیں جاری رہی۔ آخر کار انیسویں صدی کے وسط میں نیا خیال غالب آیا، مگر اسکے ساتھ بالواسطہ یہ سوال پیدا ہو گیا کہ انسان کی قدامت بھی بہت وسیع سمجھی جائے۔ لائل نے اس کام کو بھی اپنے ذمہ لیا اور سترہ عین قدامت انسان کے نام سے اپنی دوسری زمانہ خیر کتاب شائع کی۔ انسان کی قدامت کے متعلق جرمن محقق انٹروپولوجیا شمزلنگ (Schmrling) اور پوشدے پرتس (Boucher de Parthes) اور کئی دیگر علماء نے بھی بہت کام کیا تھا۔ انھوں نے انسانی ساخت کے وہ اوزار نکالے جو معدوم جانوروں کی ہڈیوں کے ہلو بہ ہلو غاروں اور کھوہوں میں پائے گئے۔ اور اسی قسم کی دیگر پرانی چیزیں دریاؤں کے دھانوں اور پہاڑیخین خاک کے نیچے سے نکالی گئیں۔ ان کے اوپر جو ریت کی تہ چڑھ گئی تھی، اسکی سوئی سے اگلے زمانے کا تخمینہ کیا گیا۔ الغرض اثریات مقدم تاریخ کی اشیاء ہم پہنچا کر محققوں نے بڑی احتیاط اور ہوشیاری سے انسان کی عمر کا اندازہ لگایا۔ اسکے متعلق بھی بہت سی رد و دیکھ ہوئی لیکن آخر کار علماء کے خیالات غالب آئے اور انسان کی قدامت مسلمہ ٹھہری۔

ابل اور مصر کے پرانے کتبے

اگر کوئی پوچھے کہ سترہ ع سے پیشتر عالموں اور مورخوں کو نہایت قدیم مصر و سوڈان (عراق عرب) اور ایشیائے کوچک کی تاریخ کا کیا علم تھا؟ تو جواب میں یہ کہنا پڑتا ہو کہ اس وقت ان ممالک کے نہایت

پڑنے والے حالات سے ہم ناواقف تھے۔ مصر قدیم کے تاریخی اصرار کی کچھ
 علماء کو معلوم تھی جسکی شاہد شاہد ماسنگ اور موسیو سنون پالیون کو ملنا
 چاہیے۔ مصر سے جو کتبے برآمد ہوئے تھے ان کے پڑھنے کا طریقہ معلوم ہو گیا
 تھا مگر اسمین ترقی بہت تھوڑی ہوئی تھی اور اس زمانے کی تاریخ
 کا کچھ ضمنی ذکر بائبل کے اوراق میں اور کچھ یونانی مورخ ہرودس
 (Herodotus) اور دیوڈس (Diodorus) کی
 تصانیف میں تھا۔ اگر اس وقت کوئی عالم یہ کہتا کہ عنقریب پڑنے
 والے کی ایسی چیزیں برآمد ہوں گی جنکی بدولت قدیم زمانہ کی تاریخ پر نیا
 زبردست روشنی پڑے گی اور عجیب و غریب حالات معلوم ہوں گے
 تو اسے پتہ و خانے کی گپ سے زیادہ وقعت ہرگز نہ دی جاتی۔ مگر بعد
 کے واقعات سے جو کچھ عیاں ہوا وہ حیرت میں ڈالنے والا جو خشتی کتابوں
 اور کتبوں اور مصوری کے نمونوں سے ایک نئی دنیا وجود میں آئی۔
 جن قوموں اور ملکوں کا یونانی مورخوں نے بڑے ادب و احترام سے
 ذکر کر کے انھیں تمدن کے مخترع قرار دیا تھا انکی تمدنی ترقیوں کے ثبوت
 دستیاب ہو گئے اور اس سے تاریخ قدیم کے نامعلوم مگر نہایت شاندار
 دور کا آغاز ہوا۔ قیاسات اور روایات شاندار تاریخی واقعات اور
 معتبر حالات میں تبدیل ہو گئے۔ ملک عظیم ایدو و رڈو ہفتم مرحوم ابھی غائب
 کرنے کے قابل بھی نہیں ہوئے تھے کہ فرانس کے دل چاہے محقق، بوتھا
 (Botta) نے نینوہ کے پڑنے محل وقوع پر جا کر کھنڈروں کو تہہ بالا
 کرنا شروع کر دیا اور اس تاریخی کام میں سر مہتری لیسرڈ نے بھی اسکا ہاتھ
 بٹایا۔ محققوں کی محنت ٹھکانے لگی۔ بہت جلد بیسیویں قسم کی پڑائی چیزیں
 نکل آئیں جس سے یہ امر ثابت ہو گیا کہ آسوریہ کے دار الحکومت کی شان و
 شوکت قیاسی نہیں بلکہ حقیقی تھی اور اسکا تمدن بہت اعلیٰ درجے پر پہنچا
 ہوا تھا۔ سنگتراشی کے رنگین اور سادہ نمونے اور کھدائی کی چیزیں دستیاب
 ہوئیں جس سے یہ ظاہر ہوا کہ اہل آسوریہ نے اس فن میں بڑی ترقی کی

تھی۔ نہ صرف یہی بلکہ خشتی کتابوں کے تودے کے تودے برآمد ہوئے۔
 چوڑی چھٹی لمبی گول اینٹوں پر عجیب قسم کے حروف کندہ پائے گئے۔ یہ
 اینٹیں آوے کے اندر پکائی گئی تھیں۔ ان حروف کو کوئی نہ سمجھ سکتا تھا
 مگر عالم اسے ایک قسم کا رسم الخط سمجھتے تھے۔ ان اینٹوں کے انبار سے
 کتب خانے ظاہر ہوئے۔ بہتوں نے خیال کیا کہ جو کچھ اینٹوں پر لکھا ہے وہ ہمیشہ
 اسرار بستہ رہیگا۔ اور بات بھی یہی ہو کہ اس زبان کے بولنے والے اور
 لکھنے والے دو ہزار سال قبل صفحہ ہستی سے نیست و نابود ہو چکے تھے اور
 اسکا پتہ لگانا معجزہ سے کم نہ تھا۔ لیکن عالموں کی دماغ سوزی کامیاب ہوئی۔
 ان حروف کے پڑھنے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔ اسے کسی اور موقع کیلئے لکھا
 رکھا ہوں لیکن بیان پر اتنا ہی کہنا کافی ہو کہ آسوری حروف کو قدیم
 ایرانیوں نے بھی اختیار کر لیا تھا۔ خط پختی کے نام سے مشہور ہو اور ایران
 میں کئی جگہ ان حروف کے کتبے پائے گئے جنھیں جرمنی کے نامی ماہر اسنہ
 گروٹے فند (Grotefend) نے عجیب و غریب دانائی کے ساتھ پڑھ کر
 غیر فانی شہرت حاصل کی۔ محققین میں ایک کتبہ ایک چٹان پر کندہ تھا۔
 جسے بعض دارا و بعض ملکہ سبی راس (بیکم نینوہ) سے منسوب کرتے تھے۔ یہ کتبہ
 تین زبانوں میں تھا۔ ایک آسوری، دوسری ساسانی، تیسری پہلوی
 اور کتبہ دارا کا تھا۔ اور یہ بھی خیال کیا گیا تھا کہ تینوں کی زبان ایک ہی
 ہے۔ سر مہتری رائسن نے بعد ازاں معلوم کیا کہ ایرانی زبان کے کتبے میں
 اسکا معنی بہت ہیں۔ ایک نام بار بار حروف یعنی میں آتا تھا جب
 ایک لفظ پڑھا گیا تو رفتہ رفتہ باقی حروف بھی پہچان لئے گئے۔ اس طرح
 کتبہ پڑھ لیا اور حروف منہی اختراع ہوئے پھر آسوری کتبہ اور خشتی کتابیں
 پڑھنے میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی۔ سترہویں صدی میں سر جان کارنوال سوس
 اور فرانس کے نامی مورخ موسیو رانسٹ رینان نے یہ دعویٰ کیا کہ آسوری
 زبان اور علم محض یاروں کی تراش ہو۔ مگر رائسن، ہنکس، اوپٹ اور
 فوکس ٹال بٹ نے ایک آسوری عبارت کا ترجمہ ایک دوسرے سے الگ الگ

رہ کر کیا اور نمونے رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے پاس بھیجے گئے جس کا صدر جانج گروٹ ایسا فاضل تھا اس نے ترجیہ دیکھا کہ یہ قرار دیا کہ حروف مینیٹائی نہیں بلکہ اصل زبان ہور اور یہ اسوری کتبے پڑھنے میں سچ بچ کامیابی حاصل ہوئی ہو۔ وہاں سے اسیرالوجی (Assyriology) یعنی علم آثار قدیمہ اسوریہ کی بنیاد پڑی۔

نینوہ کے کھنڈر خوب کھودے گئے۔ اہل میں تحقیقات ہوئی اور کئی پرانی مقامات کی دیکھ بھال ہوئی۔ سیکڑوں کتابیں اور بیسیوں کتبے برآمد ہوئے اور وہ چڑھ لئے گئے بعض کتابوں اور تحریروں پر تاریخ ہو اور تاریخی حالات قلم بند ہیں۔ ان خشتی تحریروں سے اب پرانی تاریخ بہت واضح ہو گئی ہے جن بادشاہوں کا وجود محض خیالی سمجھا گیا تھا وہ اب تاریخی اور حقیقی آدمی ظاہر ہوتے ہیں اور ان کے کارناموں کی داستانیں ان کے کتبوں میں موجود ہیں۔

عراق عرب کا تمدن

اس میں کچھ شک نہیں کہ قدیم زمانے کی تاریخ کے زمانوں اور واقعات کے سلسلے کی تمام کڑیاں نینمیتی میں۔ خالیدیہ (Chaldea) کے قدیم زمانے کے حالات بہت معتبر نہیں ہیں۔ مگر سارگون (شاہ اسوریہ) سے شروع کیا گیا تھا۔ گو اس سے وہ پہلے قیاسی شخص سمجھا گیا تھا۔ عجائب خانہ برطانیہ میں بعض لوحیں ایسی ہیں جن کے اوپر نقشہ نقش ہے۔ امریکی نامی یونیورسٹی پنسلونیہ تحقیقاتی ہم اہل کو بھیجی تھی اس نے کھنڈروں کے ڈھیر کے نیچے سے ایسی چیزیں نکالی ہیں جنہیں بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ عراق عرب میں نو ہزار سال پیشتر تمدن عروج پر تھا۔

مصری آثار قدیمہ اور ان کی شہادت

عالموں کا ایک گروہ مصر کے کھنڈروں کی غور و پرداخت میں مصروف تھا۔ انھوں نے اس خطہ تصویر کو چڑھا جو مصر قدیم میں مروج تھا۔ نیگ اور شون پالیوں کے کام کو جرمن محقق لپ میس اور گرش

در وژا، نارمن، برج، ماریوت، ماس پروادرا زن نے تکمیل پہنچایا۔ ان کے ساتھ اور کئی مشہور محققین مثلاً گارڈنرول کنس، پروفیسر فلنڈرس پیری نے مختلف کھنڈروں کے نیچے سے بہت سی چیزیں نکالیں جو تاریخی اعتبار سے نہایت قابل قدر اور قیمتی ہیں۔ ظالمی بادشاہوں کے راج پر وہت منٹو (Manetho) نے مصر قدیم کی ایک تاریخ لکھی تھی۔ اس نے جو فہرست بادشاہوں کی لکھی تھی وہ مدت تک بالکل بناوٹی شمار ہوتی رہی لیکن پروفیسر پیری کی کوشش سے کئی تحریروں ایسی برآمد ہوئی ہیں جن سے منٹو کے بیان کی تائید و تصدیق ہو گئی ہے۔ اس کی کتاب صنائع ہو گئی تھی مگر یونانی مورخوں نے اس کا ذکر کیا ہے اور کئی اقباس بھی دیے ہیں۔ مصر کی پرانی تاریخ کو واقعات ایسی صحت اور درستی سے واقع نہیں ہوتے جیسے اہل اور اسوریہ کے ہو سکتے ہیں۔ تاہم پروفیسر فلنڈرس پیری کی تحقیقات سے پانچ چھ ہزار سال قبل مسیح کے واقعات کا کچھ کچھ پتہ چلتا ہے۔ بابل اسوریہ اور مصر کی پرانی تحریروں اور آثار قدیمہ سے یہ امر بخوبی ظاہر ہو گیا ہے کہ وہاں پر تمدن کئی ہزار سال سے رائج ہے۔

تاریخ جدید کا ابتدائی باب

اس سے ظاہر ہو گیا ہو گا کہ مذکورہ مالک کے آثار قدیم سے ہمارے تاریخی خیالات نے کیسا پٹا کھایا ہے۔ اثریات کے اکتشافات کے ساتھ ایک ایسی دنیا وجود میں آگئی ہے جس کی ہستی کے نشانات مدتوں تک پڑنے شہروں کے کھنڈروں کے نیچے دفن رہے اور صرف چند سال سے انکا پتہ لگا ہے۔ انکی بنا پر ہم اپنے تاریخی تصورات قطع و برید کرینکی اند ضرورت لاحق ہوئی ہے۔ اگر آٹھ نو ہزار سال تمدن کا سوجھ بوجھ انہما پر تھا تو ہم زمانہ تاریخ کے طلوع کو کہاں ڈھونڈھنے جائیں۔ اگر اس مہیا سے دیکھا جائے تو اہل رومہ ہمارے ہم عصر اور یونان کا "ست جگ" صرف کل کی بات ٹھہرتا ہے اور صرف اہرام مصری (Pyramids)

کے بنانے والے قدرے دور افتادہ زمانہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ فرض کر دیں لوگوں نے متفقہ مین نیپور (متصل بابل) میں بیل دیوتا کا مندر بنایا تھا وہ خود کو تمدن اور شائستگی کے اوج پر سمجھتے ہوئے پرنسپل اہتھی کا خیال یہ ہو کہ اہرام مصری کی تعمیر کا زمانہ تمدن کی خزانہ سمجھنا چاہیے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ تمدن کا موسم بہار کونسا زمانہ ہوگا اس کا جذب علم انثریات مقدم التاریخ بہم پہنچا سکتا ہے جسے ان روضوں اور قیامی یادگاروں سے حاصل کرنا چاہیے جو مفصل نیپور اور نیوہ سے برآمد ہوئے ہیں اور انکی بنا پر صرف دس ہزار سال کا زمانہ تمدن قرار دیا گیا ہے جس کو تاریخ جدید کے ابتدائی باب میں شامل کیا جاتا ہے۔

مصری تمدن کا زمانہ کی ابتدا

اگرچہ اس مسئلہ پر وضاحت و صراحت سے لکھنا دشوار ہے مگر محققین کے خیالات کا اجمالی ذکر مناسب ہے مصر کے پرانے کھنڈروں سے جو کتبے اور سکے، مصوری اور سنگتراشی کے نمونے، اور دیگر اشیاء برآمد ہوئی ہیں انکی بنا پر وہان کی تمدنی حالت اور تمدن کی ابتدا کا تخمینہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر فلنڈرس پیئری جو مصر کے آثار قدیمہ کے ماہرین ہیں۔ تاریخی تحریروں اور قبرستانوں کو دیکھنے کے بعد لے قائم کی گئی ہے کہ مصر کے مسلسل تمدن کی ابتدا دس ہزار برس پیشتر یعنی متفقہ مین ہوئی تھی۔ حال یہ کہ اس وقت کی حالت اور موجودہ حالت میں کتنی مشابہت ہے اگرچہ تفصیلی حیثیت سے ملک کی آج کی حالت بالکل بدلی ہوئی ہے کیونکہ نیل کے سیلابوں کے سبب اسکے ارد گرد جو مٹی جمی رہتی ہے اس سے بہت فرق واقع ہو گیا ہے۔ اسکی بابت علماء کا اندازہ ہے کہ بالواسطہ پانچ انچہ زمین ایک صدی میں بنتی ہے اور اسکی گہرائی ۲۶ فٹ اور بعض جگہ ۶۲ فٹ پائی گئی ہے۔ اس کے نیچے گارے کے بجائے ریت نکلتی ہے جسکی وجہ سے اوسط عمق زمین ۳۹ فٹ بہت زیادہ ہے اسے ۳۵ فٹ قرار دینا چاہیے۔ اب مٹی کی اتنی موٹی تہ جسے کے لیے پانچ انچہ فی صدی کے حساب سے چھ ہزار سال کا عرصہ چاہیے لیکن اس

اندازہ میں ایک قباحت بھی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مٹی جسے کاعل آہستہ آہستہ ہوا ہو اور مکن ہو کہ جلد ہوا ہو۔ پامال تو زمینوں کے ذریعے سے نیل کے کنارے مختلف مقامات پر اسکا اندازہ کیا گیا ہے۔ اسکے لیے سات اور پندرہ ہزار سال کا عرصہ درکار ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اسکے کنارے کے طبقات ایک لاکھ سال سے شروع ہوئے ہوں۔ اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ جب زمین قابل کاشت ہوئی تو اسکے ساتھ معرین تمدنی طرز معاشرت کی بھی ابتدا ہوئی۔ نیل کی طغیانیوں سے پیشتر بارش کے ذریعے سے روئیدگی قائم رہتی ہوگی۔

آثار سے مصر کی تہذیب متفقہ مین سے سل چلی آتی ہے۔ اس ملک کی تحریری تاریخ اول شاہی خاندان کا پتہ دیتی ہے جو متفقہ مین حکمران تھا۔ اور اس پیشتر کا زمانہ مقدم التاریخ کہتا تھا؛ اسکی بابت یقین اور صحت کے ساتھ بیان کرنا دشوار ہے مگر اس زمانے کی قبریں تاریخی زمانے کے برابر پائی گئی ہیں۔ اسلئے اسے دو تین ہزار برس قرار دینا چاہیے۔

ایک ہزار قسم کے ظروف چینی اور دغنی مصر سے برآمد ہوئے ہیں جو اسکے تمدن کے مختلف قرون میں بنے تھے۔ سنگ پر مو کے نام سے ایک کتبہ مشہور ہے جو چند سال ہوئے مصر سے نکلا تھا۔ اس میں متفقہ مین کے سالانہ واقعات کا ذکر ہے۔ ایک قطار میں دریائے نیل کے چڑھاؤ، اور دوسرے میں ہمازون کا عرض و طول اور شمار دیا ہے۔ لکھا ہے۔

ایک جہاز ایک سو ستر فٹ لمبا اور ساٹھ جہاز سو سو فٹ لمبے لمبے بنائے گئے تھے حبشی مغلوب ہوئے ان کے چار ہزار مرد، تین ہزار مستورات اور دو لاکھ مویشی بطو مال غنیمت ہاتھ لگے۔ بادشاہ سنفر (Snefrue) کے محل کے ارد گرد ایک بڑی دیوار بنائی گئی۔ اسوریہ سے صنوبر کی کڑی جاذبون کے واسطے لائی گئی۔ ۳۵ مکانات شکار گاہوں میں اور ۱۲۲ تالاب مویشیوں کے لیے بنائے تھے اور ساتویں مویشی شماری ہوئی۔

بادشاہوں کے مجروں سے آبنوس اور ہاتھی دانت کی لوحوں پر لکھے

لے اڈا رس ورتھ ہٹری آٹ رٹ "جلد اول صفحہ ۲۳۲۔

۱۱۰۰ ق م شروع ہوتا ہے۔ اس ملک کے آثار قدیمہ سے اسکا کھوج ہو سکتا ہے اور
سے پیشتر کی حالت۔

۱۰۰۰ ق م مصر کے اوپر مغربی ایشیا کی قوموں نے حملہ کیا۔

۹۰۰ ق م اس قوم نے حملہ کیا جسے مصر کے شاہی خاندانوں کی بنیاد ملی۔

۸۰۰ ق م مینا تمام مصر کو فتح کر کے اسکا مطلق الشان بادشاہ بن گیا۔

۷۰۰ ق م خوفو بادشاہ ہر عظیم کی تعمیر شروع کرتا ہے۔

۶۰۰ ق م شمال کی طرف مصر پر حملہ ہوتا ہے۔

۵۰۰ ق م وسطی بادشاہت قائم ہوتی اور بارہوان خاندان بر سر حکومت

آتا ہے۔

۴۰۰ ق م بدوسامی یعنی کساس لوگ مصر پر حملہ کرتے اور پندرہویں

شاہی خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔

۳۰۰ ق م کساس لوگوں کی دوسری حرکت یعنی مصر کے وسیع حصہ

پر انکی حکومت پھیل جاتی ہے۔

۲۰۰ ق م کل الامرنہ خطوط لکھے گئے جو اب ویسے کے ویسے ہی

برآمد ہو گئے ہیں۔

بابل کی تاریخ کے واقعات

۱۰۰۰ ق م شہر سوزا (Susa) کی بنیاد قائم ہوئی۔

۹۰۰ ق م بادشاہ ایا (Ea) اریدو کی بنیاد ڈالتا اور اس ملک

کو جذب بنانے کی کوشش کرتا ہے۔

۸۰۰ ق م بادشاہوں کی قدیم ترین یادگارین جو حال میں معلوم ہوئی ہیں

انکی بنیاد اسوقت پڑتی تھی۔

۷۰۰ ق م ارینا۔

۶۰۰ ق م سامی بادشاہ سارگون اور نارام سین کا عہد سامی حکومت قائم

ہوتی ہے۔

۵۰۰ ق م گدیہ کی حکومت بابل میں قائم ہوتی ہے۔

۴۰۰ ق م عوامی لوگ بابل کو فتح کرتے ہیں

۳۰۰ ق م (داخل) ہم ربی ہر حکومت آتا اور اپنا قانون نافذ کرتا ہے۔

۲۰۰ ق م کاندان کا سیہ حکمرانی کرتا ہے۔

۱۰۰ ق م ہر بارہا کی حکومت شروع ہوتی ہے۔

۰ ق م کسے چرب کے عہد کا آغاز ہوتا ہے۔

۳۰۰ ق م بنو ناد کا زمانہ اور بابل کا زوال شروع ہوتا ہے۔

ہندوستان قدیم

کے تمدن کی بابت عالموں کی رائے

بابل اور مصر کے آثار قدیمہ اور انکی بنا پر محققوں نے جو آراء قائم کی

ہیں انکی بحث کے بعد یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کے پرنے تمدن

اور اسکے نشانات کی بنا پر انکی قدامت کا بھی مختصر ذکر کیا جائے ہم نے

شروع میں کما تھا کہ سنسکرت لٹریچر کے ذریعے سے ہمارے تاریخی تصورات

کے انقلاب کو زبردست تحریک پہنچی ہے۔

جرمنی کا مشہور محقق سیکیس ڈونکر "تاریخ تقدات" کی جلد چہارم

میں لکھتا ہے۔

پتہ تبس (جوشا دیانی سیوس [Deonyisius] کا

دوسرا نام ہے) نے ۱۰۰۰ ق م میں اپنی سلطنت شروع کی تھی سمیت یہ ہشتری کی

بابت کہا جاتا ہے کہ وہ کبریٰ سمیت سے ۲۰۰۰ برس پہلے شروع ہوا تھا اور اس

اعتبار سے یہ ہشتری سمیت کا آغاز ۱۰۰۰ ق م میں ہوا تھا۔

ناروے کا محقق رئیس کاؤٹ باؤرن جرن (Byornstjerna)

"تھیانگنی آف دی ہندوز" میں لکھتا ہے۔

بگتھنز جو سکندر عظیم کی طرف سے دربار چندر گپت میں ایلچی مقرر تھا اسے

پاٹلی پتر دیش میں جو اسکا دار السلطنت تھا ۵۳۵ اراجاؤن کی فہرست پانی

جنہوں نے پتہ تبس سے لیکر چندر گپت کے زمانے تک حکمرانی کی تھی انہیں

۱۷ مضمون کا حصہ ہندو سپر پارٹی کے ایک باب سے اخذ ہے۔

نے سکندر عظمیٰ کے حملہ ہند سے ۶۰۰ برس پہلے حکومت کی تھی اور بادشاہ ہندو تھے جسکو انہوں نے بھی اپنی تاریخ ہند کی دوسری جلد میں تسلیم کیا ہے۔ دبستان سے ظاہر ہے کہ مشرقی ہندوستان کا تمدن عروج پر تھا۔ ہندوستان کے مختلف مقامات سے جو سکے پڑنے زمانے کے نکلے ہیں ان سے بھی ہندو تمدن پر روشنی پڑتی ہے اور وہ بہت پرانا ٹھہرتا ہے۔ افسوس نے اسکا کھلے الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔

لیکن جس قوم کے ہاں برہمن دین اور برہمن راتری کے سلسلے اور اسکے مختلف زمانے یگن چترگیون، مہا یگن، منو سترن اور کلپون میں بٹے ہوئے ہوں اور پھر ہر ایک زمانہ کئی کئی لاکھ برس قرار دیا گیا اسکے لیے دس پانچ ہزار سال محض ایسے ہیں جیسے بڑے گھڑے میں پانی کا ایک چمچ۔

نتیجہ

اس ساری بحث کا لب لباب یہ ہے کہ زمانہ حال کے اثری کشفات اور علمی تحقیقات نے ہمارے تمام خیالات کو الٹ پلٹ کر دیا ہے اور تاریخی زمانہ جو پہلے محدود تھا اب بہت وسیع ہو گیا ہے۔ پرانی چیزوں کی بنا پر آٹھ دس ہزار سال کے تمدن کا یہ گنتا ہے جس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ ابتدائی وحشیانہ حالت سے انسانی حاصل کرنے میں انسان کو ضرور کچھ عرصہ درکار ہوا ہوگا اور چونکہ ابتدائی ترقی بہت آہستہ آہستہ ہو کرتی ہے اسوجہ سے دو چار ہزار سال اسکے لیے بھی مخصوص ہونے چاہئیں۔

ہر ایک کا نام اور عہد حکومت کی معیاری گئی ہے جو اہم ۶۴ برس ہوتی ہے۔ اس سے سب تبس کی حکمرانی کا زمانہ متعین شروع ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے وہ مصر کے سب سے پہلے بادشاہ سے جسکا ذکر منو نے کیا ہے، ایک ہزار برس پیشتر گذر چکا ہے۔ میننچ پر بیٹھا تھا اور مصر کے حکمران سو فی سے دو ہزار برس پہلے جسے ہرم غزہ کی بنیاد ڈالی تھی۔

پھر ایک اور جگہ وہی عالم لکھتا ہے:-

ہندوؤں کے تمدن کی قدامت کے اور بھی زبردست ثبوت موجود ہیں اور وہ الی فٹھ ایورہ اور دیگر مقامات کے سنگلاخ مندر ہیں جن پر عجیب و غریب ہنری اور دانتائی مرت ہوئی ہے وہ مصر کے اہرام سے فن تعمیر کے اعتبار سے بڑھ چڑھ کر ہیں۔ جرمن عالم پروفیسر ہیرن (Hern) کہتا ہے:-

سب تبس اور چندر گپت کے درمیان ۶۰۴۲ سال کا فاصلہ ہے۔ رومہ کا مشہور عالم پلینی کہتا ہے:-

بیکس (Bacchus) سے لیکر سکندر مقدونی کے زمانے تک ہندوستان میں ۱۵۴ بادشاہ حکمران ہوئے۔ اور ان کا زمانہ ۶۴۵۱ سال ہوتا ہے۔

ایک باختری نسخہ دبستان کے نام سے مشہور ہے جو کشمیر سے برآمد ہوا تھا۔ اسے سرولیم جو زلیورپ نے گئے تھے۔ اس میں ان بادشاہوں کا ذکر ہے جو باختر میں حکمران تھے اور ہما بیری کہلاتے تھے۔ اس سلسلے کے پہلے بادشاہ

بمبئی گرامہ برخویش نیاز دچکند
در قمار تو دل از نیند نہ باز دچکند
دست اگر سوی تو گستاخ نہ یاز دچکند
چارہ گرا با من بیچارہ چہ ساز دچکند

شبلی نعمانی

شبلی دل زودہ، در وادی غم دیر رسید
گرم اگر در رہ عشق تو نہ تاز دچکند

این چنین گردن دعوی نہ فراز دچکند
غیر ازین ہیج متاع نبود عاشق را
عاشق از بسکہ بہ پیش تو ز تو محروم است
بسکہ در دمن از اندازہ در مان بگذشت

اجودھیا

صفحہ ہستی پر بہت سے ایسے خطہ ہیں جن کی قسمت میں بچنے اپنے فیض ہاتھوں سے ہنسی کی سرسبزی و شادابی لکھدی ہو اور اس دلاویزی کے ساتھ ساتھ اہل دنیا کی ندیدی آنکھیں کچھ ایسی پڑتی رہتی ہیں کہ وہ کبھی اپنے سے انکو جہ انہیں ہونے دیتی۔ گورمانہ کے انقلابات اپنا اثر ڈال ہی چھوڑے ہیں لیکن ہرنے روپ میں دلگیری اور دل فری دوچار درجہ اور ہی بڑھ چکی ہو۔ اور زمانہ زرین کے بھولے بھالے بسنے والوں نے مذہبی پہلو کی شقی کچھ ایسی دانائی سے ان شہروں کے ساتھ لگا دی ہو جس سے ان کی آبادانی کو اور بھی اچھا موقع ملتا رہتا ہو۔ دنیا نے بہت سے پلے کھائے متعدد قالب بدلے لیکن مذہب اہل مذہب ایسے شہزور ہوتے ہیں کہ ہر آئیواں مصیبت کا مقابلہ دیرانہ کر کے موقع پاتے ہی اپنے متبرک مقامات کو اسی زیب زینت سے آراستہ کر دیتے ہیں۔

ان گنتی کے چند مقدس و خوش نصیب خطوں میں سے آودھ کا مشرقی حصہ ہو جسکو شاہی میں آودھ اور اس زمانہ میں آجودھیا کے نام سے کلاتے ہیں۔ اسکی شکل ایک جزیرہ نما کی سی واقع ہوئی ہو۔ ہر سہ طرف دریائے گھاگرہ جسکو سرجوبھی کہتے ہیں اپنے نہ تھنے والے ہواؤ کے ساتھ خدا کی یاد میں رہنے والوں کے دلوں کو دنیاوی کدورتوں سے صاف کیا کرتا ہو۔

بچھنے قدرتی مناہیوں اور دلفریب منظروں سے اسکو مالال کر دیا ہو۔ آب ہوا کے لحاظ سے بھی یہ مقام نہایت اچھا ہو۔ قدرتی ٹیلے جو کسی زمانہ میں قلعوں یا گڑھیوں کا کام دیا کرتے تھے اور جن پر خود و درخت کثرت سے اُگ آئے ہیں جو چھوٹی چھوٹی پھاڑی سلسلوں کا لطف دے جاتے ہیں۔ یا کے کنارے و نیز وسط شہر میں ہزار ہا مندر و معبد خانے ذی حوصلہ مارا جاتا۔ ہند کی مذہبی قدردانی کی داد زبان حال سے کھڑے ہے ہیں۔ آجودھیا اپنی قدیمت کے لحاظ سے دنیا کے تمام شہروں سے گئے سبقت لیگیا ہو۔ اسی

مقام میں مذہب برہمن کو کمال ترقی ہوئی ہو۔ اسی نگہ دیش میں برہمنی مذہب ایکادہ مذہب سے شاندار مذہب بن گیا۔ اسی جگہ ایکادہ اور سیدھے مذہب میں وہ شاندار رسومات اور تقریبات شامل ہوئی ہیں جن پر آج ہند کو فخر و مباہات اس درجہ ہو۔ اسی مقام پر مذہب برہمنی حد درجہ کو بچھڑو دوسرے آنے والے مذہب کے روبرو کچھ دنوں کے واسطے گمانی کی چادر میں لپٹ گیا تھا۔ ایک معمولی پنچایتی طریقہ حکومت سے عظیم نشان اور باسطوت حکومت کی بنیاد کی جگہ پڑی، جسکے جانباز سپاہیوں اور دلیر سرداروں نے جنوبی ہند کو اپنے قدموں سے پامال کر ڈالا تھا اور ہمیشہ سے سنسکرت بولنے والی قوم کا یہ مرجع رہا ہے۔

تاریخی حیثیت سے آجودھیا پر نگاہ ڈالنے سے حکومت و ماتھا لوجی کے پُر لطف قصص روایات جو غیر معمولی الفاظ سے بیان کیے گئے ہیں دیکھنے میں آتے ہیں۔ ایک قصہ مشہور ہے کہ نبی یا دیتی پسر آنگہ حاکم آجودھیا پر برہمنوں کا عتاب نازل ہوا جس سے نبی بغیر اولاد مر گیا لیکن اسکی جیتا سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ اول نگھد جو اسکے پیروں سے نکلا اور وحشی اقوام کا مورث اعلیٰ بنا اور دوسرا پرتھو جو نبی کے بازوؤں سے نکلا جسکو آجودھیا کے اول سولج بنسی راجہ ہونے کا اقتدار حاصل ہوا اور اس سے تمام آبادی کی بنیاد پڑی جسکا پتہ منو اور مہا بھارت سے چلتا ہو۔

لیکن ایک دوسری جگہ ایک دوسرے پرتھو کا نام آتا ہو اور ایک دیگر شخص بنام استوا کو کی بابت گمان غالب ہو کہ وہی پہلا بادشاہ سورج بنسی خاندان کا گذر ہو اور آجودھیا کی حکومت کا تاج اول اول اسی کے سر پر رکھا گیا۔ استوا کو حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا ہم عصر بتاتے ہیں۔ اسکے بعد راجہ سراوست کا نام آتا ہو لیکن اس خاندان میں حکومت معمولی طریقہ سے رہی اور کوئی پولیسکل تقریبات و ملکی امور قابل ذکر پیش نہیں آئے۔ اس خاندان کے لوگ

بقول لاکل (مقامی) روایات کے اجودھیا ایک جنگل بنگیا تھا۔ زراں بعد راجہ وکرما دیتہ کا نام تاریخ کے صفحات پر نظر آتا ہے جس نے برہمنی مذہب کو دوبار زندہ کر کے ہند کا قومی مذہب قرار دیا اور اسکے پیدا ہونے کا مقام یعنی بنودھاکو دوبار آباد کر لیا۔ اور اس تبرک مقام کو جو ملحدوں کے قیام سے خراب ہو گیا تھا پاک صاف کر کے تاریخی مذہبی مقامات کو از سر نو تعمیر کیا خلاصہ یہ کہ شہر اجودھیا روایتاً دوبار اور ست کیا گیا اور برہمنوں کے طریقہ پر بسایا گیا۔ لیکن اب سے اسکو صرف مذہبی شہر ہونے کا اعزاز حاصل ہا یعنی پولیٹیکل دار الحکومت ہونے کی ذہبت کبھی نہ آئی کیونکہ اسوقت سے اسکا کلیلہ کی سلطنت کو سالہا سے الحاق کر دیا گیا۔

اب ہم یکا یک اور تقریباً اگلے ایک نئے نظارہ پر نظر ڈالتے ہیں۔ سوشل جیالوجی (سڈنی طبقہ الارض) کے ایک بالکل نرے اور انوکھے قلم پر نظر نے سنیا لالیا ہوجو خود بنودھاکو سطح سطح کے اوپر برآمد ہو گیا ہے۔ اس طبقہ میں جس میں کہ اب ہم اپنے کو لیے جاتے ہیں۔ مسلمان بقول مبصران طبقہ انڈیا ابھرنے والے مادہ کے مشابہ ہیں کیونکہ رسول عربی کی الوہی قوتوں اور غیر معمولی تلقینی لکچروں نے مغربی حصہ ایشیا میں ایک کھلبلی مچا دی تھی، جس سے گندھکی مادہ اس سرعت سے نیچے نیچے پھیلتا چلا جاتا تھا کہ دیکھنے والوں اور عمیق بینوں نے پہلے ہی سے ہند کو سنبھل جانے کی صدا سنا دی تھی لیکن اس آتشیں مادہ کو روکنا ذرا کا سے دارو تھا۔ ہوت اجودھیا بھی کو سالہا سے نکل کر قنوج کے تحت کا ماتحت بنگیا تھا کیونکہ تاریخ چندریو کو فاتح اجودھیا بتاتی ہے۔ مسلمانوں کے ہتھوڑے کی ہند میں پہلی چوٹ محمود غزنوی کے زمانہ میں لگی۔

لیکن بنودھاکو کی کامل فتح شہاب الدین کے ہاتھوں ہوئی۔ قنوجی و بنارس کی حکومتیں دونوں ۱۱۹۳ء میں زیر فرمان شہابی ہو گئیں اجودھیا میں اب بھی شاہ جوران غوری کا مزار موجود ہے جو شہاب الدین کا ایک لفظ تھا۔ یہاں کا عالم خمس الدین لہتمش کا بڑا لڑکا نصیر الدین

تقریباً سب سب مذہبی زندگی بسر کرتے تھے اور علاقہ دنیاوی سے بہت کم واسطہ رکھتے تھے لیکن زمانہ گزرنے پر ایسے بھی لوگ پیدا ہوئے کہ جو اپنی جواں مری و دلیری کے لیے شہرہ آفاق ہوئے یا کسی مہتمم بالشان مہم کے سر کرنے یا ملکی پیچیدگی کی گتھی سلجھانے کے لیے تاریخی حیثیت سے قابل ذکر ہوئے ہیں۔ راجہ اچندر کے خاندان میں اس قسم کے لوگ زیادہ پائے جاتے ہیں جنہوں نے کمزور خاندان والوں کو زیر کر کے اپنی سطوت کے ڈٹنے بجائیے اور سلطنت کے دائرہ کو وسیع کر کے ہند کے بڑے حصہ پر قابض ہو گئے۔ ایک جگہ پر درگھا باو اور رگھو کا جو کمزور شاخ سے متعلق ہے ذکر ہو رہا ہے جو راجہ اچندر کے خاندان والوں سے شکست کھا کر مہلا وطن ہو گئے۔

لیکن آتشوا کو اور دوسروں کو ویسا ہی روایتی رہنے دو جیسے وہ مذہبی تھے اور درگھا باو اور رگھو کو روماکے روموس و ہیلن شمار کرو۔ راجہ اچندر کے تذکرہ میں راجہ جسرت قابل ذکر کیر کڑ ہیں اور رام تو بلا شک نیا کے غیر معمولی اشخاص میں مشمول ہونے کے قابل ہیں جس نے اپنی مدد ادا قوتوں اور فطرتی بہادری سے اجودھیا کو اس قابل بنایا کہ اسکا ذکر تاریخ عالم میں جلی قلم سے کیا جائے۔ اس راجہ کے زمانہ میں سورج بنیوں کے ہتھیار شمالی ہند میں پہنچ گئے اور سمندر پار ملک میں بنودھاکے جانا بازوں نے اپنی تلواروں کو میانوں میں کیا۔ مذہبی حیثیت سے بھی یہ ایک غیر معمولی شخص تھا جو مذہبی کتب سے متعلق ہے۔ لیکن راجہ راجہ اچندر کے زمانہ حکومت کی آپ تاب صرف ڈوبنے ہوئے آفتاب کی آخری جھلک کے مشابہ ہو کیونکہ انکے مرنے کے بعد سلطنت کا چراغ لب بام ہو گیا۔ گوسا کھیہ منی جسکو بدھ گوتم کے نام سے منسو کرتے ہیں) کے وقت تک عمان حکومت راجہ اچندر ہی کے خاندان میں رہی لیکن پہلی سی بات نہ قائم رہی اور سورج منسی سورما سیدھین سرداروں کے حملوں کی تاب نہ لاسکے اور تھوڑے ہی عرصہ میں رام کے خاندان والوں کو شیشا ملک خاندان والوں کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔ اسوقت سے گدھ میں تاریخ بنودھاکو شامل ہو گئی جس سلطنت کا کہ وہ جزو بنگی۔ اس زمانہ میں

قدموں پر گر پڑا اور غمان حکومت و تاج شاہی اپنے باپ کو سپرد کر دینے پر آمادہ ہو گیا۔ بغراخان بیٹے کی حالت زار دیکھ کر آٹھ آٹھ آنسو رونے لگا اور بیٹے کی خطا معاف کر کے دلی کی سلطنت اسکو بخش دی اور خود بنگال کی گورنری پر واپس گیا۔

دلی پہنچ کر کیتبا دے امیر خسرو کو اجودھیا کی گورنری پر مامور کر کے روانہ سوے اودھ کیا لیکن امیر خسرو چونکہ درباری آدمی تھے اس لیے دو ہی برس کے بعد پھر طلب کر لیے گئے اور انکی جگہ امیر علی گورنر اودھ نامزد ہوا۔ لیکن جب غلجینو کا دور دورہ دلی میں ہوا تو علاء الدین کو جنت نشان اودھ کی حکومت عطا ہوئی لیکن فوراً ہی علاء الدین کو دیوگرھ کی طرف رخ کرنا پڑا اور اپنی جگہ علاء الملک کو عارضی طور پر کام کرنے کے لیے چھوڑ گیا جو ۱۲۹۶ء میں مستقل طور پر حاکم صوبہ اودھ و کٹرہ علاء الدین کے سر پر اسے سلطنت ہونے پر مقرر ہو گیا۔ اسکے بعد اب پھر تاریخ خاموش ہو۔ البتہ محمود تغلق کے عہد میں آئین الملک کا نام اجودھیا کے ذکر میں آتا ہے جو غالباً یہاں گورنر تھا۔ یہ شخص نہایت ہی خیر خواہ تخت و سہرہ در عایا تھا اور ایک قابل جنرل و تجربہ کار گورنر ثابت ہوا۔

لیکن جیسا کہ اندنوں عام قاعدہ تھا آئین الملک کچھ ہی دنوں حکومت کرنے پایا تھا کہ درباری سیدگیوں نے اسکو گورنری چھوڑ کر پائے تخت حاضر ہونے پر مجبور کیا صرف اس الزام پر کہ اسنے غلطی سے دو چار درباری ورنہ کو اپنے صوبہ میں پناہ دے دی تھی۔ لیکن تھا سمجھدار اور چلتا ہوا دلی سے توحیلہ کر کے چلا آیا اور اجودھیا پہنچ کر اپنی فوج کو مسلح کر کے شاہی فوج کے مقابلہ پر آمادہ ہو گیا۔ لیکن شاہی جراتشکر کا مقابلہ کرنا سہل نہ تھا خوب جی توڑ کے لڑا اور اس جنگ میں اسکے کئی بھائی کام آئے بالآخر اطاعت قبول ہی کرنی پڑی اور اپنی معافی کا طعنی ہوا۔ بعد اسکے اودھ کی گورنری حسام الملک کو ملی۔ لیکن اسکے بعد دلی ہی کی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور سارا ہندوستان مختلف خود مختار سلطنتوں میں منقسم ہو گیا۔ اور

جو بقول مسلمان مورخوں کے ایک غیر معمولی قابلیت و ریاست کا آدمی تھا، ۱۲۶۶ء میں مقرر ہوا۔ اس شہزادہ سے اہل بودھیا کی بہت کچھ امیدیں وابستہ تھیں لیکن بے وقت کی موت نے سب پر خاک ڈال دی۔ اسکے لے کے بعد چند سال تک اس صوبہ کا حاکم اس کا ہتمام نصیر الدین طلیاشی معزئی رہا۔ یہ صوبہ دار نہایت ہی وفادار اور خوش سلیقہ آدمی تھا اور اپنی حاکمہ سلطانہ نصیب کی کمک کے لیے ایک جراتشکر روانہ دلی کیا تھا لیکن چارہ اٹائے سفر میں خود ہی قید کر لیا گیا اور جیل میں باقی ماندہ زندگی گزارنا پڑی تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نصیر الدین کے بعد قمر الدین کو یہاں کی گورنری عطا ہوئی تھی جس نے بلبن کو شاہنشاہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے کو بہت کچھ اکسایا تھا۔ گو مصنف طہقات ناصری اور منہاج السراج نے اس گورنر کی بہت کچھ تعریف کی ہے لیکن کوئی غیر معمولی کام اسنے اپنے زمانہ حکومت میں نہیں کر دکھائے۔ بعد ازاں تغلق خان کا نام آتا ہے جو ملکہ آں جہانی کا شوہر تھا۔ اسنے بھی مثل دوسروں کے باختیار ہونیکل گوش کی تھی لیکن شروع ہی میں گردن مروڑ دی گئی۔ بعد کو آرسلاخان امیر خا نیات خاں و دیگر صوبہ داران اودھ میں آتے رہے لیکن سب کے سب تیر تیغ ہوتے رہے۔

اب تاریخ اجودھیا ایک نیا سین پیش کرتی ہے۔ بغراخان و کیتبا دے لشکری سپاہی دریا سے سروج کے دونوں کناروں پر خمیدہ الے نظر آتے ہیں۔ باپ بیٹے میں آن بن ہو گئی ہے۔ بغراخان اپنے بیٹے کی تادیب پر تڑپا ہوا ہے اور بیٹا معز الدین درباریوں کے بھرکانے پر اپنے باپ کے خون کا پیاسا بن گیا ہے۔ ملک داری کی خواہش نے اسکی آنکھوں پر لالچ و عصیت کی چادر ڈال دی ہے اور وہ اپنے پیاسے باپ کے محبت و وقار کو خیر باد کہہ کر میدان جنگ میں صف آرا ہو گیا ہے۔ لیکن چند ہی روز گزرنے پائے تھے کہ نہ جہان بانی و ملک گیری کا فور ہو گیا اور کیتبا د اپنی سمجھ میں آ گیا محبت پردی کی رگ جوش میں آئی اور بے اختیار مذمت سے چور پیاسے باپ کے

اودھ شرقی خاندان جو پوری کے پالے پڑا۔ اجودھیا بھی ایک صدی تک انھیں حکمرانوں کے تحت میں رہا۔ اور گمان غالب ہو کہ دو ایک بادشاہوں نے اپنی عمریں سرجو کے کنارے گزاریں جس کے ثبوت میں صرف ایک بادشاہ کا مقبرہ باقی رہ گیا ہو لیکن وہ بھی گر کر اکر زمین کا پیوند ہو گیا ہو اور کتبہ تک کا پتہ نہیں ہے۔

سلطان ہہلول کی تقسیم سلطنت کے تذکرہ میں لکھنؤ، کٹہر وغیرہ کا ذکر ہے لیکن اودھ اپنی غیر موجودگی کی وجہ سے ممتاز ہو سکی وجہ صرف یہی معلوم ہوتی ہے کہ اجودھیا کے بجائے پائے تخت ٹانڈہ کو ہٹا دیا تھا جیسے علاء الدین کے زمانہ میں جو پور میں مشمول ہو گیا تھا۔

لیکن اب ہند سے کئی صدی کے لیے طوائف الملوک کی رخصت ہونے والی تھی اور مغل قبضہ (تلاور) کی ہیبت اودھ میں بھی ظاہر ہوئی تھی چنانچہ بابر نے بذات خود اودھ کا رخ کیا اور نانا منو کے گھاٹ پر گنگا پار کر کے کوچ کر کوچ کرتا مشہور ہے۔ اجودھیا کے دروازوں پر گھوٹے کی باگ دوکی بابر کے ہمرکاب فتح نصرت تو تھی ہی پہنچتے ہی چنانچہ انہوں کو جو اس وقت اجودھیا کو لوٹ رہے تھے بھگا دیا اور باقاعدہ حکومت قائم کی۔ چونکہ ایک عرصہ سے کسی حاکم کے نہ ہونے سے بد نظمی غایت درجہ پھیلی ہوئی تھی اس لیے انتظامی مشین کو باقاعدہ طور پر درست بنانے کے لیے بابر نے چند روز اجودھیا ہی میں قیام کیا لیکن افسوس کہ اس نے اپنی کمزوری اور جیسا تعصب کو راتم بھون میں مسجد بنوا کر ہمیشہ کے لیے اپنے نام کے ساتھ جگہ دیدی یہ ایک ایسا دھبہ بابر کے کیر کٹر پر لگ گیا ہے جو حکام شرعی اور پولیٹیکل سیاسی عقلمندی کے بالکل خلاف تھا اور ایک عرصہ دراز تک اس کے پاک دامن پر دُور سے نظر آتا رہے گا۔ ہمایوں شیر شاہ کی وجہ سے بنودھا کو اپنے قدموں

سے سرفراز نہ کر سکا لیکن اکبر نے اس سرزمین کو ضرور محنت بخشی جبکہ وہ سکند تھاں کے مقابل لشکر آرا ہوا تھا۔ اس ممتاز بادشاہ کی آمد کی یادگار میں کئی قصبے آباد کیے گئے تھے اور اکبر نے بھی مثل بابر کے اپنی تشریف کی یادگار میں ایک مسجد تعمیر کرائی لیکن اس میں اس تعصب کا نام تک نہ تھا جو بابر نے ظاہر کیا تھا۔ ایک علیحدہ جگہ پر چھوٹی سی مسجد اپنے ہم درجہوں کے لیے بنوادی تھی اور ہندوؤں کے کسی معبد میں دست برد نہ کی۔

سلطنت مغلیہ کے زمانہ میں امن امان کے باعث لوگوں کو سفر کرنے اور جگہ بہ جگہ آنے جانے کا خیال پیدا ہو چلا تھا اور لوگ کثرت سے اجودھیا میں آباد ہوتے جاتے تھے۔ مغربی بہاد کے ہمراہ مغربی تمدن اور مغربی علوم و فنون بھی ہند کے سب پرانے شہر میں کثرت پھیلنے لگے تھے۔ چنانچہ نئی ساخت کی عمارات، بڑے بڑے میناروں اور بیٹیاوی گنبدوں کی مسجدیں سرعت کے ساتھ اس شہر میں بنتی چلی جاتی تھیں لیکن اس لحاظ سے کہ ہندو کے دل نہ دیکھیں مسجد و مقابر وغیرہ بیرون شہر عموماً تعمیر ہوتے تھے جنھوں نے رفتہ رفتہ ایکٹ اور دوسرے شہر کی صورت قبول کر لی۔ سعادت خاں کی آمد نے نئے سرے سے ایک دوسرے ہی شہر کی بنیادوں کی دی جو زیادہ تر اسلامی عمارات سے مزین ہوتا گیا اور اجودھیا صوبہ کی دارالحکومت کی حیثیت سے تبدیل ہو کر صرف ایک ہندوؤں کا تیر تھا گاہ رہ گیا اور یہ عزت اسکو ہوت تک حاصل ہو۔ آخری دور میں مغربی تمدن نے بھی اس کی بہت کچھ یاری کی اور مرحوم راجہ سریتاب رائے شگہ بہادر نے اس کو رشک فردوس بنانے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ ہماری بھی دعا ہو کہ خدا اسکو راجہ رچند رجبی عظمت نبی پر لایہ عطا کرے

عزیز

در عشق چو باب تو بہ بستم بستم
آزردہ مکن دلم تو اے واعظِ شہر
زندم زبے نگار بستم بستم
بگذار و بر و کہ ہرچہ بستم بستم
حمید کوٹلوی

اصول زندگی

معاشرت درست و پائیدار نہیں ہو سکتا، اور جب تک کسی ملک کے افراد میں بلا اختلاف عقائد و خیال یک جہتی اور ہم آہنگی کے ساتھ اتفاق و محبت کا مبارک عنصر پیدا نہ ہو، اور نیز یہ کہ وہ حق مساوات کو ملحوظ رکھ کر زندگی کے چند مختصر مگر مستقل اصول کے پابند نہ بنیں، زندگی کی سچی برکات ہرگز حاصل نہیں کر سکتے۔

اختلاف عقائد و خیال کوئی تعجب انگیز امر نہیں۔ انسانی قلوب طبائع کا تخالف ایک قدرتی بات ہے اور یہ ہر ملک میں پایا جاتا ہے۔ لیکن جس قسم کا اختلاف بد قسمتی سے ہم اپنے ملک و وطن میں پاتے ہیں وہ نہایت حیرت انگیز بلکہ قابل فحسوس ہے، کہ ہم اُسکے باعث اپنی گراں پایہ زندگی کی کسی برکت و سعادت کا ٹھہ نہیں دیکھ سکتے۔ بعض اوقات یہ اختلاف ایسی فحسوس ناک صورتیں اختیار کر لیتا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے ملنے کی عوض ہٹتے ہٹتے بعد اُشتر قین پر جا گرتے ہیں۔ الغرض ہر کو اب تک اسی طفلانہ روش کے اندازے کسی سمت اس پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچنے نہیں دیا، مگر ہم ہیں کہ ہمیں اُسکا احساس تک نہیں!

اس امر کا ٹھیک پتہ لگانا وقت طلب ہو گا کہ حضرت انسان نے اس پر شوکت کائنات میں کب سے آکر آنکھیں کھولی ہیں اور اسکی زندگی کی قیادت کس وقت یا کس زمانہ سے شروع ہوئی ہے۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ آنکھیں کھولتے ہی اُسے ایک ایسا عالم نظر آیا جس میں اُسکے محسوسات اور برد کا کے لیے غیر محدود وسعت تھی۔ وہ ایک چیز کی جنبش کے سبب پتہ لگانے ہوئے اسباب کے عظیم الشان سلسلہ تک پہنچا اور اسی طرح رفتہ رفتہ اُسکے دل میں سب سے پہلے جس چیز کا احساس زیادہ اثر انداز ہوا وہ اُس ہستی کا احساس تھا جسے جاننے کی ابتک بڑی بے نفع الشان کوششیں ہو چکی ہیں لیکن وہ ابھی تک بہت کچھ نامعلوم ہے۔

دنیا میں اُس قوم سے بڑھکر قابل الزام کوئی قوم نہیں جو زندگی کے ہول گم کرے، یا ضروریات حیات کی طرف سے ایسی غلط فہمیوں کا شکار ہو جکا جس سے نخوت و تکبر، نفاق و نفرت، تنزل و افلاس، اور تعصب و جہالت اُسے چاروں طرف سے آکر گھیر لیں۔

تاریخ ہمیں جہاں تک دوسے سکتی ہو اُس سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہوتی ہے کہ نوع انسان کے جس گروہ نے جس وقت زندگی کے شائستہ اصول اور اُسکی لازمی ضرورتوں سے بے نیازی شروع کر دی اُسی وقت سے نامعلوم طور پر اُس میں دل و زکبت کے اسباب پیدا ہو گئے حتیٰ کہ وہ ٹٹے ٹٹے چند گناہ اور بیکار افراد کا مجموعہ رہ گیا اور پھر اُسے ابھرنے لگا تو ابھرنے لگا۔

کتاب عالم کے بیان ہستی کا سیاق و سباق میں ہندوستان میں بھی اپنے افراد ملک و قوم کا یہی خلاصہ پیش کرتا ہے اور ہم اپنی مجموعی حالت کو مبیار زندگی سے بہت کچھ گرا ہوا اوٹلی، علمی، اخلاقی اور تمدنی خصوصیتوں سے بالکل معرپا پاتے ہیں۔ بہر کیف اس وقت ہندوستان کے وسیع برعظم میں برٹش حکومت کے زیر اثر ہم تمام ہندو اور مسلمان جس آزادی اور آسائش و راحت سے بسر کر رہے ہیں اسکا اعتراف نہ کرنا ایک قسم کا کفران نعمت ہے لیکن اگر ہم سے یہ سوال کیا جائے کہ ہم نے اس پُر امن زمانہ میں کیا کیا اپنی زندگی کو کامیاب بنانے میں کون سے اصول جدید قائم کیے تو جواب یہ ہو گا کہ ہم نے قدیم اصول بھی کھو دیے۔ واہ بے ہم! افسوس! افسوس! قدیم و جدید کی بحث یہاں بے محل ہوگی۔ ہر سمجھدار شخص تھوٹے سے غور کے ساتھ اپنی زندگی کی لازمی ضرورتوں اور اُسکی علمی، عملی، جسمانی، یا تمدنی ہمتیوں کو سمجھ سکتا ہے۔ لیکن سچے افسوس ہے کہ ہم جس قدر انھیں سمجھنے کی کوششیں کیں ہمارا ہر قدم پیچھے کو پڑا ہے۔ جس ترقی کو ہم ترقی کہتے ہیں دراصل وہ ترقی محض ہے۔ کیونکہ خلاق و اعمال کی درستی کے بغیر کسی قوم کا نظام قومیت اور امن

دور و عشق نہ ہیج کسے محرم راز

ہر کسے پر حسب فہم گناہے وارد

مگر اُس مقدس سستی برتر کے دانش آموز خیال نے مختلف ممالک کے مختلف انجیال انسانوں میں مختلف سماواتا سے جلوہ گری کی ہے۔ انکار کسی کو نہیں۔ مذہب کا یہ ہیولے مقدس کچھ ایسے اندازوں سے اٹھا جسکے لیے اُسکی صورتی ترہ خراش میں انسان کو متحیلہ نے بہت کام دیا اور اپنی سمجھ کے مطابق ابتدائی صدیوں میں شجر و حجر اور برق و باد کے سامنے سرنگوں ہوتا رہا۔

لیکن انسان کی زندگی ایسی چیز تھی جو دوسرے حیوانات کی طرح محض کھانے پینے، چلنے پھرنے، اور سونے جاگنے، تک محدود رہتی کیونکہ انسان نفسِ طہ کے پروازیں اُس خالقِ اکبر نے اپنی بالائے حکمتوں سے بڑے وسیع پیمانہ پر ارفع اور بلند رکھی تھیں، چنانچہ انسان زندگی کے مختلف مرحلے طے کرتے ہوئے حسیات سے گزر کر آخر آج علم کے اس درجہ پر پہنچے ہیں کہ دنیا کی تمام مخلوقات سے ہمیں اپنا استحقاق شرافت و اہمیتا فائق و بالا معلوم ہو رہا ہے، اور علم کے اس مبارک انکشاف پر ہم تمام مقدس بزرگوں اور رہنماؤں کے صدق دل سے شکور ہیں جنہوں نے ہمارے سہلائی کی دستگیری کی ہیں اور ہم بھی اُنکے نام لیوا ہیں۔

لیکن چونکہ انتظام قدرت کچھ ایسا اعلیٰ اور بالا ہے کہ اُس میں کوئی چیز مہل یا بیوقت ظاہر نہیں ہوتی لہذا علم کا یہ ہوش افزا مرکا شفق بھی حضرت انسان پر زندگی کی بنے تھا کہ ششوں اور ان تھک موشکافیوں کے بشک اُس وقت ہوا جبکہ وہ آثار علوم و تمدن اور انوار تہذیب و اخلاق سے بہرور ہونے کے لیے قدرتا اہل ہو چکا تھا۔

خیالات کی اس تجدید نے انسان کے سابقہ تہات اور قدیم مفروضات کی بہت کچھ اصلاح کی اور اُسے موجودات کی غلامیوں سے خود بخود ایک قسم کی مذہمت محسوس ہونے لگی حتیٰ کہ وہ انسانی غلامی کی قید سے بھی آزاد ہو گیا۔ انسان کی اسی فطری حریت نے نظام حکومت کو شخصیت سے بدل کر مہوریت

پر لاٹھیرایا اور اُس نے اپنی زندگی کے اصولوں کو جانچا، مذہب کو زیادہ گہری نگاہوں سے دیکھا، اور اُسکی ضروریات یا اصلیت کو بھی سمجھا۔ جس کا تمام لب لباب اور حاصل سچائی اور صدقت، معاملات کی درستی ایفا، عہد، ایثار نفس، ایک دوسرے کی ہمدردی، اور کردار و اعمال کی اصلاح پر ٹھہرتا ہے۔ ان چیزوں کو اگر آج بھی ہم اپنی زندگی سے علیحدہ کر دیں تو ہماری تمام جمہیت جانوروں کا گلتہ اور ہماری زندگی محض وحشیانہ اور ابلہانہ ہو جائیگی۔

یہ موٹی موٹی چند باتیں ہیں ہر مذہب سکھاتا ہے۔ یہ چند اصول ہیں ہر آسمانی کتاب سے ملتے ہیں۔ اور زندگی میں ہیں امن و امان یا سلام کے ساتھ جینے کے لیے انکی سخت ضرورت ہے۔ اگر یہ باتیں عقائد و خیال سے اٹھا دی جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہماری شب بیداریاں، ریاضتیں، مجاہدے، اور تمام ہتمام کی عبادتیں کچھ کام آسکیں گی۔ ہرگز نہیں، کسی بزرگ نے خوب کہا ہے ۵

مباش در پے آزار ہرچہ خواہی کن کہ در طریقت مایہیچ ازیں گناہے نیست لیکن تمام مقدس کتابوں اور آسمانی نوشتوں میں روحانیات کے بحث کی بعض پیچیدگیوں نے انسان کو محنت شاقہ یا محض روحانیات کی جن اُلجھنوں میں اُلجھایا وہ تار و پود نہایت عجیبان سے صدیوں بنی فہم انسان پر تنار ہا بلکہ ہم اہل ایشیا پر اب تک تانا ہوا ہے۔ حالانکہ روحانیات کے تمام مرکا شفات کا مہل مقصود صلاح اخلاق و عمل پر مبنی تھا نہ کہ شعلہ اور کراستوں پر۔ کیونکہ خرق عادات کے تمام مظاہر ضروریات حیات سے خارج اور زندگی کے لازمی اصولوں سے بالکل جداگانہ چیز ہیں۔ علامہ غزالی اسی لیے اپنے ملفوظات میں لکھتے ہیں کہ ”ایک شخص اگر آسمان پر اڑ کر بتلائے یا فضا میں تیرتا پھرے لیکن اُسکے اخلاق اچھے نہ ہوں تو سمجھو کہ ایک تنکا ہے جو ہوا میں اڑ رہا ہے۔“ انھیں خصائص حیات کو سمجھ کر کسی دانائے یہ کہا ہے ۵

تو کاربزمیں رانکوسا سختی کہ با آسمان نیز پر دست
آج یورپ میں جا بجا ہوائی جہازوں کا زور ہے۔ لیکن انھیں بھی یہ
خیال ریل، اسٹیم، موٹر کار، اور ہسٹیکس بنالینے کے بعد پیدا ہوا۔ گرجہ
ہو ہم لوگوں پر کہ ہم دفعۂ زمین چھوڑ کر عرش اعظم پر پہنچنا چاہتے ہیں اور
اپنی زندگی کو کسی مفید اصول کی پابندی کے بغیر محض اداہم اور بعض مفروضات
عجیبہ کی پیروی میں گزار دینے کے عادی ہو رہے ہیں۔

بیشک انسان کا شرف و کمال انسان ہونے میں ہی نہ فرشتہ ہونے میں۔
یہی وجہ تھی جس کے باعث خداوند نے فرشتوں کو آفرینش آدم کے وقت
جلالی کے ساتھ ڈانٹ کر فرما دیا کہ چپ ہو! آفرینش آدم کے معاملہ میں جو
کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ بات بھی سچی تھی کیونکہ فرشتوں کو
روحانیت کے اعتبارات سے خواہ کیسا ہی اعلیٰ درجوں پر سمجھ لیا جائے مگر
وہ اپنی فطرت کی خاص نوعیت کے باعث انسانی آفرینش کی اہمیت یا اسکی
اغراض کو سمجھنے سے معذور تھے۔ چنانچہ علم آدم الالہامی کے بعد
یا اشارہ تم عنہم علی الملائکۃ اس امر کی صاف شہادت ہے کہ انسان خداوند
کی نظر میں فرشتوں سے بڑھ کر عزیز اور محبوب تھا اور اس شرف و قبول
کی وجہ صرف کمال روحانیت نہیں بلکہ اکتساب علوم و فنون اور بحسن
اعمال و اخلاق کے ساتھ زندگی میں امتحانات حیات کی وہ غیر محدود کشمکش
تھی جس میں رہ کر حضرت انسان نے اپنا کمال و شرف علمی، اخلاقی، تمدنی،
عقلی، اور علمی صورتوں سے ثابت کیا ہے اور یہ وہ بات ہے جو فرشتوں کو
نصیب نہیں ہوئی۔

مگر قطع ازیں اس ملکوتی روحانیت کا خیال بوجہ چند در چند تمام
ساسانی، کیانی، کلائی، عبرانی، اور ایرین نسلوں میں راسخ رہ چکا ہے بلکہ اب
تک ہم اسے موجود پاتے ہیں۔ ایشیا کا ہر عالم اور نکتہ رس خصوصیت سے بھی
بال کی کھال کھینچتا رہا جس پر فرشتے ناز کر کے فعل ہو چکے تھے۔ لیکن ہمارے
یہاں تو ہوتے ہوتے اُس بال کی کھال بھی یہاں تک کھینچی ہو کہ بال بھی باقی نہیں

بچا۔ یعنی سچی روحانیت بھی ہمارے پاس نہ رہی ہے

ہم حیرتم کہ دہقان بچہ کار کشت مارا

تمام مذاہب شہدہ جب تنظیم اور تمام آسمانی صحائف یقیناً واجب الاحترام ہیں۔
خداوند کے جلال کا کوئی بیان اور اُس انیک روپی پریم آتما کی عظمت کا کوئی
حرف جس کا غرپر لکھا ہو اُسے چوکرا آنکھوں سے لگانا ہماری زندگی کا دستور
ہونا چاہیے۔ ہم ہندوستانیوں کا یہ فخر ہے کہ ہم لوگ سچائی، صداقت، گرگیان
اور ست پر جان دیتے ہیں۔ لیکن باوجودیکہ زندگی کے بے ہتار بانی انعامات
علوم و فنون کی مختلف صورتوں میں ہمارے سامنے پڑے ہیں ہم تاحال روحانیت
کے جس گورکھ دھندے میں آنکھیں بند کیے پھنسے ہیں اُس سے نکلنا یا
خداوند کی پرشکوہ کائنات کو نگاہ بصیرت سے دیکھ کر نمایاں طور پر اپنے
فرائض حیات کو سمجھنا ہمارے مکان سے باہر ہو رہا ہے اور ہم اُس عالم توحید
کو اس عالم جہانیت سے بالکل علیحدہ سمجھتے ہیں حالانکہ ۵

جہان صورت کا ذرہ ذرہ جہاں معنی کا آئینہ ہے

مگر انھیں کو جو دیکھتے ہیں جو جانتے ہیں نگاہ کرنا

ناظرین معاف فرمائیں۔ ان الفاظ سے ہمارا مقصد خداوند بخواسستہ پر گز
نہیں ہے کہ روحانیت بے کار چیز ہے۔ یورپ کی ترقی کو ہم خود ناقص سمجھتے
ہیں کیونکہ اُن میں بے انتہا مادیت کا زور ہوتا جاتا ہے۔ یورپ کے ایوانِ خلا
کا ستون بھی مدت ہوئی کہ مرکز ثقل سے ہٹ چکا ہے۔ لیکن اس میں کچھ
شک نہیں کہ روحانیت کے مسائل کو ہم لوگوں نے اپنی مخصوص غرض فہمیوں
اور عقیدت مندوں سے جس نوعیت سے سمجھ کر بیکاری اور خیالی دینداری
کے سہارے میں چپ سا دھلی ہو وہ نہایت افسوس انگیز ہے۔

دنیا میں انسانی زندگی کو اصول نظام کا پابند کر کے ٹھیک طریقہ سے
درست رفتار کے ساتھ چلانے کا کام ہے اور مذہب جب حشو و زوائد
سے پاک درست حالت میں رہتا ہے وہ اپنی غرض کی تکمیل میں کبھی قاصر
نہیں رہتا۔ لیکن جب اس میں مردور ایام کے باعث بعض عجائب پسند انسانوں

لیکن اگر جوتی بھی پائوں میں نہ رہی تو سخت مشکل ہے۔ تخت و تاج نہ سی مگر کم از کم دنیا میں اگر ہم وجود رکھتے ہیں تو ہمیں اُن لوازم کی سخت ضرورت ہے۔ جن کا مہیا کرنا جسمانی اور روحانی ضرورتوں کے واسطے نہایت ضروری ہے۔ لیکن ہم ان سبب کو جمع کرنے کے لیے اُس وقت تک ہرگز قابل نہیں بن سکتے جب تک ہم اپنی زندگی کو چند ایسے اصولوں کا پابند نہ بنالیں جنکی پابندی کا یقینی نتیجہ سعادت اور برکت مانا جاتا ہے۔ اگرچہ ہماری مقدس کتابیں ان ہدایات سے بھری پڑی ہیں لیکن میں اپنے خیال ناقص کے مطابق چند باتیں عرض کرتا ہوں۔ سنو! امیر اکام نہیں ہر اہل بصیرت خود نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے۔

(۱) ہم ہر انسان کو انسان ہونے کے لحاظ سے دیکھیں اور طبعی نہ کہ باعتبار مذہب۔ کیونکہ مذہب کی کوئی خصوصیت کسی کی پیشانی پر لکھی ہوئی نہیں۔ سب انسان انسان ہیں اور سب لوگ خلاق و عمل تمدن و تہذیب کی ضرورتوں میں مساوی ہیں۔

(۲) ہر شخص کی شرافت عزت اور فضیلت کا معیار اخلاق و تہذیب اور علم و عقل کے مقدس نور کی جلوہ گری پر قائم ہونا چاہیے نہ کہ دولت، امارت یا خاندانی وجاہت پر۔

(۳) بٹوالوں، گردواروں، مندروں، سماجوں، مسجدوں، اور کلیساؤں کو ہم احترام و ادب کے ایک درجہ پر لائیں کیونکہ ان سب میں اوسط یا بلا واسطہ اُسی خداوند برتر کی ستائشیں اور پرستشیں ہوتی ہیں جو ہر شخص کا خالق اور ہم سب کا مالک ہے۔

(۴) تعلیم کو نہایت اچھے اسلوب کے ساتھ لڑکیوں اور لڑکوں کے لیے لازمی قرار دیا جائے اور اُنکے نصاب تعلیم کو ہر دو سال کے بعد معلوماتِ جَد سے زیادہ بہتر بناتے رہنے کی کوشش جاری رکھی جائے کیونکہ تمام کائنات قدرتاً اصول ارتقا کے ماتحت ہے۔

(۵) کسی پیشہ اور حرفت کے شخص کو ذلیل نہ سمجھا جائے بلکہ اہل علم

اور اندھے عقیدت مندوں کی عقیدت کا ہیولی مختلف آمیزشیں کر دیتا ہے تو مذہب کی صورت بھی بگڑ جاتی ہے مگر کل لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ زندگی کے اہم مقاصد کو کم کر کے نظامِ قومیت اور اصولِ حیات سے علیحدہ ہو کر اوہام کے غاروں میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ کرنے کے ضروری اور پیش پا افتادہ کاموں کو چھو کر غنا و ہمار کا شکار کرنا کمالِ انسانی سمجھنے لگتے ہیں حالانکہ لکھنے والے قائلِ ملتہ رسول نے یہ بھی کہہ دیا کہ ۵

عقائد کا رکن نہ شود و ام باز ہیں

کا بیجا ہمیشہ باد بود دستِ دام ر ا

اے عزیزانِ وطن! اگر ہماری ضروریاتِ حیات کسی دوسرے شخص کی جسمانی، علمی، اور تمدنی، محنتوں سے پوری ہوتی ہیں، اگر کم آوروں کے لیے یہ پرگزراؤ قات کر کے روحانی فضائل کے نفع سے سناٹے ہیں، تو ہمارے تمام مجاہدے، اور یوگ کے سائے آسنِ شستیں بالکل بیکار ہیں۔

اے براءِ درانِ قوم! اگر ہم خداوند کی بے انتہا نعمتوں، دولتوں، اور برکتوں سے جو ہر وقت ہمارے تمھارے آس پاس وسعت سے پھیلی ہوئی ہیں فائدہ اٹھا کر مشکلاتِ حیات کو حل نہیں کر سکتے تو ہماری دینداری محض افسانہ ہے۔ اے محترم بزرگو! اگر بننے اپنی گراں مایہ زندگی کے فرائض کو محض چند گھنٹوں کی وظیفہ خوانی تک محدود سمجھ رکھا ہے تو ہم بیش از بیش ملکن ہو فرشتہ ہو جائیں مگر ہمارے لیے انسان ہونا زیادہ باعثِ فخر ہوگا۔ انسانیت بہت بڑی چیز ہے۔

زمانہ کبھی نہیں بدلتا۔ اُسے جس پنج پر قدرت نے رکھا ہے چل رہا ہے۔ مگر ہاں انسانی ضرورتیں اُسکے علم و عقل، ادراک و خیال، کی رفت و بستی کے زیر اثر ہمیشہ بدل جاتی ہیں۔ آج دنیا میں امن و عزت کی زندگی گزارنے کے لیے جن وسائل و سبب کی ضرورت ہے اُن سے چشم پوشی کر کے اگر ہم محض اپنے ہلاک ہی کے کارناموں کے قصہ خوان بنے ہے تو ہماری تمام آوازیں بکاہ ہو گئی اور ہمارے سب شتے ٹوٹ جائیں گے۔ تاج و تخت کی قیمت اگر چہ جوتی ہے،

یہ تمام مذکور اصدد باتیں ایسی دشوار اعلیٰ ہرگز نہیں کہ ان پر ہم عمل نہیں ہو سکتے اور اگلا کیا بھی ہو تو یہ سمجھنا چاہیے کہ ہم کچھ بھی کر نہیں سکتے اور نہ ہمیں آئندہ کچھ ہوگا۔

اے عزیزو! اگر ہمیں سچے دل سے خداوند کو پیار کرنے کی تعلیم دگئی ہو اور اُسے ہم ہر انسانی وجود میں جلوہ افروز مانتے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم ہر آدمی سے باخلاق و محبت پیش آئیں۔ اور اس محبت کا ثبوت ہر شخص کے طرز عمل یا انداز معاشرت اور لوگوں کے ساتھ روزانہ زندگی کے معاملات سے ظاہر ہو سکتا ہے۔

فی الحقیقت جو شخص خداوند کی نظر آنی والی مخلوق انسانی سے پیار و محبت نہیں کرتا وہ اُس نظر آنی والی ہستی سے جسے خدا کہتے ہیں کیا محبت کر سکتا ہے۔ آہ! جس کا ظاہری انداز اور حال یہ ہو کہ وہ بندگان انہی سے نفرت و کدورت برتے اُسکے باطن کی کیفیتوں کو سمجھنے کے لیے کسی زیادہ کس کی ضرورت نہیں۔

اے پیارے عزیزان ملک قوم! اس وقت ہماری زندگی بالکل بے نظام ہو کر علمی، علمی، تمدنی، روحانی اور جسمانی حیثیتوں سے معرض خطر میں آئی ہوئی ہے۔ اقوام مغرب نے علوم و فنون یا باہمی اتحاد و محبت کی مقدس شمع جلا کر اپنے مقامات کو جس روشنی سے روشن کیا ہے یہ کوئی انوکھی بات نہیں یہ ہمارے ہی گھروں کی دہلی بھی آگ تھی جس نے ایک دنیا کو آج گواہ بنا دیا ہے مگر افسوس کہ ہم سرد ہو کر حیرت کے ساتھ آج اُن آتش افروزوں کا ٹھٹھکتے ہیں۔ پیارے عزیزو! آج وہ وقت نہیں کہ محض لٹکا اور دوار کا کی تعریفیں ہمارے کام آسکیں۔ وہ زمانہ نہیں کہ ”پریم سلطان بود“ کی منطق سے کچھ عقدہ کشائی ہو سکے۔ آج بمقتضائے وقت اس امر کی سخت ضرورت آپڑی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنی زندگی کو علمی، اخلاقی، علمی، تمدنی، اور روحانی اعتبارات سے ذاتی کوششوں کے ساتھ منفرد طور پر ثابت کر کے دکھلائے کہ ہم زندہ ہیں مردہ نہیں۔

مفید علمی معلومات سے اُنکی مدد کریں۔ بالذات نجس یا ذلیل کوئی نہیں، تمام ذلتوں اور بنجاستوں کی جڑ جہالت ہے اور وہ دور ہو سکتی ہے۔

(۶) گروہ انات کا ہر طبقہ بلا اختلاف عقائد و ملت احترام کیا جائے۔ ۶ سالہ ضعیفہ اور پانچ سالہ لڑکی دونوں کیساں عزت کی مستحق ہیں کیوں کہ ہماری موجودہ بچیاں آئندہ نسلوں کی مائیں ہیں۔ عورت کو خداوند نے بقائے نسل کی وہ اہمیت اور خدمت عطا کی ہے جسے مرد ہرگز انجام نہیں دے سکتا اور اسی لیے وہ قابل احترام ہے نہ کہ لائق حقارت و صعوبت۔

(۷) زانی اور فاسق و فاجر اگرچہ قانونی گرفت سے آزاد ہیں مگر ضرورت ہے کہ ہم اپنا اخلاقی قانون زندہ کریں اور ایسے اشخاص کو جن پر زانی ہونے کا گمان ہو انھیں سوسائٹی میں یہاں تک لیں کہ حقیر سمجھا جائے کہ وہ اپنی ذلت کو محسوس کریں اور اصلاح حال کے لیے تیار ہوں۔

(۸) معاملات میں راستی، صداقت، دیانت، باہمی محبت الفت کے ساتھ معذور الحالوں کی امداد، اور ایک دوسرے کی جائز ہمدردی کو ہم ہر جگہ اپنا ایک انسانی فرض قرار دیں۔ مگر پیشہ ور گداؤں، پھلک سگلوں، اور مفت خوردوں کی طرف التفات نہ کریں۔

(۹) شادی اور نکاح کے لیے سختی سے لڑکیوں اور لڑکوں کی بغت، اہلیت، قابلیت، اور صحت کا خیال رکھا جائے۔ نابالغی کی شادیاں، یا شتر گربہ جو ہرگز مستحسن نہ سمجھے جائیں۔ والدین کو اس امر کا خیال اپنا فرض سمجھنا چاہیے۔

(۱۰) زانیہ یا فاسقہ مستورات کو سختی سے ناقابل التفات سمجھا جائے اور اسکے لیے مردوں کو اپنے اخلاق و عمل کی اصلاح کرنے کی سخت ضرورت ہے کیونکہ عورت مرد ہی کے خیالات سے متاثر ہوئی ہوتی ہے۔ عورتوں کے بگاڑ کا الزام بہت کچھ مردوں کے سر ہے۔

پیارے عزیزان وطن! تم ان باتوں کو جس نقطہ نگاہ سے دیکھو تمہیں اختیار ہے۔ لیکن جہاں تک انسان ہونے کی حیثیت سے ضمیر ہدایت کر سکتا ہے

نکروں گا۔ کھانا کھاتے وقت یہ مسلمان ہیرا شس قاتل کو اپنے ساتھ شریک کرتا ہے کہ محبت راسخ ہو جائے لیکن تھوڑی ہی دیر کے بعد اس ہیرا کو خبر پتی ہے کہ تمھارا لایق اور جوان بیٹا کسی مغربی کے ہاتھوں بازار میں مارا گیا ہے۔ ٹاش پڑی ہے۔ یہ سن کر اس قاتل کے پیروں تلے سے زمین نکلتی ہے اور امیر پر ایک سنگ کا عالم طاری رہتا ہے۔ لیکن امیر فوراً ہی سنبھل جاتا ہے اور انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھ کر اس شخص کو کہتا ہے کہ اے شخص تم کچھ ہراس نہ کرو میں تم سے جو عہد کر چکا ہوں وہ نہ توڑ دوں گا۔ مگر سب سے کہ تم اب یہاں سے چلے جاؤ ورنہ ممکن ہے کہ میرے دل میں بغض بے بشریت جو شہنشاہ پیدا ہو جائے۔ یہ کہہ کر وہ ہیرا ٹھٹھا ہے اور اس قاتل سمان کو ایک جوڑا اور چند شرفیاں اور ایک تیز رو گھوڑا دیتا ہے کہ اس پر بیٹھ کر تمہیں یہاں سے نکالنے میں سانی ہوگی۔ قاتل سخت مذہب و رخصت کے ساتھ معذرت طلب کرتا ہے۔ آخر امیر نے رخصت ہوتے وقت کسی خاص بانی خیال سے متاثر ہو کر اسے کہا کہ تھرو میں تمھاری پشانی تو چوم لوں کیونکہ تم میرے مہمان تھے اور پھر خدا حافظ کہہ کر اسے رخصت کرتا ہے۔ بیٹے کی تجویز و سفین بعد میں کی جاتی ہے۔ اللہ اللہ! کیا لوگ تھے۔

برکین: باتیں حق لغزت نہیں۔ ہم انسان ہیں، اگر ہمارے شریفیہ مسرت آج بھی زندہ ہو جائیں تو ہم سب ایسے ایشا اور اسی قسم کی محبت ہمدردی کا جلوہ ہونے لگ جائے۔ ہم خداوند نے وہ اعزاز بخشا ہے جو فرشتوں کو بھی نصیب نہ ہوا۔ لیکن اس اعزاز کو زبانی طور پر نہیں بلکہ عملی و اخلاقی طور سے دنیا پر آشکارا کرنے کی ضرورت ہے اگر ہم علانہ ہب اس نور مقدس کو جو روحانی اور جسمانی طور پر حسن اعمال اور باہمی ہفت اتحاد کے ناگزیر تعلقات سے وابستہ ہو ظاہر نہیں کر سکتے تو نہیں معلوم کہ ہم لوگ اپنے اپنے خیال میں کون سے سرگ، بیکٹھ اور فردوس و خلائے خواہ دیکھتے ہیں۔ آہ! ہمیں کون سمجھائے کہ یہ زندگی نہایت گراں قدر دولت اور خداوند کی بے نظیر نعمت ہے۔ اسے خواہ مخواہ کی جگہ پیکاریں صرف جو رستم کرنا ہیں نہ بلکہ مقصود ہرگز نہ پہنچا سکیں۔ مبارک ہیں وہ نفوس جنہوں نے تعلیم کی اصلی غایت زندگی کے حقیقی مقصد، اور اپنی ہستی کے متم با انسان غرضان کو سمجھ کر بغض صداوت و

آئے دن کے مذہبی جھگڑے اور مقدس پیکاریں بیکار ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ اس گئے گزے حال پر بھی ہمارے دلوں میں سنت کی زنت، سچائی کا احسان گیان کی جستجو، دانش کی تلاش، اور رفعت و کمال کا ذوق موجود ہے اور شیک ہم اہل ہند کا یہ فخر ہے کہ ہم ست پر جان دیتے ہیں۔

مگر کیا ست پندرہ یا بیس ہو سکتے ہیں؟ کیا سچائی جھگڑا پیدا کرتی ہے؟ کیا سچ کو پاکر انسان کے دل میں بغض و عناد و غصہ و غرور یا دوسروں کی حقارت و نفرت کا مواد فاسد باقی رہ سکتا ہے؟ اگر اسکا جواب ہر ذی ہوش نفی میں دیتا ہے تو پھر کس قدر قابل الزام و حیرت ہیں ہم کہ یہ تمام باتیں ہم میں موجود ہیں اور سخت رنج کا مقام ہے کہ ہم آئے دن ہندو اور مسلمان عزیزان و وطن کی دھڑکنے لگھنوں کے قہقہے سنتے رہتے ہیں۔ اسے بھائی جبکہ

رام ہو جاتے ہیں وحشی بھی یہاں خلاق ہو کھینچنے دل ملانے کس طرح دشوار ہیں؟ اسے بھارت مانا کے سپوت بیٹا کیا تمھارے دلوں سے ایثار نفس کی وہ تمام شانیں گم ہو چکی ہیں؟ جو کبھی تمھارے لیے نشان تیار تھیں۔ اور لے سلام کے محترم نام لیوا افراد کیا آپ نے ان تمام خلاقی محاسن اور علمی فضائل کو بھلا دیا ہے جو تمھارے سلاف کو کبھی اے صد نازش تھے؟ آہ! اگر ایسا ہے تو ہماری حالت لایق فوس مذہب ہی نہیں بلکہ قابل ملامت بھی ہے۔ مگر ہم اس اقد کو کیوں کر بھول سکتے ہیں جبکہ سری رام چندرجی نے باوجود سختی تحت و تاج ہونے کے تمھارے کی تحریک اور اپنی چچی کیلئے کے کہنے سے اپنے چچا زاد بھائی بھرت کے لیے خندہ پیشانی کے ساتھ حکومت سے ہاتھ اٹھا کر بن باس اختیار کر کے جنگل کو چل دیے تھے!

اور کس قدر متاثر کر نیوالا ہے یہ نظر کہ اسلامی حکومت کے عہد میں قرطبہ کا ایک مسلمان امیر (صعان ابن جریر) رات کو اپنے مکان کے صحن میں بیٹھا ہے۔ دفعتاً کیا دیکھتا ہے کہ ایک شخص دیوار پھانڈ کر صحن میں کودا ہے اور گرتے ہی اس نے کہا کہ خدا کے لیے مجھے پناہ دو۔ میرے پیچھے ڈھونڈھنے والے پھرے ہیں کیونکہ مجھ سے ایک خون ہو گیا ہے۔ یہ بات سن کر امیر چونک اٹھتا ہے کہ قتل تو گناہ عظیم ہے لیکن اچھا جب تک تمھاری زندگی ہے تم بلاشبہ جیو گے اور میں تمھارے راز کو فاش

کہ ورت و نفرت کے عنصر کو اپنے دل سے نکال دیا ہو۔ وہ یقیناً نجات پائیں گے۔
اُن کے واسطے ہر جگہ فوراً ہی فوراً پھیلا ہو۔ وہ قدرت کے ہر منظر اور دنیا کے ہر مشاہد
سے لازوال سرور حاصل کر سکتے ہیں اور انھیں کی زندگی زندگی ہو۔ کیوں کہ
وہ اُن پائدار اصولوں کے پابند ہیں جن میں لیل نہار کی کوئی گردش کسی قسم کی تبدیلی
پیدا نہیں کر سکتی۔ اُن کا ہر کام علم و عقل کے مضابطوں کے ماتحت انجام پاتا ہو۔
کہ انھوں نے گیان اور دانش کو سمجھ کر اپنا دل روشن کیا ہو۔ ایسے لوگ مر کر

زندہ ہوتے ہیں بلکہ زیادہ نام پاتے ہیں، اگرچہ اُن کی زندگی کا اصول شہرت
یا ناموری کے خیالوں سے بالکل الگ ہوتا ہو۔ کاش ایسی سچی سادہ اور
خوش انجام زندگی ہم سب کو نصیب ہو، ورنہ اس زندگی اور بے ہول زندگی
سے موت بہتر ہو تاکہ ہم کسی کی دل آزاری نہ کر سکیں۔

جو کعبہ سر نہا دم زوروں نہا برآمد
تو بروں در چہ کردی کہ درون خانہ آئی

ق-ح-ا

دولابہ راستی کش

لوگوں کی ہیئت کذائی بالکل بدل دی ہو۔ پہلے زمانہ میں مدہ امر از کتاب جرم کرنے
کے بعد نقب زن شاذ و نادر نہا چاہے میں اپنے اخیال قبیح پر نام ہو اکر تھے، لیکن آ
مردن جو میں گھنٹہ میں کاشنس (نورایان) کی چکیاں جرم کے دل کو موم کر دیتی
ہیں اور وہ اپنی حرکت پر نام و پشیمان ہو کر لوٹ کا مال واپس بھیجتا ہو۔ لیکن اسکا
لینڈیا رڈ کے مبصر، اہران سائیس کی اُس شخص پر مسکراتے ہیں، ان کے نزدیک
اس پردہ نگاری میں کوئی دوسری ہی صورت پوشیدہ ہو۔ وہ کہتے ہیں کہ جدید
نقب زن اونچی سوسائٹی کے لوگ ہیں جو ارج منصفیت کے خیال سے نہیں بلکہ محض
تفنن طبع کی غرض سے نقب زن کرتے ہیں اور پیشہ و نقب زن کی طرح تمام خطروں
کو برداشت کر کے لطف اٹھاتے ہیں۔ اگرچہ بعض آدمی اسے انگریزی قوم کے
تمزل و انحطاط کی علامت بتلاتے ہیں لیکن ہم اس سلسلے کے خلاف ہیں اور اس جہت
کو خال نیک سمجھتے ہیں۔ کھیلوں اور تفریح کے معاملات میں پیشہ ور کھلاڑیوں کی
ریادتی پر کون انگریز ہو جو افسوس نہیں کرتا۔ ایسی صورت میں ہم صدق دل
سے اس اولوالعزم گروہ کا پیشہ نقب زنی میں خیر مقدم کرتے ہیں جس طرح
پیشہ ور کھلاڑیوں نے ہمارے قومی کھیلوں کو کم وقت کر دیا اسی طرح ہیں امید ہے
کہ یہ آزاد نش نقب زن پیشہ در مجرموں کی اصلاح میں مدد و معاون ہونگے۔ جو
نقب زن چوری کا مال چو میں گھنٹہ میں واپس کرے، اس قابل ہو کہ اسکی

لندن کے ایک فیشن ایل حصہ میں چند نوجوان جمع ہیں۔ بعض کھیتی مڑا
ہیں جو زمانہ بھر کی سیر تفریح اور لندن پیرس کے عشرت خانوں اور تماشگاہوں
سے سیر ہو کر یہاں آئے ہیں، کچھ بحری اور بری فوج کے افسر ہیں، چند سچلے
ممبر پارلیمنٹ بھی ہیں، اور ایک دو وزیران سلطنت کی صورتیں بھی نظر آتی ہیں
ڈیوک آف ڈورچسٹر، صدر انجمن نے حاضرین جلسہ کو مخاطب کر کے بیان
کیا :-

مائی لارڈز اینڈ مینٹلین ! آج تک ہمارے کلب کے کسی ممبر نے شہرت پسندی
کی نازیبا اور مکر وہ عادت اختیار نہیں کی ہو۔ اور نہ ہم کسی ممبر کو شہرت طلبی کا لازم
قرار دے سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں انبار ڈیلی ٹکڑ میں ہماری نسبت مضمون آرٹ
خالی اندیشہ نہیں۔

چاروں طرف سے "شرم شرم" کی آوازیں آئیں اور مضمون پڑھنے کا تقاضا
ہوا۔ صدر انجمن نے فرمایا۔

کل کے اخبار میں مندرجہ ذیل مضمون ایڈیٹریل کالم میں شائع ہوا :-
گزشتہ بارہ ماہ میں اسکاٹ لینڈ یارڈ کی پولیس نے ایک نئی وضع کے لازم کا سراغ
لگایا ہو۔ یعنی ایسا نقب زن جو دوسرے ہی دن مال مسروقہ مالک کو واپس کر دیتا
ہو۔ علی حلقوں میں اسکی توجیہ یوں کی گئی کہ آج کل کی تہذیب تعلیم نے جرائم پیشہ

حوصلہ افزائی کیجئے۔ کیونکہ ہمیں سید ہو کہ جو مثال آزاد نقیب بن قائم کرتے ہیں اسکی تقلید جرم پیشہ جو آج نہیں توکل ضرور کریں گے۔

جٹلیں! خوش قسمتی سے ہم اب تک پولیس کی زد سے بچے ہوئے ہیں، لیکن اخبار ڈیلی نکلنے کے حوصلہ افزا مضمون کی وجہ سے ہمیں پھونک چوک کر قدم رکھنا لازم ہے۔ میں جلد ممبران کو مدد دہرہ کی احتیاط اور دور اندیشی برتنے کی نصیحت کرتا ہوں۔ نہ صرف پولیس بلکہ اخبار نویس بھی ہمارے طریقہ کار روائی اور ہمارے درجہ سے ایک مددک واقفیت رکھتے ہیں۔ مگر ہر کہ پولیس ممبران کلب کے نام سے بھی آگاہ ہو۔

چاروں طرف سے صدائیں بلند ہوئیں کہ کل ہی سے ہم اس اخبار کا چندہ بند کر دیں گے۔ ڈیوک نے اس گرم جوشی کا شکریہ ادا کر کے کہا کہ مجھے آپکی اس تائید سے بڑی تقویت ہوئی۔ اب میں جلسہ کے ایجنڈا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اگرچہ ظاہر میں معلوم نہیں ہوتا مگر ہم آج کل سائنس اور علم کے زمانہ میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہمارے کلب نے اب تک سائنس کی طرف چندا توجہ نہیں کی ہے، اگر کبھی توجہ کی بھی تو ایسی مادی چیزوں کے لیے جیسے ریڈیم یا ایروپین (ہوائی جاز)۔ سائیکالوجی (علم روحانیات) سے تو بولے نام کے ہیں کچھ بھی واقفیت نہیں ہے۔

کپتان کانبرولائٹس تو اسکے بچے بھی نہیں کر سکتا۔

ڈیوک نے قطع کلام پر کچھ دھیان نہ کیا۔ ”مجھے خیال ہوا کہ اپنے کلب کی اعلیٰ خصوصیت قائم رکھتے ہوئے زمانہ حال کے جدید ترین اختراع سے کچھ نفع بھی حاصل کریں۔ خوش قسمتی سے ہمیں موقع حاصل ہے۔ ڈیلی نکلنے کی اسی شاعت میں تحریر ہے کہ جرنی ڈاکٹر بام رجز پروفیسر یونیورسٹی برلن نے ایک ایسا آلہ ایجاد کیا ہے جس سے انسانی دل کے تمام پوشیدہ راز آئینہ کی طرح معلوم ہو جاتے ہیں اسکا نام گلوبکائی کلو میٹر یا دولابہ راستی کش ہے۔ اسکا موجد آج کل لندن میں مقیم ہے۔ اور یہ بات بڑی دل خوش کن ہے کہ اس آلہ کا تمام سامان اس قدر مختصر ہے کہ آسانی سے ایک چھوٹے سے دستی بیگ میں سما جاتا ہے۔ آج لارڈ رسی

نے میجر نکلم کی تائید سے آرل آف ڈنٹن کا نام کلب کی ممبری کے لیے تجویز کیا ہے۔ دولابہ راستی کش سے ایک ہفتہ دو کاج کا کام لیا جائیگا۔ اول تو اسے چار آرل ڈنٹن بطور فیس داخلہ ممبری پیش کر سکیں گے دوم اسکی مدد ہم عالم ذہنیات و سائنس کے خرمین کی خوشہ چینی کر سکیں گے جس کی ہمیں بہت ضرورت ہے۔ میں یہ بھی تجویز کرتا ہوں کہ دولابہ راستی کش حاصل ہو جانے کے بعد ہم میں سے ایک ممبر امتحان کے لیے بھی ڈالکر جس کسی کا نام نکلے تجویز کیا جائے اور آلہ لگا کر اسکے دلی خیالات اور پوشیدہ راز جنہیں وہ اپنے ساتھ قبر میں چھپانے کا خواہشمند ہو معلوم کیے جائیں۔ اے حضرات! یہ خیالات نہ صرف ہماری دلچسپی اور خوش طبعی کا باعث ہونگے بلکہ شاید ہم کے لیے اخلاقی سبق کا کام دینگے۔

پریسیڈنٹ کچھ اور کہنا چاہتا تھا مگر منشی کے قہقہوں اور تالیوں کے شور نے خاموش کر دیا۔

ڈاکٹر بام رجز پروفیسر برلن یونیورسٹی قدوقاست کے لحاظ سے غیر معمولی آدمی تھا۔ اُنچائی میں پچھنٹ چھ انچ سے کم نہ تھا اور اسی تناسب جسمات کا خیال کر لینا چاہیے۔ جسمانی عرض طول کے ساتھ اسکی دماغی قوت بھی ارفع و اعلیٰ تھی جس کی تصدیق یونیورسٹی کی میٹھا رڈ گریوں سے ہوتی تھی۔ وہ یاضی کے بیابان میں فیل بہت کا درجہ رکھنے کے ساتھ عالم ایجادات و اختراعات میں ممتاز تھا۔ چنانچہ تارکول سے ارغوانی رنگ جسکی تلاش میں کیا گرنڈرہ سو برس سے سرگردان تھے اسی یگانہ روز گار نے نکالا ہے۔ حال میں اس نے دولابہ راستی کش ایجاد کیا ہے جس کے ذریعہ سے انسان کے پوشیدہ راز آں واحد میں معلوم ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر موصوف لندن میں رائل سوسائٹی اور انفران محکمہ فوجداری کے روبرو اس دولابہ راستی کش کی حیرت انگیز قوتوں کی تشریح کرنے کی غرض سے مقیم بھی ہے۔ ڈاکٹر بام رجز کی ذہانت ہمیں تک محدود نہیں، خود اسکی روحانی قوت اس درجہ ترقی یافتہ ہے کہ با کسی آلہ کی مدد کے بھی اسے ایسی میٹا باتیں معلوم ہو جاتی ہیں جو دوسروں سے پوشیدہ

رہتی ہیں۔ اُس نے انشاع نور کا ایک نظام مقرر کیا تھا۔ اسکے نزدیک ہر انسان کی شخصیت سے اُسکی دلی خیالات میں رنگی ہوئی شعاع خارج ہوتی رہتی ہے۔ اگر آدمی کے خیالات خراب ہیں تو شعاع بھوسے رنگ کی نکلیگی۔ خیالات زیادہ فاسد ہیں تو اسی نسبت سے بھورا رنگ اُٹل بسیا ہی ہوتا جائیگا۔ اگر کسی آدمی کا دل روحانیات کی جانبائل ہو تو اُس کی شعاعیں آسمانی رنگ کی ہونگی۔ سبز شعاع بغض و حسد کی شہادت دیتی ہیں اور زرد رنگ سے نفاست مزاج ظاہر ہوتی ہے۔ غرض کہ اسی طرح مختلف رنگوں سے مختلف خیالات کا پتہ چلتا ہے۔ اور تو اور وہ انسان کی شعاع بلامداد کے بھی دیکھ کر دلی خیالات معلوم کر لیتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ لوگ اُسکی صحبت سے ہترا کر تے تھے۔ خود اُسکی شعاعیں ایسی واقع ہوئی تھیں کہ وہ اپنے خلاف لوگوں کے خیالات فوراً محسوس کر لیتا تھا۔

یہ حالات معلوم کرنے کے بعد ہم باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ ایک ات ڈاکٹر بام برجز کے فلسفیانہ خواب کے سلسلہ میں عجیب جینینی کے آثار ظاہر ہوئے۔ اہل جرمنی کی کفایت شعاری کی عادت ڈاکٹر موصوف میں بدرجہ غایت موجود تھی اور وہ اپنی نیند کا بھی ایک لمحہ ضائع نہ کرتا تھا۔ جبکہ اُس کا جسم خاک کی نیند کے آغوش میں استراحت و سکون کرتا تھا، اُسکی دماغی قوت جسم خاکی کے گراں با تعلقات سے علاحدہ ہو کر برابر کام کرتی رہتی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ معمولی آدمیوں کی طرح اُسکی روح بے ٹھوڑھکانے اور پریشان خواب کھا کرتی ہو بلکہ اُس نے نیند اور دشمنندی کے ساتھ نیند کی حالت میں بھی اپنی روحانی قوت کو کسی خاص مسئلہ کے حل کرنے میں مصروف رکھنے کی طاقت حاصل کر لی تھی۔ سونے سے پہلے سوچ کے لیے ایک دقیق مسئلہ تجویز کیا جاتا اور تمام شب اُسکی روح فضا عالم میں مسائل غلیظہ کے حل و عقد میں مصروف رہتی اور صبح کو پروفیسر ستر ہرات سے تروتازہ ہو کر اُٹھتا تو اُسکی روح اپنی شباشی اور نیند کے نتائج کی رپورٹ کیا کرتی۔ حسب معمول آج کی رات علم حرکت اجسام کا ایک دقیق مسئلہ سونے سے پہلے روح کے حوالہ کیا گیا جس کے لیے حرکت جبریہ کا ایک مساوات کا حل

لازمی تھا۔ اس یونختہ کے دماغ کے سامنے اس وقت ایک ہیبت ناک قطار آثار عجیبہ کی پیش تھی کہ یکایک اس مساوات میں شورش کا ایک عنصر شامل ہوا۔ اُسے محسوس ہوا کہ اُسکی لیبرٹری واقع بیرٹش یونیورسٹی معرض خطر میں ہے۔ دریغ رائن سے ایک جہاز نکلا اور لیبرٹری سے ٹکرا گیا! اہل جرمن کی فوجی قوت میں زوال آ گیا! غرض کہ ان خیالات نے اُسکی شعاع کی امداد سے اُسے بیدار ہونے پرائل کیا۔ آخر کار دو بجے کے قریب ڈاکٹر موصوف نیند سے چونک پڑا۔ ایسے ضابطہ آدمی کے لیے یہ بیداری بالکل غیر معمولی تھی۔

بستر پر بٹیکر سوچنے لگا کہ کیا اسرار ہے۔ سامنے کھڑکی سے ہو کر چاند کی روشنی کمرہ میں آرہی تھی مگر کہیں سے کوئی آواز نہ سُنی دیتی تھی! پھر اس شورش کی کیا وجہ؟ اُسکی شخصیت کی شعاع جینینی سے تھر تھرانے لگی۔ شاید کسی دوست مصیبت نے اثر کیا ہے۔ یا کسی قریبی آفت کا سامنا ہے۔ اُسے اپنے ملازمین کی نظر سے بالکل اطمینان تھا کیونکہ سب نوکر اپنے ساتھ لایا تھا اور ہر ایک کی شعاع اُسے قسم کی تھی۔ ڈاکٹر بام برجز اُٹھ کھڑا ہوا اور ایک فرغل جیم پر ڈال لیا اور دروازہ کھولا اور ہر چار طرف دیکھنے لگا۔

بالکل سکوت تھا اور کوئی آواز کان تک نہ پہنچی۔ لیکن ڈاکٹر موصوف کے دل کو اطمینان نہ ہوا۔ آہستہ آہستہ زینہ سے اُترا۔ سامنے کے کمرہ میں جہاں وہ علمی تجربات کیا کرتا تھا کچھ روشنی کی جھلک معلوم ہوئی۔ دروازہ کھولے ہی حیران ہو گیا۔

کمرہ میں ایک آدمی تھا۔ پستہ قد، خوش رو، ڈاڑھی ڈاکٹر کی ڈاڑھی سے ایک چوتھائی ہوگی۔ وہ مختلف چھوٹی چھوٹی چیزیں ایک دستی بیگ میں بھروسہ تمام بھر رہا تھا۔

ڈاکٹر (چلا کر) ڈونروٹیر! تم کیا کرتے ہو۔ آلہ کو تباہ کر دو گے۔ اُس نے گلو ایک لیپ کو چور کے ہاتھ سے چھین لیا اور غضبناک ہو کر میز پر رکھ دیا پھر دونوں آدمی ایک دوسرے کو خونخوار جانور کی طرح گھورنے لگے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ایسی حالت میں یہ دونوں لڑنے لگتے۔ پستول چلاتے یا کم از کم لہذا

ہی کے ذریعہ سے ڈرتے دھمکتے مگر ڈاکٹر چور کی طرف اس قدر حیرت زدگی کے ساتھ دیکھ رہا تھا کہ چور گھبرا اٹھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر کی نگاہ اُس کے جسم کے پار کسی چیز پر جمی ہوئی ہو۔ اُس نے گھوم کر دیکھا مگر کچھ نظر نہ آیا۔ آخر کار ڈاکٹر چلا یا ”اُہا! کیسی چت کبری شاعر ہی! میں نے ایسی شاعر پہلے کبھی نہیں دیکھی۔ تم نہایت دلچسپ آدمی ہو۔“

نقہ زن نے جھک کر فرشی سلام ادا کیا۔

ڈاکٹر (مزالیکر) نیلا اور پیلا! سبز اور غوانی! سب بھگ ایک ساتھ نظر آتے ہیں۔ بھوے رنگ کا بھی ایک ٹکڑا ہے مگر اس قدر بڑا نہیں جتنا ایک چور کی شاعر میں ہونا چاہیے۔ تم تو بالکل قوس قزح ہو! تم جیسا آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ تمھارے متعلق میں مزید حالات معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ وہاں بیٹھ جاؤ۔ ایک بڑی آرام کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا اور جلدی جلدی بیگ سے چیزیں نکالنا شروع کیں۔

چور۔ ”کس لیے بیٹھ جاؤں؟“

ڈاکٹر۔ ”میں اپنے دولابہ راسخ کش کے ذریعہ سے تمھاری شخصیت کا معائنہ کرنا چاہتا ہوں۔ تم بڑے دلچسپ آدمی ہو۔ اور اپنی جدید فہرست تجربا میں تمھارا حال پورے ایک صفحہ پر درج کروں گا۔“

چور۔ ”معائنہ کرنے کے بعد کیا کرو گے؟“

ڈاکٹر۔ ”اے۔ میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تم چور ہو معائنہ کرنے کے بعد میں تمھیں پولیس کے حوالہ کروں گا۔ پولیس بڑی خوشی سے تمھیں حراست میں لے گی۔“

چور (لجارت سے) ”اگر میں آپ کو اپنا معائنہ کرنے دوں اور اس طرح آپ کی فرست کی تیاری میں مدد ہوں۔ کیا آپ خیال نہیں کرتے کہ یہی حالت میں پولیس کے حوالہ کرنا سراسر ناشکر گزار ہی ہوگی؟“

ڈاکٹر (ہاتھ مل کر) ”اُہا! یہ نیلا رنگ بول رہا ہے! خیر۔ نہیں۔ میں تمھیں پولیس کے سپرد نہ کروں گا۔ مجھے پولیس یا اسکی کارروائیوں سے بالکل نسبت نہیں ہے۔ بس اب بیٹھ جاؤ۔“ اُس نے زبردستی چور کو کرسی پر

بٹھادیا اور اپنا دولابہ ٹھیک جانا شروع کیا اور گنگنا کر کہنے لگا۔ ”اُہا! ایک عجیب و غریب شئی ہے! ایسی رنگ برنگی شاعر میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ میں چاہتا ہوں کہ شاعروں کی تبدیلیاں دیکھنے کے لیے تمھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھوں دیکھو۔ میں تمھارا چور ہونا دل سے بھلا دوں گا۔ تمھاری بھوری شاعر چنداں بین نہیں ہے۔ اور تمھیں ملازم رکھ لوں گا۔ میں تمھیں مئس روپیہ فی ہفتہ علاوہ خوراک اور مکان کے دیا کروں گا اور ہاں! بڑی نفیس مادی بھی بنوا دوں گا“

چور نے سر ہلایا۔

ڈاکٹر (جوش میں آکر) ”اچھا دس نہیں تو پندرہ سو۔ یعنی پندرہ ہفتہ باون، کل سات سو اسی روپیہ سالانہ ہوے۔ پاک کمائی سے۔ اور وہ وہ اور خوراک علاوہ۔ سب مل کر یہ روپیہ ماہوار کے قریب ہوگا۔ موجودہ حالت میں تو تمھیں ستر روپیہ سال بھر میں بھی نقبہ فی سے ملتے ہونگے۔“

چور نے فوراً جواب دیا ”نہیں میری آمدنی اس سے زیادہ ہے۔“

ڈاکٹر (تحریر سے) ”مجھے تمھاری بات کا بالکل یقین نہیں۔ میں ایک میں یہ سب ثابت کر سکتا ہوں۔ تمام دنیا میں صرف میں ہی ایک شخص ہوں جسے تم دعو کا نہیں دے سکتے۔ اچھا آؤ آزمائش کریں۔ برقی قوت کا سلسلہ قائم کرنا چاہیے۔ اب ذرا اپنا ہاتھ اس جہت کے ٹکڑے پر رکھو۔ یوں۔ دوسرا ہاتھ کاربن پر۔ اس طرح۔ اب برقی سلسلہ ٹھیک ہو گیا ہے۔ اب میں اپنے لیپ کو اس طرح رکھتا ہوں کہ اُسکی روشنی اُس پر پڑے جو تمھارے پیچھے ہے اور اُس پر اپنے کے لیے نشان بنے ہیں۔ دیکھو اس پر پڑے پر پڑنے کے جاننے کے نشان بنے ہیں۔ اچھا دوست! اب میں تمھاری آمدنی معلوم کر دوں گا۔“

ستر روپیہ ماہوار کا لینا آسان نہیں ہے۔ اب میں تمھیں متحرک کروں گا۔ سنو۔ میں سوال کرتا جاؤں گا۔ تم کچھ جواب نہ دینا بلکہ لیپ کی نو پر دے پر تباہی تمھاری شخصیت کے ذریعہ سے یہ کو کام کر گئی۔ سچ بات معلوم ہو جائیگی اب تم ڈاکٹر بام برجز پر و فیسر بریش یونیورسٹی سے کچھ نہ چھپا سکو گے۔“

”اُہا!۔ اب میں اپنے قلم کو گھٹانا شروع کرتا ہوں۔ اور دولابہ

سوال کہتا ہوں کہ پچھلے سال چوری کے علاوہ تمہاری آمدنی کتنی تھی؟
قرص نے آہستہ آہستہ گھومنا شروع کیا اور چراغ کی فوجوں جوں
ہند سے سامنے آتے گئے اچکنے لگی۔ اکائی کے بعد دہائیاں ختم ہوئیں پھر
سیکڑے بھی۔ ہزاروں کے ہند سے آنے لگے مگر قرص برابر گھومتا رہا۔
اب تو ڈاکٹر بیاب ہو کر چلا یا۔ ”ہاے ہاے!! سلسلہ برقی میں کچھ
خرابی معلوم ہوتی ہے۔“ اسے چور کے پاس جا کر دیکھا تو دونوں ہاتھ پٹنیوں پر
رکھے تھے۔ پھر تاروں کا بغور جائزہ لیا مگر وہاں بھی کوئی خرابی نہ پائی
سب چیزیں ٹھیک تھیں۔ پھر قرص کی طرف دیکھا تو کتیس ہزار کے بعد تیس
ہزار کی رقم گزری۔ مگر قرص برابر گھوم رہا تھا۔۔۔۔۔ اب تو زیادہ متحرک ہوتے
لگی۔ چالیس ہزار، پچاس ہزار، پچاس ہزار۔ کو آٹھ انچ تک اچلی اور
قرص کا گھومنا بند ہو گیا۔

ڈاکٹر (حیرت میں آکر) ”پچاس ہزار پونڈ پاک کمائی سے! اے خدا!
لیکن یہ ناممکن ہے۔ کہیں میرا دولابہ راستی کشن تو نہیں بگڑ گیا؟ آج سے
پہلے کبھی اس نے جھوٹ نہیں بتلایا۔“

ڈاکٹر بڑی پریشانی کے ساتھ کمرہ میں ٹہلنے لگا۔ کبھی ڈاڑھی کھینچی کبھی
سر کے بال نوچنے لگا۔ ”ہاے! میں تو جمعہ کے دن رائل سوسائٹی کے
سامنے اپنے آپ کے کمالات دکھائیوا ہوں۔ میری شہرت خاک میں مل جائے گی۔
اے خدا کیا کروں؟“

ڈاکٹر کی مایوسی اور بیچینی کا اثر چور پر بھی ہوا اور وہ کہنے لگا۔ ”جناب
والا۔ آپ کو اپنے دولابہ کی صحت پر شبہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اسکا
بیان بالکل درست ہے۔ مجھے خود حیرت ہے۔ ہر ایک انکم ٹکس کے دفتر میں
تشخیص ٹکس کے لیے یہ آ رہنا چاہیے۔ پچھلے سال میری آمدنی کی ٹھیک
یہ مقدار تھی۔“

ڈاکٹر (طنز کے ساتھ) ”کیا خوب! تو میں شاید شاہزادہ مانٹ کرسٹو
سے باتیں کرنے کی عزت حاصل کر رہا ہوں۔“

چور (بے تکلفی سے) ”نہیں۔ آپ پھر اپنے آپ سے مدد لیجیے اور میرا
رتبہ معلوم کیجیے۔ آپ کے لیے یہ بالکل آسان ہے۔“

ڈاکٹر: ”ہاں ٹھیک کہتے ہو۔ میں ایک مرتبہ اور اپنے دولابہ راستی کشن
کا تجربہ کروں گا۔ اگرچہ اسکا آخری جواب حیرت میں ڈالنے والا تھا تاہم میں
اپنے دولابہ کا اعتبار کرنا نہ چھوڑوں گا۔ صاف معلوم ہو جائیگا۔ ایک مرتبہ
غلطی کرنا ممکن ہے۔ بار بار نہیں ہو سکتی۔“

”پیشہ معلوم کرنے کی قرص کہاں ہے۔“

ڈاکٹر نے پہلی قرص نکال کر اس قرص کو اٹھکی جگہ جایا۔ اس پر سو سے زیادہ
پیشوں کے نام بادشاہ سے لیکر حلال خود تک لکھے ہوئے تھے۔

ڈاکٹر (متنبہ ہو کر) ”اچھا اب برقی سلسلہ پھر قائم کر لو۔ سنو۔ میں
سوال کرتا ہوں کہ تمہارا پیشہ جس کے ذریعے تم ستر روپیہ سے زیادہ کماتے
ہو۔ کیا ہے؟ بتلاؤ۔“

قرص آہستہ آہستہ گھومنے لگا اور چراغ کی ٹوٹمانے لگی۔ حلال خور کا
نشان گزر گیا اور ٹوٹ اٹھی۔ جہاز رانی پر تو تین انچ اونچی اٹھی کیونکہ کسی نہ
میں چور بھری فوج میں ملازم رہ چکا تھا۔ اسکے بعد قرص بدستور گھومتا رہا
جب امرا کا طبقہ نزدیک آیا تو ڈاکٹر چلا یا۔ ”اے غضب“ ہاے میں کس طرح
رائل سوسائٹی کو منہ دکھا سکوں گا۔ میرا دولابہ راستی کشن بڑا دھوکہ باز اور
جھوٹا نکلا۔ ہاے ہاے۔ ارے باپ اے۔ جس وقت امیر زادوں کا نشان
سامنے آیا چراغ کی ٹوٹ بھرا اونچی اٹھی اور قرص گھومنا بند ہو گیا۔

ڈاکٹر تھکے سے کرسی پر گر پڑا۔ پسینہ کے بڑے بڑے قطرے پیشانی پر ڈوا
ہوئے اور کہنے لگا۔ ”بڑے غضب کی بات ہے! رات کے وقت ایک نف زن
میرے گھر میں گھسا ہے لیکن میرا دولابہ راستی کشن کہتا ہے کہ یہ چور نہیں بلکہ
امیر زادہ ہے جسکی سالانہ آمدنی پچاس ہزار پونڈ ہے۔“

چور کی طبیعت بڑی ہمدردانہ واقع ہوئی تھی اسکی شعاع میں لطف
و عنایت کے رنگ نے امتیازی درجہ پایا تھا۔ ڈاکٹر کی مایوسی اور پریشانی کو

دیکھ کر فوراً تسلی بخشی کرنے لگا۔

چور۔ ”تسلیم۔ بڑی مہربانی میں رہتے جانتا ہوں اور خود آسانی چلا جاؤں گا۔“

ڈاکٹر۔ ”جی ہاں۔ ضرور۔ ضرور۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔ مگر آپ جیسے امیر زادہ کالڈن کی گلیوں میں تنہا پھرنا خطرہ سے خالی نہیں ہے۔ سڑک کے لیے کسی کا ساتھ ہونا ضروری ہے۔ کیسی بھیانک اندھیری رات ہے! ایک لمحہ کی اجازت دیجیے۔“

یہ کہہ کر ڈاکٹر نے جلد جلیفون کی کتاب کی ورق گردانی کی۔ پھر جلیفون میں بات کہنے لگا۔ پینتیس۔ پینتیس۔ نمبر پینتیس؟ یہاں سرولیم تو نہیں ہیں۔۔۔۔۔ ہاں اس وقت نہ ہوں گے۔۔۔ میں ڈاکٹر بام برجز ہوں جس نے کل اپنے دولابہ رستی کش کے عجائبات دکھائے تھے۔۔۔ ہاں۔ اچھا۔ میرے یہاں ایک ناخواندہ مان گیا ہے۔ میں اسے سحرولی چور سمجھتا ہوں مگر وہ اپنے آپ کو امیر زادہ اور پچاس ہزار پونڈ سالانہ کا دولت مند سمجھتا ہے۔۔۔۔۔ سمجھیے اسکا مطلب۔۔۔۔۔ اچھا آپ آکر اسے اس کے گھر پہنچا دیجیے۔۔۔۔۔ یہاں اور کوئی نہیں ہے۔“

ڈاکٹر موصوف مکالمہ برق کی جانب اس قدر مصروف تھے کہ اپنے مکان چور کا اعلان نہ رہا۔ چور نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سے ڈاکٹر اس طرف متوجہ ہوا۔ فوراً جلیفون ہاتھ سے پھینک کر چور کے پیچھے دوڑا۔ چور کو اتنی مہلت نہ ملی کہ زینہ کی طرف جاتا۔ جلدی سے سامنے کے کمرہ میں گھس کر اندر سے دروازہ بند کر لیا۔ کمرے کے دوسری طرف کھڑکی کھولی تو حسن اتفاق سے پانی کا نل ملا جسے کپڑے کو نہایت پھرتی سے نیچے پھسلنا شروع کیا۔ بحری فوج کی ملازمت کی وجہ سے ایسے کاموں میں بڑا مشاق تھا۔ لیکن چور نے بجائے زین پر اترنے کے اپنے آپ کو ڈاکٹر کی گود میں پایا۔ جرسن قوم کی دورانہ پشی کے خیال سے وہ پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ چور کھڑکی کے راستہ بھاگنے کی کوشش کرے گا اور اس لیے زینہ کے راستہ سے ڈاکٹر وہاں پہلے سے پہنچ گیا تھا۔

چور۔ ”آپ ہرگز اپنے آلہ کی صحت پر شک نہ کیجیے۔ میرے نزدیک صحت کا پتلا ہے۔ اس مرتبہ پھر اس نے بالکل صحیح بات بتائی۔ اتفاق سے میں امیر زادہ ہوں۔“

ڈاکٹر نے نظر اٹھا کے دیکھا تو کوئی خاص علامت امارت کی نظر نہ آئی۔ پھر غور سے اس کی شعاع پر دوبارہ توجہ کی۔ اطمینان نہ ہوا۔ سر ہلا کر کہنے لگا۔ ”تم امیر زادے نہیں ہو، کیونکہ اُمردوبجے رات کو لوگوں کے گھر میں گھس کر چوری نہیں کیا کرتے۔ پچاس ہزار آمدنی اور یہ حرکت! میرے دولابہ رستی کش نے ضرور غلطی کی ہے۔“

چور۔ ”جناب پر وفیسر صاحب! آپ کی سمجھ کی خوبی ہے جو آپ آلہ کی صحت پر شک کرتے ہیں۔ شاید آپ کا دماغ مرکزِ نقل سے ہٹ گیا ہے۔“

دماغی صحت کا اشارہ پا کر ڈاکٹر نے ایک دفعہ پھر غور سے دیکھا اور بچہ ایک اسکا چہرہ ہلکا اٹھا۔ اور جوش کے ساتھ کہنے لگا۔ ”افاہ! میں سمجھا میں نے اسکا تجربہ پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔“

اپنی جگہ سے اٹھا اور چور کی پیشانی پر ہاتھ پھیر کے نہایت نرمی سے بولا۔ ”کیوں بھی اسیچ کہنا۔ کبھی تنے یہاں درد محسوس کیا ہے؟“

چور۔ ”جی ہاں کبھی کبھی رات بھر گھومنے کے بعد۔“

ڈاکٹر۔ ”میرا خیال صحیح ہے۔ بالکل یہی بات ہے۔ تم اس بات کا یقین رکھتے ہو کہ تم امیر زادے ہو اور تمھاری آمدنی پچاس ہزار پونڈ ہے؟ میرا دولابہ رستی کش بالکل صحیح کہتا ہے!“

چور۔ ”مجھے بہت خوشی ہوئی کہ آپ اس نتیجے پر پہنچ گئے۔ اب اجازت ہو تو میں رخصت ہوں۔“

ڈاکٹر۔ ”ہاں۔ بہت اچھا۔ میں تمھیں روکنا نہیں چاہتا۔ لیکن تمھارا ساتھ کسی آدمی کا جانا ضروری ہے جو بحفاظت تمام تمھیں تمھارے محل اور خزانہ کے پاس پہنچائے۔ کدو کسے بلاؤں؟“

پھر چپکے سے انسپکٹر مارول کے کان میں ڈاکٹر نے یہ بھی کہا کہ یہ شخص پاگل ہے۔“

انسپکٹر مارول نے ڈاکٹر کی بات سے اتفاق نہ کیا۔ چور کے پاس آکر کچھ دیر گھورتا رہا اور کہنے لگا کیا تم نقب نوں کی کلب کے ممبر ہو؟

چور۔ ”جی نہیں۔ میں اس عزت کا مستحق نہیں ہوں۔“

انسپکٹر۔ ”تو شاید آج رات کی کامیابی پر ممبر بنائے جاتے؟“

چور خاموش ہو رہا کچھ جواب نہ دیا۔

انسپکٹر (فخریہ لہجہ میں) ”میرا خیال صحیح نکلا؟“ (ڈاکٹر سے خطاب کیلئے) آپ کے معزز ہمان نقب نوں کی کلب سے تعلق رکھتے ہیں۔ کیا آپ نے ان حضرات کا حال انہار ٹکڑ میں نہیں پڑھا؟“

ڈاکٹر۔ ”میں ٹکڑ نہیں پڑھتا۔ میں تو صرف علمی اخبارات دیکھتا ہوں۔ اُن میں ان لوگوں کا کچھ تذکرہ نہ تھا۔“

انسپکٹر۔ ”بے شک علمی رسالوں میں یہ باتیں کہاں۔ یہاں بہت سے امیر زائے محض تفتن طبع کی غرض سے چوری اور نقب نوں کرتے ہیں۔“

ڈاکٹر۔ ”کیا میرے ہمان کی طرح یہ سب لوگ پاگل ہیں؟“

انسپکٹر۔ ”جی نہیں۔ آپ کی اور میری طرح بالکل باحواس اور صحیح الدماغ۔ ہم عرصہ سے انکی تلاش میں حیران و سرگردان ہیں۔ شکر ہے کہ آج

آپ کی عنایت کی بدولت یہ امیر زادہ ہمارے ہتھے چڑھا ہو۔ اب سب راز فشا ہو جائیگا۔ اگرچہ میں ان صاحب کو نہیں پہچانتا لیکن انکی شناخت بالکل آسان

ہو۔ ڈاکٹر صاحب! میں اپنے تمام محکمہ کی جانب سے آپکا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے اس سنگین جرائم پیشہ حضرات کا غول توڑنے میں ہمیں قیمتی مدد دی۔“

(چور سے مخاطب ہو کر) ”مائی لارڈ! تشریف لے چلیے۔“

مگر چور اپنی جگہ سے نہ ہلا۔

چور۔ ”ڈاکٹر! ہم بجز! میں آپ کو غلط فہم سمجھتا ہوں اور آپ کے وعدہ پر بھروسہ کر کے امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے ہرگز پولیس کے حوالہ نہ کریں گے۔“

ڈاکٹر (بلا اظہار راضی) ”اس کہسی پر تشریف رکھیے۔ تھوڑی دیر میں ایک صاحب آئیں گے اور آپ کو بحفاظت تمام گھر پہنچا دیں گے۔“

چور (غصہ سے) ”مجھے کسی کی خبر گیری کی ضرورت نہیں ہے۔“

ڈاکٹر۔ ”بے شک نہیں ہے۔ اب میں مکالمہ ختم کروں۔ نمبر پتیس آٹھ پتیس۔۔۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔۔۔ میں ڈاکٹر! ہم بجز ہوں۔۔۔۔۔ پانچ منٹ پہلے میں ہی باتیں کر رہا تھا۔۔۔۔۔ بہتر ہے۔ کیا نام بتایا۔ انسپکٹر مارول۔۔۔۔۔ بہت

خوب۔۔۔۔۔ آئیے۔“

چور۔ (کھڑا ہو کر) ”دیکھیے! پروفیسر صاحب! آپ نے مجھ سے کیا وعدہ فرمایا تھا؟ پھر پولیس سے باتیں کرنے کے کیا معنی؟ میں آپ کو معزز اور شرف سمجھتا تھا۔“

ڈاکٹر۔ ”تم میری شرافت کے متعلق اپنا خیال نہ بدلو۔ میں تمہیں چور کی حیثیت سے پولیس کے حوالہ نہیں کرتا۔ صرف یہ چاہتا ہوں کہ پولیس تمہیں بحفاظت گھر پہنچائے۔ آدھ گھنٹہ بعد تم اپنے محل میں اپنا خزانہ شمار کرنے لگو گے! جب تک پولیس افسر آئے خاموش بیٹھے رہو۔“

اسوقت ایک موٹر کار آئی اور پروفیسر کے دروازہ پر رکی۔ ڈاکٹر نے کھڑکی کھول کر پوچھا ”کیا انسپکٹر مارول آپہنچے؟“

”جی ہاں۔ میں حاضر ہوں۔“

ڈاکٹر۔ افسوس ہے میں اپنے معزز ہمان کو چھوڑ کر کوڑا کھولنے کیلئے خود نیچے نہیں آ سکتا۔ مگر آپ تو بے شیشہ میں ہاتھ ڈال کے دروازہ

کھول لیں اور یہاں آ جائیں۔“

تین منٹ کے بعد لندن کا مشہور سراغ رساں انسپکٹر مارول مرد میں آ پہنچا۔

ڈاکٹر۔ ”انسپکٹر صاحب! میں نے بہت بیوقت آپ کو تکلیف دی میری یہاں اسوقت ایک عجیب غریب ہمان آیا ہے (چور کی طرف اشارہ کر کے)

یہ صاحب اپنے آپ کو امیر زادہ کہتے ہیں اور پچاس ہزار پونڈ آمدنی بتاتے ہیں۔“

آپ نے صاف الفاظ میں مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ اور میں نے دولاب راستی کش کے تجربہ میں امداد دیکر آپ کو آپ کی عنایت کا مستحق بنالیا ہے۔“

ڈاکٹر (انسپیکٹر مارول سے) ”یہ بالکل صحیح ہے۔ بے شک میں نے وعدہ کیا ہے۔ اور بحیثیت ایک جرمین ضلعین کے ایف اے وعدہ مجھے فرض ہے۔“

انسپیکٹر ”آپ نے ایسے ہی وقت مجھے اپنے مہمان کی خبر گیری کے لیے بلایا تھا۔ اور میں اس خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ اور آپ کے معزز مہمان کو یہاں سے لیے جاتا ہوں۔“ (چور کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر) ”مائی لارڈ ایس اب تامل نہ کیجیے اور میرے ساتھ چلیے۔ موٹر کار حاضر ہے۔“

چور (غصہ سے) ”میں تمھارے ساتھ کیوں چلنے لگا۔ خبردار مجھے ہاتھ نہ لگانا۔ کیا تمھارے پاس میری گرفتاری کا کوئی وارنٹ ہے۔ کیا میں نے کوئی جرم کیا ہے۔ کیا کسی کی کوئی چیز چرائی ہے۔ پھر کیوں جاؤں؟ ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے کوئی الزام تو نہیں لگاتے؟“

ڈاکٹر ”ہرگز نہیں! میں نے پولیس کو صرف ایسے بلایا تھا کہ میں آپ کو پاگل سمجھتا تھا۔ اپنے دولاب راستی کش پر شک کرنے کا یہ خوب معاملہ ملا۔ جناب انسپیکٹر صاحب! میں اس ضلعین سے وعدہ کر چکا ہوں۔ یہ اگرچہ میرے ہاں اپنی خوشی سے آئے تاہم انھیں میں اپنا معزز مہمان سمجھتا ہوں۔“

انسپیکٹر (جوش کے ساتھ) ڈاکٹر! آپ اس معاملہ کی سنجیدگی کو نہیں سمجھتے۔ گذشتہ بارہ مہینہ سے ہم اس کلب کے ممبروں کی تلاش میں ہیں۔ آج نہایت عمدہ سرِ غم ملا ہے۔ دو مرتبہ ہم نے ان کے ممبر کو پکڑنے کی کوشش کی ہے۔ دیا۔ ایک بار تو آپ ہی کے ایک ہم وطن کی اسی قسم کی ضد کی بدولت اب اسکا اعادہ نہیں ہو سکتا۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس امیر زادہ کو آپ ملزم قرار دیکر قانون دامنِ عاقبتہ کی امداد فرمائیے۔“

ڈاکٹر ”مسٹر انسپیکٹر! مجھے فسوس ہے کہ میں آپ کو مرہونِ منت نہیں کر سکتا۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ آپ قاعدے قانون کے جانب اہل اور یہ امیر زادہ نقصان میں کا۔ میری وجہ سے آج جو تکلیف آپ کو برداشت

کرنا پڑی اُسکا مجھے سخت فسوس ہے لیکن میں کسی شخص کے ساتھ، خواہ وہ امیر زادہ نقیب بن ہی کیوں نہ ہو، وعدہ خلافی نہیں کر سکتا۔ مجھے آج تک کسی ایسے شخص سے سابقہ نہیں پڑا۔ یہ جنس صرف انگلستان ہی میں پائی جاتی ہے۔ میں برٹش یونیورسٹی کے علما سے اسکا تذکرہ کرونگا اور غالباً وہ اس عجیب غریب جنس کے حالات کا مطالعہ کرنا سبق آموز خیال کرے گا۔ زمانہ حال کی ترقی کا یہ عجیب نمونہ ہے۔ اور پروفیسر سیرسوجو ماہر علمِ جہانم ہیں اسے معلوم کر کے بہت خوش ہونگے۔ مگر یہ جملہ معترضہ تھا۔ کیا میں آپ کی خدمت میں سگارا ورجہ من ساز شراب پیش کر سکتا ہوں۔ موسلے اور ہوکنیم کی بنی ہوئی نہایت خوش رنگ خوش ذائقہ شرابیں میرے ساتھ ہیں۔“

انسپیکٹر مارول نے غصہ کے کانپ رہا تھا اور بڑا اہلکار چاہتا تھا مگر یہی کیا؟ ڈاکٹر صاحب! آپ بڑے بہت بہتر۔ میں صبح کو سیرسوجو سے تمام واقعہ بیان کروں گا۔ اب میں آپ کو اور آپ کے مہمان کو نہ ادا فط کتا ہوں۔“

انسپیکٹر نے ڈاکٹر کی تواضع کا شکریہ بھی ادا کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

چور ”مجھے نہایت فسوس ہے کہ آج اس قدر تکلیف و زحمت اٹھانا پڑی۔ ڈاکٹر (غصہ سے) بات کاٹ کر“ بیشک تمھیں فسوس کرنا چاہیے میں تم جیسے انگریزی امیر زادوں کی حرکات بالکل نہیں سمجھ سکتا، لیکن انسپیکٹر مارول کی بات خوب سمجھتا ہوں۔ تنے اُسکا آخری فقرہ سنا؟ مجھے کال اُٹھ گئی کہ لندن کی پولیس میرا دولاب راستی کش اپنے محلہ میں جاری کر گئی اب سرولیم خانا ہو جائینگے اور ایسا نہ کریں گے۔ اُسید ہو کہ تم اپنی رات کی کارگرداری پر مطمئن ہو۔ کیا تم اسے تفتنِ طبع کہتے ہو؟“

ارل ڈینیٹ نے نہایت گرجوشی اور سادگی سے کہا ”ڈاکٹر! بامِ برجز! میں آپ کی فیاضی کا بچہ شکر گزار ہوں۔ سرورست میں اسکی معافی چاہتا

انسپکٹر مارول کی شکایت کے اسکاٹ لینڈ یارڈ اور رائل سوسائٹی نے ڈاکٹر موصوف کی سرپرستی اختیار کر لی اور اس کے عجیب و غریب لکھناؤ منظور کر لیا۔ اسکے علاوہ اونچی سوسائٹی کے ایسے طبقوں سے ڈاکٹر کو دعوتیں دی گئیں جن کے ہاں پہنچنے کی اسے کبھی امید نہ تھی۔ ان تمام کامیابیوں کو وہ امیر نژاد نقب زن کے اثر پر محمول کرتا تھا۔ جب تک لندن میں رہا ہر جگہ اور ہر وقت دوبارہ ملاقات کا آرزو مند رہا۔ مگر اسکی صورت پھر کبھی نظر نہ آئی۔

ڈاکٹر بام برجز نے برٹش یونیورسٹی میں واپس جا کر اپنے تجربات اور انگلستان کے امراؤ کے اس عجیب و غریب کلب پر نہایت دلچسپ لیکچر دیا۔ جس کا جرمنی میں مدتوں چرچا رہا اور ڈاکٹر اسے ہمیشہ یہ الفاظ کہ کر یاد کیا کرتا ہے :-

”اسکی شعاع کیسی چٹ کبری تھی“

(مترجمہ) ظفر عمر

ہوں کہ میں نے آپ کو خواب ستراحت سے ناحق بیدار کیا۔ ناحق اس جہ سے کہ مجھے خود کو کوئی نفع حاصل نہ ہوا۔ لیکن میں اطمینان دلاتا ہوں کہ آپ کو ایک انارٹی نقب زن سے ایسا وعدہ کرنے سے جس نقصان عظیم کا خطرہ ہو وہ برداشت نہ کرنا پڑیگا۔ ممکن ہو کہ پولیس کسی قانونی بنا پر مجھے گرفتار کرنے کی فکر میں ہو اس لیے میں آپ سے نصحت چاہتا ہوں انسپکٹر مارول کا شو فرمے تعاقب کیلئے نیچے موجود ہے۔ میں بحید منوں ہونگا اگر آپ مجھے چور دروازہ سے لکچا جانے دیں گے“

ایک گھنٹہ کے بعد انسپکٹر مارول وارنٹ لیکر لوٹا۔ مگر چور روانہ ہو چکا تھا۔ آرل ڈینی کو فیس داخلہ کے حاصل کرنے میں جو ناکامیابی ہوئی اسکی وجہ سے وہ کلب میں داخل نہ ہو سکے۔

ڈاکٹر بام برجز وطن مالون کو خوش خرم و کامیابے ایس گیا۔ باوجود

— c x ∞ — تہذیر الہیہ سید مظفر علیاں آسیر لکھنوی — x ∞ —

مشہور قصبہ امیٹھی میں جو لکھنؤ سے چند کوس کے فاصلہ پر ہے آسیر کی

ولادت ہوئی۔ لیکن بہت ہی صغیر سنی میں وہ لکھنؤ چلے آئے اس لیے کہ ان کے آبا و اجداد کا مسکن مادہ لکھنؤ ہی تھا۔ آسیر کے والد ماجد دادا اور دادا شاہی سے تعلق رکھتے تھے۔ آسیر کے والد میرد علی صاحب علامہ العصر تھے اور دادا ابھی، اور وہی فضائل خاندانی آسیر میں موجود آسیر غفوان شباب ہی سے شاہی ملازمت میں داخل ہوئے۔ ان کے لیے شاہی ملازمت کوئی اہم کام نہ تھا اگر ان میں علی قابلیت اعلیٰ درجہ کی نہ ہوتی تو بھی یہ عمدہ نوکری پاسکتے تھے لیکن چونکہ یہ خود عربی فارسی میں خاص امتیاز و تبحر رکھتے تھے لہذا نہایت اغار و وقار سے انکا تعلق دربار

آسیر نے اپنے والد میرد علی صاحب المتخلص بہ مائل سے اتنی قابلیت حاصل کی کہ خود دوسرے طلباء کو پڑھانے لگے اور انکی استادانہ قابلیت کو لوگ ماننے لگے۔ شاعری میں شاعرانہ شان پیدا ہوئی۔ آسیر نے اپنے والد معذور کے سوا اپنے چچا میر سید علی صاحب بھی متواتر چار سال تک تعلیم حاصل کی۔ میر سید علی صاحب صرف و نحو، حکمت، منطق، حدیث وغیرہ میں خاص قابلیت رکھتے تھے۔ آسیر نے مولانا مرزا کاظم علی صاحب سے بھی استفادہ علم کیا، حدیث، حکیم ثنائی انھیں سے پڑھا۔ مرزا صاحب بڑے متقی عالم تھے۔

جب واجد علی شاہ تخت نشین ہوئے تو امین الدولہ وزیر ہوئے۔ چونکہ وزیر موصوف اسیر کے خاص عنایت فرماتے تھے لہذا انکو میرنشی کا عہدہ دیا۔

اتفاقاً ایک وزیر ایک شاہی خواص آیا اور اسیر کو دیوان خاص میں بلایا گیا یہاں حضرت واجد علی شاہ رونق بخش سریتھے۔ اسیر کو نہایت مینازی حالت سے پاس بٹھایا اور ایک کتاب جو کل انتخاب تھی نظم کے لیے دی حضرت واجد علی شاہ اس نظم کو سنکر بہت محفوظ ہوئے اور عزت افزائی کی۔ تالیف و مدیر الملک بہادر جنگ کا خطاب عطا ہوا اور صلاح سخن کا اعزاز بھی مرحمت ہوا حقیقت یہ ہے کہ بادشاہ اسیر پر خاص خسروانہ نوازش فرماتے تھے۔ اسیر کو بھی بادشاہ کے مزاج میں دخل تھا اور سفید مشورہ دیا کرتے تھے۔ ان کا مزاج صرف مصاحبانہ تھا اس لیے کہ اکثر مصاحب صرف زر کشی اور ہاں میں ہاں ملانے والے ہوتے ہیں مگر اسیر اپنے علم و فضل اور متقی و متشرع ہونے کے سببے حکیمانہ اور مدبرانہ اوصاف رکھتے تھے۔ چنانچہ جب امین الدولہ کی وزارت کو واجد علی شاہ نے تبدیل کیا اور انکی جگہ علی نقی خاں وزیر مقرر ہوئے تو یہ بات اسیر کو ناگوار ہوئی اور انھوں نے کنایہ اور کسی وقت صریحاً اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اسیر کی ہوشیاری اور مدبری سے علی نقی خاں بھی کھٹکتے تھے اور انکو سابق وزیر کا دوست سمجھکر علی نقی خاں نے ان اچھا برتاؤ نہیں کیا۔ حتیٰ کہ اسیر کچھ روز علی نقی خاں کی عنایت سے قید بھی رہے۔ الغرض علی نقی خاں کی وزارت کا جو انجام ہوا ظاہر ہے جب واجد علی شاہ تخت آوادم سے معزول ہو کر کلکتہ روانہ ہونے لگے تو اسیر ان کے ساتھ کلکتہ اس وجہ سے نہیں گئے کہ بادشاہ نے انکی فمائش پر عمل نہیں کیا۔ چنانچہ واجد علی شاہ نے اپنی ایک تحریر میں چند فقرات اسیر کے متعلق لکھے ہیں جن سے بادشاہ کی آزدگی خاطر اور نیز اس دلی تعلق کا جو انکو اسیر سے تھا پتہ چلتا ہے:-

تدبیر الدولہ نقی خاں صاحب بہادر جنگ اسیر نوجوانی میں راقم (واجد علی شاہ) کا ہم پایہ و ہم نوا رہا۔ اسکے باپ دادا اسیر و دیار کے

قدیم نیکو اہل ہے۔ اسیر پر مصاحب امداد رونق مل تھا۔ لیکن حبیب لکھنؤ کلکتہ چلا تو یہ لکھنؤ میں جا چھا اور مجھے چھوڑ کر واپس امپور کو اپنا بادشاہ بنالیا.... ناظرین اس تحریر کے رنگ سے بادشاہ کے اندرونی جذبات کا اندازہ فرما سکتے ہیں۔

جس زمانہ میں نواب محمد سعید خاں والی رامپور رونق فرمائے لکھنؤ میں تھے آپ نے اسیر کو اپنے صاحبزادوں کی تعلیم کے واسطے منتخب فرمایا پھر نواب یوسف علی خاں خلدیشیاں کے عہد میں لکھنؤ میں وظیفہ خوار رہے۔ نواب کلب علی خاں بہادر نے جب منتخب روزگار شعرا کو یکجا کیا تو حضرت اسیر کو بھی پیش قرار خواہ پر طلب کیا۔

اسیر محض غزل گو شاعر نہ تھے بلکہ ایک جید مصنف اور مینا سخن پر قادر تھے۔ اردو کے چھ دیوان علاوہ دیگر مصنفات فارسی و عربی کے ہیں۔ عروض و دانی میں اسیر کو خاص دست گاہ حاصل تھی۔ اردو فارسی کے علاوہ عربی میں بھی شاعری کی قابلیت موجود تھی۔ ان کا فارسی کلام بھی بہت صاف اور بامزہ ہے۔ گلشن عشق (دیوان فارسی) اور ذولسائین (قصائد مدحیہ نوابان رامپور) قابل دید و داد ہیں مصحفی کے شاگردوں میں اسیر و آتش خاص شہرت رکھتے ہیں۔

اسیر کی پُرگوئی یہاں تک مشہور ہے کہ انھوں نے بہتوں کو صاحب دیوان بنا دیا۔ اصلاح دینے میں جو مہارت انکو تھی وہ بہت کم سائز میں فنی گئی ہے۔ لیکن اس بات کا ضرور فہوس ہے کہ اسیر کے دیوان مطبوعہ بھی کیا ہیں۔ اسکا بڑا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ متعدد دیوانوں کا چھاپنا اہل مطلب اہم کام جانتے ہیں۔ لیکن تاہم یہ شکایت اسیر کے بعض شاگردوں کو دور کرنا تھی۔ انکا فرض تھا کہ انکے دیوان مطبوعہ فراہم کریں اور مناسب ہو تو انکا منتخب کلام جو ایک دو بڑے سے بڑے دیوانوں کے برابر ہوگا چھپو دیں تاکہ شائقین کلام اسیر کا شوق پورا ہو۔ مین نے بعض شائقین کو اسیر کے دیوانوں کا ستلاشی پایا۔

لیکن بازار میں نہ ملنے سے انکو یاموسی ہوئی۔ جن لوگوں نے اسیر کے کلام کو توجہ اور غور سے دیکھا ہو وہ اس بات کو جانتے ہیں کہ اسیر کے یہاں ہر قسم اور ہر رنگ کا کلام موجود ہے۔

اسیر کے شاگرد بہت ہیں اور ان کے بعض تلامذہ خاص استادانہ قابلیت رکھتے ہیں۔ اسیر مینائی، ماہر لکھنوی، شوق قدوائی، ظہور لکھنوی، یوسف لکھنوی، احمد، ریاض، سرشار، ابر، صفدر، وغیرہ استادانہ قابلیت کے لوگ ہیں۔ اسیر کی طبیعت بہت مرنجان مرنج تھی۔ اسے کبھی کسی سے مباحثہ اور معارضہ نہیں ہوا۔ دوسرے استادان فن غالب غیر بھی اسیر سے معاصرانہ برتاؤ کرتے تھے۔

بعض خاص مشاعروں میں جب اسیر اپنی غزل پڑھتے تھے تو ان کے دو چار شعر ایسی استادانہ قابلیت کے ہوتے تھے کہ اہل شاعرہ کو ان کے کمال کا معترف ہونا پڑتا تھا۔ بعض مشاعروں میں لوگوں نے اسیر کو فطرتاً و مسرت میں اٹھا اٹھا لیا ہے۔

اسیر کی وضع و تہذیب قدیم طرز کے بزرگوں کی تھی۔ مخلی گھیتلا، لمبا کرتہ، گول ٹوپی۔ وہ زیادہ تر فنس ہی پر سوار ہوتے تھے۔

اسیر ۱۲۹۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۳۹۹ھ میں انتقال کیا۔ انکی قبر انکے مکان کے قریب ندانی مقبرہ میں ہے۔

اسیر کی شاعری

جو کم مایہ شاعر سطحی شاعری میں کچھ معمولی شوخیاں پیدا کر لینے کا مذاق و ہمارت رکھتے ہیں وہ شاعری کی نہایت فصاحت و بلاغت اور مہنی افزائی کو ناپسند کرتے ہیں اور نہ یہ کڑی منزل ان سے طے ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ منزل وہی طے کر سکتا ہے جس نے تفصیل علوم کے ساتھ کامل شعر لے فارسی عربی کے کلام کی سیر کی ہے۔ فاضلانہ قابلیت کے بعد شاعر کی طبیعت ضرور ان میں کی جستجو کرتی ہے جو عامیانہ مذاق سے الگ ہو کر تے ہیں۔ اسیر کے یہاں جہاں ہزاروں صاف دسادہ اشعار ہیں وہاں بکثرت ایسے اشعار بھی ہیں جن سے

ان کی محققانہ فکر و تلاش کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے اردو میں فارسی شعرا کی نازک خیالیاں لطافت معنوی کے ساتھ دکھائی ہیں۔ درحقیقت اسیر کی شاعری ان کو ملک الشعرا ثابت کرتی ہے۔ انھوں نے ہر صنف شعر پر در طبیعت دکھایا ہے۔ مشہور مساذہ کے مشہور و مقبول اشعار کا جواب اس خوبی سے لکھا ہے کہ انکی قادر الکلامی میں شک نہیں رہتا۔ مثلاً شعرانے اس طرح میں کسے "خدا سرے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا" کیسی کسی نازک نیالیوں سے کام لیا ہے۔ گریبان کے قافیہ کو کن کن خوبیوں سے نظم کیا ہے نقد ان سخن کو اساذہ کے کچھ نہ کچھ شعور اس طرح میں ضرور یاد ہونگے۔ اسیر نے بھی اس طرح میں گریبان کا قافیہ لکھا ہے اور جس خوبی سے لکھا ہے اسکو ناظرین ملاحظہ فرما کر داد دے سکتے ہیں۔ جنون اور چاک گریبان کے ازلی تعلق کو کس خوبی سے ثابت کیا ہے۔ اسیر کے اس مطلع کو دوسرے اساذہ سے منملائیے۔ فرماتے ہیں ۵

ازل سے سلسلہ ہر جن جن فتنہ سالماں کا شگاف خامہ گن چاک ہو میر گریبان کا خامہ کن کے شگاف کو کسی اردو شاعر نے اپنے چاک گریبان سے شاید ہی سیمہ دی ہو۔ چاک گل، چاک سحر وغیرہ سے البتہ چاک گریبان کو نسبت دی ہو جدت اور خیال آفرینی ہی سے کمال شاعری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسیر کا یہ شعر بھی کس پایہ کا ہے۔ ملاحظہ ہو ۵

نبض بیارحمت کی سجاد کی آج کیا آپ نے جاتی ہوئی دنیا دیکھی زبان اور لطافت خیال کو دیکھیے کہ کتنا گہرا اثر دل پر پڑتا ہے۔ علی ہذا اسیر کا یہ شعر لا جواب ہے۔ اس مضمون کو حافظ اور تلیسی دس بھی اس خوبی سے سے نظم نہ کرتے ۵

خدا جانے دنیا جلوہ کا و ناز ہے کس کی ہزاروں اٹھ گئے رونق دی باقی ہر مجلس کی ذیل کے شعر کی آمد و بیجا خلی اور مصائب نیا دی کی حالت کو ملاحظہ فرمائیے ۵

میرے مردہ کو ہو کیوں آج اذیت چکا انکی قبر میں کیا عالم مکاں کی ہوا

نچرل حالت واقعہ کی صداقت اور ناصحانہ رنگ کو ذیل کے شعریں ملاحظہ فرمائیے۔ مصرعہ اولیٰ میں عام کلیہ بیان کر دیا اور دوسرے مصرعہ میں ایک خاص مثال لے کر اپنے قول کو اس طرح ثابت کیا ہے جسکی تکذیب ہو ہی نہیں سکتی دشمنی پر دہ افیت میں مزادیتی ہے

خوں پیے لافل ہوا در کا کلیجہ ٹھنڈا

تصویر انقلاب

ہم جانتے نہیں ہیں مجھے میرے آشنا کیا انقلاب دہر کی صورت بگئی

نازک خیالی

ترک ے کشی کی تہیہ کو ذیل کے شعریں ملاحظہ کیجیے۔ صائب کی روح کو

پھر کانیا لا شعریں ۵

ڈرتا ہوں کیس بادہ کشی ترک نہو جا

نقشہ دل ب جام ہلالِ رضاں کا

عبرت اور نصیحت

ہو بے ثبات گلشن گیاں جو چشم شبنم لے گل سمجھ کے ہنسنا سوچ نہیں سہی کا

ضعف کی حد

منفعت سے پیوند تیں ہر جازیں کا ہو گیا

مثل نقش پا جہاں بیٹھا وہیں کا ہو گیا

نئی موت

بوسہ ملا جو اس لب شیریں کا مر گئے دی جان ہنے چشمہ آبِ حیات پر

بہار کی تصویر کس نازک خیالی سے کھینچی۔ بہار کا جھولا کتنا نیا بنایا ہے

لچک ہو شاخوں میں جنبش ہوئے پھولوں میں بہار جھول رہی جو خوشی کے جھولوں میں

انقلاب کی نئی مثال

جب ٹپتا ہوا دل میں ڈرتا ہوں چرخ پر جا پڑے زمیں نیکیں

لطف زبان اور بول چال

پیپر دو دل جو نہیں جیتے ہو بوسہ کیا مال پر لوٹ بھی ہو دم لگاتے بھی نہیں

زندہ اندہ زندگی

شیشہ ہے نفل میں عام شراب لب پر ساقی یہی مزاجی و دودن کی زندگی کا

عالم نزع

چھوٹے ہیں اقربا جاتے ہیں ہم سودا کیسی کا وقت ہو چھایا ہو عالم پاس کا

تلون

کس سے کون تلون انا سے روزگار دشمن وہ لاکھ بار ہوئے لاکھ بار دوست

نیا نشین

نشین طائرانِ وح کا ہو تیغ جاناں پر ہزاروں ملیں بھی ہیں دیوارِ گلستاں پر

شوخی اور اداسندی

دلِ مجروح کو کیا دیکھے آئے ہو پیرہہ چھپاؤ چہرہ دیکھو چاندنی پڑتی ہو پسلی پر

سفر عدم کی رفتیں

زنجیرِ تعلق مے پاؤں سے تو نکلے ہو فاصلہ دو گام کا ہستی سے عدم

شکوہ حجاب

نہ اٹھا اس بُخِ روشن سے پردہ ہو چکا شکر دی شوقِ تماشہ گپ اہل تماشاکو

احساق

وہ کون ہیں جو دوست کرتے ہیں دشمنی مجھ کو تو دشمنوں سے محبت پسند ہے

صعوباتِ سفر

تھک چکے ہیں پاؤں ہسکا آستانہ دور دوری دن حکم منزل کڑی ہو اور جہان دور دوری

غم سے گریز

کیا خوب ہو موت آئے جو سب مجھے پہلو نازک ہو یہ دل داغِ غمزاں نہ اٹھیکا

ترغیبِ محبت

بے مشقت نہیں ہوتی کوئی حبت حاصل غرقِ دریا ہوا غصہ تو گو مسرِ پیا

فقدانِ سرور

مینا نہ جہاں میں نہ تھا بادہ لٹاٹ پچھتائے تو بہ تیرے گنہ گار توڑ کر

ذیل کے شعریں صداقت مضمون ملاحظہ ہو
زیت کتے ہیں جسے ہر مہربان موت کتے ہیں جسے آرام ہے
شکوہ بیرحمی

دل کو پکڑے ہوئے ہم سامنے آئے سب
ذیل کا شعر بالکل سیر کے رنگ کا ہے

جو عاتق ہو اٹھا دل سے تعلق دہرائی کا دم آیا نہ آیا کیا بھر دسا زندگانی کا
رندانہ شوخی

مستی میں اُنک آگئی جیست کو تر زاہد کا علامہ سرباز ار اُتارا
مشفوقانہ عتاب

مارا مرے سر صبح شب پہل بگڑ کر مرجھاے ہوئے پھول کا جب ہا اُتارا
عاشقانہ

اُٹھنا اُنھیں منظور ہے پہلو سے ہمارے حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تیش نل
دھوم محشر میں ہوئی جب تری آفرین کی بے گنہ لگے چھپ چھپ گنگناؤں میں

مودانہ رنگ
نظر آتا ہو ترا چہرہ زیب کس کو حُسن بے پردہ ہو پر تاب تماشا کس

شوخی
ساغر ہمارے ساتھ لب آب جو پیو تنہا جو پیو تو ہمارا الو پیو

کوئے قاتل کو جو چلتا ہوں تو سایہ ڈگر پوچھتا ہے یے جاتے ہو کہاں تم مجھ کو
جذبات عشق و محبت

کچھ تو الفت کی تسے کو چہرے بڑاتی ہو گرد اُٹھ کر مرے دہن سے لپٹ جاتی ہو
ذیل کا شعر جس پایہ کا ہو نقاد ان سخن اسکی داد دے سکتے ہیں

اُگیا صنعت ہی کچھ کام کہ تربت میں سیر ہو گئی ختم قیامت مرے اُٹھے اُٹھے
متفرق و منتخب اشار

صورت تری دکھا کے کوئی لگا یہ روز محشر آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا تصور تھا
کیوں طامین وہ آنکھ اب ہم سے لے چکے دل نکل گیا مطلب

تھی دستوں کو کیا خون ہمارے آسانی ہو کفِ افسوس مل کر رہ گئی برقی لپٹ خرم پر
جب آئی گردشی میں چشم سانی اُڑا دیے ہوش میکشوں کے

نکل پڑے سیکہ سے باہر ہزاروں سیکش بہک بہک کر
جو میں نے آنکھوں سے پوچھے آنسو اُبل پڑے اور شک خونین

لو کی دو بوتلیں بھری تھیں لگا جوتا تھا آ رہیں ڈھلک کر
میں نے کہا بکس ہوں میں لوئے عین ہوم حسرت ہماری ہو بھی باقی تھا لے دل کے پاس

کڑی ہو اس قدر منزل عدم کی کہ مر مر کر پہنچے ہیں وہاں تک
کہا جو میں نے کہ رخ سے ذرا نقاب اُٹھاؤ تو ہنس کے بولے کہ منظور قتل عام نہیں

اُنھیں کا مال تھا اچھا کیا دل لیلیا میرا کوئی چھینے نہیں لیتا ہو اُنسے کیوں کر تہیں
لما کر خاک میں بھی لے شرم اُنکی عین جاتی نگہ نیچے کیے وہ سامنے دفن کے بیٹھے ہیں

در بار جانتے ہیں مزاروں کو بے خبر مُردوں کو جا کے کرتے ہیں زندہ سلام
دل میں اپنے ہو جگہ اُس بت کا فری آسیر نالہ دل ہو کہ نا تو بس صنمناہ عشق

مند سے تنہا ہو یہاں کا فرد و نذرین قی زاہد اتنا تو نہیں سجدہ و زار میں فرق
کعبہ جو ایک سیکہ زاہر گلی گلی بت لاکھ رنگ میں ہیں خدا ایک رنگ میں

معجز لب سے جلایا تم نے مردہ غیر کا کیا ہماری لاش قابل ایک ٹھوکر کے نہیں
بسر کی ابتدا و انتہاے عمر ماتم میں محرم میں ہے پیدا قضا آئی محرم میں

نا قبول خلق تھا ایسا بنا کا فر جو میں جتنے ہندو تھے مری صند سے مسلمان ہو گئے
عبرت کا ہو مقام زمانہ کا انقلاب تکیہ فقیر کا ہے لحد بادشاہ کی

خاصیت سیاب ہو عاشق میں تھا کہ کشتہ نہوجب تکا سے آرام کہاں ہو
دل جلا کر رخ محبوب کا جلوہ دیکھا ہنسنے گھر بھونک کے کیا خوب تماشا دیکھا

غریب خانہ میں آئے تو سرفراز کیا خوشا نصیب قدم آپ کے مرے سر پر
جب تک ہو گوش ہوش فناء میں ترا جب تک ہے زبان تری گفتگو کریں

دیئے خدا نے عوض ایک ایک کی ہیں کریم بانٹ کے زر صاحب خزانہ ہوا
بت کدہ کی میں سیر کر آیا دال خدا ہی خدا نظر آیا

ہوں وہ سبیل کہ ہو نہیں عاشق دُ دل بھرا آیا جو زخم بھرا آیا

اب کہاں وہ لکھنؤ سا کناں لکھنؤ رہ گئی باقی زبان پر داستان لکھنؤ
پہلو میں وہ عیسوی ہر اجل سر پہ کھڑی ہو
کیا جان دم نزع کشکش میں پڑی ہو

اس لیے دامن سے میرے شک پونچھ لیا
باقی ابھی ہے ترک تمنا کی آرزو
کیونکہ کہوں کہ کوئی تمنا نہیں بچے

۱۔ ز۔ لکھنوی

تنقید کتب

راج ترنگنی اس نام سے ٹھاکر اچھر چند صاحب شاہپوریہ نے زبان سنسکرت کی ایک ”محرکۃ الاراء“ کتاب کا ترجمہ دو ضخیم جلدوں میں کیا ہے۔ اس میں بقول ٹھاکر صاحب موصوف کے ”قدیم فرمانروایان کشمیر کے مفصل حالات، معاصر تعلقات اور ان کے عروج و زوال کا نقشہ نہایت موثر الفاظ میں کھینچا گیا ہے“۔

وجودیکہ آج کل کے تخیل مذاق کے خلاف اس میں بہت سی باتیں پائی جاتی ہیں تاہم اصل مطالب کے دلچسپ مفید ہونے میں کلام نہیں۔ اس تاریخ کی ترتیب تدوین ہندوؤں کے چونی کے مورخ ”کلھن پنڈت“ سے منسوب کی جاتی ہے اسی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ مصنف نے اسے زیادہ تر ایک نظم کی حیثیت میں لکھا تھا۔ لیکن چونکہ اس میں قدیم فرمانروایان کشمیر کے حالات و واقعات بالاستیعاب قلمبند کیے گئے ہیں اس اعتبار سے اس میں تاریخ کی شان ضرور پیدا ہو گئی ہے۔ ٹھاکر اچھر چند کی یہ اولوالعزمی قابل داد ہے کہ آپ نے نہ صرف زر کثیر، محنت شاقہ برداشت کر کے اس کتاب کا مکمل ترجمہ اپنے اہل وطن کے فائدہ کی غرض سے کر دیا ہے۔ یوں بھی کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ جس کتاب کا ترجمہ بعض یورپین زبانوں میں ہو گیا ہو اس سے اردو خواں طبقہ محروم رکھا جاتا۔

خواہ راج ترنگنی کو بعض جوہ سے مستند و مستند تاریخ کی حیثیت دینے میں عیسا پسند طابع متاثر ہوں، لیکن یہ ضرور ہے کہ اسکی شہرت بحیثیت مجموعی عرصہ سے قائم ہو اور اکثر کتب میں اسکا حوالہ دیا گیا ہو۔ فی الحقیقت راج ترنگنی بجائے ایک تاریخ کے رزنیہ نظم کہلانے کی زیادہ مستحق ہو اور یہ

امر بالکل قرین قیاس ہے کہ کلھن پنڈت نے اپنی تصنیف میں تاریخی رنگ کی عوض ”شاعری“ کا رنگ چوکھار کھنا پسند کیا ہو۔ اور غالباً یہی سبب ہے کہ اس میں بہت سی باتیں ایسی پائی جاتی ہیں جنہیں ایک ”محرکۃ الاراء“ تاریخی کتاب میں دیکھا کر بیجا ختمہ ہنسی آتی ہو۔ جا بجا ایسے واقعات و کوائف درج کیے گئے ہیں جو بافوق العادت ہونے کی وجہ سے بالکل غیر ضروری کہے جاسکتے ہیں اور جنہیں کوئی بالغ نظر تاریخی پہلو سے وزن دار خیال نہیں کرے گا۔ بلکہ اسکے برخلاف، صاحب کتاب کی ضعیف الاعتقاد و وسادہ لوحی کا اسکو اقرار کرنا پڑے گا۔ ذاتی طور پر ہم ان تمام روایات کی عزت، دل سے کہنے کے لیے تیار ہیں جن کا ذکر مذہبی پیرایہ میں کیا گیا ہے، لیکن تنقید نگاری کا فرض یہ کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ تاریخ میں ان کا جو نہایت بھونڈا نظر آتا ہے۔ اور ان باتوں کی وقعت اس زمانہ میں کھیتہ نہیں ہو سکتی جبکہ ادھام باطلہ اور منفرط حسن اعتقاد کی مضمرات کا قلع قمع تعلیم کی بدولت ہوتا جا رہا ہے مثلاً راجہ پرور سین ثانی کے حال میں شہر پور پور کے آباد کرنے کا واقعہ سرتاپا خلاف فطرت ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ راجہ شہر کے لیے موقع تلاش کرتا ہوا ایک ندی کے کنارے پہنچتا ہے۔ جس کے دوسری طرف اُسے ایک یوں نظر آتا ہے جو راجہ کو دیکھا کر تعجب لگاتا ہے اور کہتا ہے:-

سواے بکرماجیت، شودرک، اور آپ کے، جو دلیری میں بہت بڑھے ہو
ہیں، کامل استقلال کی مثال اور کہیں مشکل سے نظر آتی ہے۔ ہے پر تھو
راج! آپ کی خواہش پوری کی جائے گی۔ آپ اس پشتہ پر سے گزر کے میر
پاس آئیے۔

قرین قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ تاریخ نگاری کے فن سے نااہل ہوں۔ بالخصوص اس صورت میں کہ بعض تاریخی کتابیں، جو زمانہ کی دست برد سے بچ رہی ہیں، اب تک دیکھی جاسکتی ہیں۔

اور اس کا جواب کہ اگر ہندوؤں نے تاریخیں لکھی تھیں وہ گئیں کہاں یہ یالگیاہر کہ ہندوؤں کا بیان تو یہ ہے کہ قدیم ہندوستان کی تاریخیں بھی ضرور تھیں لیکن مسلمان علماء و مؤرخین نے کج خانہ اسکندریہ کی طرح انھیں محو و بیکار کر کے جلا کر برباد کر دیا۔ مترجم صاحب کا ذاتی خیال اس باب میں حسبِ میل ہے۔

کسی حق پسند کو اس بات سے انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمان علماء و مؤرخین نے ہندوستان کے قدیم نسخے کو ضرور مدہ پہنچایا ہے۔ آج

مندرجہ بالا تینوں شخصیات کا تہ نظیر کی محتاج ہیں مترجم صاحب کے پہلے اصول موضوعہ کے مطابق گویا ایک شخص کا کئی علوم میں دست بر لکھنا اس بات کا مترادف قرار دیا گیا ہے کہ وہ تمام علوم پر حاوی ہے۔ یعنی افلاطون فلسفی ہونے کے ساتھ ایک شاعر اور مہمار، اور ہومر، شاعر ہونے کے ساتھ ایک اعلیٰ درجہ کا ریاضی دان اور مصور بھی تھا۔ یہ قاعدہ جس قدر پوچ ہے ظاہر ہے۔ اسی طرح مسلمان علماء و مؤرخین نے ہندوستان کی قدیم تاریخوں کے جلا کر برباد کرنے کا الزام اس وقت تک ناقابلِ اعتماد و ہونا وقتیکہ مستند حوالوں سے یہ نہ ثابت کر دیا جائے کہ اسلامی فتوحات سے پہلے یہاں تاریخوں کا کوئی ذخیرہ تھا بھی۔ لیکن یہ حوالہ جات راج ترنگنی ایسی شاعرانہ تاریخ سے نہ ہونا چاہئیں۔

یہ امر بھی غور طلب ہے کہ مسلمانوں کو، ہندوؤں کی تاریخی کتب کے ساتھ کوئی خاص دشمنی تھی۔ کیوں کہ سنسکرت لٹریچر کی وہ بیش قیمت کتابیں جن پر ہندو مذہب کا دار و مدار سمجھا جاسکتا ہے اب تک موجود ہیں حالانکہ قدرتی طور پر سب سے پہلے مسلمانوں کو انھیں کیجا نب توجہ ہونا چاہیے تھا۔ بہر کیف حضرت مترجم نے بطور دفع و خل مقدور جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اسکی وقت جملہ معترضہ سے زیادہ نہیں اور حقیقت حال یہ ہے کہ ہندوؤں نے فنِ تاریخ

سے اپنی مناسبت ثابت کرنے کی کوئی یادگاری کوشش نہیں کی۔ بلاشبہ انھیں تاریخی واقعات کو نظم و شرکی صورت میں نہ دیکھنے کا شوق رہا ہو گا جیسا کہ متعدد ذمہ نظموں اور بشیما رکتوں کے مطالعہ سے آشکار ہوتا ہے۔ لیکن دراصل ان میں نہ ہی رنگ اس درجہ غالب تھا کہ تمام چیزوں میں اسکا پتہ چلتا ہے۔ اسکا اعتراف باوجود نالال ہے، نے اپنی کتاب سولینریشن ان انشٹنٹ انڈیا میں ان الفاظ کے ساتھ کیا ہے :-

غرض کہ علم نجوم و ہندسہ و جبر مقابلہ و صرغ و نحو و موسیقی و فلسفہ و تعمیرات جو معراج ترقی کو پہنچ گئے ان سب کا تعلق قدیم ہندوستان کے مذہب سے تھا لیکن علم کے دوسرے شعبے جن کو مذہب سے کوئی تعلق نہ تھا انکی جانب لوگوں نے اس قدر توجہ نہیں کی۔

دوسری جگہ بابو صاحب موصوف پھر لکھتے ہیں :-

ہندوؤں کے دلوں پر مذہبی خیالات نے اس قدر تسلط کر رکھا تھا کہ بلابالغہ انکی دنیاوی کتابیں، مذہبی کتابوں کے مقابلہ میں بے اہم و کم قیمت تھیں۔

یہ انھیں مذہبی خیالات کا پر تو ہے جو راج ترنگنی میں خصوصیت سے پائے جاتے اور جسکی وجہ سے قدیم تاریخ ہند کے تمام واقعات علی العموم، مشکوک و مبہم نظر آتے ہیں۔

تاہم اگر ان نقائص سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو راج ترنگنی میں بعض خوبیاں بھی ہیں۔ اسکے مطالعہ سے قدیم کشمیر کی طرز معاشرت اور نظام تمدن پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ انداز حکومت اور اصول سلطنت پر کہیں کہیں اچھی بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب کا مصنف شاعر بھی تھا بلکہ کہنا چاہیے کہ شاعر ہی تھا، اس وجہ سے اکثر مقامات پر شاعرانہ تلمیحات و استعارات کے استعمال سے انشا پر دازی کی جھلک پیدا ہو گئی ہے۔ کہیں کہیں مناظر قدرت کا نقشہ نہایت مؤثر الفاظ میں دکھایا گیا ہے کہ بے اختیار تعریف کرنا پڑتی ہے۔

مترجم نے بھی کتاب کے مکمل دواویز بنانے میں غیر معمولی سعی کی ہے۔

کشمیر کا جغرافیہ، فرما زوایا، کشمیر کے شجرات نسب، مصنف راج ترنگنی کے سوانح عمری، یہ تمام چیزیں ٹھاکر اچھر چند صاحب کی بے لاگ محنت کی رہنمائی ہیں۔ تفہیم مطالب میں آسانی پیدا کرنے کے خیال سے ایک ہزار سے زائد فٹ نوٹ بھی شامل کر دیے گئے ہیں جن کی موجودگی یقینی طور پر فائدہ مند ہے۔ ڈیڑھ سو صفحات کا ایک طویل سیاقہ ان سب پر طرہ ہو جیمن بحث و مباحثہ کی بہت گنجائش نکل سکتی ہے۔ فوسس ہو کہ مترجم صاحب کا تسلیم لے زنی کرتے ہوئے اپنی حد سے کہیں کہیں آگے نکل گیا ہو۔ تاہم اس خیال سے وہ قابل معافی ہیں کہ قومی طرفداری کے جذبات سے متاثر ہو کر کچھ بڑے بڑے ثقہ و متین مولف بھی کچھ حلوں پر اتر آتے ہیں۔

کتاب کی چھپائی کا اہتمام بھی کافی طور پر اچھا ہوا ہے۔ اور بلا تلافی کو اسکے واسطے گراں بار خرچہ برداشت کرنا پڑا ہو گا۔ ہر دو جلد، جو جدا گانہ طور پر مجلد ہیں اور جن کی صفحہ بندی بھی علیحدہ علیحدہ ہے، ان کی مجموعی قیمت آٹھ روپے اور محصول ڈاک عدہ جو بہر حال مناسب موزوں ہو ملے گا پتہ یہ ہے :-

ٹھاکر اچھر چند اینڈ کمپنی، کٹرہ پوریاں، لاہور

نشاطِ عمر مولوی بشیر الدین احمد دہلوی کا نام نامی عرفی سے مستغنی ہے۔ آپ مولانا نذیر احمد ایسے نامور اور زرخیز جواوید باپ کی یادگار ہونے کے علاوہ خود بھی مصنف و مؤلف ہونے کا قابل فخر امتیاز رکھتے ہیں۔ اس وقت تک آپ کے قلم سے جو کتابیں نکلی ہیں، اگرچہ انکی تعداد چنداں زیادہ نہیں لیکن نوعیت و مفاد کے اعتبار سے آپ کی علمی کوششیں مقبولیت کی سند حاصل کر چکی ہیں۔ "اقبال و لہجہ" سے جسکا پیرایہ تحریر اور انداز بیان مولانا نذیر احمد کے طرز کا بہترین نمونہ ہے، اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ آپ کو اپنے والد بزرگوار کی طرح سوسائٹی کے معائبے محاسن کا تذکرہ دل آویز و موثر طریقہ پر کرنا بہت اچھی طرح آتا ہے۔ اسی طرح

آپ کی بعض دوسری کتابیں کسی نہ کسی پہلو سے مفید و کارآمد ثابت ہو چکی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو ہندوستانی طرز معاشرت کی درستی و اصلاح کا کافی انماک ہوا اور یقیناً اسی غرض کو مد نظر رکھ کر آپ نے امریکہ کے مشہور ڈاکٹر سلونین سٹال کے سلسلہ "سلف اینڈ سیلس" کی بعض کتب کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ کتابیں امریکہ و یورپ میں غیر محدود شہرت و وقعت حاصل کر چکی ہیں اور چونکہ ان میں سلسلہ وار، بچوں سے لیکر بوڑھوں تک کے واسطے نہایت بیش قیمت معاشرتی تعلیمات قلمبند کی گئی ہیں اور ان واقعات و معاملات پر عقلی و نقلی دلائل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے جن سے کسی انسان کو چارہ نہیں، اس وجہ سے ان کتابوں کی قدر قیمت آج کل ہاں بہت ہے۔ ہندوستان میں پنجاب ریجنس بک سوسائٹی (لاہور) کی مساعی جملہ سے اردو میں اس سلسلہ کی اول تین کتابوں کا ترجمہ ہو گیا ہے اور وہ بجائے خود قابل تعریف ہیں لیکن اسکے باوجود مولوی بشیر الدین احمد کی یہ الو العزما علمی خدمت کسی طور سے فعل عبث نہیں قرار پا سکتی۔ مولوی صاحب نے ترجمہ تو ضرور کیا ہے لیکن ہندوستانی رسم و رواج اور ضروریات کو مد نظر رکھ کر اس میں ضروری اور مفید ترمیم کے لیے بھی گنجائش نکال لی ہے جو ہر طرح قابل داد ہے۔ گویا آپ نے ان تمام امور کو، جن پر ڈاکٹر صاحب نے یورپین سوسائٹی کے نقطہ خیال سے نگاہ ڈالی ہے ہندوستانی معاشرت کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ اسکے علاوہ آپ نے پیرایہ تحریر عالمانہ و فاضلانہ دکھایا ہے جو بجا آیات قرآنی اور احادیث نبوی کا جوہر استناد اس خوبی سے لگایا گیا ہے کہ کتاب کی شان دوبالا ہو گئی ہے۔ انکے مایوسہ قابل مترجم نے ثبوت کے طور پر اپنے ذاتی تجربات و مشاہدات کا تذکرہ کر کے مطالب میں غایت درجہ کی دلچسپی کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ پنجاب ریجنس بک سوسائٹی کے تراجم میں یہ تمام خوبیاں مفقود ہیں۔ ان میں لفظی ترجمہ کی پابندی کی گئی ہے اور نشاطِ عمر اس قسم کی ف سے مطلقاً سہرا ہے۔ اصولاً بھی مولوی بشیر الدین کا یہ طرز عمل کسی طرح قابل گرفت نہیں بلکہ اسکے برخلاف کسی غیر زبان کی کتاب کا ترجمہ جب کیا جائے

تو اُس میں ترمیم و اضافہ کی آزادی مترجم کو اخلاقاً حاصل ہونا چاہیے۔
 اردو زبان میں اکثر ترجمے اس خصوصیت سے خالی ہوتے ہیں اور مفسرین
 کی نظریں انکی کوئی وقعت نہیں ہوتی۔ بعض صورتوں میں تو لفظی ترجمہ
 کی قید دل آویز و مفید مطالب کا خون کر دیتی ہے اور مترجم کی محنت بجا
 مشکور ہونے کے مورد لعن و طعن قرار پاتی ہے۔ اردو زبان میں مغربی لٹریچر
 کے بعض گرانمایہ جواہر کا اضافہ بذریعہ ترجمہ ہو رہا ہے اور اس سے لڑکوں
 ادب کو خاص طور پر مطمئن ہونا چاہیے لیکن اسی کے ساتھ اہل قلم گروہ
 کا فرض ہے کہ وہ اپنی سوشل اور تمدنی خصوصیات کو نظر انداز نہ ہونے دیں
 تاکہ انکی کوشش اہل ملک کے لیے نفع بخش ثابت ہو۔ مولوی بشیر الدین
 ان تمام وجوہ سے، مستحق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے نہ صرف ایک کارآمد
 سلسلہ کتب کا اردو زبان میں ترجمہ کر کے اردو خوان ناظرین کو اُس سے
 متمتع ہونے کا موقع دیا ہے بلکہ دوسروں کے لیے راستہ بھی کھول دیا ہے
 کہ غیروں کے مال و متاع کو، نیک نیتی کے ساتھ اپنے تصرف میں کس طرح
 لانا چاہیے۔

ڈاکٹر سلینوس مٹال صاحب نے اپنے اس مشہور و معروف سلسلہ میں
 کئی کتابیں لکھی ہیں۔ پہلی کتاب نو عمر لڑکوں کے متعلق ہے، دوسری نوجوانوں
 کے لیے، تیسری فلسفہ ازدواج سے تعلق رکھتی ہے اور علی ہذا القیاس۔ جن
 مباحث پر ڈاکٹر صاحب کی یہ تصانیف مبنی ہیں ان کی تفصیل تحصیل حاصل
 ہوگی۔ مختصر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جن امور کا، توالد و تناسل سے تعلق پایا گیا
 ہے ان سب پر آپ نے رے زنی فرمائی ہے۔ لڑکوں کے متعلق ڈاکٹر صاحب
 کی پہلی کتاب جن میں عادات قبیحہ کے مضر نتائج کو نہایت خوبی سے ذہن نشین
 کرنے کے علاوہ اور بھی بہت سی بیش قیمت اخلاقی نصیحتیں بیان کی گئی ہیں
 اُسکا ترجمہ مولوی بشیر الدین احمد اس سے پیشتر خزر طفلان کے پُر معنی
 و موزوں نام کے ساتھ شائع کر چکے ہیں اور ”نشاط عمر“ دوسری کتاب کا
 ترجمہ ہے۔ اسکے اندر کس قسم کے مضامین قلمبند کیے گئے ہیں، اسکا جواب مندرجہ

ذیل سرخیوں سے ملے گا جو اقتباساً درج ذیل کیجاتی ہیں۔ سرمایہ زندگی
 تزکیہ نفس، جسمانی کمزوری، امرئیں نبیثہ اور انکے ہونا ک تاج،
 اعتدال توالد و تناسل اور ان کی غرض، مرد و عورت کے تعلقات،
 شادی کا مقدس فریضہ، وغیرہم۔

بلاشبہ یہ مسائل جس قدر دقیق اور نازک ہیں اُس قدر یہ انسانی زندگی
 پر موثر بھی ہیں۔ بعض باتیں ظاہر میں نکا ہون میں شاید غیر مہذب یا
 مشغل کن دکھائی دیں لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان
 باتوں پر اسے مبنی کرنے کا اس سے زیادہ مہذب اور متین انداز ناممکن
 خودیورپ میں ایک جماعت ڈاکٹر سلینوس مٹال پر فحش و گندہ لٹریچر کی
 فراوانی کا سامان ہم پہنچانے کا الزام لگاتی ہے اور ممکن ہے کہ ہمارے بعض
 ہموطن مولوی بشیر الدین احمد کو بھی اس الزام کا بھٹہ سدی مستحق
 سمجھیں۔ تاہم معمولی طور پر بھی اگر غور سے کام لیا جائے تو پتہ چل سکتا
 ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور مولوی صاحب، دونوں کی کوششیں رفاد عام اور
 خیر خواہی نام پر مبنی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ توالد و تناسل کی طرف
 ہمارے یہاں کسی کو توجہ کرنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں ہوئی۔ حالانکہ
 اسی پر قومی زندگی کا انحصار ہے۔ ”نشاط عمر“ میں جو کچھ اور جیسی کچھ نصائح
 و ہدایات مندرج ہیں وہ علی طور پر نوجوانوں کے لیے نہایت کارآمد ہیں
 اور اسکی ضرورت ہے کہ ملک کے نونال انھیں آویزہ گوش بنائیں۔ بقا
 نسل کا مسئلہ نہایت درجہ اہم ہے۔ پس جو لوگ اپنی مذموم عادت کی بدولت
 اپنی نسل کو خراب کرتے ہیں وہ اخلاقی طور پر قوم اور ملک کے گناہگار ہیں
 اور انھیں گناہگاروں کی ہدایت کیلئے ”نشاط عمر“ ایسی کتاب کی ضرورت پڑتی
 ہے کہ اسکی اشاعت ہندوستان میں کافی طور پر ہو تاکہ جس مقصد کو پیش
 رکھ کر مولوی بشیر الدین احمد صاحب نے یہ خدمت انجام دی ہے وہ باحسن اوجہ تکمیل کو
 پہنچے۔ اسکی قیمت ۳ روپے ۶ پیسے ہے جو تقریباً ۳۰ صفحات کی کتاب کیلئے کچھ زیادہ
 نہیں کہی جاسکتی۔ ملے کا پتہ:- مولوی بشیر الدین احمد صاحب، اول تعلقہ دار عثمان آباد،
 (ریاست حیدرآباد دکن)

بزم فرید اردو لٹریچر کی خوش قسمتی ہے کہ اُس میں ہر پہلو سے نمایاں ترقی کے آثار پیدا ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کوششیں جو ہو رہی ہیں وہ محدود ہیں حالانکہ ہماری ضرورتیں اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان کوششوں کا دائرہ وسیع کیا جائے۔ تاہم جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ بسا غنیمت ہے۔ یہ بالکل قرین قیاس ہے کہ جو بنیاد آج پڑ رہی ہے اُس پر کبھی عالیشان عمارتیں کھڑی ہو جائیں گی۔ یعنی اردو زبان میں تاریخ، فلسفہ، سائنس، ادب، شاعری، وغیرہم مباحث پر جو چھوٹی چھوٹی کتابیں اس زمانہ میں تصنیف یا تالیف یا ترجمہ ہو رہی ہیں وہ گویا ایک شاندار مستقبل کی خبر دیتی ہیں۔ تصوف کی ایک شاخ رہ گئی تھی لیکن اس کمی کے پورے کرنے کی گراں بار ذمہ داری کا رکناں ”نظام الاشاع“ نے اپنے سر لے لی ہے اور اس وقت تک اُن کی مساعی حیلہ سے صوفیانہ مشرب کی کئی شریعتیں کتابیں نکل چکی ہیں، جو اپنے محاسن ظاہری و باطنی کے اعتبار سے قابلِ تعریف و ستحس و داد ہیں۔ اس باب میں ملامحمد الواحدی کی بے لاگ خدمات خصوصیت سے استحقاقِ اعتراف رکھتی ہیں، جن کے قلم سے، حال میں ”بزم فرید“ کے نام سے ایک مفید و دلچسپ کتاب کا ترجمہ شائع ہوا ہے۔

”بزم فرید“ جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے ”حضرت بابا فرید شکر گنج قدس اللہ سرہ العزیز کے اعمال و اقوال کا مجموعہ ہے“ جسے حضرت سلطان الاولیا محبوب الہی (خواجہ نظام الدین) نے زبان فارسی میں راحتِ القلوب کے نام سے ترتیب یا تھا اور ملامحمد الواحدی نے اُسکا اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ حضرت محبوب الہی، حضرت بابا فرید شکر گنج کے راسخ الاعتقاد اور حضور رس و حاضر باش پیرو تھے۔ دوسرے بزرگانِ دین کی طرح بابا صاحب کا دربار بھی تقریباً روزانہ منعقد ہوا کرتا تھا، اور مختلف اذکار ہوا کرتے تھے جن کے اُتار میں سیکڑوں نکتے معرفت و حقیقت کے لکے جاتے تھے۔ انہیں کارنامہ باتوں کا مجموعہ ”بزم فرید“ ہے جو نہ صرف ایک گراں پایہ شیخِ طریقت کے محفوظ ہونے کے باعث بلکہ تصوف و اخلاق

کے آب و دار موتیوں کی ایک سلک ہونے کے لحاظ سے بھی طبقہ صوفیہ میں جائز طور پر ہر دل عزیز کی اور مقبولیت حاصل کرنے کا حق رکھتی ہے اور امید ہے کہ ملامصاحب کا یہ ترجمہ ہندوستان کے متصوفین کے لیے دلچسپی کا نیا سامان پیدا کرے گا۔ آج کل جبکہ اخلاق و آداب کی کساد بازاری ہو رہی ہے اور تصوف کے حقیقی معنوں کے سمجھنے کی قابلیت عام طور پر مفقود ہوتی جا رہی ہے۔ اس قسم کی کتابیں قدر دانی کی مستحق ہیں۔ ملامحمد الواحدی صاحب لائقِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے رحت القلوب کا ترجمہ نہایت خوبی سے کیا ہے اور عبارت و انداز بیان کی خوبیاں ہاتھ سے جانے نہیں پائیں بلکہ اس کے برخلاف طرزِ تحریر میں سلاست و روانی کا اس قدر خیال رکھا گیا ہے کہ پڑھنے والے کو اسکا خدشہ بھی نہیں ہوتا کہ یہ کسی غیر زبان کا ترجمہ ہے۔ زبان کی خوبیوں سے قطع نظر، مطالب کے اعتبار سے بھی ”بزم فرید“، غایتِ درجہ سبق آموز ہے۔ عالمِ تصوف کے ہر ارادہ خلاق و علمت کے نکات، حسنِ معاشرت کے متعلق ہدایتیں، اس کتاب کے صفحات میں کمالِ عمدگی سے قلمبند کی گئی ہیں اور اس لحاظ سے نہ صرف فرقہ صوفیہ بلکہ عامہ مسلمین کے لیے بھی اسکا مطالعہ عبث نہیں قرار دیا جاسکتا۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ ظاہر میں اور دنیا پرست نگاہوں میں بعض باتیں قابلِ اعتراض ٹھہریں لیکن اس سے اور مفید باتوں کا انحصار اہل نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ روحانی دنیا کے ہر عجیب و غریب ہوتے ہیں اور انکا انکشاف دنیا داروں کی عقل سے محال ہے ان پر عبور کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اور وہ یہ ہے کہ پہلے تم اپنی طبیعت کو اُسی رنگ میں رنگو اور پھر جب تم میں روحانی منازل کے طے کرنے کی صلاح پیدا ہو جائیگی تو اسوقت یہ تمام مسائل، جو عقدہ لایخل اور راز سرستہ نظر آتے ہیں خود بخود حل ہو جائیں گے۔ اس قسم کے مضامین، جو ہماری سمجھ میں نہ آئیں، انکے متعلق ہمارا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ یا تو ہم انہیں اپنے اور اک سے بالاسمجھ کر اُن سے قطع نظر کریں یا بقول خواجہ حسن نظامی صاحب ”اسکی کوئی اچھی تاویل نکال کر دل کو سمجھا لینا چاہیے“۔

مختصر یہ کہ ”زم فزید“ گوناگوں دلچسپیوں سے ملبوہ۔ اہل علم حضرات کو اسکی قدر دانی کرنا چاہیے تاکہ مترجم و پیشبر کی حوصلہ افزائی ہو۔ چھپائی کا غزوہ و غیر سب نہایت موزوں و مناسب ہے۔ ضخامت ۱۱۲ صفحے جو جسکی قیمت مع محصول ڈاک و خرچہ و بی بی ۱۰ روپے زیادہ نہیں۔ دفتر نظام المشائخ، فیض بازار دہلی سے طلب فرمائیے۔

عجیب غریب صدی پنجاب لٹریچر سوسائٹی (انارکلی۔ لاہور) کی جانب سے جو مساعی جمیلہ اردو علم ادب کے سنوارنے اور نکھارنے میں عمل میں آئی ہیں وہ اسکا حق رکھتی ہیں کہ انکا ذکر و مباحثات کے ساتھ کیا جائے۔ آگے دن اس سوسائٹی کی زیر نگرانی ابھی اچھی کتابیں نکلتی رہتی ہیں اور ان میں ایک مشترکہ خوبی یہ ہے کہ یہ ساری کتابیں، خواہ مستقل تصنیف ہوں یا تالیف و ترجمہ، مذاق جدید کے عین مطابق ہوتی ہیں جس سے ہماری علمی ضروریات کی تکمیل متصور ہے۔ حال میں اس سوسائٹی کی جانب سے آلفرڈ رسل ولس کی دلچسپ سبق آموز کتاب ”دی وڈر فل سچری ریڈر“ کا ترجمہ مندرجہ عنوان نام کے ساتھ شائع ہوا ہے، جس کے مفید و کارآمد ہونے میں شک کی گنجائش مطلق نہیں ہو سکتی۔

مہذب و تمدن مخلص عالم میں آجکل ترقی و عروج کا دور دورہ ہے، مصر، برطانیہ، ہندوستان وغیرہ کی سر زمینیں اپنے اپنے وقت پر سرسبز ہوئیں، پھولی پھلیں اور پھرائیں ہمارا زمانہ ختم ہو گیا۔ اب یورپ امریکہ کی باری ہے اور ان ممالک میں آج کل ایجاد و تحقیق کی بدولت جو عجائبات عالم ظہور میں آ رہے ہیں وہ بجائے خود حیرت انگیز و ہوش ربا ہیں۔ بالخصوص انیسویں صدی عیسوی میں حکمت و سائنس کو جو عروج حاصل ہوا ہے اور اسکی بدولت مادی و اقتصادی نتائج مستنبط ہوئے ہیں ان پر عبور حاصل کرنا، اور ان سے واقفیت ہم پنجابی ہر اس شخص کے لیے لازمی و لا بد ہے جو جسکو مبدیہ فیاض سے اپنے ذہن و دماغ سے کام لینے کا ذوق و ودیت ہو اور ”عجیب غریب صدی“ میں انکا تفصیلی

ذکر کیا گیا ہے۔ گویا کتاب کیا ہے، کچھ بے ٹے موتیوں کی ایک لڑی ہے۔ اسکے مطالعہ سے ان تمام صلاحات و ترقیات کا مشروح و مورخانہ حال معلوم ہو سکتا ہے جو ”تہذیب یورپ“ کی تاریخ میں نمایاں درجہ رکھتی ہیں۔ یہ سب لوگ جانتے ہیں کہ آج کل نئی ایجادیں عجیب غریب کمشافات، اور حیرت انگیز تنظیلات ہوتے رہتے ہیں لیکن شکل ہے کہ کوئی شخص ان کے متعلق صحیح اور سلسل کیفیت بیان کر سکے۔ ”عجیب غریب صدی“ اس شکل کے حل کرنے کا بہترین ذریعہ ہے۔ اصل کتاب میں، جو انگریزی میں ترتیب دی گئی ہے ہر قسم کی معلومات کو ایک جگہ فراہم کر دیا گیا ہے اور جس مسئلہ کو ہاتھ لگایا ہے اس کے تمام مراحل عمدگی و خوش سلوہی سے طے کیے ہیں۔ ”عجیب غریب صدی“ ترجمہ ہونے کے لحاظ سے ان تمام محاسن کی حصہ دار ہے جو اصل کتاب میں پائی جاتی ہیں۔ انگریزی میں یہ کتاب بچوں کیلئے لکھی گئی تھی لیکن ہندوستان میں اسکا ترجمہ نہ صرف نو عمر لڑکوں کے لیے کارآمد ہو بلکہ وقت کار اور تعلیم یافتہ نوجوان اور بوڑھے اسکے ذریعہ سے اپنی معلومات میں کافی اضافہ کر سکتے ہیں۔ بعض مضامین اس میں ایسے دقیق ہیں کہ تا وقتیکہ پڑھنے والا علم طبعیات میں مہارت نہ رکھتا ہو ان سے حظ نہیں اٹھا سکتا لیکن اسکے باوجود انکے مفید و دلچسپ ہونے میں شک نہیں۔ وہ مضامین، جن سے انسانی تہذیب و تمدن کے مختلف النوع مداخل پر روشنی پڑتی ہے، ازمنہ سابقہ و زمانہ موجود کی معاشرتی زندگی کا سبق آموز تقابل پیش کرتے ہیں اور اس قابل ہیں کہ انکا مطالعہ غور و خوض سے کیا جائے۔

اس ترجمہ کے متعلق صرف ایک شکایت ہے اور وہ یہ ہے کہ ترجمہ میں زبان کی خوبیاں بالکل جاتی رہی ہیں جسکی وجہ سے مضامین کی دلچسپی بہت کم ہو گئی ہے۔ کاش نظر ثانی کر کے اسکو با محاورہ اور رواں کر دیا جاتا تو اسکی شان دوبالا ہو جاتی۔ پنجاب لٹریچر سوسائٹی کی طرف سے جتنے اور جتنے بھی نادر الوجود تراجم شائع ہوئے ہیں انکے مفید و کارآمد ہونے میں کلام نہیں لیکن جہاں تک دیکھا گیا ہے ان میں زیادہ تر خرابیاں زبان کی پائی

جاتی ہیں۔ سوسائٹی کے کارناموں کی غنت ہمارے دل میں بہت زیادہ اور
اسی لیے سرسری طور پر ان نقائص کا ذکر کیا گیا ہے کہ کار پر دازان سوسائٹی
مان کی اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ کسی کے عیوب کا انشا کرنا نہ فراموش
تعالیٰ ہے نہ تنقید نگار کو کسی کی خرد گیری کرنے سے کوئی ذاتی نفع حاصل ہوتا
ہے بلکہ اس سے مقصود محض اصول کی پابندی و اصلاح طلبی ہے۔ اس

اعتبار سے امید کو ناپا چاہیے کہ سوسائٹی اس ناپ چیز مشورہ کو اپنی عنایت تو
سے محروم نہ رکھیں گی۔

بجالت موجودہ بھی عجیب و غریب صدی قدر دانی کا استحقاق رکھتی ہے
قیمت ۶، ۲۰۰ صفحے کی ایک جامع کتاب کے لیے بہت کم ہے۔

سید القلم

کلام شاد

(از ہمارا جہ بہادر سر راجہ کشن پرشاد صاحب بالقاہم جی سی آئی ای)

جو وہ آجائے پہلو میں تو بیشک زندگی ہوگی
اُسی کو کر رکھو اپنا تم اُس کے گرنہیں ہوتے
ترے پاؤں کی آہٹ نے بیا محشر کیا ظالم
نہیں جبے و سر کوئی دوئی کا ذکر پھر کیا ہے
خدا والے نہیں پابند کچھ مسجد کے اے وعظ
زمانہ سے نہیں مطلب ہے کچھ کام غیروں سے
ذرا اُٹھ کر سامنے آجائے اک دن
طرفداری کر گیا کس طرح وہ میری کہئے تو
تدے زاہد کو لے سانی پلانے بادہ خواروں
نہیں چلتا کسی کا بس کریں گولا کھ تدبیریں
نشیلی آنکھ دکھلائے تھے قربان لے سانی
مقابل اُٹھ کر جو آدگے مزا ہوگا
ستم کے آپ خوگر ہیں جفا کے آپ عادی ہیں
بجز میرے کہاں ہے غیر کوئی دونوں عالم میں

و گرنہ خاک میری اور اُس بت کی گلی ہوگی
اگر وہ دشمن جاں ہو خدائی مدعی ہوگی
لحد میں عاشق شیدا کے بھی ہل چل پڑی ہوگی
یہ دعویٰ ہی غلط ٹھہرا خدائی دوسری ہوگی
وہ بتانے میں بھی جائیں اُسکی بندگی ہوگی
فلک کیوں دشمن جاں ہو جو اُس دوستی ہوگی
تصدق آپ پر اُس دن ہماری بخودی ہوگی
زبان آشنا کیوں کر زبان مدعی ہوگی
مزا وہ مے کا کیا جائے کبھی جس نے نہ پی ہوگی
وہی بات آئینگی آگے جو قسمت میں لکھی ہوگی
خودی میں سارا عالم اور اپنی بخودی ہوگی
ہماری آنکھ کی پتلی تماشہ دیکھتی ہوگی
مگر یہ یاد رکھیے گا خدائی مدعی ہوگی
مری حیرت مگر میرا تماشا دیکھتی ہوگی

دکن میں اب نہ بیلے گی طبیعت شاد کی ہرگز

جو وہ اجمیر کو جائے تو پھر اُسکی خوشی ہوگی

محس

جو نودۃ العلماء کے دارالعلوم کی رسم فونڈیشن کے موقع پر از سر جان ہوا فٹ
گورنر مالک متحدہ آگرہ دادہ کی حضور میں پڑھنے کے لیے ایک دست کی فراموش سے لکھ کر
لکھو بھیجا گیا تھا گریسی صلیت وہاں پڑھا نہیں گیا اور اب تک شائع بھی نہیں ہوا۔

ڈر حادثات دہر کا پھراس عمارت کو ہوا رکھی گئی ہو علم اور صلاح پر جسکی بنا
ہوں راج اور مزدور جسکے اہل علم و تقا اور منتری جسکا بنے صو کا غود فراروا
ہوٹ نے ڈالی تیری نیولے نڈو کر شاخدا

اب کلین فصل خدات تیری سب ان ہون سر جان جو تیرا مٹی قوم ہے تیری معین
رک کے آخر جھپٹے ہیں تیری جابلہل بن لے نڈو یہ سامان بختا یہ بانی نہیں
پھڑ پھڑ اس بیڑے کو کیا جسکا خدا ہونا خدا

بے گھر تھا تو لے نڈو جھکو گھر دیا سر جان دیرا نہ تھا۔ آباد جھکو کر دیا سر جان نے
موقع تجھے بہتر سے بہتر تر دیا سر جان نے خاک تھا اک تو رنگ سمن بھڑا جانے
اب تو قدم آگے بڑھا خواہش کر رہی سوا

اُس ملک اہل ملک سمجھو خدا ہے مہربان آزاد ہوں مذہب ان آباد ہوں معبد جان
ہو سلطنت اُس قوم کی جو علم کی ہو قدراں جلسو نہیں پلکے شریک کر ہون م زبان
دین تاکلنے خلق شاہانے دل رب بڑھا

دین علم کی ترغیب نہیں جو علم سے بیزار ہوں انکو جانین نیند غفلت جو سرشار ہوں
خیر اپرا انکو چڑھائیں جو کہ ناہوار ہوں دین داعی حق پر بیخ انکو جو عقد ہوں
جس قوم کو کھین کر دین وکر اسکا اٹھا

مکن ہو کچھ اس حکومت میں نالان و زمین پاس تو خالی حکومت کوئی عالم میں نہیں
وہ بادشہ قبضہ میں جسکے تہاں ہوا زمین اسکی حکومت میں بھی شادی جو کہیں انکمین
باران رحمت کہیں رحمت کہیں سب بڑا

حق یہ جو جس ملک میں قوم کی حالت جدا ہر قوم کا مقصد لاکس قوم کی حاجت جدا
رسمین جہاں قوم کی مذہب جدا ملت جدا نقشہ جدا رنگت جدا صورت جدا سیرت جدا
ہو انتظام اُس ملک میں کام انکلسن کا حالی

محس۔ درود

منت کش سر خار نگاہ ناز سینے دل حمید کہ ہے خوگر نیاز
سامان عیش چھوڑ کے اید اطلب ہوا ہوتا ہو در عشق میں جو کچھ وہ سب ہوا

منت پذیر نالہ نا قوس برہمن ن شرمندہ نولے بخلوت در انجمن
شیرازہ نظام نوا ہائے کائنات اک درد دل چویش گہوارہ حیات
اقلم عشق حسن میں جسکی تیز ہے وہ چیز دل میں راحت جان عزیز ہے

عاشق کی جان صوفی صافی کا لار دل لے دست ذوق بندش ترکیب ہو گل
لے ہمکنار لذت سامان آرزو تیری کسکے موت میں بھی جان آرزو

جس دل میں تیرا فیض محیط روان ہوا

دُنیا کی بزم عیش میں وہ سرگران ہوا

لے درد تو نہاں ہو بیان بزم راز میں خلوت کدے ترے ہن ہون کے گزاریں
دُنیا فریب غور وہ ذوق مجاز ہے تیری حقیقتوں سے جہاں بے نیاز ہے
ظاہر پرستیوں سے مٹی شوکت نیاز کس کو سائیں بزم میں یہ قصہ دراز
شیخ حرم نشین ہے صنم ساز انجمن مایا کے جال میں ہے گرفتار انجمن
ہے قحط گرچہ تیرے متاع گزار کا واقعہ نہیں جان ہی نوا لے راز کا
فیض ازل کا دست سجا ہے کھلا ہوا پتا ہے اُسکے فضل و کرم کا جھکا ہوا
مستلزم مات بود نہ ہر قیمتست

حشیمہ حیات بود آب و بے بہات

افسوس ہو کہ حال دون کا خراب ہے ذوق مجاز چشم خرد کا حجاب ہے

نظارہ باز عالم پہاں غموش ہیں ن مست خار ساغر صہبائے دوش ہیں
محو سال برق تجلی طور جان اُن کی نظر میں اور کی گنجائشیں کہاں
ترکش میں اُن کے آج بھی و تیرا ہے جو منزل حیات میں سامان راہ ہے

عشق سے رہتی ہے طبیعت گرم؛ شعلہ رویوں کے ساتھ صحبت گرم
عشق کے کھیل ہم نے کھیلے ہیں سو پر زار و شرم کیلے ہیں
عشق کے لطف ہم نے پائے ہیں کیا کمین کیا مڑے اڑائے ہیں
عشق سے دل گزار ہوتا ہے ناز میں بھی نیا ز جو تا ہے
سو دو این ہیں اک کک اکی سوا د این ہیں اک لک اکی
یہ ہے معشوق نوجوانوں کا یہ ہے محبوب راز دانون کا
عشق سے آدمیت آتی ہے آدمی کو مروت آتی ہے
عشق سب بل نکال دیتا ہے عشق سانچے میں ڈھال دیتا ہے
ہے معلم ہزار مجنون کا سبق آموز ہے فلاطون کا
عشق کا لطف زندگانی ہے زندگی کا مزاج انی ہے
عشق عاشق کو بخشواتا ہے عشق جنت میں لیکے جاتا ہے
عشق ایمان ہے خدا رکھے یہ مری جان ہے خدا رکھے
عشق باطن ہو عشق ظاہر ہو اس سے توبہ کرے تو کافر ہو
نالہ عشق نعمت نے ہے اثر عشق نشہ سے ہے
اس سے دل کو سرد ہو تلے

اس سے نشہ میں چور ہوتا ہے

آکھ کا طلسم

دنیا میں روئے اہل نظر کی جو شان آکھ ہے طفلِ مردک کا منور مکان آکھ
شرم و مروت اور غضب کی جو شان آکھ تیغِ نگاہِ نازبتان کی ہے سان آکھ
اتھا اگر الم کا کرے ابر تر بنے
کا جل کی کوٹھری ہو جو عاشق کا گھر بنے
یہ آکھ دشتِ خوبیٰ کا غزال ہو یہ آکھ جامِ بادہ حسن و جمال ہے
یہ آکھ زکس چمن انفال ہو شرم و حیا و مہر کی ہر اسکا خال ہے
عجازِ عیوی سے اگر سین مارے
امرت کا گھونٹ خلق کے نیچے اتارے

یہ آکھ نگاہِ غریبہ و غضب کو ہے یہ آکھ آئینہ بُخِ عیش و طرب کو ہے
دن کو یہ آفتاب ہو متاب شب کو ہے مخزنِ مروت اور حیا کا یہ سب کو ہے
طوطی کی آکھ ہو جو دفا سے حذر کرے

دریا چٹے شراب کا مستی جو گھر کرے

غصے میں ہو تو کھینچے خنجر فلک اٹھے انگارہ تل ہو کوئے کی صورت ہو کٹھے
ڈھیلوئے آگ شعلہ نظر سے جھک اٹھے سوچ ہو ایک نیزہ پہ چلی چک اٹھے
کھیر کی طرح کاٹے سر کو جو دیکھ لے
قیمہ بنائے چھوڑے جگر کو جو دیکھ لے

موقعِ خوشی کا ہو تو بنے کشتِ زعفران خندہ دہانِ مردم دیدہ سے ہو عیان
خگین ہو کر تو زخم کی صورت ہو خنجرِ نشان ہو ایک بوندِ پانی سے بحرِ وانِ دِلن
موقعِ حیا کا ہو تو نہ اُن پر نظر اٹھائے

بتلی چھپے پلک میں نہ غیر سے اٹھائے

کرتی ہر عیش و ہم کے اثر کو قبول آکھ باغِ نشاطِ غیر سے چنتی ہو پھول آکھ
ہوتی ہو رنجِ اہلِ الم سے لول آکھ ہوتی ہو سات پر دوشین اپنے بول آکھ
القصدہ فرد جذب و اثر میں نگاہ ہے

سمیرِ زیم ہمارے بیان کا گواہ ہے

اگے رشی منی جو خدا رس گذر گئے اس آکھ سے ہزاروں ہی اعجاز گئے
مردے کٹی میں آئے تو زندہ وہ گھر گئے دیکھا نگاہِ قہر سے جنکو وہ مر گئے

معلوم ہو یا چھی طرح خاص عام کو

پھونکا تھا شیوہ جی نے نہیں آکھ شو کا کو

غصہ میں ہو تو عقل کے اوسان کھو یہ سیاب کے کنوئیں میں ہو گود بوسے یہ
سارے بدن کا کسل مٹا دے جو سوئے یہ کل جسم پر ادا اسی ہو طاری ہو روئے یہ
دل سے شریک درد ہو اعضا کے روگ میں

گر حسرتِ نکاح خون ہو بیٹھے یہ سوگ میں

سینہ جو غم سے شق کہ جگر میں شگاف ہو اقرار دل کو جرم سے یا انحراف ہو

بلطن سیاہ ہو کہ کد رک صاف ہو یہ آنکھ حال جسم کا فوٹو گراف ہو
ماندنہض نقشہ تقریر کھینچ دے

نظرون میں بات بات کی تصویر کھینچ دے

تاثر سارے جسم کی اس پر ضرور ہو غمگین ہو یہ جو درد کا اس میں قوت ہو
پنی لے جو دے دین تو یہ نشہ میں چور ہو مستی بدن کو پھر اسے پہلے سرور ہو

موج بکا اگر ہو تو نوارہ چھوٹ جائے

دریائے اشک بارہ یہ ہو بند ٹوٹ جائے

خواب کترا سکو غیب کی تین بتاتے ہیں جنکا نہو گمان وہ چیرین دکھاتے ہیں
خواب اسکے ایک آن میں کعبہ بتاتے ہیں بے کوڑی پیسے چین کی پورا کھاتے ہیں

کیفیت اچھے خواب کی لکھون یہ نہیں

تفریح طبع کیلئے بھوٹے بھی کم نہیں

سویا جو بھی منید میں محمود کا پیر دی خواب نے تولد محمود کی خبر
شاہ جہان جو ہند کا تھا تاملہ امور دکھلاے اسکو مسجد جامع کے سقف در

دہلی میں ٹھیک خواب کی تعمیر ہو گئی

مسجد اسی نمونہ کی تعمیر ہو گئی

ہر چیز کو بتاتی ہو کھوٹی کھری یہی حسن و جواہرات کی جو جہری یہی
کرتی ہو سبکی مثل خضر رہبری یہی جنس نفیس خواب کی ہو مشتری یہی

الفت کا دوسرے پر اثر دیکھنے سے ہو

بچوں کو ہوشوں کو نظر دیکھنے سے ہو

دنیا کا کام کوئی نہوا آنکھ اگر نہ ہو لطف حیات نام کو بھی عمر بھر نہ ہو
دم بھر کسی طرح بھی خوشی سے بسر نہ ہو بیکار آنکھ بھی جو اس میں نظر نہ ہو

قد آنکھ کی وہ جانے اسے روچکا ہو جو

خالق سے آنکھ کے نظر کھوپکا ہو جو

لازم ہو سب کو سبکی حفاظت کریں ہم فرامین اپنے نور بصارت کی روک تھام
سرمد لگاؤ میں کام لین عینک سے صبح و شام جسمین نظر پہ زور پڑے وہ کریں نہ کام

آنکھ کا ضعف کلی ٹائے زوال ہو

افسوسناک موت سے مرئی خال ہو

اس آنکھ کا ہر کام کہ دیکھے نہ مال غیر فرصت جو کچھ ملے کہ علمی کتب کی سیر
کے لئے جو جاکے دیکھے کہ جاکے سیر دیر تیر بیل کے مول نے ہمنظر سے سیر

عورت جو دیکھے غیر کی فی الفور بند ہو

دام حیا پسند و مردت پسند ہو

آنکھیں ہی ہیں نعمت اُفق میں تنگ نہیں مٹی خراب ہو جو قرین چمک نہیں
آنکھوں بغیر حرف غم و رنج حک نہیں کندن کا لطف خاک نہیں گرد مائیں نہیں

ہر آنکھ میں اتنی بصارت کا گھر ہے

جب تک دم میں دم ہے قائم نظر ہے اُفق لکھنوی

سیتا کی فریاد

تیرے ترکش میں ابھی ہمال و کماند رقصا تیرا بقی تھا کوئی مجھ پر چلانے کے لیے
کم تھی وہ صحرانوردی؟ کم تھے وہ راؤں کے بڑا آہ ایام بھی باقی تھے آنے کے لیے

وہ زمان جان گزرا جب ہر گل باغ اشوک شعلہ نار عقوبت تھا جلانے کے لیے
آہ اتھے اس قید میں سامان جنم کے تمام تھی مگر اسید دل کو لگا گدا نے کے لیے

روکنا جاں کو نکھنے سے کہ آئین کے ضرور دل سے یوں کناکھ میں تیرا آنے کے لیے
ہائے میں مجبور اب کس رکھوں چشم اُمید

جب ہوئے آمادہ وہ آنکھیں چرانے کے لیے

آنسو دکھائیے کیوں جاری ہو گھٹن پر سجتا تو تو کتنا تھا چلو گنا گنا لانے کے لیے
کاش آگ کا تو ہمیشہ کے لیے لے لے مجھے یوں اگر تیار تھی میری پلانے کے لیے

آرزو رشیوں کے ارش کی بھی تھی بیشک پڑ تھی تیار اس حالت میں آنے کے لیے
کیا کہو گی؟ کیوں ہوئی آوارہ دشت بلا تنگ من اب اسے اُنکے آستانے کے لیے

دلخ رسوائی جو فرضی دامن سیتا ہے مٹ ہی جاؤں گاش میں اس کو تانے کے لیے
ہائے وہ دل کس طرح مجھ سے کد ہو گیا آئینہ تھا جو دل صافی زلنے کے لیے

جاننے والے ہیں وہ اسرار کے اول تو پھر آتش سوزان تھی کافی اڑانے کے لیے

رام کی خاطر زلف نہ کھوڑا تھا۔ مگر آہ بھکو رام نے چھوڑا نہ کے لیے
لب پہ ٹھوکر رام کا آنے تو کٹ جائے زبان بھکو پیدا ہی کیا صدرا ٹھانے کے لیے
ہنگام ہورام مجھ سے تو ممکن ہی تھا کس طرح آتا جو کچھ تقاضا پیش آنے کے لیے
میں نہ چھوڑ دینی نہ چھوڑ گئی خیالِ ام کو

گو چھتا ہی ہے دامن چھلانے کے لیے

آہ الے صحرائے پھولوں اس لیے ہنستے ہوں کسے ہنستے ہوں؟ کسے ہنسنے کے لیے
تم تھے دور نے خندانِ ام کا تھا او گھوٹا اب ہنسو گے تم کسی کو غولنے کے لیے
انہوہیتا کی آنکھیں پر ہنستا کلا دل ہو اب جتنے کو گھنیں غن پنا کے لیے
لطفِ گلشنِ حرم صحرائے حرمِ ہوا سبزوار و آبی ہوں خیالِ آواز کے لیے
تھالے باد صبا اٹھ کھیلو گے دن گئے اب جیگی تو کیسی خاک اڑانے کے لیے

دل بڑھیکا کسا آبی گالی گھٹا کو دیکھ کر

آئیگی تو آئیگی بجلی گرانے کے لیے

دھرتی ماما کھول دے غرضِ الفت کھول دے ساری دنیا اب ہو بھوکا کٹ کھانے کے لیے
میں کہاں لے آمان تیرے وہاں آزم توٹ پر طرزِ جفا کو آزمانے کے لیے
پوچھتی رہتی ہوں تیرے گھر کو مگر ناگمان

مضطرب ہو آہِ اجان زار جانے کے لیے تلوک چند محروم

.....

خالق نے آدمی کو دیے ہیں عجیب ہاتھ ایسے کہاں کسی کو ہوئے ہیں نصیب ہاتھ
شکلیں مرض کو ہوتی ہو کیا کیا مرض کے رکھتا ہو جیکہ نبض پر اپنا طبیب ہاتھ
مسند نشین صد ہوا اک صاحبِ قار باندھے کھڑا ہو سائے کوئی غریب ہاتھ
مشہور ہو رہا ہو کہ بن جائے گا وہ کام جس کام میں لگائے کوئی نصیب ہاتھ
ایجاد و اختراع زبانے میں کر گئے کیا کیا دکھا گئے ہیں ادیبِ لب ہاتھ
دنیا میں جو جان کیں تھو کا ہوا میں کام دور دور مگر میں قریب ہاتھ
فل کے فراق میں نہ نکلا جان زار دنیا سے دھوڑے جانے کہیں عند لب ہاتھ
اتوں میں روح بھونک رہا ہو اثر کی جار و نظار جو بھینک رہا ہو خطیب ہاتھ

رہتی ہو آرزو یہ صفت کی رات دن رکھ کر مری سخن پہ نہ کوئی ادیب ہاتھ
یک بار گی یہ کیوں تماشائی پھر کٹھا آئی جو کوئی بات عجیب غریب ہاتھ
کہتا ہوا ایک دوسرے سے کیا حج ترا لگ جائیگی زمین مجھے درجیب ہاتھ
ہاتھ آنے چار ہاتھ لگے دو کہیں کہا دن بھر میں سچ بتا لگا کیا نصیب ہاتھ
گرتی ہیں بھلیان سی زمین فراق پر دیتا ہو جیکہ ہاتھ میں کوئی صیب ہاتھ
ہو آرزو کسی کی کسی پر تار ہوا دھن ہو کسی کو آئے ہمارے قیب ہاتھ
اب تو نکالتے ہیں فلک کو بھی راستہ جلوہ دکھا رہے ہیں بعید قریب ہاتھ

لے اٹھ کر پڑھو گے دیکھتی رہتے غفلت

پھیلائے مرگے پونہیں بے نصیب ہاتھ

.....

حق کے لیے شیخ کو رستہ دکھا دیر اندل کہیں نہ رستہ دکھا
تھار گداز دوست میں دل ہی رہبر کب خضر تھا رہنے رستہ دکھا

گلشن سے نسیم بو اڑا لائی ہے سوئے ہوئے فتنہ کو جگالائی ہے
یہ سنہری ہے اور چھلا داسنکر گفام کو کا ندھ پہ اٹھالائی ہے

کیا کوئی سے حسنم کا فسانہ تیرا کہ تو ہی کہاں تھا آشیانہ تیرا
نادان سمجھ لینے کو کہ دانہ بٹل لایا جو قفس میں آہ و دانہ تیرا

ہو طائر روح کیا ٹھکانہ تیرا دنیا ہو سیاہ قید خانہ تیرا
کچھ بھی نہیں یا شاخ مفید لکھ سوا وان قافِ قدس تھا آشیانہ تیرا

دعا کا مقولہ ہے کہ عقبی مل جائے صنم کی تنہا ہے کہ دنیا مل جائے
دنیا عقبی یہ دونوں چھوڑے ہم نے ہم تو یہی کہتے ہیں کہ سوائی مل جائے

محمد علی

